خطبات حکیم الاسلام

جلد ۵

افادات

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی
نوّر اللہ مرقدہٗ

مرتبہ
قاری محمد ادریس ہوشیار پوری

اضافہ وترتیب جدید :- مولانا محمد شفیق فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار۔ کراچی۔ فون ۲۶۳۱۸۶۱

حقوق طباعت بحق ناشر محفوظ هیں۔

مرتب مدظلہ کے اصل مکتوب گرامی کا عکس

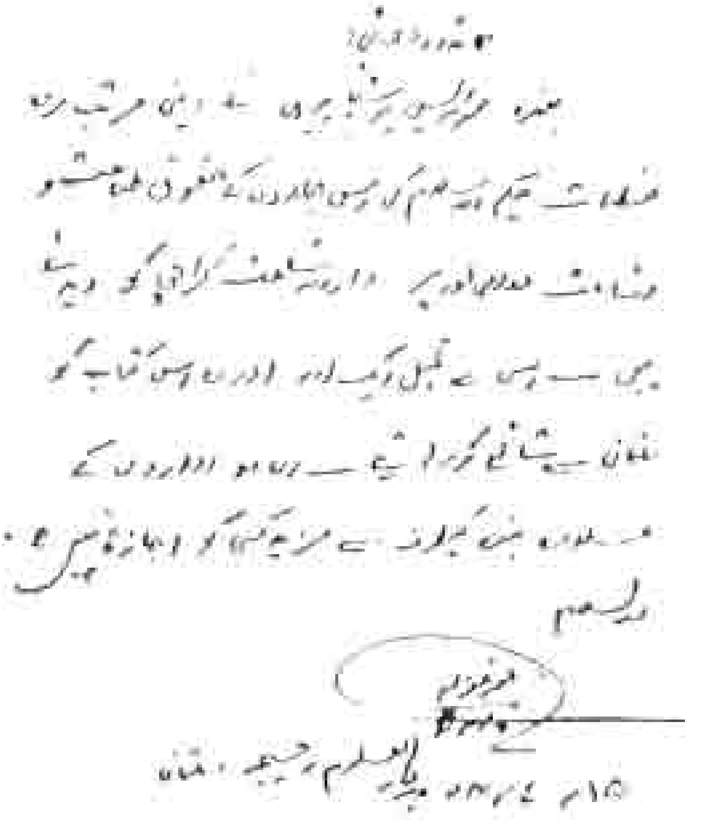

طبع اوّل کمپیوٹر : ۱۹۹۷ء

طبع دوم کمپیوٹر جدید ایڈیشن نومبر ۲۰۰۰ء

باهتمام : خلیل اشرف عثمانی

مرتب : قاری محمد ادریس ہوشیارپوری ۔اضافہ وترتیب جدید، مولانا محمد شفیق صاحب

مصححین : مولانا محمد عمیر صاحب۔ مولانا عبدالبصیر صاحب۔ مولانا محمد ہارون صاحب

طباعت : حسان پرنٹنگ پریس

فون: 6642832

ملنے کے پتے :

بیت القرآن اردو بازار، کراچی ۱

ادارۃ المعارف دارالعلوم، کراچی ۱۴

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور

ادارۃ القرآن ڈی۔ ۴۳۷۔ دیپ روڈ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔

اجمالی فہرست

نام خطبات	صفحہ
مکتوب گرامی	۴
دعوات فتحیہ	۵
انتساب	۶
پیش لفظ	۷
کلمات تبرک	۹
حرف سپاس	۱۰
افادات علم و حکمت	۳۷
افادات علم و حکمت	۵۹
افادات علم و حکمت	۱۱۷
افاداتِ علم و حکمت	۱۲۱، ۲۳۹
مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب	۲۵۵
مؤتمر اسلامی قاہرہ میں خطاب	۲۵۹
مؤتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب	۲۶۷
تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہندوستان	۲۸۳
امتیازِ دار العلوم	۲۸۵
الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم	۲۸۹
اکابرِ دیوبند اور آزادیٔ ہند	۲۹۹
حدیث پاکستان	۳۰۵
خطبہ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند	۳۱۳
آزادیٔ ہند کا خاموش راہنما	۳۲۵
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ شخصیت و کردار	۳۴۳
آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب	۳۴۹
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	۴۰۵
آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند	۴۰۹
تیونس و مراکش کی جدوجہد آزادی	۴۱۷
اظہار تشکر	۴۲۳
عالم اصغر	۴۳۳

عارفِ ربانی، حجۃ القراء شارح شاطبی

حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحب

(ادام اللہ بقاءہ بالعزۃ والجمال)

مکتوب گرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے پیارے عزیز مولوی قاری محمد ادریس صاحب نورک اللہ علماً وعرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمدللہ بخیریت ہوں، مرض میں نہ اضافہ ہے اور نہ افاقہ، اللہ پاک سے احباب کی مخلصانہ دعاؤں کی بدولت صحت وقوت کا امیدوار وطلب گار ہوں۔ الحمدللہ سب نمازیں حرم شریف میں ہو رہی ہیں، کبھی کبھی عمرہ بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ ذہنی سکون، طبعی بشاشت میسّر ہے۔ فللہ الحمد والشکر۔ آپ کی مساعیٔ حسنہ کے ثمرات خطبات حکیم الاسلام جلد اوّل مکمّل مُنے، بے حد لُطف آیا۔ اللہ پاک حکیم الاسلام دامت برکاتہم اور جامعینِ خطبات کو اپنی شایانِ شان دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ یہ ایک مبارک اور عظیم کام کر رہے ہیں۔ ان مواعظ، خطبات کا مقصود یعنی رجوع الی اللہ ورسولہ صحیح معنی میں امّتِ مسلمہ کو عطا ہو۔

میرے پیارے! آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ اعراب سے معریٰ ہیں۔ طبع ثانی میں صحیح اعراب لگا دیئے جائیں کہ پڑھنے والے سب حافظ وعالِم نہیں ہوتے۔ آج کل خطبات جلد ۲ سُن رہا ہوں وعظ "راہِ اعتدال صفحہ ۸ میں" ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ کا ترجمہ شاید لکھنے سے رہ گیا ہے۔ طبع ثانی میں اس کو بھی پُورا کر دیا جائے۔ تمام احباب کو بہت بہت سلام اور چھوٹے بچوں کے لئے پیار ودعا پیش ہوں۔ اس پرچہ کی دعائیں اللہ پاک سب کے حق میں قبول فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

دعواتِ فتحیہ

حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو اور پُورے خاندان کو اور پُورے عالم کے مسلمانوں کو کامل عافیت و راحت اور سکون و اطمینان کے ساتھ رکھ کر جملہ ضروریات اپنے غیبی خزانے سے پوری فرماتے رہیں اور آج سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک بے شمار' بے حساب' حلال' بابرکت' باوسعت رزق بھی آپ حضرات کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو عطا فرمائے آمین! نیز آپ حضرات کو اور ہم سب کو آخرت کی فکر و شوق دنیا کی فکر و شوق سے کروڑ درجے زیادہ نصیب فرمائے۔ نیز موت اور خاتمے کے دن کو ہم سب کے لئے کروڑوں عیدوں سے بڑھ کر خوشی کا دن بنا دیں۔ نیز ہماری قبروں کو اپنی رحمت سے جنت کا باغ بنادیں اور دوزخ کے گڑھے نہ بنائیں اور سب کی تمام پریشانیوں کو راحتوں سے اور بیماریوں کو شفائے کامل عاجل مستمر سے اور مشکلات کو آسانیوں سے اور رنجوں اور غموں کو خوشیوں سے اور قرض داریوں کو سبکدوشیوں سے اور تنگیوں کو فراخیوں سے آن کی آن میں اور دم کے دم میں بدل دیں۔

اٰمین یا ربّ العالمین۔ بجاہِ سیّدِالمرسلینَ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

ازاحقر کاتب السلام علیکم و عرض دُعا قبول ہوں۔

بقلم عبدالقادر بن محمد متقی عفی اللہ عنہما

۵/۶/۱۴۰۲ھ

۳/۱/۱۹۸۲ء

بعد عصر حرم نبوی شریف (صلی اللہ علیہ وسلم)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

انتساب

خطبات حکیم الاسلام کی پہلی جلدوں کی طرح جلد پنجم
کی ترتیب و تدوین کے اس ذرۂ بے مقدار کو بھی اپنے اُس
صاحبِ حریت و تعلیم للتربیت اُستاذ مستقیم الاحوال بزرگ
عارف ربانی کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جو زندگی بھر خدمت
قرآن حکیم میں مصروفِ عمل رہے اور بالآخر قرآن کریم کی ایک
دُنیا اُن سے اکتسابِ فیض کر رہی ہے۔
—— بالآخر چالیس برس کی تعلیم جہد و جہد کے بعد
اُسی مسند پر جان جان آفریں کے سپرد کر دی، جہاں
روزِ اوّل درسِ قرآن کریم کے لئے رونق افروز ہوئے تھے ——
یعنی مرادِ سعید و القرآت ورسانۃ اللہ مساجدہ،
شیخ الحدیث والعلم، عارف باللہ سیدی و سندی مولانا
حضرت امام النحوی القاری رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرہ العزیز
(خلیفۂ ارشد حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب
مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ) سے ہے —— جن کے فیضِ
صحبت، بے پایاں عنایات اور حسنِ توجہ کی بدولت ناچیز نے
تمام کیا۔ ——

ہدیۂ مور و قطرہ بجانب بردن شد خار و خس همره بگلستان بردن
اما چہ کنم کہ رسمِ مور است پائے ملخے پیشِ سلیمان بردن

یکے از تلامذۂ حضرت سید الاسلام
محمد عزیز
۲۹ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہِ الکریم وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ واتباعہٖ اجمعین امّا بعد

خطبات حکیم الاسلام جلد پنجم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

اللھم لااحصی ثناء علیک کما اثنیت علیٰ نفسک۔ اللھم لک الحمد کالذی تقول وخیرا مما نقول۔

خطبات کی ترتیب کا جب آغاز ہوا تھا تو جلد اوّل کی ترتیب کے بعد اپنے محدود وسائل کے پیش نظر بندہ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اپنے اکابر واساتذہ کرام کی دعاؤں سے یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اہلِ علم میں مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنے بندوں میں مقبول بنایا۔ امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے فضلِ عظیم اور دریائے کرم کے صدقے اپنی جناب اقدس میں اِسے قبول فرما کر آخرت کی نجات کا ذریعہ بنا دیں گے۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

ہمارے سلسلۂ قرآن حکیم کے جد امجد حضرت اقدس عارف باللہ شیخ القراء مولانا قاری فتح محمد صاحب (مہاجر مدنی) قدس اللہ سرہٗ نے تو اس ناکارہ کی اس قدر حوصلہ افزائی وعزّت فرمائی کی کہ حضرت والا کی شفقتوں کے اظہار کے لئے بندہ کے پاس الفاظ نہیں۔ جب کبھی بھی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ با اہتمام دریافت فرماتے۔ خطبات کی مزید جلد آئی --- اور اتنا شغف رکھا کہ چاروں جلدیں اہتمام کے ساتھ اپنی مجالس میں سُنیں۔ جلد چہارم کے بعد بھی دریافت فرمایا کہ اور جلد آئی — بندہ نے عرض کیا پہلے بھی آپ کی دعاؤں سے سب کچھ ہوا۔ آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ انشاء اللہ آجائے گی۔ الحمدللہ حضرت اقدس کی دعاؤں سے پانچویں جلد تو آپ دیکھ رہے ہیں۔ مگر افسوس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ اور میں جلد حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مدارج قرب میں بہت زیادہ ترقیات سے نوازے آمین!

بہرحال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے یہ کام جاری رہا اور انشاء اللہ ابھی جاری ہے۔ اسی طرح اپنے عظیم محسن استاذ حضرت اقدس شیخ القراء قاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں ایک بار حاضری ہوئی۔ فرمانے لگے :

"بھائی! میں تو آپ کو روزانہ یاد کرتا ہوں، آپ پتہ نہیں یاد کرتے ہو یا نہیں؟"۔

آپ کے اس فرمان پر مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی بہت زیادہ ہوئی پھر ارشاد فرمایا :

"بھائی! وہ آپ کی "خطبات حکیم الاسلام" کی جلد میرے تکئے کے نیچے رکھی ہے جب رات کو (تدریس سے فارغ) ہو کر گھر جاتا ہوں تو اسے دیکھتا ہوں"۔ پھر فرمایا :

"بھائی! زندگی میں سب یاد کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقی محبت کا پتہ تو

مرنے کے بعد چلتا ہے۔ اس وقت کون یاد رکھتا ہے"۔

حضرت اقدس کا اشارہ اس طرف تھا (جو میں سمجھ سکا) چونکہ کتاب کا انتساب حضرت والا کی طرف تھا کہ اب تو آپ محبت کا اظہار کررہے ہو مرنے کے بعد بھی یاد رکھنا۔ مراد حضرت کی یہ تھی اس وقت آدمی کو دعاؤں میں یاد رکھا جائے۔ فراموش نہ کیا جائے --- یہ حضرتؒ کی کمال تواضع تھی۔ ورنہ کجا بندۂ نابکار اور کجا میری دعاء۔ ان حضرات اکابر کے اس تذکرہ خیروبرکت سے خود خطبات اور مرتب خطبات سے جو ان کی محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ خطبات کی اہمیت اور مرتب کے لئے نجات کی سند ہے --- ایفائے عہد اور تعمیلِ حکم کے لئے خود بھی حضرت اقدسؒ کے لئے دعاگو ہوں اور تمام قارئین کرام سے بھی ملتجی ہوں۔

اسی طرح حضرت اقدس شیخ القراء قاری فتح محمد صاحبؒ اگرچہ وصال فرماگئے۔ مگر اب بھی حضرت والا کا خط مبارک برائے حصول برکت اور "دعواتِ فتحیہ" کو اسی طرح جزوِ کتاب بنایا جارہا ہے۔ جس طرح ان کی حیات مبارکہ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سب اکابر کو ہماری طرف سے بہت جزائے خیر نصیب فرمائے آمین!

بہرحال ان حضراتِ اکابر کی دعاؤں نے بہت کام دیا۔ علاوہ ازیں اور بہت سے اکابر اور خطبات کے قارئین کرام نے بہت دعاؤں سے نوازا۔ امرواقعہ یہ ہے کہ یہ اکابر کی دعاؤں اور قارئینِ خطبات کی دعاؤں کا ثمرہ ہے اور بس!

پانچویں جلد کی ترتیب کے سلسلہ میں جو مطبوعہ تقاریر حاصل ہوئیں وہ بھی شامل کی گئیں۔ لیکن بعض جگہ کچھ ناگزیر تبدیلی کرنی پڑی۔ بالخصوص بعض عنوان بدلنے پڑے اور ان کے خطبات کے اس طرز کے موافق کیا گیا۔ جو قارئین کرام کے پہلی چار جلدوں کے مطالعہ کی وجہ سے ایک خاص ذوق بن گیا تھا۔ بایں ہمہ بندہ ادارہ "الحق" اکوڑہ خٹک پشاور، اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مبلغ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت بہاولپور کا بھی تہہ دل سے بھی شکرگزار ہے کہ انہوں نے یہ تقریر بہم پہنچائی۔

اسی طرح اپنے برادر محترم جناب مولانا محمد رفیق صاحب انور نعمانی (مقیم مدینہ منورہ) زادھا اللہ شرفا وکرامتہ کا تہہ دل سے شکرگزار اور ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے پانچویں جلد کا خاصا مواد مہیا کیا اور پانچویں جلد میں ان کی طرف سے بہت ہی زیادہ معاونت ہوئی۔ اس تبلیغی سلسلہ میں جس پاکیزہ جذبے سے انہوں نے معاونت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور دارین میں اس کا بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین!

خطبات حکیم الاسلام کی پانچویں جلد کے منظرعام پر آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ ظاہری طور پر جہاں مواد کا نہ ملنا باعثِ تاخیر ہوا۔ وہاں یہ بھی سبب بنا کہ میری اہلیہ محترمہ کا بچے کی ولادت کے چند روز بعد انتقال ہوگیا اور ذہنی سکون جو ترتیب و تالیف کے کام کے لئے لازمہ ہے' نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ نصیب فرمائے۔ قارئینِ باتمکین سے ان کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اور یہ استدعاء بھی ہے کہ خطبات کی چھٹی جلد کی تکمیل کے لئے دعاؤں سے یاد فرمائیں۔ احسان وکرم ہوگا۔

بندۂ نابکار
محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلۂ
جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

کلماتِ تبرک

الحمد لولیّہ والصّلوۃ والسّلام علی نبیّہ

امّا بعد!

برکت السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلاّم مولانا قاری محمد طیب صاحب مدّظلہ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نام نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیّت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے ــــ علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہلِ علم، خطباء، ائمہ مساجد اور مقرّرین و مبلّغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے۔ عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہوگیا۔

الحمد للہ! بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسوّدہ بنظرِ عمیق دیکھا، اور متعدّد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ **وفوق کل ذی علم علیم۔**

عزیزم مولوی حافظ قاری محمدؐ ادریس سلّمہ، (فاضل خیر المدارس، ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتّب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب، موجودہ شکل میں منظر عام پر آگئی۔ دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمۂ کی اس محنت وجاں فشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے اور اپنی جناب خاص سے اس کا اجرِ بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل، صحت وعمر میں برکت نصیب فرما کر خلوص وللّہیت کے ساتھ مزید بر مزید خدمتِ دینِ متین کے مواقع فراہم فرمائے۔ اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

آمین

جزاک اللّٰہ یا ادریس خیرا
علی ماصنعت لاھل الدین خیرا

بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ

۱۱ر۳ر۱۴۱۱ھ

(والد محترم مرتب مدظلہ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حرف سپاس

ناسپاسی ہوگی اگر اول، دوم، سوم، چہارم کی طرح جلد پنجم کے اس مجموعہ صد رنگ کا سر نقطۂ آغاز اس بزرگ و مہربان شخصیّت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مجھے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کر دیا۔

تشکر و امتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک ایسی شخصیّت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت و عظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکتِ اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلۂ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم ___ کی علمی رہ نمائی اور عملی شفقت و عنایت ہی سے میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستہ پند و حکمت کو مرتّب کر سکوں۔

دستِ بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ بتصدّقِ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے ظلِّ عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے اور اپنی جنابِ خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایانِ شان اجر و ثواب سے خوش وقت و شاد کام فرمائے اور اس کوششِ ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ آمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

افاداتِ علم وحکمت

مختلف مواقع پر کیے گئے سوالات اور حضرت حکیمُ الاسلام قدّس اللہ سرہٗ العزیز کے علمی جوابات

فہرست مضامین

◆ احوالِ واقعی ۳۷
◆ مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور حضرات علماء دیو بند ۳۷
◆ مانعین زیارتِ قبور سے جنگ ۳۹
◆ زیارتِ قبور کے لئے سفر ۳۹
◆ تعظیم جائز اور عبادت ناجائز ۴۱
◆ اسماءِ شرکیہ سے احتراز ۴۲
◆ تعظیم اولیاء کرام ۴۲
◆ جزوِ عبادت بھی غیر اللہ کیلئے جائز نہیں ۴۳
◆ قیام و سجدہ کی ممانعت ۴۳
◆ سجدۂ قبر کی ممانعت ۴۳
◆ درود شریف کی عمومی حکمت ۴۴
◆ آدابِ زیارتِ قبور ۴۴
◆ وہابی اہل نجد کا عقیدہ ۴۴
◆ زیارت روضہ اطہر کی نیت سے سفر ۴۴
◆ علماء دیو بند کے خلاف بے جا اشتعال ۴۵
◆ ایصالِ ثواب کی ممانعت کا الزام ۴۵
◆ انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ برزخی ۴۶
◆ علاماتِ حیات ۴۷
◆ استدلالِ حیات ۴۸
◆ نذر و نیاز یا ایصالِ ثواب ۴۸
◆ مشرکانہ نذر و نیاز ۴۹
◆ ذبیحہ کی نامزدگی ۵۰
◆ ہدیہ و ضیافت یا صدقہ ایصالِ ثواب ۵۰
◆ ایصالِ ثواب کے لئے ایام کی تخصیص ۵۱
◆ دوام و التزام کا فرق ۵۱
◆ مشابہت سے احتراز ۵۲
◆ چہلم، برسی ہندوانہ رسم ہے ۵۲
◆ برصغیر کے مسلمانوں میں رسوم کی پابندی کی وجہ ۵۳
◆ ہندو مسلم اختلاط کے اثرات ۵۳
◆ دین اور رواج کا امتیاز ۵۴
◆ حاصل کلام ۵۴
◆ ایصالِ ثواب کا تعلق نیت سے ہے ۵۴
◆ ایصال ثواب کا صحیح طریقہ ۵۵
◆ علم غیب کا تنازع ۵۵
◆ علماء دیو بند کا عقیدہ ۵۶
◆ علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ ۵۶
◆ علماء دیو بند کا دعویٰ ۵۷
◆ نماز کے بعد مصافحہ ۵۷
◆ نماز کے بعد دعاء ثانیہ ۵۸

افاداتِ علم و حکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
حضرت حکیمُ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز
کے علمی جوابات

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
◆ قرآن حکیم اور انسانی نفسیات	۵۹
◆ انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات	۶۰
◆ گائے علامت حیات ہے	۶۲
◆ تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت	۶۳
◆ تعبیر خواب میں اعداد و شمار کا دخل	۶۴
◆ روحانی لحاظ سے رحمتِ نبویؐ کے عالمگیر آثار	۶۵
◆ مادی لحاظ سے رحمتِ نبویؐ کے عالمگیر آثار	۶۶
◆ عالم آخرت میں رحمت نبویؐ کے عالمگیر آثار	۶۷
◆ رحمت نبویؐ کے ابدی آثار	۶۸
◆ رحمتِ نبویؐ کے ازلی آثار	۶۹
◆ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم	۶۹
◆ حقیقت توسل	۷۰
◆ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟	۷۲
◆ اکمال دین کا طریق	۷۲
◆ تشہیر اکمال دین	۷۲
◆ اکمال دین کے بارے میں ازالۂ تشکیک	۷۳
◆ خلق و کسب	۷۴
◆ قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ	۷۵
◆ تعیین مراد میں احوال متکلم کا دخل	۷۷
◆ عرش رحمت خاصہ کا مظروف ہے	۷۹
◆ کیفیت استواء غیر معلوم ہے	۷۹
◆ پس منظر	۸۰
◆ شعراء کا ادب	۸۰
◆ عوام کا ادب	۸۱
◆ تلبیس ادب	۸۲
◆ کمال ادب	۸۴
◆ زیور علم	۸۵

فہرست مضامین

◆ حدود ادب	۸۵	◆ اعتراف شخصیت	۱۰۲
◆ تحفظ دین کا طبعی نظام	۸۷	◆ جذبات مسرت	۱۰۳
◆ ذوق ادب کا نتیجہ	۸۷	◆ مولانا مدنی قدس سرہ	۱۰۳
◆ مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات	۸۸	◆ کمال جامعیت	۱۰۴
◆ وسائل عبادات پر اجر و ثواب	۸۸	◆ ایک حسین امتزاج	۱۰۴
◆ تارک آداب، تارک شریعت ہے	۸۹	◆ شیخ العرب والعجمؒ	۱۰۵
◆ فقہاء کا مقام معرفت	۹۰	◆ سیاسی نقطۂ نظر	۱۰۵
◆ ذوقی آداب	۹۰	◆ مرکب نصب العین	۱۰۶
◆ اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ	۹۲	◆ مینارۂ نور	۱۰۶
◆ سرچشمہ آداب	۹۲	◆ معنوی معیت	۱۰۷
◆ نماز میں عبادت کا پہلو	۹۴	◆ (انٹرویو)	۱۰۹
◆ نماز تمام کائنات کو جامع ہے	۹۴	◆ قندیل راہنمائی	۱۰۹
◆ اوقات جامعیت	۹۵	◆ نفاذ اسلام کا مرحلہ ترتیب	۱۰۹
◆ نماز سے انانیت نفس کا ازالہ	۹۶	◆ علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت	۱۱۰
◆ نماز میں فن تصوف کا موضوع	۹۶	◆ نفاذ اسلام کے سلسلہ میں فرد کی ذمہ داری	۱۱۱
◆ روحانی اور اخلاقی مقامات	۹۶	◆ نفاذ اسلام میں حکومت کا کردار	۱۱۱
◆ مسئلہ حیات النبی سے متعلق اجماعی مسلک	۹۷	◆ بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطۂ نظر	۱۱۲
◆ مفاہمت کی بنیاد	۹۸	◆ اتحاد مسلم	۱۱۲
◆ اجتماعی نقصان	۹۸	◆ اکابر دیوبند کا مشن	۱۱۳
◆ مساعی طیبہ	۹۹	◆ ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر	۱۱۳
◆ قدر مشترک	۱۰۰	◆ حضرت مدنیؒ اور قیام پاکستان	۱۱۴
◆ حق گوئی وانصاف پسندی	۱۰۱	◆ مولانا آزادؒ اور پاکستان	۱۱۴
◆ سکوت مصلحت	۱۰۱	◆ خدا حافظ	۱۱۵
◆ فروعی اختلاف کی حیثیت	۱۰۲	◆ نظم در مدحت حکیم الاسلامؒ	۱۱۵
◆ خوشی کی لہر	۱۰۲		

افاداتِ علم و حکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

فہرست مضامین

حسن نیت سے حرام، حلال نہیں بنتا	۱۱۷	تلبیس ابلیس	۱۲۷
عمل مشروع ہی میں حسن نیت کا اعتبار ہے	۱۱۸	خطاء اجتہادی اور عصمت	۱۲۸
عمل صالح کی دو بنیادیں	۱۱۸	لغزش اور گناہ کا فرق	۱۲۸
شرک وبدعت کی بنیاد	۱۱۹	عصمت اطفال	۱۲۹
قوم کے اخلاق کا تحفظ	۱۲۰	عصمت انبیاء علیہم السلام	۱۲۹
ظلمت اخلاق	۱۲۰	عصمت انبیاء علیہم السلام اور عصمت اطفال کا فرق	۱۲۹
قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے	۱۲۰	باعث تعجب ایمان	۱۳۰
حرام میں شفا نہیں	۱۲۱	جبری عصمت	۱۳۱
متبادل صورت	۱۲۱	حفاظت اولیاء کرام	۱۳۱
مطالعہ کا علم لائق اعتماد نہیں	۱۲۲	حضرت شبلیؒ کا عبرتناک واقعہ	۱۳۱
مسلم وحربی کے درمیان سودی معاملہ	۱۲۲	حفاظتِ اولیاء کا طریق	۱۳۳
دار الحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا	۱۲۲	وجوہِ عصمت	۱۳۳
سود پر دلچسپ مباحثہ	۱۲۳	اولیاء اللہ سے صدورِ گناہ خلافِ تقویٰ نہیں	۱۳۴
حکم شرعی کے تحت قومی ہمدردی	۱۲۴		
مدار دین حجت ہے	۱۲۴	مقامِ عصمت اور شیطان	۱۳۵
مراتب عصمت	۱۲۵	حفاظت اولیاء اور شیطان	۱۳۵
منشاء گناہ	۱۲۵	حاصل کلام اور درجات عصمت	۱۳۶
شیطان کا گناہ اور حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش	۱۲۶	بندہ حکم پر انکشاف اسرار ہوتا ہے	۱۳۶
		مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی یا جہنمی؟	۱۳۷

فہرست مضامین

♦ اسلم ترین مذہب	۱۳۸
♦ نس بندی	۱۳۹
♦ استثنائی حکم	۱۳۹
♦ منظم فساد سے روٹی کی بچت	۱۴۰
♦ تقسیم دولت میں عدم توازن	۱۴۰
♦ سرمایہ دار کا طریقِ واردات	۱۴۱
♦ کثرتِ اولاد پر انعام	۱۴۱
♦ استثنائی اجازت	۱۴۱
♦ حضرت حکیم الاسلامؒ سے ایک ملاقات	۱۴۲
♦ دار العلوم کا مستقبل	۱۴۲
♦ تجدید دین کا مظہر اتم	۱۴۳
♦ ظرافت آمیز شکوہ	۱۴۴
♦ امام دعوت وعزیمت	۱۴۵
♦ تین بڑے کام	۱۴۵
♦ روح دار العلوم	۱۴۶
♦ اصلاح معاشرہ اور خلافتِ اسلامیہ	۱۴۷
♦ افغانستان سے رابطہ	۱۴۷
♦ ترکوں سے روابط	۱۴۸
♦ انگریزی دور میں محکمہ قضا کا قیام	۱۴۹
♦ تحفظ خلافت اور روابطِ اسلامیہ	۱۵۰
♦ حضرت نانوتویؒ کی علمی شان تجدید	۱۵۰
♦ علوم کا عروج	۱۵۱
♦ کچھ اپنی زندگی کے بارے میں	۱۵۲
♦ پیدائش کا پس منظر	۱۵۲
♦ حضرت حکیم الاسلامؒ کی بسم اللہ	۱۵۳
♦ ناز برداری	۱۵۳
♦ مسلمانوں کے تنزل کے اسباب	۱۵۴
♦ مذہبی نقطۂ نظر کے اسباب تنزل	۱۵۵
♦ نقطۂ نظر کا اختلاف	۱۵۶
♦ برسر اقتدار طبقہ کی اصلاح کا طریق	۱۵۶
♦ حکومت سے کام لینے کا طریق	۱۵۷
♦ حکام اور اہلِ دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز	۱۵۸
♦ تعمیری انداز میں اصلاح	۱۵۸
♦ ورثہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)	۱۵۹
♦ دار العلوم کی ترقی	۱۵۹

افاداتِ علم و حکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیمُ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کے علمی جوابات

فہرست مضامین

- وصول الی اللہ کے اصول ۱۶۱
- مجاہدات باطنیہ کی مثال ۱۶۲
- مقصد کی لگن ۱۶۳
- اختلاف استعداد ۱۶۳
- اعضاء کی پیوند کاری ۱۶۴
- دین کی بنیاد مسائل پر ہے مصالح پر نہیں ۱۶۴
- نس بندی یا کنبہ بندی؟ ۱۶۵
- عمومی طور پر تقلیل اولاد کی صورت ۱۶۵
- مقصود تکثیر اولاد ہے تقلیل کا تعلق عوارض سے ہے ۱۶۶
- تمدنی مشکلات ۱۶۶
- وعظ و نصیحت سے شخصی تبدیلی آتی ہے ۱۶۶
- خلافت اخلاق ۱۶۷
- علامت ظہور مہدی ۱۶۷
- ذرائع یقین ۱۶۷
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کا حکم ۱۶۸
- تمدنی چیز کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کا حکم ۱۶۹
- نبوت مجموعہ بشریت وملکیت ۱۶۹
- حدیث ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۷۰
- اسلام کا نظام اجتماعیت ۱۷۲
- منصب افتاء کی نزاکت ۱۷۲
- منصب تدریس و تبلیغ ۱۷۳
- علم و عمل کا امتیاز ۱۷۳
- حیات نبوی ﷺ اجماعی مسئلہ ہے ۱۷۳
- حیات کامل ۱۷۴
- قبض روح کا امتیاز ۱۷۴
- دست نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ۱۷۴
- لسان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ۱۷۶
- صوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ۱۷۶
- چشم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ۱۷۷
- حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ۱۷۷
- حیات بعد الوفات کا امتیاز ۱۷۷
- علامات حیات ۱۷۷
- حیات شہداء ۱۷۹

فہرست مضامین

◆ حیات صلحاء	۱۷۹
◆ موت کفار	۱۸۰
◆ مراتب حیات	۱۸۰
◆ ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز	۱۸۱
◆ طفولیت کا امتیاز	۱۸۱
◆ حیات برزخ کا امتیاز	۱۸۲
◆ نوعیت حیات	۱۸۲
◆ سلامتی کا راستہ	۱۸۳
◆ انکشاف برزخ	۱۸۴
◆ انکشاف سجین	۱۸۴
◆ عالم منام	۱۸۵
◆ مقام میت کا انکشاف	۱۸۵
◆ تعدد ارض وسماء	۱۸۷
◆ میت کا علم وادراک	۱۸۷
◆ علیین وسجین کا مقام	۱۸۸
◆ حجیت کشف	۱۸۸
◆ جنت وجہنم کا جغرافیائی مقام	۱۸۸
◆ مقام ارواح	۱۸۹
◆ جنیہ سے نکاح کا حکم	۱۸۹
◆ حضرت حکیم الاسلامؒ سے ایک جن کی ملاقات	۱۹۰
◆ اقسام محبت	۱۹۱
◆ قیام میلاد اور عرس کی تحقیق	۱۹۲
◆ ملت اسلامیہ کا ناسور	۱۹۳
◆ تاریخی تخریبی فرقہ	۱۹۴
◆ ذوق دین کی کمی	۱۹۴
◆ بشاشت ایمان (ایمانی کیفیت)	۱۹۴
◆ کیفیت مقام	۱۹۵
◆ کیفیت برزخ	۱۹۶
◆ تعبیر کیفیت ناممکن ہے	۱۹۶
◆ انسان کی قوت بیانیہ کا عجز	۱۹۷
◆ عدم احصاء ثناء باری کی وجہ	۱۹۸
◆ تسلیم عجز ادائیگی شکر ہے	۱۹۸
◆ یاجوج ماجوج میزان تحقیق پر	۱۹۹
◆ اقوام یورپ کو یاجوج ماجوج قرار دیا جاسکتا ہے؟	۲۰۰
◆ سد سکندری	۲۰۰
◆ آیت قدرت	۲۰۰
◆ حضرت کشمیریؒ کی رائے	۲۰۱
◆ اقوام یورپ کے مورث اعلیٰ کا نام	۲۰۱
◆ ظہور خاتم الدجالین کے آثار	۲۰۱
◆ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے دجال کا تقابل	۲۰۱
◆ تقابل اضداد کی حکمت	۲۰۲
◆ استدراج دجال	۲۰۲
◆ قتل دجال کی صورت	۲۰۲
◆ حضرت مسیح علیہ السلام کو قاتل دجال بنانے کی حکمت	۲۰۳
◆ وصف خاتمیت میں مماثلت	۲۰۳
◆ وصف رحمت میں مماثلت	۲۰۴
◆ تربیت اتباع میں مماثلت	۲۰۴

فہرست مضامین

- زہد و شوکت کی زندگی میں مماثلت ۲۰۴
- ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں شبیہ محمدی کا دخل ۲۰۶
- زوجیت حضرت مریم علیہا السلام ۲۰۸
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام تجدید ۲۰۸
- غلبۂ اسلام ۲۰۸
- مراتب تکمیل دین کی صورتیں ۲۰۹
- اسلام کا غلبۂ تام ۲۰۹
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کی حکمتیں ۲۱۰
- اسلام کی شان خاتمیت ۲۱۰
- تعوذ دجال کی دعاء کی حکمت ۲۱۱
- عبدیت عیسوی ۲۱۲
- مدفن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۲۱۲
- علامات ظہور مہدی علیہ السلام ۲۱۲
- منیٰ میں جنگ عظیم ۲۱۳
- شام کی جنگ عظیم ۲۱۳
- مغرب کی طاقتوں کی شکست ۲۱۴
- مشرکین سے اسلام کا مقابلہ ۲۱۴
- مجوس سے اسلام کا مقابلہ ۲۱۴
- یہود سے اسلام کا مقابلہ ۲۱۵
- عیسائیوں سے دوامی مقابلہ اور اس کا انجام ۲۱۵
- مقام تجدید ۲۱۵
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمال عدل ۲۱۶
- عدل کی حسی برکات ۲۱۶
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلفاء سبعہ ۲۱۷
- دابۃ الارض ۲۱۷
- جن پر قیامت قائم ہوگی ۲۱۷
- عالم کی بنیاد ۲۱۸
- قبولیت بعدد ۲۱۸
- کیا اہل دنیا آسمان سے آگے جاسکتے ہیں؟ ۲۱۸
- سیارات کا تعلق اہل دنیا سے ہے ۲۱۹
- توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت ۲۲۰
- التفات حقائق اسلام کا موضوع ہے ۲۲۰
- ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کا مذہبی فائدہ ۲۲۱
- دیوبندی و بریلوی حضرات کے باہمی قرب کا فائدہ ۲۲۱
- باہمی نفرت اسلام کا ذوق نہیں ۲۲۱
- رسوم کا غلبہ ۲۲۲
- اختلافی مسائل کا آسان حل ۲۲۲
- بریلوی عالم کی توہین بھی درست نہیں ۲۲۲
- مولانا احمد رضا خان دیوبند کے فیض یافتہ ہیں ۲۲۳
- اپنے کام سے کام ۲۲۳
- مسجد ڈھلوانے کا قصہ ۲۲۳
- حضرات دیوبند اور پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم ۲۲۳
- ایک بریلوی بزرگ سے ملاقات کے اثرات ۲۲۴

فہرست مضامین

◆ سنت وبدعت کا تاثیری امتیاز ۲۲۴
◆ تقسیم ہند کے بارے میں علماء دیوبند کا اختلاف ۲۲۴
◆ مسلمانوں کا باہمی اختلاف غیروں کو غلبہ دلاتا ہے ۲۲۵
◆ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلب روم کو جواب ۲۲۶
◆ غیر مسلم قوموں کا طریق واردات ۲۲۶
◆ اجلاس صد سالہ ۲۲۷
◆ گروہی خصوصیت کی دعوت نقصان ۲۲۷
◆ اسباب اتحاد ۲۲۷
◆ عشرہ فنڈ ۲۲۷
◆ عطیۂ رحمت ۲۲۸
◆ انفاق محبوب کا التزام ۲۲۸
◆ نعمائے جنت ۲۲۸
◆ انسان ہر طرف سے عدم میں گھرا ہوا ہے ۲۲۹
◆ وجود حقیقی ۲۲۹
◆ اسلام میں انتخاب امیر کا ایک طریق ۲۳۰
◆ انتخاب کا مغربی طریقہ ۲۳۰
◆ امیر تغلّب ۲۳۱
◆ اقتدار میں رسہ کشی کا سبب ۲۳۱
◆ رائے عامہ کی ہمواری ۲۳۱
◆ امیر کی غلطی کا حکم ۲۳۲
◆ افراط و تفریط فرقہ واریت کی بنیاد ہے ۲۳۲
◆ عرس کا مسئلہ ۲۳۳
◆ اسلام کے نام پر رائج رسوم ۲۳۴
◆ ذکر میلاد یا جشن میلاد ۲۳۴
◆ دیوبندی بریلوی کوئی فرقہ نہیں ۲۳۵
◆ انگریز کا انتقام ۲۳۵
◆ رد بدعات اور اتباع سنت ۲۳۶
◆ اتباع آباء ۲۳۶
◆ غلبۂ آداب شریعت ۲۳۶
◆ ابوالحال اور ابن الحال ۲۳۸

افاداتِ علم و حکمت

فہرست مضامین

◆ مدارس کی صورت حال پر ایک فکر انگیز انٹرویو (مختصر پس منظر) ۲۳۹
◆ نصابِ تعلیم .... //
◆ طرزِ تعلیم .... //
◆ معلم کا اثر ۲۴۰
◆ طلباء کی اخلاقی حالت ۲۴۱
◆ رابطہ کا فقدان .... //
◆ اساتذۂ کرام کا معیار ۲۴۲
◆ کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟ ۲۴۳
◆ اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے .... //
◆ طلباء کی سیاسیات میں شرکت کے آثار ۲۴۵
◆ فکر معاش نے علمی ترقی روک دی ۲۴۶
◆ پست فکر بھی علمی ترقی نہیں کر سکتا .... //
◆ علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا کر دیتا ہے ۲۴۷
◆ طبعاً فکری قوت کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں ۲۴۸
◆ فضلاء کرام کی اپنی مادرِ علمی سے وابستگی کی ضرورت .... //
◆ حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں دین آسکتا ہے ۲۴۹
◆ اکابر کے خواب کی تعبیر ۲۵۰
◆ صدیق حمیم و رفیقِ قدیم (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) ۲۵۲
◆ معیت و رفاقت .... //
◆ رفاقتِ تدریس ۲۵۳
◆ رفاقتِ سلوک .... //
◆ رفاقتِ خدمت .... //

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارس دینیہ بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے کیونکہ اگر کوئی تعلق دیرپا اور مستحکم ہو سکتا ہے تو وہ صرف علمی تعلق ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں۔

اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار و مستحکم ہو۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- نعمت کبریٰ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۵
- مبارک احساس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ //
- دارالعلوم کا امتیاز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۶
- دارالعلوم کا تعارف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۶
- حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۷
- مستحکم رابطہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۷

مؤتمر اسلامی قاہرہ میں خطاب

اس وقت مادی وسائل حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلط جما کر انہیں ایک نقطہ پر لا کھڑا کر
ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے کے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں
اور تمام لوگ وحدت نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم بھی ا
وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کری
کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلاامتیاز رنگ و نسل زمان و مکان کی حدود سے بالا ہو کر مساویا
برتاؤ کرتا ہے۔
وہ جس طرح جمود و تقشّف سے دور ہے ایسے ہی دونوں تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظ

فہرست مضامین

◆ جامعہ از ہر کی خوش نصیبی ۲۵۹
◆ مصر اسلام کا نشان قوت ۲۶۰
◆ حجاز مقدس مرکز عبادت ۲۶۰
◆ شام عظمت اسلامی کا مظہر ۲۶۰
◆ استحکام مصر عالم عرب کے امن کا ضامن ہے ۲۶۱
◆ جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی مآخذ ۲۶۱
◆ اسلامی تہذیب و ثقافت اپنانے کی ضرورت ۲۶۲
◆ مقصد اجتہاد ۲۶۳
◆ تجاویز ۲۶۳
◆ اسلام کے تین مرکزی نقاط ۲۶۴
◆ اسلام کا اجتماعی دفاع ۲۶۵
◆ ادائے فرض ۲۶۵

مؤتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- احوال واقعی ۲۶۷
- مؤتمر کے اغراض و مقاصد ۲۶۸
- مؤتمر کے زیر بحث مسائل ۲۶۸
- مسئلہ اجتہاد ۲۶۹
- مجتہد فیہ مسائل کا حل قوت فکر و عمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے ۲۷۰
- ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل پیش کیا جاتا رہا ۲۷۰
- فکر و عمل کی یکسانی وحدت امت کا موجب ہے ۲۷۰
- انسانیت کو عالمی دین کی تلاش ۲۷۱
- اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالۂ شبہات ۲۷۱
- دائرۂ اجتہاد میں اتباع اسلاف ۲۷۲
- عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت ۲۷۳
- مصر کی صنعتی ترقی ۲۷۳
- دار القرآن کا سنگ بنیاد ۲۷۴
- مدینۃ الازہر ۲۷۴
- ہزار سالہ علمی عظمت ۲۷۴
- صدر ناصر، خدمت اور کردار ۲۷۴
- مصر کی عمومی مذہبی حالت ۲۷۵
- اکرام ضیف ۲۷۵
- مصر کا سرکاری مذہب ۲۷۶
- اشتراکیت کا پروپگنڈہ ۲۷۶
- مصری قوم کی قرآن کریم سے والہانہ محبت ۲۷۶
- حفاظت قرآن کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری کارنامہ ۲۷۷
- مغربیت سے مرعوبیت ۲۷۸
- ممکن الزوال خرابیاں ۲۷۸
- بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت ۲۷۹
- سفر حجاز ۲۸۰
- مدینہ یونیورسٹی میں خطاب ۲۸۰
- بے اصل بات ۲۸۱
- الرابطۃ الاسلامیۃ کے اجلاس میں شرکت ۲۸۲
- دار العلوم کا بین الاقوامی تعارف ۲۸۲

امتیازِ دار العلوم

عدمِ اعتناءِ دین کے اس دور میں جبکہ علومِ دینیہ سے شدید بُعد پیدا ہو چکا ہے، اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا، یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال میں چندہ نسبتاً زیادہ ہی آیا۔ اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔۔۔۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دورِ فتن میں دار العلوم کا قائم رہنا، اسباب کے درجہ میں نہیں ہے، بلکہ غیبی امداد و اعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ ایک بڑی کمی ۲۸۵
◆ مہمانوں کا شکریہ ۲۸۶
◆ تأسیس دار العلوم کا امتیاز ۲۸۶
◆ طلباء کرام کا امتیاز ۲۸۶
◆ حصولِ علم کا امتیاز ۲۸۷
◆ دار العلوم کے انتظام و انصرام کا امتیاز ۲۸۷
◆ مدرسین کرام کا امتیاز ۲۸۸
◆ روح درالعلوم ۲۸۸

الہامی ادارہ اور اس کے فضلاء کی تنظیم

دین کی بقاء علم دین کے بقاء سے ہوتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت و شوکت باقی ہو تو قابل اعتناء نہیں تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہو کہ ایسا ادارہ ضروری ہے۔ ایک مجلس میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے' دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی، الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چنانچہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ قیام دارالعلوم۔۔اسباب و محرکات ۲۸۹
◆ خشت اوّل ۲۹۰
◆ مرکز روحانیت ۲۹۱
◆ دارالعلوم کی شان تجدید ۲۹۱
◆ مرکز اتحاد ۲۹۲
◆ تنظیم کی ضرورت ۲۹۲
◆ مقصد تنظیم ۲۹۲
◆ تنظیم خدمات ۲۹۳
◆ وسعت دارالعلوم ۲۹۳
◆ معیار اہتمام ۲۹۴
◆ معیار طلبہ ۲۹۴
◆ تنظیم کے فوائد ۲۹۵
◆ اجلاس صد سالہ ۲۹۵

اکابر دیوبند اور آزادئ ہند

اس پوری جماعت کی سر پرستی کے ساتھ تحریکِ آزادی اس وقت جاری رکھی، جب انگریز کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہیں تھا بلکہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آگئے۔ اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر پاشا کے قول کے مطابق:

"شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثّہ میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔"

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

- شیریں ثمر کے حصول پر تبریک ٢٩٩
- اکابر ملت اور جہاد آزادی ٣٠٠
- شیخ الحدیث دارالعلوم کی پیشن گوئی ٣٠٠
- آزادئ ہند کی جدجہد کی ابتدا صرف مسلمانوں نے کی ٣٠١
- ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات ٣٠١
- ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل ٣٠٢
- ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات ٣٠٢
- نئے ہندستان میں وحدتِ جماعت کی ضرورت ٣٠٢
- پس منظر ٣٠٣

حدیث پاکستان

جب عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے۔ اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاجِ اصلاح ہے۔ جو علماء حقانی ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آگئی ہے۔ اور اصلاح کے راستے کچھ بند ہو گئے ہیں طلباء کا ادھر آنا منقطع ہو گیا ہے۔ اور دار العلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔

دار العلوم کی سعی پر حکومت ہند نے راستہ کھول دیا ہے۔ اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دار العلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلباء علم کے لئے ہندوستان کے راستے کھول دے۔ امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

فہرست مضامین

◆ عظیم الشان نفع ۳۰۵
◆ پاکستان جانے کے مقاصد ۳۰۶
◆ دنیا کا عمومی دینی انحطاط ۳۰۶
◆ اصلاح کی ذمہ داری ۳۰۷
◆ پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے ۳۰۷
◆ فتنوں کا سد باب ۳۰۸
◆ اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات ۳۰۸
◆ بڑی امید افزاء خوبی ۳۰۹
◆ اعلانِ استغناء ۳۰۹
◆ دیانت عمل کی تاثیر ۳۰۹
◆ قدرِ دار العلوم ۳۱۰
◆ حضرت مدنی کا تصرف ۳۱۰
◆ قمیصِ عثمانی ۳۱۱
◆ جذباتِ تشکر ۳۱۱

خطبۂ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاھد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں در حقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔
اسی طرز فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ اور آج بحمد اللہ تعالیٰ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتب فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علماء دیوبند علمی، تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظ دین اور اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی کوئی اور صورت نہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- خطبہ استقبالیہ ۳۱۳
- شکر و سپاس ۳۱۴
- دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی ۳۱۴
- قیام دارالعلوم کا پس منظر اور اسباب تاسیس ۳۱۵
- دارالعلوم دیوبند اور احیائے دین کی عالمگیر تحریک ۳۱۶
- جامعہ دارالعلوم کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد ۳۱۶
- دارالعلوم کی تصنیفی خدمات ۳۱۸
- جامعہ دارالعلوم کا تعلیمی امتیاز ۳۱۹
- دارالعلوم کا سلسلہ سند ۳۱۹
- جامعہ دارالعلوم کا انتظامی طریقہ کار ۳۱۹
- ملی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دارالعلوم کی تاریخی خدمات ۳۲۰
- جامعہ دارالعلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ ۳۲۱
- عصری بین الاقوامیت کے تقاضے ۳۲۱
- عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت ۳۲۳

آزادیٔ ہند کا خاموش راہنما

اس سے اندازہ کرلیا جائے کہ اس دارالعلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی ح
تک محدود نہ تھا، بلکہ اس ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خ
مختاری، حق خودارادیت، معاشی استغنا، وسائلِ قوت کی فراہمی، رابطہ عوام، تالیفِ خواص وغیرہ کے
ملے جلے جذبات کار فرما تھے۔۔۔اور دارالعلوم کی تاسیس ایک "خاص مکتبِ فکر" کی تاسیس تھی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- آزادی کی خوشی کی تکمیل ۳۲۵
- آزادی کا ہیرو ۳۲۶
- شاملی کے میدان کی تلافی ۳۲۶
- سیاسی محکومیت کے ازالے کی واحد تدبیر ۳۲۷
- جہادِ شاملی کے رخ کی تبدیلی ۳۲۷
- آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ۳۲۸
- خاموش راہنمائی کے آٹھ اُصول ۳۲۸
- وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں ۳۲۸
- جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ ۳۲۹
- سرکاری امداد کا بدل ۳۳۰
- تالیفِ خواص ۳۳۱
- اتحادِ مشرب ۳۳۲
- ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد ۳۳۲
- روحانیت واخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل ۳۳۳
- سرکاری امداد سے احتراز کی حکمت ۳۳۴
- سرمایہ داری پر ضرب کاری ۳۳۴
- تنظیم مدارس آزادی کی خشت اول ۳۳۵
- جمعیت علماء کا پس منظر ۳۳۶
- ملت کا وقار بازیافت کرنے کے اصول ۳۳۶
- عوامی قوت کا پرواز ۳۳۷
- عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ ۳۳۸
- یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر وقیمت ۳۳۸
- رئیس الاحرارؒ کا غایت تاثر ۳۳۹
- انقلاب ۵۷ء کے اولین ہیرو ۳۳۹
- عدالتِ شرعیہ کا قیام ۳۴۰
- دارالعلوم میں صنعت وحرفت کے شعبہ کا مقصد ۳۴۰
- دارالعلوم کے ذریعے 'ہندو مسلم' کا پرواز ۳۴۰
- دارالعلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر ۳۴۱
- تنظیم ملت کا نیا خاکہ ۳۴۱
- قیامِ دارالعلوم کا بنیادی محرک ۳۴۲
- اصولِ آزادی کی امین شخصیت ۳۴۲

○ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ شخصیت و کردار

فہرست مضامین

◆ میری سعادت ۳۴۳
◆ ذوق علم کا رنگ ۳۴۳
◆ تقریر و بیان کا رنگ ۳۴۳
◆ طرز تدریس ۳۴۴
◆ کمالِ اخلاق ۳۴۴
◆ حق پسندی ۳۴۵
◆ اندازِ تحریر ۳۴۵
◆ نظم و شعر ۳۴۶
◆ سیاسی خدمات ۳۴۷
◆ خراجِ تحسین ۳۴۸
◆ تعمیلِ حکم ۳۴۸

آل انڈیا احناف کانفرنس سے خطاب

جس امام کی جو ذہنی خصوصیات ہونگی وہی اس کے اصول استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلد بظاہر تو جزئیاتِ فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔ پس اگر وہ فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کردے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہو مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں۔ ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

- شکریہ وتمہید ۳۵۰
- تحریر خطبہ کی غرض وغایہ ۳۵۰
- اللہ کا کام اور اس کا کلام ۳۵۱
- تکوین وتشریع کا مبدأ ومعاد واحد ہے ۳۵۱
- تکوین وتشریع کے اصول بھی ایک ہیں ۳۵۲
- ایجاد اور اجتہاد ۳۵۳
- اجتہاد کی انواع ۳۵۴
- مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے ۳۵۴
- شریعت حد درجہ مرتب اور منظم ہے ۳۵۵
- تنظیم شریعت کی چند امثلہ ۳۵۷
- انکشافِ علوم میں نبی اور امتی کا فرق ۳۵۹
- نصوص کتاب وسنت کا ظہر وبطن ۳۶۰
- علماء شریعت کے دو طبقات، اہل ظاہر اور اہل باطن ۳۶۲
- صحابہ میں اہل علم کے دو طبقات ۳۶۴
- ملکہ اجتہاد وہبی ہے کسبی نہیں ۳۶۵
- علم باطن ہی مورث طمانینت ہے ۳۶۷
- صحابہ میں اہل اجتہاد ۳۶۸
- امت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے ۳۷۱
- صحابہ میں تقلید رائج تھی ۳۷۲
- اجتہاد و تقلید کی حدود ۳۷۳
- اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اسکی واضح دلیل ۳۷۴
- ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائج بد ۳۷۵
- اختلافِ آئمہ باعث رحمت ہے ۳۷۶
- مسائل فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی ۳۷۹
- متبعین فقہ کے لقب "اہل السنۃ والجماعت" کا ماخذ ۳۸۰
- تقلید شخصی اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے ۳۸۲
- تقلید شخصی کونسی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟ ۳۸۳
- آئمہ کے اختلاف مذاق سے پیدا شدہ مختلف اصول ۳۸۶
- امام ابوحنیفہ کے فقہ کی چند امثلہ ۳۸۷
- عدم تقلید یا تلفیق میں دائر سائر بننے کے چند واضح مفاسد ۳۹۳
- سلف میں تقلید معین عام تھی ۳۹۶

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ:

میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں کے انکشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

- موضوع تقریر ۴۰۵
- انگریزی اقتدار کا تسلط اور مسلمانوں کی شکست 〃
- مذہبی انقلاب کی ضرورت ۴۰۶
- ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی 〃
- مدارسِ عربیہ کی معنوی بنیاد 〃
- خلافتِ ترکی کی تائید ۴۰۷
- فکر قاسمی کے تین بنیادی عناصر ۴۰۸
- حضرت نانوتویؒ کی دورۂ یورپ کی تمنا 〃

آئینۂ خدمت جمعیت علماء ہند

پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشمکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے، جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو جو سب کے قضیئے چکا سکے۔۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرۃ مذہبی جماعت ہو سکتی ہے جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے۔۔ مذہب اور بالخصوص "دین فطرت" (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حدبندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ شکریۂ اکابر ۴۰۹
◆ نظریاتی فتن کا دور ۴۱۰
◆ متضاد عناصر کی ہمہ گیر راہنمائی .... //
◆ جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت ۴۱۱
◆ قومی تعمیر کی دفعات .... //
◆ سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ .... //
◆ نصاب تعلیم اور ذریعہ تعلیم ۴۱۲
◆ ذوق عربیت کی اہمیت .... //
◆ تربیت عوام ۴۱۳
◆ اصلاح معاشرت .... //
◆ جمعیت کا منتہائے نظر ۴۱۴
◆ تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار ۴۱۵
◆ بیکاری اور بے روزگاری کا مسئلہ .... //
◆ جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت .... //
◆ سرمایۂ جمعیت ۴۱۶

تیونس و مراکش کی جدوجہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین۔ قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو، یا اندھیری رات کا فرزند، جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے، اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خودارادیت میں مختار ہو۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- احوال واقعی ۴۱۷
- حق خود ارادیت ۴۱۷
- آزادی کی حمایت ۴۱۸
- تیونس کی صورت حال ۴۱۸
- مراکش کا مسئلہ ۴۱۸
- دو (۲) نئی سلطنتیں ۴۱۹
- مطالبات اور تائید ۴۱۹
- فرانس کا دیوالیہ پن ۴۲۰
- مطالبہ آزادی کی مذہبی پوزیشن ۴۲۰
- استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار پر عتاب الٰہی ۴۲۱
- آزادی مذہبی اور انسانی حق ۴۲۲
- جہاد آزادی میں شرکت ۴۲۲

اظہارِ تشکر

دورۂ افریقہ سے واپسی پر الوداعی خطاب

- ◆ محبت و شکر گزاری کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا ۴۲۳
- ◆ آپ کی محبت کے جذبات دل کا جوہر بن گئے ہیں جو آخرت تک ساتھ جائینگے ۴۲۴
- ◆ اصلی شکریہ عملی زندگی میں انقلاب ہے ۴۲۶
- ◆ دنیوی مشکلات کے حل کے لئے دینی و روحانی تدبیر ۴۲۷
- ◆ شریعت کا ہر حکم دینی دنیوی فوائد پر مشتمل ہے ۴۳۰
- ◆ بار دگر شکریہ ۴۳۱

عالم اصغر

انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں۔

آسماں ہاست در ولایت جاں
کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست۔ و بالا ہست
کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے ع

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

- اقسام عالم اور ان کے حصص ۴۳۳
- عناصر اربعہ کی کار فرمائی میں کمال درجہ تشابہہ ۴۳۴
- مٹی کی جملہ انواع ۴۳۴
- آگ کی جملہ انواع ۴۳۴
- پانی کی جملہ انواع ۴۳۵
- ہوا کی جملہ انواع ۴۳۵
- انواع جمادات ۴۳۵
- انواع حیوانات ۴۳۶
- آثار زلزلہ ۴۳۶
- عقل و حکمت کے آثار ۴۳۶
- ستاروں کے آثار ۴۳۶
- ملائکہ و شیاطین ۴۳۷
- عالم غیب سے تشابہہ ۴۳۷

افاداتِ علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
حضرت حکیمُ الاسلام قدّس اللہ سرّہ العزیز
کے عِلمی جوابات

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم ط

حامداً لِلّٰہ العظیم ومصلیاً علیٰ رسولہ الکریم
وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین
امّا بعد

اَحوالِ واقعیٔ

اس مجلس کا موضوع مذاکرہ تھا۔ کوئی تقریر اور وعظ نہیں ہے۔ جیسا کہ بمبئی میں بھی یہی صورت ہوئی ہے کہ عشاء کے بعد کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں اس میں جس نے کوئی سوال یا شبہ پیش کیا تو جو اپنے علم میں ہوا وہ عرض کردیا گیا۔ وہی موضوع اس مجلس کا بھی ہے ___ لیکن بجائے اس کے کہ مختلف لوگ مختلف باتوں کے سوالات کریں ' بعض حضرات نے کچھ سوالات مجھے لکھ کر دیئے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا جائے ___ اور یہ سوالات اکثر غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ان کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

مزاراتِ اولیاء پر حاضری اور علماء دیو بند

سوال (۱) پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ علماء دیو بند ' اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی قبروں اور مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور قبروں پر فاتحہ و دعا کو منع کرتے ہیں ___ حالانکہ یہ کِذب محض اور بالکل جھوٹ ہے اور افتراء باندھا جاتا ہے ___ علماء دیو بند کا مسلک یہ ہے کہ اولیاء اللہ اہل اللہ کی قبروں پر جانا انتہائی برکت کا ذریعہ ہے ' فیض کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور علماء دیو بند کے ہاں خود بیعت و ارشاد کا سلسلہ ہے۔ اگر ویسے تو چشتی کہلاتے ہیں۔ لیکن چاروں خاندانوں میں ہمارے بزرگ ریاضتیں بھی کرواتے ہیں اور اجازت بھی دیتے ہیں یعنی چشتیہ ' قادریہ ' سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ ہمارے دیو بند کے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن

صاحب رحمتہ اللہ علیہ نقشبندی تھے اور ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر عُرس کے موقع پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ دار العلوم کے مفتیٔ اعظم تھے۔

تو ایک سلسلہ ہمارے ہاں نقشبندیت کا ہے ___ دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدّین صاحب رحمتہ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت شاہ عبد الغنی صاحب محدّث دہلویؒ سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہؒ تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ نقشبندیہ ہیں اور عامۂ دیوبند کے بزرگ جیسے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ یہ سب چشتی ہیں۔ ہمارا سلسلہ حضرت خواجہ معین الدّین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ، ان بزرگوں سے ہوتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ پر منتہی ہوتا ہے، یہ حضرات تقریباً سلسلہ کے جس قدر اولیاء اور بزرگ ہیں ان کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے اور استفاضہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ، بانیٔ دار العلوم دیوبند اکثر و بیشتر سال میں کلیر شریف حاضر ہوتے اور اس انداز سے کہ میرے خیال میں آج بھی کوئی بزرگوں کا معتقد شاید اس انداز سے نہ جاتا ہو۔ رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے اور نہر کے کنارے کنارے راستہ جاتا ہے ___ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نہر کے کنارے پٹڑی پر پہنچ کر جوتے اُتار لیتے تھے۔ چھ میل ننگے پیر طے کرتے تھے اور وہاں پہنچ کر عشاء کی نماز کے بعد روضہ میں داخل ہوتے۔ پوری رات مزار پر گزارتے تھے۔ اس میں ریاضتیں، مجاہدہ اور استفاضہ و حصُولِ فیض کرنا اور صبح کی نماز کے لئے وہاں سے نکلتے تھے ___ بہر حال یہ کتنا انتہائی غلط بیانی اور افتراء پردازی ہے کہ علماء دیوبند اولیاء اللہ کو نہیں مانتے۔ اگر نہ مانتے تو ان کے سلسلے میں کیوں داخل ہوتے؟ بیعت وارشاد کا سلسلہ کیوں قائم کرتے؟ اگر مزارات کی حاضری پر جانے کو وہ ناجائز سمجھتے تو خود ننگے پیر ادباً مزارات کے لئے کیوں پیدل جاتے؟۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ، جس قدر بھی ہندوستان سلسلے کے اکابر ہیں سفر کرکے ان مزارات پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ محبّ اللہ صاحب الٰہ آبادی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار الٰہ آباد میں ہے۔ تو وہاں گئے۔ اس طرح کلیر شریف گئے اور اجمیر شریف الگ گئے ___ اسی طرح خود میں نے بھی ان تمام مزارات کی حاضری بھی دی اور جب موقع ہوتا ہے حاضر ہوتا ہوں۔

چنانچہ ایک بار اجمیر شریف میں حاضر ہوا اور کسی کو اطلاع نہیں دی اور یہ خیال تھا کہ ایصالِ ثواب کرکے بس دو گھنٹوں کے بعد واپس ہو جاؤں گا، جمعہ کا دن تھا جب میں وہاں پہنچا تو مزار پر حاضر ہوا۔ دو، اڑھائی گھنٹے وہاں قیام کیا، اس کے بعد باہر نکلا تو تقریباً جمعہ کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ نماز جمعہ پڑھ کر اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ گاڑی رات کو آٹھ بجے جاتی تھی۔ اس بناء پر ارادہ تھا، چونکہ یہاں کسی سے خاص کوئی تعارف بھی نہیں ___ لیکن جب میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے گیا تو بعض لوگوں نے مجھے کچھ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ شاید کسی نے پہچان لیا ہو۔ نماز جمعہ کے بعد ایک جماعت نے آکر مجھے گھیر لیا اور اس میں دیوان صاحب آگے آگے تھے۔ جو وہاں کے سجادہ نشین ہیں ___ انہوں نے فرمایا کہ:

"اپنوں سے یہ اجنبیت کیوں؟ ___ کہ نہ کوئی اطلاع ہے نہ خبر ہے اور چھپکے چھپکے آنا اور آکر چلے جانا۔ آخر ہم لوگوں سے یہ اجنبیت کیوں برتی گئی؟"۔

میں نے عرض کیا کہ میں نیازمندانہ اور خادمانہ حاضر ہوا تھا اور خادم اعلان کرکے نہیں آیا کرتے، نیازمند اطلاعیں دے کر نہیں آتے، حاضر ہونا ان کا فرض ہے۔

تو میں اطلاع دے کر کیسے آپ حضرات کو تکلیف دیتا۔ نیاز مندانہ حاضر ہوا ہوں ہزاروں یہاں خدّام آتے ہیں۔ ایک خادم اور آگیا۔ اس میں اطلاع کی ضرورت نہیں تھی، بہرحال انہوں نے اصرار کر کے ٹھہرادیا۔

مجھے رات کو واپس ہونا تھا۔ ریزرویشن بھی ہوا ہوا تھا۔ اس لئے سب کو منسُوخ کروایا۔ میں کہا مجھے دہلی لازمی پہنچنا ہے۔ وہاں جلسہ کا پروگرام ہے۔ تو انہوں نے فون اُٹھا کر مولانا حفظ الرّحمٰن صاحب (سیو ہاروی ؒ) سے بات کی کہ آپ چاہے جلسہ کریں نہ کریں مگر اسے نہیں آنے دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے روک لیا۔

پھر خانقاہ میں وہیں تقریر کا اعلان کیا۔ چنانچہ حضرت خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے فضائل پر کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر بھی کی۔

اگر علماء دیوبند بزرگوں کے مزارات پر جانے سے روکتے، تو مجھے کیوں جانے کی توفیق ہوتی اور ہمارے بزرگوں کو کیوں توفیق ہوتی؟

مانعین زیارتِ قبور سے جنگ

ہم لوگوں کی ان لوگوں سے جنگ تھی اور ہے جو واقعہ میں مزارات پر جانے سے روکتے ہیں اور محض تعصّباً جنگ نہیں تھی بلکہ دلائل سے جنگ ہے اور حدیث کی رو سے جنگ ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ اوّل تو مطلقاً فرمایا :

> **کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور۔ الا تزوروھا فانھا تذکّر الاخرۃ۔**
>
> "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا لیکن اب میں اجازت دیتا ہوں۔ قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہاں جانے سے آخرت یاد آتی ہے اور آدمی کے سامنے خود اس کی موت آجاتی ہے جس سے طاعت اور عبادت کی طرف جھکتا ہے"۔

غرض فرمایا کہ پہلے روکتا تھا اب اجازت دیتا ہوں۔ گویا ممانعت منسوخ ہوگئی اور اجازت ثابت ہوگئی ــــ غرض اوّل تو اس حدیث کی رو سے حق ہے اور ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ قبور پر جائے اور آخرت کی یاد تازہ کرے۔

زیارتِ قبُور کے لئے سفر

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ قبر کو مستقل مقصد سفر بنا کر جانا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کہتی ہے کہ ناجائز ہے ــــ ہمارے بزرگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ مستقلاً اگر زیارتِ قبور ہی کے لئے سفر کیا جائے تو جائز ہے۔ بحث اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

> **لا تشدوا الرّحال الا الی ثلاثۃ مساجد مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، ومسجدی ھذا۔**
>
> "سفر جائز نہیں ہے مگر تین مساجد کی طرف ــــ ایک مسجد حرام یعنی بیت اللہ شریف، ایک مسجد اقصیٰ یعنی شام میں بیت المقدس اور ایک میری مسجد۔ یعنی مسجد نبوی"۔
>
> (علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام)

اس سے بعض لوگوں نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ قبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں ہے ــــ علماء دیوبند یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبروں کو مقصد بنا کر سفر نہ کرو۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کی قید ہے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سفر جائز نہیں ــــ اگر ہو سکتا تو ان مسجدوں کی طرف ہو سکتا ہے۔

ان تینوں کو کیوں جائز رکھا گیا ــــ؟

اس لئے کہ ان تین مساجد کی جو خصوصیت ہے وہ عالم میں کسی مسجد کی نہیں ــــ بیت اللہ شریف کی تو یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے ــــ مسجد نبویؐ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز پڑھی تو پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی یہ خصوصیت کہ ایک نماز اس میں پڑھی جائے تو دس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ بقیہ اللہ کی سب مسجدیں برابر ہیں اور محترم ہیں۔ خصوصیت سے کسی مسجد کو مقصد بنا کر جانا' اس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ اس میں کوئی خاص ثواب ہے۔ حالانکہ کوئی خاص ثواب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم کوئی معاملہ کریں کہ گویا ہم زیادہ ثواب سمجھتے ہیں۔ جہاں بھی جائیں گے نماز برابر ہوگی اور اجر ملے گا۔

تو جو لوگ قبروں کا سفر ممنوع قرار دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں استثناء منقطع ہے۔ یعنی کسی مسجد کی طرف سفر جائز نہیں' مگر ان تین مسجدوں کی طرف۔

گویا مسجدوں کی طرف سفر کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان تین مسجدوں کی اجازت ہے۔ بقیہ کی نہیں۔ اس واسطے کہ مسجد کا مفہوم عام لے لیں۔ چاہے اس میں قبر ہو چاہے کچھ ہو۔ تو کسی قبر کی طرف بھی جانا جائز نہیں۔ صرف ان تین مسجدوں کی طرف جانا جائز ہے۔

ہم کہتے ہیں استثناء میں اصل متصل ہے۔ سفر کر کے مساجد کی طرف جانے سے روکا گیا۔ صرف تین مسجدوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اس روایت میں قبروں کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے قبروں کا مسئلہ بالکل جُداگانہ ہے۔ اس حدیث سے قبروں کے سفر کی ممانعت یا قبروں کی طرف سفر کی اجازت کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث صرف مساجد کے بارے میں ہے۔

رہا قبروں کا مسئلہ ــــ تو اول تو حضور علیہ السلام نے خود فرمایا کہ پہلے تو میں تمہیں روکتا تھا۔ اب اجازت دیتا ہوں۔ اس اجازت میں یہ قید نہیں لگائی کہ اگر شہر میں ہوں تو کر لو اگر باہر ہوں تو مت جاؤ (یعنی کجاوہ کس کر شہر سے باہر مت جاؤ) تو عمومی طور علماء دیوبند اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ قبروں کو مقصد بنا کر اگر سفر کیا جائے تو جا سکتے ہیں۔ گویا یہ حضرات دوسروں سے اس بارے میں لڑتے ہیں کہ دوسرے کہتے ہیں کہ قبروں کی طرف سفر جائز نہیں اور علماء دیوبند کہتے ہیں کہ جائز ہے' برکات کا موجب ہے اور ان سے استفاضہ ہوتا ہے۔ ایک عام استفاضہ' وہ ہر مسلمان کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ وہاں پہنچ کر آخرت کی یاد تازہ ہوگی۔ ایک خاص استفاضہ ہے جو اہلِ حال کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ صاحبِ قبر سے برکات کا اَخذ کرنا اور لینا' تو جو لوگ صاحبِ مراقبہ ہیں یا صاحبِ کشف ہیں' روحانیت سے اَخذ کرنا جانتے ہیں' اس طریقہ سے واقف ہیں۔ وہ فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

غرض ان حالات میں یہ کہنا کہ علماء دیوبند قبروں پر جانے سے روکتے ہیں بالکل ایک سفید جھوٹ ہے کوئی

اس کی اصلیت نہیں۔ شریعت جب ممانعت نہیں کرتی تو علماء دیو بند کیا چیز ہیں کہ ممانعت کریں۔ وہ تو شریعت کے تابع اور غلام ہیں۔ جو شریعت حکم دے گی، جس سے روک دے گی، روکیں گے۔ بہرحال اجازت بھی دیتے ہیں اور ان کا عمل بھی ساتھ ساتھ ہے۔ یہ سب حضرات گئے ہیں جاتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں، محض عوام کو اشتعال دلانے کے لئے اس قسم کی افتراء پردازیاں کی جاتی ہیں۔ جیسا موقع ہوتا ہے ویسا ہی جھوٹ بول دیا جاتا ہے۔ تو کوئی اس کی اصلیت نہیں۔

تعظیم جائز اور عبادت ناجائز

ہاں، ایک ہے قبروں پر جاکر بے ادبی سے پیش آنا، اس کو ہم بھی روکتے ہیں اور ساری دنیا روکے گی، قبریں اس لئے ہیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ ان سے ہم بندگی سیکھیں اور وہی کام کریں جو ان اصحابِ قبور نے کیا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدّین اجمیری چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر مبارک پر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک اور مخلص بندے تھے، انہوں نے خدا کے ٹوٹے ہوئے بندوں کو اللہ سے جوڑا اور کہا کہ :

صرف اللہ کے آگے جھکو!

ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خواجہ معین الدّین رحمتہ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو سجدہ کریں۔ ہم اس کو شرک جانتے ہیں۔ ہم اس لئے جاتے ہیں کہ برکات حاصل کریں۔

انبیاء علیہم السلام نے جب اپنے لئے سجدہ جائز نہیں سمجھا تو اولیاء اللہ اس کو کس طرح سے جائز سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ بعض صحابہؓ حاضر ہوئے اور آتے ہی حضور علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا، یہ کیا حرکت کی؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! ہم نے قیصر اور کسریٰ کے درباروں کو دیکھا یہ سلاطین اپنی مسندوں پر ہوتے ہیں اور لوگ آکر ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ سجدہ کرائیں تو اللہ کا رسولؐ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ہم اس کو سجدہ کریں۔

آپؐ نے فرمایا :

"کبھی ایسا مت کرنا، اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ لیکن دنیا میں کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں۔ بجز اللہ کے ___ عبادت صرف ایک ذات کی کی جائے گی اور توقیر و تعظیم سب اللہ والوں کی حسبِ درجہ و مرتبہ کی جائے گی"۔

تو انبیاء علیہم السلام جیسی قدسی ذوات ان کے لئے بھی جب سجدہ جائز نہیں ہے تو اولیاء اللہ کے لئے کس طرح جائز ہوگا؟ اور عوام تو بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ تو قبروں پر جاکر قبروں کو سجدے کرنا اس کو علماء دیوبند شرک جانتے ہیں ___ حاضر ہو کر برکات حاصل کرنا، ان اللہ کے بندوں کے نام لے کر اللہ سے دعائیں مانگنا، اس سب کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ عبدیت کے خلاف نہیں بلکہ یہ "عین عبدیت" ہے۔

اگر یہ اہل اللہ اور بزرگ دنیا میں موجود ہوتے اور ان کی بارگاہ میں ہم لوگ حاضر ہوتے جب بھی سجدہ نہ کرتے۔ اس لئے کہ اگر ہم سجدہ کرتے تو وہ حضرات خود ہمیں اپنی مجلس سے نکال دیتے کہ :

"میں تمہیں اللہ کے لئے سجدہ کرانے کے لئے آیا ہوں یا اپنے لئے سجدہ کرانے کے لئے

آیا ہوں"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صلحاء کے بارے میں قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔

"کسی بشر کے لئے جائز نہیں، جس بشر کو اللہ نے کتاب دی ہو، علم دیا ہو۔ فضل و کمال دیا ہو ___ کیا جائز نہیں ہے؟ یہ کہ لوگوں سے یوں کہے کہ میرے بندے بنو اور میرے سامنے جھکو"۔

بلکہ اللہ کا بندہ جس میں علم اور حکمت ہوگی کہے گا کہ اللہ والے بنو اس کے آگے جھکو اس کو اپنا رب سمجھو اسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو، صرف اس کے آگے جھکو۔ یعنی عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں۔ عبد بننا صرف اللہ کے سامنے جائز ہے اور کسی کے لئے نہیں۔

اسماء شرکیہ سے احتراز

اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

احبّ الاسماء الی اللّٰہ عبد اللّٰہ وعبد الرّحمٰن۔

"اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں"۔

کیونکہ اس میں خدا کے سامنے عبدیت اور بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بندے کے نام کے سامنے آدمی عبد لگا دے۔ مثلاً عبد النبی کہہ دے یا کوئی چیز کہدے کہ کسی بندے کا نام لے کر عبد لگا دے وہ جائز نہیں رکھا ___ چاہے اس کے دل میں نہ ہو کہ میں اس کی عبادت کروں، مگر نام رکھنا بھی جائز نہیں۔ ممنوع قرار دیا۔ اس لئے کہ اس نام سے شرک کی بو آئے گی۔ توقیر اور تعظیم کا ذکر آئے گا تو انبیاء علیہم السلام کی بھی عظمت کی جائے گی، اولیاء اللہ کی بھی عظمت کی جائے گی، صلحاء مؤمنین کی بھی عظمت کی جائے گی۔

تعظیم اولیاء کرام

مؤمن کا اکرام اور تعظیم شریعت نے فرض قرار دی ہے۔ فرمایا :

المؤمن علی المؤمن حرام، دمہ ومالہ وعرضہ۔

"ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ یعنی اس کی جان اور اس کا خون بھی حرام اور اس کی آبرو بھی حرام"۔

نہ خون گرایا جائے نہ آبرو ریزی کی جائے نہ گالم گلوچ کی جائے۔ گویا ہر مسلمان کو با آبرو سمجھا گیا ___ تو مسلمانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ اولیاء کرام ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کی عزت اور حرمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اولیاء سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کا طبقہ ہے کہ وہ سارے عالم بشریت کا خلاصہ ہیں۔ اس کے حق میں ظاہر

بات ہے کہ انتہائی تعظیم فرض قراردی گئی ہے۔ اگر ذرا توہین ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

غرض ایک تعظیم و توقیر ہے ایک عبادت ہے۔ اس میں یہ فرق ہے کہ عبادت خالص اللہ کے لئے ہے تعظیم اور توقیر بندوں کے لئے ہے۔ پھر جس درجے کے بندے ہوں گے 'اسی درجے کی تعظیم کی جائے گی'، لیکن جس تعظیم میں عبادت کی بو آنے لگے تعظیم ممنوع ہوجائے گی۔

جزءِ عبادت بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں

فقہاء حنفیہ لکھتے ہیں کہ سلام اتنا جھک کر کرنا کہ رکوع کی سی صورت ہوجائے یہ ناجائز ہے۔ اسی لئے کہ اس میں عبادت کی بو آنے لگی اور اس میں عبدیت اور بندگی کا شبہ پیدا ہوگیا اور عبدیت اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ تو سلام بھی اتنا جھک کر مت کرو کہ رکوع کی شکل ہو۔ کیونکہ رکوع عبادت کا جز ہے۔ رکوع کسی بندے کے آگے جائز نہیں۔

قیام و سجدہ کی ممانعت

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں ___ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات جس درجہ عظیم و کریم اسی درجہ تعظیم کی بھی مستحق ہے۔

لیکن آپؐ نے ارشاد فرمایا :

من سره ان يتمثل له الرجال قياما فليتبوا مقعده من النار۔

"جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ میرے آگے ہاتھ باندھ کے تعظیم سے کھڑے ہوں وہ جہنم میں جاکر اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لے"۔

تو اس کی ممانعت فرمائی کہ لوگ میری بارگاہ میں ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوں۔ فرمایا 'میں بھی بندہ ہوں' تم بھی بندے ہو' اللہ نے مجھ پر وحی کی یہ عظمت دی۔ اس کی تعظیم کرو' سامنے کھڑے ہوکر قیام کرنا' یہ اصطلاحی عبادت کا ایک جز ہے' اس واسطے شریعت اسلام نے مستقلاً قیام کو روکا ___ غرض انبیاء علیہم السلام دنیا میں موجود ہوں سجدہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر سجدہ کیا جائے وہ خود ناخوش ہوجائیں گے۔ رکوع نہیں کیا جائے گا۔ وہ رکوع کرنے والے کو خود اپنی بارگاہ سے نکالدیں گے۔ ہاتھ باندھ کے قیام نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے دُھتکار دیں گے۔

اولیاء اللہ سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے اولیاء اگر یہاں موجود ہوں تو ان کی بارگاہ میں ایسی حرکت جائز نہیں ہوسکتی تو وفات کے بعد کس طرح سے جائز ہوسکتی ہے ___؟

سجدۂ قبر کی ممانعت

اسی واسطے حضور علیہ السلام نے فرمادیا :

لا تجعل قبري وثنا يعبد۔

"دیکھو میری قبر کو بت مت بنالینا کہ اسے سجدہ کرو یا جاکر اس کی پوجا کرو"۔

اس معلوم ہوا کہ آپ ؐ نے اپنے زمانہ قیام دنیا میں بھی سجدہ سے روک دیا۔ جیسا کہ میں نے حدیث بیان کی اور وفات کے بعد بھی روکا کہ میری قبر کو سجدہ گاہ مت بنانا کہ اسے بت بنالو اور اسے سجدہ کرو۔

درود شریف کی عمومیت کی حکمت

چنانچہ فرمایا :

صلوا علی حیث شئتم۔

"درود شریف پڑھو، جہاں سے بھی پڑھو گے میرے پاس پہنچ جائے گا"۔

بہرحال ہم یہ دلائل شرعیہ سے سمجھے ہوئے ہیں کہ اولیاء اللہ کی تعظیم جزء ایمان ہے۔ ان کی محبت جزء ایمان ہے، لیکن عبادت حرام ہے، چاہے وہ دنیا میں موجود ہوں یا وہ آخرت میں تشریف لے گئے ہوں، نہ ان کی عبادت کی جائے گی نہ ان کی قبروں کی عبادت کی جائے گی۔ ان کی ذات کی تعظیم زندگی میں بھی واجب اور وفات کے بعد بھی واجب۔ اس لئے قبروں پر بے ادبی کے ساتھ جانا یہ بھی بے ادبی ہے۔ ادب کے ساتھ حاضر ہونا چاہئے اور اسی طرح سمجھ کر کہ گویا وہ حضرات موجود ہیں۔

آدابِ زیارتِ قبور

امام ابو حنیفہ ؒ نے مسند ابی حنیفہ میں روایت نقل کی ہے کہ آداب زیارت میں سے ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرو اور میت کی طرف منہ کرو اس لئے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تمہاری بات سنے گا۔ تو جب یہ تفصیل موجود ہے تو اولیاء تو بڑی چیز ہیں، صلحاء مؤمنین کی قبروں کے ساتھ گستاخی جائز نہیں۔

چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ قبر کو تکیہ لگا کر بیٹھنا یہ ممنوع ہے۔ قبر کو پھلانگ کر جانا یہ ممنوع ہے یا اِدھر سے جائے یا اُدھر سے جائے۔ قبر کے اوپر سے پھلانگ کر جانا یہ صاحب قبر کی بے حرمتی ہے ___ تو جس شریعت نے مؤمنین، صالحین کی اور اولیاء اللہ کی اتنی توقیر کی ہو کہ ان کی زندگی میں بھی تہذیب سے پیش آؤ۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبروں سے توقیر و تعظیم کا معاملہ کرو۔ تو کون ہے جو ان کی قبروں کی بے ادبی جائز رکھے گا ___ ؟ کون مسلمان ہے جو کسی درجہ میں بھی اولیاء اللہ کی حیاً و میتاً گستاخی جائز قرار دے گا؟

علماء دیوبند نہ صرف جانا بلکہ مستقل مقصود سفر بنا کر جانا جائز قرار دیتے ہیں۔

وہّابی اہلِ نجد کا عقیدہ

البتہ نجد کے لوگ جو خود کو وہابی کہلواتے ہیں۔ وہ ممانعت کرتے ہیں اور بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ وہ روضۂ اقدس کے پاس جانے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ مسجد نبوی ؐ کی نیت کر کے جاؤ۔ مزار اقدس کی نیت کر کے نہ جاؤ۔

زیارۃ روضۂ اطہر کی نیت سے سفر

تو علماء دیوبند ان کے خلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جانا ضروری ہے جو شخص بھی حج کو جائے وہ قبر

شریف کو مقصد بنا کر مدینہ منوّرہ حاضر ہو۔ مسجد کی حاضری تو جُداگانہ عبادت و طاعت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیّت سے سفر کرے۔ احادیث میں ایسے عنوانات موجود ہیں۔

من زار قبری وجبت لہ شفاعتی۔

"جس نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت اس کے حق میں واجب ہوگئی"۔

بعض روایات میں ہے کہ :

من حج ولم یزرنی فقد جفانی۔

"جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے میرے اوپر ظلم کیا"۔

علماء دیو بند تو فقط زیارتِ قبر شریف ہی کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ زیارت قبر کے لئے سفر کر کے بھی جانا جائز قرار دیتے ہیں۔ تو جو جماعت اس درجہ آگے بڑھی ہوئی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ روکتی ہے سوائے جھوٹ، اتہام اور افتراء کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

علماء دیوبند کے خلاف بے جا اشتعال

بس میں نے یہ عرض کیا جماعت علماء دیوبند بے ادبیوں کو ناجائز کہتی ہے اور قبر پر جا کر سجدہ کرنا یہ صاحب قبر کی گستاخی ہے۔ اس لئے کہ جس صاحب قبر نے کبھی قبر کو سجدہ نہ کیا ہو اس کی قبر پر جا کے آپ سجدہ کریں، اس کا کتنا دِل دُکھے گا، جس نبی اور پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر یہ تعلیم دی ہو کہ غیر اللہ کے آگے کبھی سجدہ مت کرنا۔ اس نبی کی قبر پہ جا کے آپ سجدہ کریں تو اس نبی مکرم کے اوپر کیا گزرے گی؟ ان کو اس بندے سے کتنی نفرت پیدا ہوگی۔ جو شرک میں مبتلا ہوا۔ تو بدعات و منکَرات کو روکا جاتا ہے۔ لوگ اس کو اصل کا روکنا قرار دیدیتے ہیں اور یہ محض اشتعال دلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ دوسرے لوگ، لوگوں کو ان منکَرات و بدعات کے اندر مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب بدعات سے روکتے ہیں تو وہ ہمارے خلاف اشتعال دلانے کو کہتے ہیں کہ یہ تو قبروں پر ہی جانے سے روکتے ہیں۔ یہ تو اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔

جسے جائز کہتے ہیں وہ الگ ہے، جسے ناجائز کہتے ہیں وہ الگ ہے۔ گستاخی کرنا ناجائز ہے۔ زیارت کرنا عینِ طاعت ہے۔ زیارت قبور کرنا عینِ مقصدِ دین ہے۔

ایصالِ ثواب کی ممانعت کا الزام

سوال یہ بھی کہتے ہیں کہ قبروں پر فاتحہ اور درُود کو منع کرتے ہیں۔

اگر فاتحہ پڑھنے سے منع کریں تو قبروں پہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر قبروں پر تو فاتحہ ہی پڑھنے کے لئے جاتے ہیں کہ وہاں ایصالِ ثواب کریں اور یہ فاتحہ کا عنوان بھی کچھ نیا عنوان ہے۔ ایصالِ ثواب کے لئے فاتحہ کا لفظ بعد میں لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔ اصل لفظ ایصالِ ثواب ہے۔ بلکہ ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں جن سورتوں کے تذکرے آتے ہیں ان میں فاتحہ کا ذکر تک بھی نہیں۔ اخلاص، زلزال اور کافرون کا ذکر آتا ہے۔ سورت فاتحہ کا ذکر نہیں۔ نامعلوم فاتحہ کا لفظ کہاں سے استعمال کیا گیا ہے۔ سیدھا جو لفظ شرعی ہے۔ وہ "ایصال ثواب" ہے کہ ثواب پہنچاؤ۔ اب اس میں جس کو جو سورت یاد ہو۔ اخلاص (قل ہو اللہ) کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مختصر سورت ہے۔ ایک دفعہ پڑھنے پر ___ ایک تہائی قرآن کا ثواب پہنچائے گا۔

اور سورت کافرون کو فرمایا گیا یہ رُبع قرآن یعنی چوتھائی ہے۔ تو قرآن کی چوتھائی کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اگر کسی نے چار دفعہ یہ سورت پڑھ لی تو گویا پورے قرآن کا ثواب ہو گیا اور وہ پہنچا دیا۔

سورت زلزال کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا ثواب نصف قرآن کے برابر ہے۔ تو اگر کسی نے دو ۲ دفعہ سورت کو پڑھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پورے قرآن کو ثواب ہو گیا۔ تو ان سورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ تھوڑے سے وقت میں ثواب زیادہ ہو جائے ___ اور جو اس سے زیادہ بڑھے مثلاً سورۃ یٰسین ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کے پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ اگر کوئی باہمت آدمی یہ سورت پڑھ لے تو سبحان اللہ نورٌ علیٰ نورٌ ہے۔ دس قرآن کا ثواب پہنچائے ___ اور اس میں اچھی صورت یہ ہے کہ اگر وقت کم ہو تو قبر کی زیارت کو گھر سے چلے تو اسی وقت سورۃ یٰسین پڑھنا شروع کر دے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔ وہاں جا کر ثواب پہنچا دے۔ تو یہ جو چند سورتوں کی تخصیص کی گئی۔ یہ اس لئے کہ وقت کم لگے اور ثواب زیاہ ہو۔ ورنہ جونسی آیات پڑھ کے ثواب پہنچائے گا۔ ہر حرف پر دس نیکی کا وعدہ ہے۔ اگر الٓمٓ کا لفظ پڑھ کر ثواب پہنچائے تو تیس نیکیوں کا ثواب ہو گیا۔ تو جتنا چاہے ثواب پہنچے۔ تو یہ کہنا کے فاتحہ سے روکتے ہیں یہ بالکل کذب محض' افتراء اور دوسروں پر اتہام ہے ___ اور خدا جانے یہ چیزیں کہاں سے لی گئی ہیں۔ ان حضرات کا نہ یہ عمل ہے نہ یہ عقیدہ ہے۔ تو کسی شخص کے اوپر یا کسی جماعت کے اوپر اس عقیدے یا اس کے عمل کے خلاف اس پر تہمت باندھنا' افتراء پردازی سوائے اس کے کہ عوام کو بھڑ کانے کے لئے یہ حرکت کی جائے ___ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا یہ کہ ان کا اس میں کوئی فائدہ ہو گا۔ وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر یہ علماء دیوبند جانے لگیں تو ہمارا یہ فائدہ رک جائے گا۔ تو فائدے میں ہم حارج نہیں ہیں۔ تم فائدے اٹھاؤ مگر افتراء پردازی کی کیا ضرورت ہے؟ غرض یہ چیز بالکل غلط ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ برزخی

دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعوذ باللہ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد مٹی میں مل گئے ہیں ___ یہ بھی بالکل جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔ یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے اور شیخ عبدالوہاب کے معتقدین کا ہے۔ جن کو "وھابی" کہا جاتا ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بری ہیں۔

علماء دیوبند کہتے ہیں کہ حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے بدنوں کو زمین کے اوپر حرام قرار دیدیا گیا ہے۔ مٹی ان کو نہیں کھا سکتی ___ تو یہ کہنا کہ مٹی میں مل کے مٹی ہو گئے' بالکل جھوٹ ہے اور علماء دیوبند پر جھوٹ نہیں بلکہ حدیث پر جھوٹ لگانا ہے۔ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ وہی عقیدہ علماء دیوبند کا ہے۔

اور علماء دیوبند صرف یہی نہیں کہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مٹی میں بالکل صحیح و سالم محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا بلکہ علماء دیوبند کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اسی طرح سے جسم کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح سے جسم کے ساتھ دنیا میں تھے اس میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ فقط یہ نہیں کہ بدن محفوظ ہے بلکہ بدن میں وہی حیات محفوظ ہے جو حیات دنیا کے اندر محفوظ تھی۔ اسی طرح آپ ہیں اور زندہ ہیں۔

علاماتِ حیات

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ونبیّ اللّٰہ یُرزَق۔

''اللہ کا نبی زندہ ہے اور اس کو رزق دیا جارہا ہے''۔

تو کھانے پینے کے لئے رزق عطاء کیا جارہا ہے۔ اب جیسا وہاں کا عالم ہے رزق بھی ویسا ہی ہوگا اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پُلاؤ زردہ اور گیہوں کی روٹی ہو۔ جیسے روح پاک اور جسم پاک لطیف ہے۔

تو لطیف ترین غذائیں آپؐ کے لئے تجویز کی گئی ہیں وہ پہنچتی ہیں۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں فرمایا گیا :

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلّون۔

''انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں''۔

تو حیات کے لئے دو چیزیں ہیں۔

علامت ہوتی ہیں۔ ایک خوردو نوش وہ بھی حدیث سے ثابت ہے اور ایک حرکت وہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

بلکہ اعلیٰ ترین حرکت ''حرکت عباداتی'' ثابت ہے ___ غرض حیات آج بھی ثابت ہے۔ البتہ یہ ہے کہ آثار و افعال کو روک دیا گیا ہے۔ کہ وہ جو دعوت و تبلیغ کے لئے جاتے تھے وہ روک دیا گیا ___ اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک روشن چراغ ہو یا روشن بتی یا قمقمہ ہو آپ اسے ہنڈیا میں بند کردیں تو اس کی روشنی میں کوئی فرق نہیں آیا مگر جو اس کی کرنیں ہیں وہ عالم سے منقطع ہوگئیں۔ وہ جو چاندنا پھیل رہا تھا وہ ایک ہنڈیا میں چلا گیا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں تشریف لے گئے، حیات اور روشنی اور فیضان کی وہی نوعیت ہے جو اس عالم میں تھی۔ مگر اب عالمِ قبر میں محدود کردی گئی اور اس عالم سے منقطع کردی گئی ___ مگر اس کے باوجود ہم اس کے قائل ہیں کہ آپؐ اس عالم میں تشریف نہیں لاتے لیکن روحانی فیض جاری ہے۔ یہ جو ہمارا اور آپ کا ایمان سنبھلا ہوا ہے، یہ اسی فیض سے تو سنبھلا ہوا ہے۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ادھر توجہ نہ ہو تو ایمان باقی نہیں رہ سکتا۔ اصل مؤمن آپؐ کی ذات بابرکات ہے۔ آپؐ کے طفیل میں اور لوگ مؤمن ہیں۔ آپؐ کے ایمان کا پَرتو پڑ گیا جو ہم مؤمن کہلانے لگے۔ ورنہ اصل مؤمن آپؐ ہیں۔ وہ جو ایمانی فیض ہے وہ برابر جاری ہے۔ غرض یہ کہنا کہ انبیاء علیہم السلام مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے۔ العیاذ باللہ۔

یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے ہمارا عقیدہ نہیں۔ ہمیں زبردستی اور خواہ مخواہ وہّابی اور نجدی بنادیا۔ یہ فقط اشتعال انگیزی ہے اور یہ محض اس لئے کہ چونکہ ہم بدعات کا رد کرتے ہیں تو اس کے جواب میں نجدیوں اور وہّابیوں سے نسب نامہ جوڑدیا، حالانکہ کہاں نجدی و وہّابی اور کہاں دیوبندی؟۔

غرض یہ نجدیوں کا عقیدہ ہے کہ مٹی میں مل گئے۔ ہم اس کا رد کرتے ہیں کہ یہ غلط عقیدہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔

اِستدلالِ حیات

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن آپ کی وراثت نہیں بٹتی۔

نحن معاشر الانبیاء لانورث۔

"انبیاء علیہم السلام وہ گروہ ہیں کہ ہم وراثت میں کسی کو وارث نہیں بناتے"۔

اس لئے کہ وراثت مُردہ کی بٹا کرتی ہے۔ زندہ کی وراثت بٹنے کے کیا معنیٰ؟ جب آپ اسی طرح سے زندہ ہیں تو جو اس وقت آپ کی ملک تھی آج بھی آپ کی ملک ہے۔ آپ کی ازواجِ مطہراتؓ سے کسی کا نکاح جائز نہیں۔ اس لئے کہ آپؐ حیات ہیں تو کسی زندہ کی بیوی سے کس کی مجال ہے کہ نکاح کرے۔ بیوہ سے نکاح ہوتا ہے نہ کہ زندہ خاوند کی بیوی سے۔

غرض جب آپ زندہ ہیں تو آپ کے مال میں وراثت نہیں بٹ سکتی۔ یہ دلائل ہیں جو آپ نے حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں پیش کئے ہیں جو ان دلائل کے قائل ہوں' ان کی طرف نسبت کر کے یہ کہنا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں کہتے کہ قبر میں مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے۔ تو یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ عقیدہ کسی کا ہو اور جوڑ دیا کہیں ___ تو جو لوگ اتنی بے تحقیق بات کہیں کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ کس کا عقیدہ ہے اور کس کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا وہ اسی طرح سے اسٹیج پر مسلمانوں کی تربیت کریں گے؟

ہاں یوں کہو کہ فلاں کا عقیدہ ہے اور فلاں کا نہیں ہے۔ ایک لاٹھی سے ہانک دینا یہ تو کذبِ محض اور افتراءِ محض ہے اس لئے یہ سوال بھی بالکل بے محل ہے۔ علماء دیوبند اس عقیدے سے بَری ہیں۔

نذر و نیاز یا ایصالِ ثواب

ایک یہ سوال کیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز اور ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں ___ یہ بھی وہی بات ہے۔ ایصال ثواب کو تو ہم خود کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہنا کہ یہ ایصال کو روکتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے ___ ہم لوگ چشتی ہیں اور چشتیہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب صبح و شام بیٹھ کر اپنے معمولات کو پڑھو' خواہ ذکر و شغل کرو یا نفی اثبات کرو۔ تو ہمارے اکابر اور بزرگوں کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کم سے کم تین مرتبہ "سورۃ اخلاص" پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ کے تمام بزرگوں کو ثواب پہنچاؤ اور پھر دعا مانگو کہ یا اللہ! ان کے طفیل سے ہمارے قلب میں بھی نورانیت پیدا فرمادے۔ تو جن کے صبح و شام کا روزانہ کا معمول یہ ہو کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ثواب پہنچاتے ہیں اور اولیاء سلسلہ کو بھی۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ ایک بے وجہ کی تہمت لگائی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان سے نفرت دلانے کے لئے جہاں جیسا موقع ہوا ویسا ہی اٹھا کے جھوٹ بول دیا۔ بالکل بے اصل چیز ہے۔ غرض ایصال ثواب کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کے معمولات میں داخل ہے۔ جیسے روزانہ تسبیح و تہلیل معمولات میں ہے۔ خود ہم لوگ بھی اس کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے معمولات شروع کرنے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیرانِ سلسلہ

کو ثواب پہنچا لے اب آگے رہ گئی نذر ونیاز؟

تو اگر نذر ونیاز کے یہ معنیٰ ہیں کہ بھائی! مال دیدو اور ثواب پہنچاؤ تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ تو جائز ہے ـــ آپ نے چار فقیروں کو کھانا کھلادیا اور یہ نیت کی کہ اس کا ثواب فلاں فلاں بزرگ کو پہنچے۔ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ وہ پہنچے گا علماء دیوبند بھی اس کے قائل ہیں اور نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا بھی ان کے ہاں معمول ہے ـــ تقریباً سال میں ایک دو مرتبہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بکرا ذبح کر کے کھانا پکایا اور غریبوں میں ایصالِ ثواب کے لئے تقسیم کردیا۔

جو صاحبِ حیثیت ہیں وہ بڑا جانور ذبح کر کے بہت سوں کی دعوت کردیتے ہیں جو بے چارے کم حیثیت ہیں انہوں نے دو چار پیسے صدقہ کردیئے۔ بہرحال اگر نذر ونیاز کے معنیٰ یہ ہیں کہ مالی عبادت کا ثواب پہنچاؤ۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہم اس کو شرعاً جائز سمجھتے ہیں اور ہمارا معمول ہے۔

مشرکانہ نذر ونیاز

ایک نذر ونیاز کے معنیٰ بھینٹ چڑھانا ہے کہ کسی بکرے کو لے جاکر قبر پر باندھ دے یا کسی بزرگ اور فقیر کے نام پر چھوڑ دو اس کو ہم شرک جانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی نذر ونیاز صرف اللہ کے نام کی ہوسکتی ہے۔ صرف اللہ کے نام پر جانور چھوڑا جاسکتا ہے ـــ جیسے آپ حج پہ جائیں تو "ھدی" لے کر جانا یا ھدی کو چھوڑ دینا، یعنی اونٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دینا یہ اللہ کے لئے جائز ہے۔ غیر اللہ کے لئے جائز نہیں۔ مشرکینِ مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے جانور اپنے بزرگوں اور بتوں کے نام پر چھوڑا کرتے تھے۔ ایک کو سائبہ ' ایک کو وصیلہ اور ایک کو حام کہتے تھے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

مثلاً جس اونٹنی نے دس دفعہ بچے جن دیئے ہوئے ہوں۔ جب وہ جن چکی اب اس کو ایک بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ جس نے پہلا حمل جنا اس کو ایک بُت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے' اس کو کچھ نام دیدیتے تھے اور اس کے گلے میں ہار ڈال دیتے تھے اور عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ فلاں بُت کے لئے اور یہ فلاں بُت کے لئے۔

قرآن کریم نے اس کا رد کیا ـــ فرمایا :

مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔

"اللہ نے نہ سائبہ رکھا نہ بحیرہ نہ وصیلہ' نہ حام رکھا کہ بتوں کا نذر ونیاز کرو۔ یہ اللہ پر اِفتراء ہے کہ بھینٹ چڑھاؤ بتوں کے نام پر اور یہ کہو کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ـــ اللہ نے ہمیں امر کیا ہے ـــ فرماتے ہیں یہ افتراء پردازی ہے۔ ہم نے اس کا امر نہیں کیا"۔

غرض نذر ونیاز کے معنیٰ اگر مالی عبادت کے ہیں کہ کھانا پکا کے غریبوں کو کھلاؤ اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔ یہ جائز ہے' اگر کپڑا دینا ہو تو ثواب کی نیت کردو۔ یہ بھی جائز ہے۔ تلاوتِ قرآن کریم کرکے ثواب پہنچاؤ' یہ بھی جائز ہے' غرض بدنی عبادت ہو یا مالی عبادت ہو' دونوں کا ثواب پہنچتا ہے۔ اگر مالی عبادت کو آپ نذر ونیاز کہتے ہیں' علماء دیوبند اس کے منکر نہیں اور اگر نذر کے معنیٰ چڑھاوے کے ہیں کسی کے نام پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا ولی ہو یا نبی ہو۔ اس کو قرآن کریم نے روکا ہے اس کو علمائے دیوبند بھی روکتے ہیں۔ تو مطلقاً یہ کہہ دینا کہ نذر ونیاز سے روکتے ہیں یہ غلط ہے۔ ایک خاص نذر ہے جس میں شرک ہے اس کو روکتے ہیں۔ مطلقاً مالی عبادت کا

ثواب پہنچانا اس کو کسی نے نہیں روکا۔ یہ جائز ہے اور ان حضرات کا بھی یہ عمل جاری ہے۔

ذبیحہ کی نامزدگی

اسی طرح کسی بزرگ کے نام پر ذبیحہ کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔ فقط اللہ کے نام پر ذبح ہو گا۔ جب بھی آپ ذبح کریں گے تو یوں کہیں گے :

بسم اللہ وعلٰی ملۃ رسول اللہ۔

یا جب بھی قُربانی کرتے ہیں اس میں بھی آپ اللہ کا نام لیتے ہیں۔ ذبیحہ تو صرف اللہ کے نام پر ہو گا لیکن جس کو ثواب پہنچانا چاہیں آپ نام لے سکتے ہیں کہ :

"اے اللہ! میں اس ذبیحہ کو کرتا ہوں تاکہ ثواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچادے یا فلاں بزرگ کو پہنچادے"۔

تو ایک ہے ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کرنا کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے نامزد کر رہا ہوں۔ یہ جائز ہے اور ایک ہے کسی کے نام پر ذبح کرنا یہ عبادت ہے۔ تو ذبح تو اللہ کے نام پر ہو گا اور ثواب کے لئے کسی ایک یا دو یا بیس کو نامزد کر دیں اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اگر نذر کے معنٰی یہ ہیں کہ کسی کو ثواب کے لئے نامزد کر دے کہ مثلاً میں فلاں بزرگ کو ایصال ثواب کے لئے یہ کھانا پکارہا ہوں۔ اس میں کچھ حرج نہیں۔ ایک کو نامزد کرو' دو کو نامزد کرو' بے شک تمام اولیاء امّت کے لئے نام لگاؤ ___ اور یہ کہ فلاں کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور ثواب کا کوئی ذکر نہیں۔ جو نام پر ذبیحہ ہو گا۔ وہ صرف اللہ کے نام پر ہو گا اسی طرح کسی نام پر جو جانور چھوڑا جائے گا' تو صرف وہ اللہ کے نام پر چھوڑا جائے گا وہ کسی بزرگ کے نام پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

بہرحال میں نے عرض کیا کہ اگر نذر و نیاز کے معنٰی ایصال ثواب کے ہیں یا نامزد کرنے کے ہیں کہ فلاں بزرگ کو ثواب پہنچانے کے لئے اس بکرے کو ذبح کر رہا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس معنٰی کے لحاظ سے ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اگر نذر و نیاز کے یہ معنٰی ہیں کہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں اور فلاں بزرگ کے نام پر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ جائز نہیں۔ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مشرکینِ مکّہ بُتوں کے نام پر چھوڑتے تھے اور قرآنِ کریم نے اس کا رَد کیا ہے۔

ہدیہ ضیافت یا صدقہ ایصالِ ثواب

اگر ایصالِ ثواب کے لئے کچھ پکا رہیں تو وہ غرباء کا حق ہو گا۔ اغنیا کا حق نہیں ہے کہ وہ کھائیں اس لئے کہ یہ صدقہ ہے ___ یہ رسم ہے کہ آپ نے رشتہ داروں اور برادری کو جمع کیا اور ان کو کھلادیا۔ یہ صدقہ کیا ہوا۔ یہ تو نام و نمود کی دعوت ہو گئی۔ صدقہ اس کو کہتے ہیں کہ آپ فقیروں کو کھلائیں تاکہ آپ کو ثواب ہو۔ اور اغنیاء کو اگر کھلائیں تو اس میں ثواب نہیں ہو گا۔

ہاں اس طرح ثواب ہو سکتا ہے کہ آپ ہدیہ کی نیت کریں کہ خوشی کے طور پر دعوت کر رہا ہوں۔ اس میں ایصال ثواب کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ غرض ایک یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو دعوت پہ بُلانا۔ تو یہ ضیافت اور ان کے لئے ہدیہ ہے جو آپ ان کے لئے گویا پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایصال ثواب کی نیت نہیں ہوئی اور ایک ایصال ثواب کے لئے صدقہ کرنا ہے اس کو ہدیہ نہیں کہتے۔ تو صدقہ کے لئے غریب کا ہونا ضروری ہے۔ اگر

آپ اغنیاء اور مال داروں کو بلا کر کھلادیں گے تو وہ کھانا بھی کھا جائیں گے اور ثواب بھی سارا کھا جائیں گے۔ وہ کسی اور کو نہیں پہنچے گا۔

ایصالِ ثواب کے لئے ایام کی تخصیص

سوال نمبر (۵) ایسے عزیز واقارب اور متوفیاں کے لئے اگر تیسرے یا دسویں اور چالیسویں کوئی کھانا وغیرہ پکا کر اس پر فاتحہ دیں اور برادری وغیرہ کو جمع کر کے کھلائیں۔ اس کو بھی علماء دیوبند منع کرتے ہیں؟

جواب : تو اتنی بات معلوم ہوگئی کہ ایصال ثواب سے تو نہیں روکتے۔ اس لئے کہ شریعت نے اجازت دی ہے کسی کو روکنے کا کیا حق ہے۔ اب اس میں اپنی طرف سے قیدیں بڑھانا کہ تیسرے دن کرو، چوتھے دن کرو، اگر یہ اتفاقاً ہے تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتفاق سے آپ کے دل میں آیا کہ میں میت کو ایصال ثواب کروں اور وہ تیسرا دن تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں یا دسواں اور چالیسواں دن اتفاق کے طور پر تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن اگر یہ سمجھ کر آپ کریں کہ چالیسویں دن تو پہنچے گا ورنہ نہیں۔ تو یہ غلط ہے کہ یہ عقیدے میں خلل اندازی ہے، عقیدے میں برابر قرار دیا گیا ہے کہ چالیسویں دن پہنچائے گا جب پہنچے گا۔ اتالیسویں دن پہنچائے جب بھی پہنچ گا تو جس چیز کو شریعت عام قرار دے اس کو خاص بنادینا یہ امّت کا حق نہیں۔ یہ صرف رسول کا حق ہے۔ جس چیز کو اللہ کا رسول خاص قرار دے۔ اس کو عام کرنا یہ امّت کا حق نہیں۔

مثل رمضان شریف کے لئے شریعت نے تیس روزے خاص کر دیئے امّت کو حق نہیں کہ وہ شعبان کے بھی روزہ رکھا کرے کہ ہم اس کو بھی رمضان سمجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے تخصیص کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح شریعت نے نماز کے پانچ اوقات مقرّر کئے ہیں۔ بندہ پابند اور مقید ہے کہ انہی اوقات میں نماز ادا کرے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ کہے کہ میں آج ظہر کو عشاء کے بعد ادا کروں گا یا عصر کے بعد پڑھ لوں گا اور یہ کہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس میں حرج یہ ہے کہ اللہ نے نمازوں کے اوقات خود مقرّر فرمادیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا۔

اللہ نے نماز وقت کی قید کے ساتھ فرض کی ہے تو وقت کی قید اٹھانے والا کوئی دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا تو قید لگائے اور وہ اٹھائے۔ یہ تو اللہ کا مقابلہ ہے تو جہاں شریعت نے قید لگادی اسے اٹھانے کا حق نہیں اور جہاں قید نہیں لگائی اور بے قید رکھا۔ وہاں قید لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ دونوں چیزیں برابر ہیں تو مقیّد کو مطلق کرنا اور مطلق کو مقیّد کرنا یہ صرف شارع علیہ السلام کا کام ہے۔ اللہ و رسول کا کام ہے کسی غیر کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوام والتزام کا فرق

پھر اس میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ایک ہے وقت کا تقیّد کرنا اپنی سہولت کے لئے۔ مثل میرے پاس فلاں مہینہ کے فلاں دن آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ اس دن میں اپنے حالات کے لحاظ سے کر سکتا ہوں۔ ورنہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر اتنا کریں اور دوسرے کو ملامت نہ کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ یہ سب دنوں کو برابر سمجھتا ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسے مثلاً آپ حضرات تاجر ہیں اور سیزن کا کوئی مہینہ آگیا۔ اس میں آمدنی زیادہ ہوتی

ہے اور بکری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس مہینے میں غرباء کو کھانا کھلایا کروں گا۔

تو یہ ایک عمل ہے اس عمل پر آپ نے اتفاقی احوال کے لحاظ سے دوام کر لیا آپ کے عقیدے میں یہ نہیں ہے کہ اس دن ثواب پہنچاؤں گا تو پہنچے گا۔ ورنہ نہیں پہنچے گا۔ اس واسطے کہ اگر کوئی شعبان میں کرتا ہے تو اس کو بھی صحیح قرار دے رہے ہیں اور ایک نے اتفاق سے شوال میں کیا۔ آپ نے کہا اس نے بھی ٹھیک کیا۔ اب آپ خود جس مہینے میں دوام کر رہے ہیں تو اس کے خلاف کو بھی جائز سمجھتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔

بہرحال یہ سمجھنا کہ اس مہینے میں ہوگا اور اس کے خلاف کو ناجائز سمجھنا یہ عقیدہ ہے اور عقیدہ بنانا جائز نہیں جب تک اللہ کا رسول عقیدہ نہ بتلائے۔ غرض ایک ہے دوام اور ایک ہے التزام۔ دوام اور التزام میں یہ فرق ہے تو ایک یہ ہے کہ آدمی کسی مہینے کا پابند بن جائے اور عقیدے میں یہ سمجھے کہ یہ کام اسی مہینے ہو سکتا ہے، یہ مہینہ نکل گیا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یہ جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عقیدہ ہے اور ایک التزام کے بغیر دوام ہے کہ میری مصلحت کے لحاظ سے میں اس مہینے میں کھلا سکتا ہوں اور عمر بھر اس کا پابند ہو گیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ جائز اس میں بھی ہے دوسرے میں بھی جائز ہے۔ یہ ایک ذاتی مصلحت ہوگی۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مشابہت سے احتراز

بس اب اتنی بات دیکھی جائے گی کہ اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی موجود ہے جو اس خاص مہینے میں یا اس وقت کو لازم سمجھتی ہے اور آپ نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ عمل کریں گے تو آپ پر تہمت یہ آئے گی کہ ان کا بھی وہی عقیدہ ہے۔ ایسے میں مشابہت کی وجہ سے ترک کر دینا چاہیے ـــــ لیکن اگر سارے ہی ایسے ہوتے کہ فی نفسہٖ ہر مہینے میں جائز سمجھتے لیکن اپنی اپنی مصلحت کی وجہ سے کسی نے کوئی مہینہ اختیار کر لیا کسی نے کوئی۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ فی نفسہٖ عقیدہ بنائے بغیر عمل کا اپنے کو پابند کر لینا جائز ہے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے ترک کرایا جائے گا' اگر کوئی قوم دنیا میں اسے لازم سمجھتی ہے اور آپ اسے لازم نہیں سمجھتے مگر عملاً وہی کر رہے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کا بھی وہی (لازم سمجھنے کا) عقیدہ ہے تو لوگ اس سے حجّت پکڑیں گے تو ایسے مواقع پر ممانعت کی جائے گی۔ مگر وہ ممانعت مصلحتاً ہوگی حرام یا ناجائز ہونے کی وجہ سے اس فعل کی ممانعت نہیں ہوگی۔

بہرحال اس سے آپ سمجھ گئے کہ عزیز و اقرباء یا متوفیان کے لئے تیسرے دسویں یا چالیسویں دن کھانا پکا کر فاتحہ دے کر برادری کو بلا کر دعوت کھلانے سے جو علماء دیوبند روکتے ہیں اس کا آپ تجزیہ کر لیں کہ کیوں روکتے ہیں۔ بات کو گول مول نہ رکھئے ـــــ اب تک میں نے تیسرے' دسویں اور چالیسویں دن کے روکنے کے بارے میں کلام کیا کہ ان کو عقیدہ بنا کر مخصوص کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر اپنی مصلحت کی وجہ سے خاص کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

چہلم' برسی ہندوانہ رسم ہے

مگر یہ ظاہریات ہے کہ اگر آپ کو فرض کیجئے تیسرے دن اور محرم کے مہینے کی سہولت ہے تو کیا ضروری ہے کہ جس کا عزیز مرے وہ محرم ہی کے مہینے میں مرے اتفاق سے وہ شعبان کے مہینے میں انتقال کر گیا تو وہ کون سا دن ہوگا جس میں آپ کو سہولت ہوگی۔ تجارت کا تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تو یہ تیسرا' دسواں اور چالیسواں بلکہ چہلم یہ کوئی قید شریعت میں نہیں ہے۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تابعین اور آئمہ مجتہدین سے ثابت۔ یہ ایک بے اصل سی چیز ہے۔
بلکہ اگر ثابت ہے تو یہ ہندوؤں سے ثابت ہے۔ ان کے ہاں تیسرا بھی ہے' چوتھا بھی ہے' چالیسواں بھی ہے' برسی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسم وہیں سے لی گئی ہے۔

برِّ صغیر کے مسلمانوں میں رُسوم کی پابندی کی وجہ

اور اس کی بنا در حقیقت یہ ہوئی ہے اور بھی بہت سی رسمیں اسی طرح ہیں۔ غرض اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس کی بنا یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کرام کے صدقے پھیلا ہے تو ان حضرات کے طفیل سے ہندوستان کے جو لوگ مشرک تھے' وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ چنانچہ ننانوے لاکھ آدمی تنہا حضرت خواجہ اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو ہوئے ہیں وہ تعداد اس کے علاوہ ہے ___ اسی طرح اور حضرات صوفیاء ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں ان حضرات کی دیانت' امانت' سچائی' خلوص اور بزرگی دیکھ دیکھ کر خود بخود جوق در جوق لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اسلام میں داخل ہوگئے ___ لیکن ان کی تعلیم کا بندوبست پورا نہیں ہوسکا۔ حکومتوں نے توجہ نہیں کی۔ عوام مسلمین نے دھیان نہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں تو داخل ہوگئے' مگر مسائل کا علم نہیں ہوسکا۔
تو جو رسمیں انہوں نے اسلام کے نام سے کرنی شروع کردیں۔ مثلاً ان کے دیوالی کی چھڑی نکلتی تھی انہوں نے بھی بعض بزرگوں کے نام پر جھنڈا نکالنا شروع کردیا ___ ان کے ہاں ستی کے اوپر پرشات چڑھتا تھا انہوں نے جاکر قبروں پر مٹھائی چڑھادی ___ ان کے ہاں کسی دیوتا کے نام پر کوئی کام ہوتا تھا انہوں نے وہ کام کسی بزرگ کے نام پر کردیا۔
تو اسلام کا ایڈیشن بنادیا جب کہ حقیقت وہی تھی جو پہلے سے آرہی تھی۔ غرض اس کی بنا یہی ہوئی کہ اسلام میں داخل تو جوق در جوق ہوئے مگر ان کی تعلیم نہ ہوسکی۔ تو وہ عورتیں اور مرد جو رسمیں ان کے گھروں میں تھیں ان کے اپنے ذہن سے یا کسی کے کہنے سے انہی کا نقشہ بدل کے وہ سب اسلام بنادیا۔ اب وہ ساری رسمیں اسی طرح سے چلی آرہی ہیں۔ اب جبکہ کوئی عالم اس کو ناجائز کہتا ہے تو خفا ہوتے ہیں کہ باپ دادا سے تو ہم یہ رسمیں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے منع کرنے والا؟
پھر اس کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے حالانکہ وہ ان کی خیر خواہی میں یہ سب کچھ کررہا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔ دین اصلی وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے پیش فرمایا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے۔ یہ رسوم وغیرہ یہ شرکیہ مزاج ہے۔ لوگ اس کو نہیں سنتے۔ بلکہ اس رسم پر زور دیتے ہیں۔

ہندو مسلم اختلاط کے اثرات

تو زیادہ تر یہ رسمیں ابنائے وطن (ہندوؤں) سے آئی ہیں اور پورے ہندوستان میں اس کا مسلمانوں کے دین پر اثر پڑا ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں انہوں نے بھی آپ کی قبول کیں اور رفتہ رفتہ ان میں توحید آئی کہ ایک ان میں مستقل ایسا فرقہ (آریوں کا) پیدا ہوگیا۔ جو شرک اور بت پرستی کو روکتا ہے اور مسلمانوں میں شرک اور بت پرستی اسلام سے پیدا ہوگئی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں اسلام سمجھ کر کررہے ہیں اور حقیقت میں وہ شرک ہوجاتا تو یہ چیزیں وہاں سے چلیں۔ ورنہ دور صحابہؓ میں کہیں اس کا وجود نہیں کہ کہیں دسواں اور

چالیسواں ہیں۔ اسی طرح تابعین کے زمانہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ آئمہ مجتہدین میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ اسی طرح فقہ میں نہیں۔ البتہ فقہ میں رد موجود ہے کہ یہ غلط اور یہ غلط۔

دین اور رواج کا امتیاز

بس ایک رواج چلا آ رہا ہے۔ تو رواج کا نام دین نہیں۔ دین تو رواجوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے تا کہ خدائی رواج قائم ہو۔ خدائی قانون قائم ہو۔ اس واسطے جب بھی کوئی عمل کیا جائے تو دیکھا جائے کہ کتاب اللہ میں ہے یا نہیں؟ سنت رسول اللہؐ میں ہے یا نہیں؟ سنت صحابہؓ میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟ اگر معلوم ہو جائے تو آدمی سر آنکھوں پر کرے اور اگر نہ نکلے تو پھر اس سے بچنے کی کوشش کرے ___ اور اگر نہیں ہے۔ مگر غیروں کے اندر ہے اور عمل کریں تو ان سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس کو پوری طرح سے ترک کر دینا چاہئے۔ ورنہ وہ مسلم اقوام کا مزاج بدل دے گا۔ جو ان کا موحدانہ مزاج ہے اور اسلام نے توحید کا مزاج بنایا ہے۔

حاصلِ کلام

غرض دو باتیں میں نے عرض کیں، ایک یہ ہے کہ کسی مسئلہ کو شریعت نے مطلق چھوڑ دیا ہو اور اپنی طرف سے قید لگانا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کون ہیں کہ خوامخواہ اس کو مقید کریں؟

لیکن اگر آپ کوئی دن اپنی مصلحت سے مقیّد کر رہے ہیں کہ مجھے آج کے دن سہولت ہے اور آپ اس کی تبلیغ نہیں کرتے۔ اپنی سہولت دیکھتے ہیں تو کرلیں لیکن یہ بھی جائز سمجھتے ہیں کہ اگر اس کے کوئی خلاف کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ___ البتہ اس میں یہ ہوگا کہ اگر کسی قوم نے اس کو لازم سمجھ رکھا ہے تو احتیاطاً آپ کو رکنا پڑے گا کہ اس وقت یہ فعل آپ کے واسطے موضع تہمت ہو جائے گا۔ اس لئے آپ کو اس سے بچ جانا چاہئے۔

اور اس کے بچنے میں کوئی دشواری نہیں ___ اور بچنے سے آدمی جب رکے کہ اس دن تو ثواب پہنچتا ہے پھر نہیں پہنچے گا۔ جب ثواب اب بھی پہنچتا ہے اور چار دن بعد بھی پہنچتا ہے تو ضرورت کیا ہے کہ خوامخواہ اپنے اوپر ایک بَلائی جائے اور اپنے سر پر تہمت رکھی جائے۔

دوسری بات یہ کہ فاتحہ کے معنٰی اگر ایصال ثواب کے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ ہونا چاہئے ___ حدیث میں میّت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے دریا میں ڈوبتا ہوا آدمی کہ تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے وہ آس کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ میرا کوئی عزیز مجھے ثواب پہنچاتا ہے یا نہیں؟ تو آپ کو اس کی آس پوری کرنی چاہئے۔ اس کو ثواب پہنچانا چاہئے۔

ایصالِ ثواب کا تعلق نیت سے ہے

ایصال ثواب کا تعلق قلب سے ہے۔ آپ نیت کریں گے تو ثواب پہنچ جائے گا۔ اگر آپ اس ثواب پہنچانے میں چند قیدیں لگائیں کہ کھانا یوں رکھا جائے اور اس پر یوں پڑھا جائے ___ بعض سہاگنیں جمع ہوں جن کے اب تک بچہ نہ ہوا ہو اور وہ ایک ایک یا سات سات چاول کے دانے اٹھائیں۔ یہ محض رسوم ہیں۔

شریعت کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ غرض ایصال ثواب کا تعلق قلب کی نیت سے ہے۔ آپ نے نیت کی' کھانا پکا کے بانٹ دیا۔ فقیر سے بھی یوں نہ کہا کہ میں کیوں کھلا رہا ہوں؟

بس قلب کی نیت یہ ہے کہ ثواب پہنچے' بس پہنچ جائے گا۔ یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ جب تک مسجد کا ملا نہ آئے گا ثواب نہیں پہنچے گا۔ یہ سب کھانے پینے کی باتیں ہیں۔ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ ثواب پہنچانا ہے اور یہ صدقہ ہے۔ اسی واسطے مستحقین کو کھلائے۔ یہ جو ساری برادری کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو کھلادیا یہ تو وہی رسمی بات ہوگئی۔ ثواب سے اس کا تعلق ہوگا تو وہ کھانے کے ساتھ ثواب کو بھی کھا کر چلے جائیں گے۔ میت غریب کے لئے کچھ بھی نہ رہے گا۔ میت کو جب پہنچے گا جب آپ مستحق کو صدقہ دیں۔

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ

اس واسطے اگر دعوت کرنی ہے' شوق سے کیجئے اور آپ ہر روز دعوت کیا کیجئے۔ آپ کے عزیز ہیں' اقربا ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے۔ جتنی چاہیں آپ دعوتیں کریں۔ دس' بیس' سو سو کو جمع کریں ___ مگر ثواب پہنچانے کی عبادت کو کیوں آپ کرکرا کرتے ہیں کہ اس میں خلط ملط کریں۔ کچھ مستحق کچھ غیر مستحق کچھ امراء کچھ غرباء ___ معلوم ہوتا ہے دل کے اندر کچھ نمو کا جذبہ ہے۔ برادری کی اٹک ہے کہ نہیں کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی' تو جس میں ناک کٹنے کا خوف ہو وہ عبادت ہوتی ہے؟

ناک کٹنے کا خوف ہو تو وہ مخلوق کی اطاعت ہوگئی۔ نہیں کریں گے تو برادری والے نام رکھیں گے۔ تو نماز' روزہ اور صدقہ نام رکھنے اور نام کٹنے کے خوف سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے' تو آدمی عبادت بھی کرے اور اس کو کر کے کھودے' تو اس کے کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ صحیح طریق سے کیجئے۔

تو یہ کہنا کہ یہ علماء دیوبند منع کرتے ہیں تو وہ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے ان رسموں سے منع کرتے ہیں۔ تو یہ اشتعال دلانا ہے اور یوں نہیں کہتے کہ علماء دیوبند ایصال ثواب کو جائز بلکہ ضروری کہتے ہیں مگر جو رسوم باندھ رکھی ہیں' ان کو روکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں ان کے کھانے پینے کا نقصان ہے ___ تو یوں کہتے ہیں کہ یہ مطلق ثواب سے روکتے ہیں تاکہ عوام میں اشتعال پیدا ہو۔ ایصال ثواب جیسی مطلق چیز کو تم مقید کرتے ہو تو اس **تقیید** کو روکتے ہیں کہ تم کو اس کے مقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے عام کر رکھا ہے اس کو عام رکھنا پڑے گا جس کو وہ خاص کردے اس کو خاص رکھنا پڑے گا۔ ہم عیاذاً باللہ شارع نہیں ہیں کہ شریعت وضع کریں۔ شریعت وضع کرنے والا اللہ ہے اور اس کو پہچانے والے اللہ کے رسول ہیں اس کے بعد کسی کو شریعت کے وضع کرنے کا حق نہیں۔ صحابہؓ میں یا ائمۂ مجتہدین بھی اس شریعت میں سے مسائل نکال سکتے ہیں۔ لیکن مستقل شریعت وضع کردیں یہ کسی کا حق نہیں۔

علمِ غیب کا تنازع

سوال : علماء دیوبند سرکارِ دو عالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں' دیوانوں اور جانوروں کے مشابہ کہتے ہیں؟

العیاذ باللہ' العیاذ باللہ اور معاذ اللہ شیطان کے علوم کو آپ ؐ کے علوم سے زیادہ بتاتے ہیں۔

جواب : یہ بھی بالکل افتراء اور بالکل کِذب ہے ___ یہ دعویٰ اصل میں وہی لوگ کرتے ہیں جو علماء دیوبند کو الزام دے رہے ہیں ___ اور یہ قصہ یہاں سے چلا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کو وہ سارا علم حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ علم غیب کلی اور جزئی جزئی کا وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کو ہے ___ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا اور میرے ساتھ ساری مخلوق کا علم ملا کر اللہ کے علم کے سامنے ایسا ہے کہ جیسے ایک بے پید سمندر پر ایک چڑیا آئے اور اس میں چونچ لگائے۔ اس کی چونچ کو جو تری لگ جاتی ہے تو اس تری کو سمندر سے کوئی نسبت نہیں۔ ساری مخلوقات کا علم مل کر اللہ کے علم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو چڑیا کی چونچ کی تری کو سمندر سے ہے۔ تو حضور علیہ السلام تو یہ فرمائیں اور ہم دعویٰ یہ کریں کہ جتنا اللہ تعالیٰ کو علم ہے وہ سب آپ کو ہے۔ عقلاً بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات بھی لامحدود اور صفات بھی لامحدود۔ صفاتِ کاملہ میں سے علم بھی ہے۔ تو علم بھی اس کا لامحدود' اس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ بندہ خود محدود' عمر محدود' ذات محدود' صفات محدود اور قوتیں محدود' تو لامحدود چیز' محدود چیز میں کس طرح سما سکتی ہے؟

تو شرعاً میں نے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک پیش کیا اور عقلاً بھی یہ محال ہے تو عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

علماء دیو بند کا عقیدہ

علماء دیو بند کا یہ دعویٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے ساری کائنات میں سے وہ علم کسی کو نہیں دیا۔ نہ اتنا زیادہ کسی کو ہے۔ آپ اَعلمُ الخلائق ہیں۔ تمام ملائکہ کو بھی وہ علم نہیں ہے جو آپ کو ہے۔ تو کائنات میں سب سے زیادہ علم والی ذات جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ ایک تو اَعلمُ الخلائق ہونا ہے کہ ساری مخلوق سے زیادہ آپ عالم ہیں اور ایک اللہ کے برابر ہونا۔ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

مخلوق' خالق کی کسی صفت میں اللہ کے برابر ہو جائے۔ یہ عقلاً بھی محال ہے اور نقلاً بھی اور ایک یہ کہ مخلوقات میں سب سے زیادہ افضل ہونا۔ تو وہ ذات ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ___ غرض مسئلہ یہاں سے چلا کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کلی حاصل ہے۔

علماء بریلی کے دعویٰ کا تجزیہ

اس کے بارے میں بعض بزرگان دیو بند نے لکھا ___ کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ”علم کلی“ حاصل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر علم کلی کا یہ مطلب ہے کہ ساری کی ساری جزئیات اور کلیات حاصل ہیں۔ یہ عقلاً بھی اور نقلاً بھی غلط۔ خود حدیث کے بھی خلاف۔ قرآن کریم کے بھی خلاف ___ اور اگر یوں کہتے ہیں اور آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل میں سے بعض علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے تو وہ بعض کچھ اور بعض کچھ اوروں کو بھی حاصل ہے۔ تھوڑا بہت علم اللہ نے ہر انسان کو دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم ہر فرشتے کو دیا۔ تھوڑا بہت علم جنّات کو بھی دیا۔ پھر اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کیا رہی؟

تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ اگر تمہارے دعوے کا یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ مطلب ہے تو یہ بھی غلط۔ یہ مطلب علمائے دیو بند کا تھوڑا ہی ہے یہ تو خود بریلوی حضرات کا مطلب ہے جن کو ہم رد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سر پر تھوپ دیا کہ تم یوں کہتے ہو کہ معاذ اللہ جانوروں کے برابر علم ہے۔

اور جِنّات کے برابر علم ہے "عیاذاً باللہ، عیاذاً باللہ، نقلِ کفر، کفر نہ باشد ___ شیطان کے برابر علم ہے ___ تو یوں کہا گیا ہے کہ اگر تم علم کے معنیٰ یہ سمجھتے ہو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر جانور کو بھی علم ہے۔ ہر فرشتے کو بھی علم ہے۔ جناب کو بھی یہ علم ہے۔ اس میں فضیلت کیا رہی؟

غرض تمہارے مطلب کی دو شاخیں بیان کر کے اسے رد کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ اپنے مطلب کا کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ تھوپ دیا ہمارے سر کہ تم یہ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ بالکل غلط ہے ___ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ ہم سے یوں کہیں کہ صاحب! فلاں آدمی آیا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ فلاں جگہ وبا پھیل گئی ہے خدانخواستہ کوئی باقی نہ رہا۔

تو ہم اس کو کہیں گے کہ بھائی! "سوچ لو کہ کوئی باقی نہیں رہنے کا کیا مطلب ہے"۔ آیا یہ مطلب ہے کہ ایک بھی باقی نہیں۔ یہ تو بظاہر خلاف بات ہے کل کے اخبار میں آچکا کہ بہت سارے زندہ ہیں اور اگر یوں کہو کہ بعض آدمی انتقال کر گئے تو کون سا شہر ایسا ہے جس میں روز بعض لوگ انتقال نہیں کرتے۔ تو یہ جو ہم نے الزام قائم کیا یہ آپ کے دعویٰ پر ہم نے قائم کیا۔ ہم نے تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

تو مطلب تو آپ کے دعویٰ کا بیان کیا جا رہا ہے اور آپ ہمارے سر تھوپ رہے ہیں کہ تمہارا یہ مطلب ہے ___ ہمیں اس مطلب سے کیا تعلق؟

علمائے دیوبند کا دعویٰ

ہم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوقات سے زیادہ علم دیا گیا ہے نہ اتنا علم انبیاء علیہم السلام کو ہے نہ اولیاء کو ہے نہ فرشتوں کو ہے ___ لیکن اللہ کے علم کے سامنے وہ جز ہے۔ کلی علم تو فقط اللہ کو ہے آپؐ کا علم اس کا ایک جز اور ایک شمّہ ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو جو علم دیا گیا ہے وہ بھی ایک جز ہے تو اس فرق کو سمجھ لیجئے کہ ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری کائنات سے بڑھ کر عالِم ہونا اور ایک ہے حضور علیہ السلام کے علم کا اللہ کے علم کے برابر ہونا ___ یہ برابر تب ہوگا جب ذات برابر ہو، صفات برابر ہوں، احوال برابر ہوں۔ جب کہیں برابری نہیں ہے تو صفات میں کیسے برابری ہوگی ___ ؟ صفات میں سے علم بھی ہے تو علم میں برابری کیسے ہوگی؟

یہ ناممکن اور محال ہے۔ خود قرآن کریم بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہا ہے، حدیث بھی اس کے خلاف دعویٰ کر رہی ہے۔ تو یہ عجیب چیز ہے کہ ان کے دعویٰ کے مطلب کی ایک شق کو بیان کیا جائے۔ اور وہ اس کو ہمارے سر تھوپیں ___ بھائی! تمہارا یہ دعویٰ تھا اور اس کی وضاحتیں تھیں۔ تم دونوں کا انکار کر دو۔ بس ٹھیک ہے ___ ہم کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام "اعلم الخلائق ہیں" باقی تمام مخلوقات کا علم مل ملا کر ایسا بھی نہیں ہے جیسے سمندر کے سامنے چڑیا کے چونچ کی تری ہوتی ہے ___ لیکن یہی نسبت حضور علیہ السلام کے علم کو اللہ کے علم کے ساتھ ہے۔

نماز کے بعد مصافحہ

سوال : نماز کے بعد مصافحہ کو منع کرتے ہیں؟

جواب : اور نماز کے بعد مصافحہ کو واجب کس نے کیا ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ کسی جائز چیز کو اگر آپ واجب سمجھیں گے تو منع نہیں کیا جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا ___ نماز کے بعد مصافحہ کرنا نماز کی سنتوں میں

داخل نہیں، سُنن وضو میں داخل نہیں، سنن دعا میں داخل نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے کوئی لازمی چیز نہیں۔ اتفاقاً کرلیا تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ کبھی عقیدت ومحبت میں کرلیا تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو نہ کرے اس کو آپ ملامت کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے واجب جانتے ہیں۔ تو جو چیز واجب نہ ہو آپ اسے واجب جان کر کرنے لگیں تو روکا نہیں جائے گا تو اور کیا کیا جائے گا؟

تو یہ ساری باتیں وہی تو ہیں کہ جس چیز کو اللہ جائز قرار دیں اسے جائز رکھو۔ جسے واجب قرار دیں اسے واجب رکھو۔ جسے حرام قرار دیں اسے حرام رکھو۔ واجب کو جائز بنادے اور جائز کو واجب بنادے۔ اس کا آپ کو حق نہیں۔ مصافحہ کرنا جائز ہے ــــ لیکن نہ کرنا بھی جائز ہے جائز کے معنٰی یہ ہوتے ہیں کہ جب کرو جب بھی مضائقہ نہیں۔ نہ کرو تب بھی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی کرنے پر زور دینے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے واجب جانتا ہے۔ تو اسے روکا جائے گا اگر نہ کرنے پر زور دینے لگے تو اسے بھی روکا جائے گا۔ کیونکہ اسے ترک پر زور دینے کا حق نہیں، اللہ نے برابر رکھا ہے۔ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں، نہ کرے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ روکنا فرض بنا کر کرنے سے ہے اور سُنن نماز سمجھ کر کرنے سے روکتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم نے مصافحہ کو رواج سمجھ لیا ہے اور جہاں کسی نے رواج سے روکا وہ کافر ــــ تکفیر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ضروریات دین کا جو انکار کرے وہ کافر ہے۔ تمہارے مصافحہ کو روک دیا وہ کافر، کھانا پکانے کو روک دیا وہ کافر ــــ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس مصلحت سے روکا ہے۔ کون سی حد بندی کے لئے روکا، اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح تکفیر کرنا یہ آپ کے لئے بھی جائز نہیں۔

نماز کے بعد دُعاء ثانیہ

سوال : نماز کے بعد دعاء ثانیہ کو منع کرتے ہیں۔

جواب دعاء ثانیہ کے لازم ہونے کو منع کرتے ہیں۔ جائز ہونے کو تو منع نہیں کرتے۔ دعاء ثانیہ اگر اتفاق سے کوئی کرے اور ثانی کیا چیز ہے۔ کوئی دس دفعہ کرلے، چار دفعہ کرلے۔ کوئی مضائقہ نہیں ــــ لیکن اس کو اس طور پر لازم قرر دے کہ جو نہ کرے تو اسے کہے کہ یہ غلط آدمی ہے۔

اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اسے لازم سمجھتے ہیں۔ تو یہ لازم تو نہیں۔ غرض جواز ہے، لزوم نہیں۔ جواز کو منع نہیں کیا جاتا، لزوم کو منع کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حررۂ ۸-۵-۱۲ھ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

افادات علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز
کے علمی جوابات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

قرآن حکیم اور انسانی نفسیات

ظاہر بات ہے کہ آیت میں ظاہری پاکی وناپاکی تو مراد نہیں ہے کہ جس کے کپڑے پاک ہوں وہ تو **طیبین** میں داخل ہو گیا اور جس کے کپڑے ناپاک ہوں وہ **خبیثین** میں داخل ہو گیا **طیبین وخبیثین** بلحاظ عقائد واعمال اور افکار کے مراد ہیں کہ **طیبین** وہ ہیں جن کے عقائد بھی درست‘ اعمال بھی درست اور جن کا فکر بھی درست اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ **خبیثین** میں داخل ہے۔

اور اگر انبیاء علیہم السلام کی بھی اولاد ہو اور وہ کفر میں مبتلا ہو وہ **خبیثین** میں شامل ہوگی‘ **طیبین** میں شامل نہیں ہوگی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمادیا گیا :

اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ ۔

وہ آپ کے اہل میں سے نہیں‘ آپ کا اہل وہ ہے جو آپ کا مطیع ہو۔ جیسے کہ حدیث میں آپؐ نے ارشاد

فرمایا :

من اطاعنی فھو الی۔

جو میری اطاعت کرے گا وہ میری آل اولاد میں داخل ہے۔ جو اطاعت نہیں کریگا وہ آل اولاد سے خارج ہے ___ یہاں پر نسبی اولاد مراد نہیں' روحانی اولاد مراد ہے جو میرے دین پر ہو اور اس دین پر چلے وہ میری اولاد ہے۔

اور بعض روایات میں آپ ؐ نے فرمایا بھی ہے کہ :

انا لکم بمنزلۃ الوالد ۔

"میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں"۔

اس سے بھی نسبی باپ مراد نہیں بلکہ نسبتی اور روحانی باپ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو میرا دین پہنچا اور وہ اس پر چلا تو میں اس کے حق میں باپ ہوں اور وہ میرے حق میں اولاد ہے اور جو اس سے نکل گیا نہ میں اس کے حق میں باپ ہوں اور نہ وہ میرے حق میں اولاد ہے۔ یہی معنی طیب وخبیث کے ہیں کہ جو اس فکر وعقیدے اور عمل سے خارج ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ جو ان میں داخل ہے وہ طیبین میں داخل ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جو طیبین میں داخل ہیں۔ وہ دین پسند ہیں۔ وہ طیبات ہی کو پسند کریں گے کہ ان میں بھی دین ہو ___ کوئی نیک صالح یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی فاحشہ آجائے یا بدکردار آجائے بخلاف خبیثین کے جو خبث میں مبتلا ہیں انہیں عورتیں بھی وہی پسند ہوں گی جو خبث میں مبتلا ہوں۔ ___ پاک صاف اور طاہرات ہوں تو ان کی طبیعت کبھی رجوع نہیں کرے گی اس لئے کہ دلوں کے اندر خبث بھرا ہوا ہے تو یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو قرآن نے اٹھایا ہے کہ نیک آدمی نیک چیزوں کی طرف توجہ کرے گا اور بد آدمی بدچیزوں کی طرف ___ وہ چیزیں عورتیں ہوں یا اشیاء ہوں جب دل میں بدی ہے تو بدی ہی پسند آئے گی ___ دل میں پاکی ہے تو پاکی ہی پسند آئیگی۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان کی طبائع ہی پاک پیدا کی گئیں ہیں بالطبع جب نبیؑ کی طبیعت چلے گی خیر کی طرف چلے گی۔ شر کی طرف کبھی نہیں جائے گی' اس لئے کہ بنیاد پاک ہے ___ اسی طرح سے اگر ان کے طفیل سے کسی کی بنیاد پاک ہے۔

یا ریاضت ومجاہدہ سے اپنی طبیعت پاک کرلی تو وہ پاک ہی چیزوں کو پسند کرے گا' ناپاک چیزوں کو کبھی نہیں پسند کرے گا ___ غذا بھی ہو تو پاک غذا پسند کرے گا' ناپاک نہیں' لباس ہو تو جائز لباس پسند کرے گا' ناجائز کبھی نہیں۔ ہر چیز میں یہ اصول چلے گا' کیونکہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔

یورپ کے ایک ریفارمر نے لکھا ہے کہ قرآن کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے جس نے نفسیات سے بحث کی ہے اور کتابوں میں احکام دیئے گئے ہیں۔ یہ ناجائز ہے یہ حلال ہے یہ حرام ہے اور قرآن کریم نے صرف حلال وحرام بیان نہیں کیا' حلال تک پہنچے کا جو نفسیاتی طریقہ ہے ادھر بھی توجہ دلائی ہے' حرام تک پہنچنے کے جو نفسیاتی اصول ہیں ان کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات

جیسے مثلاً ایک حدیث ہے جو قرآن کریم کی شرح ہے۔ اس میں فرمایا گیا' صحابہؓ کا مجمع تھا' آپؐ نے فرمایا

کیف بکم اذا فسق فتیانکم وطغیٰ نسائکم۔

لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تمہارے نوجوان فاسق وفاجر بن جائیں گے اور عورتیں آزاد ہو جائیں گی اور تمہارے کہنے میں نہیں رہیں گی۔

صحابہؓ تو خیر القرون میں ہیں۔ ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ حیران ہوئے عرض کیا' یا رسول اللہ! کیا یہ ہو جائے گا۔؟

قال نعم واشد ۔

''یہ بھی ہو گا اور اس سے زیادہ سخت بات ہو گی''۔

کیف بکم اذا لم تامروا بالمعروف ولم تنتهوا عن المنکر۔

اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب اچھی باتوں کی نصیحت چھوٹ جائے گی اور بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے گا ___ تو صحابہؓ میں حیرانی پیدا ہوئی کہ یہ کیسے ہو گا۔ وہ تو پاک زمانہ ہے' رات دن معروفات میں ہیں۔ بدی کا تو ان کی ذہنوں میں تصور بھی نہیں آتا۔ تو حیران ہوئے اور عرض کیا :

وان ذلک لکائن یارسول اللہ۔

''یا رسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟''

قال نعم واشد ۔

''یہ بھی ہو گا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہو گا''۔

کیف بکم اذا امرتم بالمنکر اونهیتم عن المعروف۔

''اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب منکرات کی تو ہدایت کرنے بیٹھ جاؤ گے اور معروفات کے روکنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے''۔

اب تو صحابہ کرامؓ کا پہلے سے بھی زیادہ تحیر بڑھا اور عرض کیا۔

وان ذلک لکائن یارسول اللہ؟

''یا رسول اللہ! ایسا بھی ہو جائے گا''۔

قال نعم واشد ۔

''یہ بھی ہو گا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہو گا''۔

کیف بکم اذا رایتم المعروف منکرًا والمنکر معروفاً۔

اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا کہ اچھی چیزوں کو تم برا جاننے لگو گے اور بری چیزوں کو اچھا جاننے لگو گے۔ یعنی فہم ہی الٹ جائے گا کہ اچھی چیزیں بری نظر پڑیں گی اور بری چیزیں دلوں کے اندر اچھائی بن جائیں گی۔

تو اس حدیث میں درجات بتلائے گئے ہیں کہ سب سے پہلے عمل سے ابتداء ہوتی ہے کہ عملی طور پر آدمی فسق وفجور' اور تعدی وزیادتی کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ عمل خراب ہوتا ہے۔ نوجوان فاسق وفاجر ہو گئے' عورتیں سرکش اور آزاد بن گئیں۔ خاوند کی سنتی ہیں نہ باپ کی سنتی ہیں نہ اولاد کی سنتی ہیں۔ جو ان کے جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ تو یہ عملی خرابی ہے۔

عملی خرابی جب جڑ پکڑ جاتی ہے تو نصیحت کا کارخانہ رک جاتا ہے۔ نصیحت کرنے والے کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کہدیا کہ تمہارا عمل نہیں ہے تو تم کس منہ سے نصیحت کر رہے ہو۔ تو نصیحت کا لیاظ نہ رہے گا۔ تو نصیحت رک جائے گی' تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو گیا۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اچھی باتوں سے روکنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور بری باتوں کی ہدایت کرنے

کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور چوتھا مقام فہم کے الٹ جانے کا ہے کہ جو اچھائی کی چیزیں ہیں وہ بری بن جائیں اور جو بری کی چیزیں ہیں وہ اچھی نظر آنے لگیں۔

یہاں آکر فہم کا الٹاپن ظاہر ہوتا ہے۔ غرض خرابی پہلے عمل سے شروع ہوتی ہے۔ پھر عقیدے پر، پھر نصیحت پر، پھر عقل و فہم پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ انجام کار آدمی الٹا چلنے لگتا ہے قلب میں زیغ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب یہ نفسیاتی اصول ہے کہ عمل اول بگڑے گا، فکر بعد میں بگڑے گا، عقیدہ اس کے بعد میں بگڑے گا اور پھر فہم الٹ جائے گا ___ تو فقط یہ نہیں فرمایا کہ برائی سے بچو۔ برائی سے بچنے کا نفسیاتی راستہ بھی بتلادیا کہ عمل کی حفاظت کرو تاکہ فکر محفوظ رہے۔ فکر کی حفاظت کرو تاکہ عقیدہ محفوظ رہے ___ عقیدے کی حفاظت کرو تاکہ فہم میں کجی نہ پیدا ہو۔ تو یہ ایک سلسلہ ظاہر فرمایا۔

تو یورپ کے ریفارمرنے یہی کہا کہ دنیا کی ساری کتابوں میں احکام موجود ہیں، قرآن کریم میں احکام کے ساتھ نفسیات سے بحث کی گئی ہے۔ جو کسی کتاب میں نہیں کی گئی۔ فطرت کے راستے دکھلائے گئے۔

اب جب قرآن کریم کی تعلیم ہی چھوٹ جائے تو احکام کیسے معلوم ہوں۔ احکام نہ معلوم ہوں تو عقائد کیسے درست رہیں۔ عقائد درست نہ ہوں تو فکر کیسے صحیح رہے اور جب فکر صحیح نہیں رہے گا، الٹا ہو جائے گا ___ تو دل ہی الٹ جائیں گے۔

اسی کو فرمایا گیا :

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۔

"بہت سے وہ لوگ ہیں جو مومن ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ شرک میں مبتلا ہیں ایسی تو وہ مقام ہے"۔

گائے علامت حیات ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ گائے ذبح کرکے اس میت سے ملاؤ، وہ زندہ ہو گا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہو ___ فرمایا ___

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔

"مذاق مسخرہ ہم نہیں کیا کرتے۔ میں تو وحی الٰہی سے کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا اس کی شان کیا ہوگی؟"

فرمایا :

"وہ نہ بوڑھی ہو نہ بن بیاہی بلکہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہو"۔

انہوں نے کہا رنگ کیا ہو گا؟

صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۔

نہایت زرد خوش رنگ جو نگاہوں کو خوش کرتی ہوگی اور یہ کہ وہ نہ کسی کھیتی میں جڑی ہوئی ہو نہ کسی محنت میں لگی ہوئی ہو۔ یہ ساری شانیں ایک ہی گائے میں پائی جاتی تھیں، وہ ایک صالح آدمی کی ملک تھی، اس

کا انتقال ہوگیا۔ اس کے یتیم بچے تھے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بس یہی ایک گائے تھی۔
سارے بنی اسرائیل جمع ہو کر وہاں پہنچے اور کہا کہ اس گائے کی کیا قیمت ہے؟
اس نے کہا اس کو ذبح کر کے اس کی کھال بچھائے دیتا ہوں، اس میں سونا بھر دو، تو لاکھوں روپے کا سونا ان کو ملا۔ تو اس کو ذبح کر کے اس کو میت سے ملایا گیا، وہ زندہ ہوا اس نے قاتل کا پتہ دیا، غرض گائے علامت حیات ہے۔

سامری نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دریائے نیل میں فرعونی غرق ہوئے۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام مع بنی اسرائیل کے پار ہوگئے۔ پانی کی دیواریں کھڑی ہوگئیں اور پانی رک کر بارہ راستے بن گئے اور بارہ قبیلے اس سے گزرے جو ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے ___ فرعون جب نکلا تو ہامان نے کہا کہ آپ کے اقبال سے دریا میں راستے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرا اقبال ہے۔ یہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ ہے۔
مگر وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دوسرا زیرِ گھوڑی یعنی مادہ پر سوار تھا۔ وہ گھوڑی جو تھی آگے بڑھی، گھوڑا بھی لپک کے اس کے پیچھے پڑا۔ اور وہ دریا میں کود گئے، تو یہ سارے قبطی کودے اور وہاں غرق ہوگئے۔
اس کے بعد سامری نے دیکھا کہ جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کے سم کے نیچے اگر خاک بھی ہوئی تو سبزہ اگ آتا تھا۔ اس نے سمجھا کہ اس میں حیات کا مادہ ہے۔ اس نے چٹکی اٹھا کے رکھ لی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے زیوارت جمع کرو، سونے چاندی کے زیورات جمع کر کے اس کا بچھڑا بنایا۔ اس میں وہ خاک پھونکی تو کودنے لگا اور اس میں آواز بھی نکلی۔
اس نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) خدا کو دیکھنے وہاں گئے۔ خدا تو معاذ اللہ یہاں آگیا۔ وہاں سے گو (گاؤ) کی پوجا شروع ہوئی۔

ہندوستان میں جو گاؤ پرستی کی وبا آئی ہے تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چند بنی اسرائیل جو مرتد ہوگئے تھے۔ بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں۔ تو جو کلمات حقہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے سنے ہوئے تھے ان میں کچھ اپنی چیزیں مل بلا کر لوگوں کو سمجھایا تو وہاں سے گوسالہ پرستی شروع ہوگئی ___ بہرحال اتنی بات معلوم ہوئی گائے جو ہے اسے حیات سے مناسبت ہے ___ اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا دودھ نہیں ہوتا تو بچوں کو گائے کا دودھ پلواتے ہیں۔ اس کے اندر وہی مادہ ہے یعنی حیات آفرینی جو ماں کے دودھ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے خواب میں گائے وغیرہ دیکھنا انشاء اللہ حیات کی علامت ہے۔

تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت

تعبیر خواب کا تعلق کچھ موسموں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ دیکھنے والے کی صفات سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کا بھی تعلق ہوتا ہے تو معبر اگر صحیح ہے تو وہ قواعد کی رو سے تعبیر دے گا، اسی لئے حکم ہے کہ ہر ایک سے خواب مت کہو جو پہلے تعبیر دے دے گا وہی واقعہ ہو جائے گا۔ اسی لئے سمجھ دار اور خیر خواہ سے خواب کہو تاکہ وہ اچھی تعبیر دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ وہ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ ایک بہت بڑا دنبہ جو گائے کے برابر ہو، ان کے مدمقابل آیا۔ تو مولانا نے اس کے سینگ پکڑ لئے۔ اب کبھی وہ ریلتا ہے تو یہ پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی یہ ریلتے ہیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی مقابلہ میں اس نے مولانا کے سینگ مارا تو مولانا کی بائیں ران میں لگا اور ایک قطرہ خون کا نکلا۔ یہ خواب دیکھا۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ صبح کو خواب کی تعبیر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ بھائی صاحب! میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو حضرتؒ نے اپنے اصول کے مطابق فرمایا۔

"موت کو دنبے کی شکل (قیامت میں) دی جائے گی۔ تو موت سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ کبھی تم اسے ہٹا دیتے ہو کبھی وہ تمہیں ہٹا دیتا ہے ___ جو سینگ بائیں ران پر لگا اور قطرہ خون کا نکلا ___ اس کے بارے میں فرمایا کہ عرب کا محاورہ ہے کہ جدی رشتوں کو بطن سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ بطون کا اور پیٹ کا رشتہ ہے اور بنی اعمام جو چچا تائے کی اولاد ہے ان کو **افخاذ** سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ران کی اولاد ہے یہ عرب کا ایک محاورہ ہے ___ فرمایا کہ بائیں ران میں جو سینگ لگا تو "ران" سے میں یہ سمجھا کہ بنی اعمام میں کوئی حادثہ پیش آئے گا چونکہ ایک قطرہ خون کا نکلا تو آپ کی چچا تائے کی اولاد میں چھوٹی عمر کا بچہ گزر جائیگا اور چونکہ عورت بائیں پسلی کی پیدائش ہے اور بائیں جانب خون لگا تو وہ لڑکی ہوگی اور چونکہ ایک قطرہ خون ہے تو لڑکی چھوٹی عمر کی ہوگی"۔

جب وہ تعبیر دی تو تھوڑی دیر میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں جو آپ کی چچازاد بھائیوں میں بچی پیدا ہوئی تھی وہ گزر گئی ___ فرمایا تعبیر آ گئی ___ تو تعبیر میں گویا احادیث کا بھی دخل ہوا۔ جیسا کہ حدیث شریف سے انہوں نے استنباط کیا۔ اس لئے تعبیر دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔

اسی طرح تعبیر خواب میں اختلاف موسم کو بھی دخل ہے تو معبر پہچانے گا اور موسم کے لحاظ سے تعبیر دے گا۔

تعبیر خواب میں اعداد و شمار کا دخل

اسی طرح اعداد و شمار کا بھی دخل ہے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ جب مرض وفات میں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور تمام علماء کا حلقہ بہت پریشان تھے مگر مولانا نے اطمینان دلایا کہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوگا۔ اب مطمئن تو ہو گئے مگر انتقال ہو گیا ___ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انتقال نہیں ہوگا اور انتقال ہو گیا۔ فرمایا:

"میاں! کشف تو صحیح تھا۔ تعبیر میں غلطی ہوئی۔ فرمایا، جب میں نے مراقبہ کیا تو لفظ "مہدی" میرے سامنے نمایاں ہوا اور مہدی کے جو اعداد و شمار ہیں وہ ساٹھ سے بھی اوپر پہنچتے ہیں اور مولانا کو جو مرض لاحق ہوا تو عمر انچاس سال کی تھی۔ تو میں نے کہا۔ ابھی عمر کافی باقی ہے ___ لیکن اس سے مراد لفظ مہدی نہیں تھا بلکہ مہدی کی ذات مراد تھی چنانچہ حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ کی عمر ۴۹ سال کی ہوگی۔ غرض ذات مراد تھی۔ نام مراد نہیں تھا۔ اس لئے تعبیر میں غلطی ہوئی ہے۔ کشف میں غلطی نہیں تھی"۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کشف میں اعداد و شمار کو بھی دخل ہے۔ اس لئے معبر کو بہت سی چیزیں دیکھنی ہوتی ہیں۔ آیات و احادیث سے استدلال، موسمی اختلاف کو سامنے رکھنا۔ اعداد و شمار کا خیال رکھنا ___ بہرحال یہ ایک مستقل فن ہے جو معبر ہی جانتا ہے۔ اس لئے خواب ہمیشہ کسی ایسے آدمی سے ذکر کرنا چاہئے

جس کو اس عالم شہادت سے بھی مناسبت ہو اور عالم مثال سے بھی ہو تو وہ مطابقت اور تطبیق دے کر تعبیر دے سکتا ہے۔

روحانی لحاظ سے رحمت نبویؐ کے عالمگیر آثار

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت عامہ ہونے کی بڑی دلیل تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا :

اول ما خلق اللّٰہ نوری۔

"اللہ نے سب سے پہلے میری حقیقت پیدا فرمائی"۔

اب ظاہر بات ہے کہ "نور" سے مراد حسی نور تو نہیں ہو سکتا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے جیسے چاند اور سورج کا نور اور حسی نور کی نور معنوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اپنے نور اور روشنی سے صورتیں اور شکلیں دکھاتا ہے اور نور علم سے اشیاء کی حقیقتیں اور ماہیتیں کھلتی ہیں۔ اس لئے علم کا نور' آفتاب وماہتاب کے نور سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اول میرے نور کو پیدا کیا۔ کہ وہ "نور علمی" ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوند دیا گیا اور آپ کو "مجسم علم" بنایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی شریعت کے ہر ہر حکم کے نیچے حکمت ہے۔ ہر حکمت کے نیچے حقیقت ہے ہر حقیقت کے نیچے علت ہے جس پر حکم کا مدار ہے۔ اس طرح پوری شریعت علم سے لبریز ہے۔ حتیٰ کہ معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا ___ جہاں ہزاروں معجزات دیئے گئے جن کا اثر آسمانوں میں بھی ظاہر ہوا' زمین میں بھی ظاہر ہوا' حجر و شجر اور حیوانات میں بھی ظاہر ہوا اس لئے حیوانات نے بھی آپؐ کی نبوت کی شہادت دی۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزات کا اثر آسمان تک پہنچا۔ غرض یہ معجزات تو ایک طرف ہیں لیکن سب سے بڑا معجزہ آپؐ کو عطاء کیا گیا یہ علمی اور کلامی معجزہ ہے جو قرآن کریم ہے جو اپنی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے' اپنی جامعیت احکام کے لحاظ سے غرض ہر اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے ___ تو حقیقت میں علم گوند دیا گیا اور معجزہ علمی دیا گیا' تو آپؐ سرتاپا علم ہیں ___ ظاہر بات ہے کہ علم ہی سے دنیا چل رہی ہے۔ حق تعالیٰ کے علم و حکمت اور مشیت ہی پر یہ سارے کاروبار اور کارخانے چل رہے ہیں۔ اس لئے علم اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔ ویسے تو ساری صفات ان کی بلند ہیں مگر علم سب سے اونچی صفت ہے۔ اس واسطے کہ ہر صفت اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہے۔ مثلاً ارادہ ہے تو اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک مراد معلوم نہ ہو۔ قدرت ہے جب تک مقدور معلوم نہ ہو اس پر قدرت کیسے حاصل ہوگی؟ تو ارادہ وقدرت علم کا محتاج ہوا ___ فعل ہے جب تک علم نہ ہو وہ سرزد نہیں ہو سکتا ___ لیکن علم اپنا کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔ نہ ارادے کا نہ قدرت کا ___ مثلاً آپ ریل میں جا رہے ہیں اور ایک بڑا دریا نظر پڑے۔ تو ارادہ کریں تب معلوم ہو کہ یہ دریا ہے۔ ارادہ نہ کریں تب معلوم نہ ہو یہ دریا ہے۔ وہ تو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے علم اپنا کام کرنے میں ارادے کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے قدرت کا محتاج نہیں کہ اس تالاب پر آپ کو قدرت ہو جائے۔ تو معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے۔ ورنہ معلوم نہ ہو' قدرت ہو نہ ہو جب سامنے آئے گا تو علم ہو جایا کرے گا۔

غرض ہر صفت علم کی محتاج ہے کہ وہ علم کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ علم کسی صفت کا محتاج نہیں' بلکہ غنی

ہے' اس لئے ساری صفات اور سارے کمالات علم ہی کے تابع ہیں ___ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوندھ دیا گیا' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبوت اور ولایت آپ کی محتاج ہے' آپ اس کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے علمی اور عملی کمالات دیئے ہیں۔ اگر ایک بھی ولی دنیا میں نہ ہو آپ کے کمالات بدستور ہیں۔ اگر ایک بھی صحابیؓ نہ ہوتا آپ کے کمالات بدستور تھے۔ غرض آپ کے علمی کمالات کسی چیز کے محتاج نہیں' آپ کے اندر غناء ہے جبکہ ہر چیز علم کی محتاج ہے۔ جب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز' حلال ہے یا حرام۔ تو یہ آپ ہی کے بتلانے سے پتہ چلے گا۔ غرض ساری دنیا محتاج ہوئی حتیٰ کہ نبوتیں بھی محتاج ہوئیں۔

گویا آپ کی نبوت جو ہے وہ ذاتی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں آپ کی نبوت کے تابع ہیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان ہے تو آپ کے فیضان سے پچھلوں میں تو نبوتیں پیدا ہوئیں اور اگلوں میں ولائتیں پیدا ہوئیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی محتاج اور اولیاء بھی محتاج ___

یہی وجہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ کی اقتداء کی اور آپ کو امام بنایا گیا ___ اور اس میں انبیاء علیہم السلام نے تقریریں کیں۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا مجھے اللہ نے "صفی اللہ" بنایا اور مجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا' مجھے اولاد دی تو دنیا اولاد سے بھردی ___ یہ میرے فضائل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے اللہ نے کلام کیا۔ مجھے متکلم بنایا' کلام کی توفیق دی اور طور پر مجھ سے بات چیت ہوئی' مجھے اور میرے ماننے والوں کو بحر قلزم میں نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ غرض انہوں نے یہ اپنے فضائل بیان کئے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ملک دیا کہ کسی کو ویسا ملک نہیں ملا۔ ہواؤں پر مجھے قدرت دی' جانوروں پر مجھے قدرت دی' سب میری رعایا میں داخل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ مجھے اللہ نے "روح اللہ" بنایا' مجھے بلا باپ کے قدرت سے پیدا فرمایا ___ جب یہ سب بیان کر چکے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل بیان فرمائے کہ مجھے "رحمۃ للعالمین" بنایا' مجھے "شفیع المذنبین" بنایا۔ مجھے "خاتم النبیین" بنایا ___ میری نبوت کو اصلی بنایا اور نبوتیں تابع کیں۔ تو سب نے کہا کہ یہی وجہ ہے اور بنیاد ہے کہ آپ سارے انبیاء علیہم السلام پر افضل ہیں ___ غرض پہلی رحمت تو یہی ہے کہ دنیا میں ہر کمال آپ کے نور کی وساطت سے پیدا کیا گیا' دنیا میں کچھ ہے وہ کمال ہی سے چل رہا ہے۔ نقصان اور عیب سے دنیا نہیں چل رہی اور کمالات سارے علم کے تابع ہیں۔ تو آپ کے علوم سے ازل سے لے کر ابد تک روشنی پھیلی۔ تو پہلی رحمت تو یہی ہوئی۔

مادی لحاظ سے رحمت نبوی کے عالمگیر آثار

دوسرے یہ کہ حافظ ابن کثیرؒ محدث نے روایت نقل کی ہے کہ :

لولاک یا محمد لما خلقت اٰدم ۔

اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گویا پیدائش اور وجود درحقیقت آپ کے طفیل میں ہوا۔ تو وجود اور زندگی کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تو جب وجود سب سے بڑی نعمت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا کیا کلام ہو سکتا ہے ___ غرض مادی اعتبار سے دیکھا جائے تو وجود کی دولت آپؐ کے طفیل میں بٹی ___ روحانی نعمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کمالات علمی آپؐ کے طفیل سے پیدا ہوئے۔ تو مادی لحاظ سے بھی آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ روحانی طور پر بھی آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔

عالم آخرت میں رحمت نبویؐ کے عالمگیر آثار

پھر یہ کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کا مقام آپؐ ہی کو دیا جائے گا۔ تمام امتوں کے صلحاء کے لئے آپؐ شفاعت کریں گے۔ میدان محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے اور زمین پر ساری مخلوق اس طرح سے ہوگی کہ نہ جھک سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں ___ اور آفتاب کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوگی' لوگ پسینے میں غرق ہوں گے ___ اور اس طرح چالیس برس کا عرصہ گزر جائے گا اس وقت لوگوں کے دلوں میں آئے گا کہ کسی سے شفاعت کراؤ' تو آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ :

"اللہ نے آپؐ کو ہم سب کے لئے باپ بنایا۔ باپ کی شفقت والفت معلوم و متعین ہے۔ آپؐ ہماری سفارش کریں کہ اس مصیبت سے نجات ملے"۔

وہ فرمائیں گے :

لست لھا۔

"میں اس کا اہل نہیں ہوں"۔

میں نے ایک غلطی کی تھی ___ گو وہ معصیت تو نہیں کی تھی مگر ایک لغزش تھی' جس درخت کی ممانعت کی گئی تھی وہ کھالیا تھا۔

اور معصیت یوں نہیں تھی کہ معصیت حکم کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کی ___ شیطان نے اس میں تاویل سکھائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کو دوامی زندگی ملتی ہے۔ تو یہ ممانعت جو تھی وقتی تھی۔ آپ میں اس وقت تک اتنی استعداد نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے استعداد پیدا ہوگی' اب کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔

تو تاویل کے راستے سے کھایا اور تاویل کے راستے سے کوئی کام کرنا معصیت نہیں ہوتا' خطاء فکری اور خطاء اجتہادی ہوتی ہے اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں ہوتی ___ اس لئے کہ مجتہد اگر صواب کرے تو دوہرا اجر ملتا ہے۔ خطا پر ایک اجر ملتا ہے ___ تو معصیت پر اجر تھوڑا ہی مل سکتا ہے؟ اس لئے معصیت تو نہیں تھی۔ خطاء فکری واجتہادی تھی۔ وہ مجھ سے سرزد ہوگئی۔ تو اسے پیش کریں گے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے کہ میں اللہ سے جاکر تمہاری سفارش کروں۔ میں اس کا اہل نہیں' تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

پھر لوگ نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے وہ بھی عذر کر دیں گے کہ :

لست لھا ۔

"میں اس کا اہل نہیں"۔

میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کو بلالیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا :

اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ ۔

"جب یہ کفر میں مبتلا ہے تو تمہاری اولاد نہیں رہا"۔
تمہاری اولاد وہ ہے جو تمہاری مطیع ہو۔ جب یہ مطیع نہیں ہے تو تمہارا اہل نہیں ہے۔

اِنِّیْ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ۔

حق تعالیٰ نے فرمایا۔ جاہلوں کی سی باتیں مت کرو، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ تو نوح علیہ السلام نے اسی وقت استغفار کیا ___ تو نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ مجھے سے یہ خطاء سرزد ہوئی تھی۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں سفارشی بن کر جاؤں اگر مجھے فرمایا کہ تم نے تو غلطی کی تھی تمہاری شفاعت کا کیامنہ ہے تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا ___ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ ___ ___ وہ بھی عذر کردیں گے کہ لست لھا میرے سے فلاں لغزش ہوگئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے میں نے ایک قبطی کو تھپڑ مارا تھا۔ اس کی گردن اڑگئی حالانکہ وہ خطاء عمداً نہیں کی تھی کہ اسے قتل کیا ہو مگر نبی کا ہاتھ اتنا قوی ہوتا ہے وہ تلوار سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑگئی۔ اس لئے میرا منہ نہیں ہے کہ میں جا کر سفارش کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے قتل کیا تھا ___ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں ___ مگر جب لوگ ان کے پاس آئیں گے تو وہ فرمائیں گے۔ لست لھا میں اس قابل نہیں ہوں ___ میری قوم نے مجھے خدا اور اس کا بیٹا کہا ___ اگر یہ فرمادیا گیا کہ اچھا آپ وہی ہیں جنہیں ہماری مسند پر خدا بنا کر بٹھایا گیا تھا؟ کیا وہ آپ ہی ہیں جنہیں خدا کا بیٹا کہا گیا تھا؟ حالانکہ اللہ بیٹے اور باپ سے بری ہے۔

میرا منہ اس قابل نہیں کہ میں سامنے ہوں۔ اس لئے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں۔ تو لوگ آپؐ کے پاس حاضر ہوں گے۔ آپؐ فرمائیں گے انا لھا انا لھا میں اس کا اہل ہوں، میں سفارش کروں گا چنانچہ آپؐ مقام محمود پر فائز کئے جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سات دن رات کی لمبی مدت تک میں سجدے میں پڑا رہوں گا اور اللہ کی وہ حمد وثناء بیان کرونگا کہ عالم میں کسی نے نہیں کی ہوگی اور اب میرے دل میں بھی نہیں ہے۔ اسی وقت القاء کی جائے گی۔

مگر اس قدر غنا کا دن ہوگا کہ سات دن آپ سجدے میں رہیں گے اور کچھ نہیں کیا جائیگا ___ سات دن کے بعد فرمائیں گے کہ :

یا محمد! ارفع راسک سل تعطی واشفع تشفع۔

"سر اٹھاؤ۔ سوال کرو ہم عطا کریں گے۔ شفاعت کرو تو ہم قبول کریں گے"۔

غرض پورے عالم میں صلحاء کے لئے خواہ وہ کسی امت کے ہوں آپ شفاعت فرمائیں گے ___ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم اب حساب شروع کرتے ہیں اور جس کا جو ٹھکانہ ہوگا۔ وہ وہاں پہنچ جائے گا۔ غرض یہ شفاعت کبریٰ کا مقام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا۔ اس دن آخرت میں سب اولین و آخرین پر آپؐ کی فضیلت اور آپؐ کی سیادت پورے عالم پر ظاہر ہوگی ___ اس وقت جو منکر کفار ہوں گے وہ حسرت میں پڑیں گے کہ کیوں نہ ہم ایمان لائے ___ تو یہ تیسری "رحمت عامہ" ہے جو پورے عالم پر متوجہ ہوگی۔

رحمت نبویؐ کے ابدی آثار

اسی طرح آپؐ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا میں ہوں گا جو جا کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور کہوں گا کہ

دروازہ کھولو۔ پھر امتیں داخل ہونا شروع ہوں گی۔ گویا جنت میں داخلہ بھی آپؐ ہی کے طفیل میں ہوگا۔ اسی طرح ابد تک آپؐ کی رحمت پہنچی ہوئی ہے۔

رحمت نبویؐ کے ازلی آثار

اور ازل سے رحمت یہ ہے کہ جب عہد الست لیا گیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا الست بربکم۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔؟

ساری مخلوق کو آدم علیہ السلام کی کمر سے نکالا اور جمع کیا اور فرمایا :

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کیا جواب دیں۔ اس لئے کہ آدم کی کمر سے نکلے ہوئے اس وقت کوئی عقل وشعور نہیں تھا اور صفت ربوبیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو حیرانی پیدا ہوگئی تو سب سے پہلے آپؐ نے ہی جواب دیا کہ ___ بلیٰ ___ کیوں نہیں۔ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔

آپؐ کے جواب دیتے ہی تمام انبیا علیہم السلام کی زبان پر جاری ہوگیا۔ بلیٰ بلیٰ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ اس کے بعد ساری مخلوق نے زبان سے کہا بلیٰ آپ ہمارے رب ہیں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں تمہارے باپ کو گواہ کرتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا اس آسمان وزمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا۔ اور اس ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے اقرار کیا ___ جب تم دنیا میں پہنچو تو اس اقرار کو یاد رکھنا اور میرے رب ہونے کو ماننا اور میری تقدیر پر راضی رہنا ___ غرض اس وقت سب نے بلیٰ کا لفظ اختیار کیا اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اختیار کیا۔

تو رحمۃ للعالمین ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے جواب دینے کے قابل جب ہوئے جب آپ نے جواب سکھلایا ___ تو حق تعالیٰ نے تو تعلیم کے ذریعے سے ربوبیت کا اقرار کرایا۔ اس لئے رحمت عامہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے؟ ___ غرض ازل میں بھی رحمت، دنیا میں تشریف لائے تب رحمت، برزخ میں پہنچیں گے تب رحمت، شب معراج میں پہنچے تب رحمت، قیامت کے دن شفاعت کبریٰ ہوگی تب رحمت اور :

اول من یدق باب الجنۃ ۔

"کہ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے"۔

تب رحمت ___ غرض اول سے لے کر آخر تک رحمت ہی رحمت ثابت ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں بلکہ فرمایا آپ "رحمۃ للعالمین" ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے ملائکہ کے لئے بھی رحمت، عالم جنات کے لئے بھی رحمت، عالم حیوانات کے لئے بھی رحمت اور عالم بشر کے لئے بھی رحمت۔

غرض جتنے عالم اللہ نے بنائے ہیں سب کے لئے آپؐ رحمت ہیں۔ جب وجود ہی ہر چیز کا آپ کے طفیل میں ہوا تو ہر چیز مرہون منت اور مرہون احسان ہے۔ اس واسطے آپ کی رحمۃ للعالمینی ازل سے چلی اور

ابد تک چلتی رہے گی۔ قیامت پر ختم نہیں ہوگی بلکہ جنتوں میں بھی چلے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔

رتل وارتق۔

''تلاوت کرتا جا اور جنت کے درجات طے کرتا جا''۔

ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم تو آپؐ ہی لے کر تشریف لائے۔ تو مدارج کی ترقی قرآن کریم کے ذریعے ہوئی جو آپؐ کے ہاتھ سے دنیا کو پہنچا۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ قرآن کریم کی جتنی آیات ہیں' جنت کے اتنے ہی درجات ہیں ___ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ یہ جو آیتیں ہیں یہی بعینہ جنت میں درجات کی صورت میں منکشف ہو جائیں گی۔ یہاں یہ آیتیں علمی شکل میں ہیں وہاں جاکر باغ و بہار کی شکل اختیار کریں گی ___ اس کا مطلب یہ نکلا کہ اور قومیں تو جنت میں داخل کی جائیں گی اور مسلم حفاظ کے سینوں میں خود جنت آئی ہوئی ہے۔ جو یہ قرآن کریم ہے۔ اس کی آیات ہی جنت بنیں گی۔

تو یہ سب رحمۃ للعالمین ہی کی شان کا ظہور ہے ___ غرض آپؐ کی رحمت قلوب سے لے کر قوالب تک' ازل سے لے کر ابد تک' دنیا سے لے کر برزخ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسی لئے رحمۃ للعالمین کہا گیا' رحمۃ للعالم نہیں کہا گیا۔ اس میں تمام عالم داخل ہیں۔

اللہ نے سب سے بڑا ہدیہ جو مخلوق کو دیا' وہ آپؐ کا وجود مسعود ہے جو عطا کیا گیا ___ اور اسی لئے فرمایا کہ جب کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئے یا کوئی غم طاری ہو تو وہ میری وفات کو یاد کرے کہ اس سے بڑا صدمہ عالم کے لئے نہیں ہے۔

حقیقت توسل

توسل کا ایک تو مطلب یہ ہے جو دنیا میں ہوتا ہے کہ جو شفاعت کے طور پر کسی کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ حاکم پر اس کا اثر ہے۔ حاکم اس کی بات کو مان لے گا ___ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔ یہ شرک میں بھی داخل ہے۔ حق تعالیٰ پر کس کا اثر ہو سکتا ہے۔ وہ خود مؤثر بالذات ہیں ان پر کون موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وسیلہ کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا ___ یہاں تو توسل کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رحمت سے آپ نے ان لوگوں کو نوازا ہے' اس میں مجھے بھی حصہ عطا فرما دیجئے کہ میں بھی اس رحمت سے نوازا جاؤں۔ وسیلے کے یہاں یہ معنی ہیں تو یہ معنی کہ وہ وسیلے والا حق تعالیٰ پر اثر رکھتا ہے' اس کے دربار میں تو سب بندے ہیں اور سب محتاج ہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جو سب سے زیادہ مقدس طبقہ اور حق تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں لیکن قیامت کے دن صورت یہ ہوگی کہ انبیاء علیہم السلام اس طرح تھرتھرائے ہوئے ہونگے جیسے ___ میدان میں پڑا ہو پتہ۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ تورات کہاں ہے؟ وہ عرض کریں گے میں نے موسیٰ علیہ السلام کو پہنچا دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جائے گا کہ آپ کو تورات پہنچی؟ وہ عرض کریں گے' جی ہاں پہنچی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے۔ میں نے امت کو پہنچا دی ___ غرض موسیٰ علیہ السلام کو جب طلب کیا جائے گا تو

کیفیت یہ ہوگی کہ اس طرح تھراتھرائے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ تھرتھر کانپتا ہے ــــ یہی صورتحال اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوگی۔

اسی طرح سے قرآن کریم کے بارے میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ قرآن کریم کہاں ہے؟

عرض کریں گے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پہنچادیا' تو آپؐ طلب کئے جائیں گے اور پوچھا جائے گا آپ تک قرآن کریم پہنچا؟

آپؐ عرض کریں گے' جی ہاں پہنچا۔

فرمایا جائے گا' آپ نے کیا کیا؟

عرض کریں گے' میں نے امت کو پہنچادیا۔

فرمایا جائے گا کہ اب بیٹھ کر سناؤ ــــ تو آپؐ کے لئے عرش کے نیچے منبر بچھایا جائے گا۔ سارے اولین و آخرین کے مجمع میں آپ پورا قرآن کریم تلاوت فرمائیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اندر ایک تو لفظ ہیں' لفظوں کے نیچے ان کے معانی ہیں۔ معانی کے نیچے ان کی حقائق ہیں۔ حقائق کے نیچے اسرار و مصالح اور **حکمتیں** ہیں۔ یہ سب چیزیں مجسم کر کے نمایاں کی جائیں گی اور قرآن کریم ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک باغ و بہار کھڑا ہوا ہے۔ ہزاروں رنگ کے پھول اس میں کھلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں خوشبوؤں سے معطر ہے ــــ تو لوگ کہیں گے یہ قرآن تو آج تک ہم نے سنا ہی نہیں۔ یہ تو عجیب و غریب قرآن ہے ــــ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ شانہ موجود حضرات انبیاء علیہم السلام موجود' اور ملائکہ علیہم السلام موجود تو روحانیت کی کیا انتہا ہوگی؟ پڑھنے والے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو روحانیت کا کیا مقام ہوگا؟ غرض جو ساری چیزیں علمی طور پر قلوب میں تھیں مجسم ہو کر سامنے آئیں گی۔ تو ایک عظیم باغ و بہار کی صورت میں قرآن نمایاں ہوگا۔ تو صحابہؓ بھی کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے آج تک سنا ہی نہیں تھا۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت انبیاء علیہم السلام کی شان بھی یہ ہوگی کہ وہ مصیبت کی وجہ سے تھرتھرائے ہوئے ہونگے۔ تو پھر میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ اس واسطے توسل کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ صاحب وسیلہ کا اثر اللہ تعالیٰ پر پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی حکومتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تو صرف' توسل کے یہ معنی ہونگے کہ جس رحمت و برکت سے آپ نے ان بزرگوں کو نوازا ہے اس میں ہم غریبوں کو بھی شامل فرمالیجئے' کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے نہ یہ معنی کہ ہم اثر ڈالتے ہیں اور حق تعالیٰ ہماری سفارش سے مجبور ہوجائیں گے۔ حق تعالیٰ جابر ہیں مجبور نہیں ہیں۔ قاہر ہیں مقہور نہیں ہیں۔

مقہور و مجبور تو بندے ہیں۔ اس لئے توسل کے یہ معنی کہ اللہ پر اثر ہو یہ تو شرک ہے اور ایک یہ کہ اس توسل کی نعمت میں ہمیں داخل فرمالیجئے' یہ دعا اور استدعاء ہے یہ عبدیت اور بندگی میں داخل ہے۔ اس توسل میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ توسل کے اس معنی کے لحاظ سے آپ یہاں بیٹھ کر دعا مانگیں' خواہ کسی قبر پر جا کر مانگیں وہ جائز ہے یہاں بھی جائز ہے' قبر پر بھی جائز ہے ــــ قبر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرا یہ کام کردیں اس کی اجازت نہیں ہے لیکن یہ کہ حق تعالیٰ سے مانگے کہ جس نعمت سے آپ نے انہیں نوازا ہے اس نعمت سے مجھے بھی نواز دیجئے۔ اس توسل کی اجازت دی گئی ہے۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟

عید میلاد النبی پر جلوس اور مجلس وغیرہ یہ سارے مظاہرات ہیں جیسے دنیا میں نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی مزاج کے مطابق ہوتیں تو سب سے پہلے صحابہؓ کرتے، تابعین کرتے، ائمہ مجتہدین کرتے ـــــ

لیکن کسی سے منقول نہیں بلکہ چند صدیوں کے بعد یہ مظاہرے شروع ہوئے، ان مظاہروں میں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ بھائی! کرلیا ـــــ لیکن یہ جو نمائشی صورتیں ہیں اور غلو ہے یہ اسلامی مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسری اقوام سے لیا گیا ہے جیسے ہندوؤں میں جلوس نکلتے ہیں۔ ان کے جو مقتدئی ہیں ان کی صورتیں بنا بنا کر اونٹوں پر اور ہاتھیوں پر رکھتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔ اسلام تو حقائق لے کر آیا ہے، صورتوں اور شکلوں کی نمائش لے کر نہیں آیا۔ اپنے اندر حقیقت پیدا کرو۔ نمائش خود بخود ختم ہوجائے گی۔ اسلام کا موضوع تو یہ ہے جو خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں ان میں بھی زیادہ مت الجھو ـــــ اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں اگر صورتوں کے عشق و محبت مبتلا ہوا تو حسن خاتمہ کے اندر فرق پڑجائے گا اس لئے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کا وقت ہے اور آپ صورتوں میں الجھے ہیں تو صورتیں حقیقت سے روکیں گی۔ اس واسطے اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو۔ حقائق کا طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔

اکمال دین کا طریق

سوال اول :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ یہ آیت قرآن میں اپنی جگہ سب سے آخر میں چاہئی ہے، ورنہ اسکی موجودہ جگہ قرآن کے غیر مرتب ہونے پر دال ہوگی؟

جواب :

الیوم سے خاص یوم نزول آیت مراد نہیں، بلکہ مطلقاً دور حاضر مراد ہے اور وہ عام ہے، وقت نزول کو بھی اور نزول آیت کے ماقبل و مابعد کے زمانے کو بھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ "آج بڑا نازک زمانہ ہے" یا "آج لوگوں کو بھلا کام کرنا دشوار ہوگیا ہے" ـــــ "یا آج کا دن تو وہ ہے کہ بھیڑیوں نے بھی انسانوں سے پناہ مانگی ہے" ـــــ ظاہر ہے کہ اس سے یوم تکلم کی تاریخ مراد نہیں ہوتی بلکہ وہ دور مراد ہوتا ہے جس سے متکلم اور مخاطب گزر رہے ہوتے ہیں ـــــ پس یہاں بھی الیوم سے مراد دور حاضر ہے جس سے مخاطبین قرآن گزر رہے تھے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری حصہ نہ کہ خاص یوم نزول آیت۔

چنانچہ اس آیت کے نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جاملے ـــــ اس صورت میں اگر اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی کچھ آیتیں اتریں تو وہ اکمال دین کے منافی ثابت نہیں ہوسکتیں اور نہ ہی دائرۂ اکمال سے خارج ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یوم نزول آیت سے پہلا اور پچھلا سارا دین اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ میں داخل رہے گا۔ گو یہ آیت درمیان میں آجائے اور سب سے اخیر میں نہ رہے۔

تشہیر اکمال دین

رہا یہ کہ اس آیت کے نزول کا وقت کلیۃً آخر میں بلکہ یوم وفات نبویؐ میں کیوں نہ رکھا گیا کہ ظاہر طور پر

اس آیت سے پورے دین کی تکمیل کا اعلان ہو جاتا اور الیوم کے معنی مطلقاً دور حاضر کے نہ لینے پڑتے؟۔

جواب یہ ہے کہ اس آیت سے فقط اکمال دین کی کوئی علمی یا اعتقادی خبر ہی دینی مقصود نہ تھی بلکہ اکمال دین کا پورا پورا اشتہار بھی مقصود تھا اور اس کے لئے یوم نزول سے بڑھ کر دوسرا کوئی وقت موزوں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ یوم عرفہ تھا جس میں حج کے لئے اطراف سے لوگ جمع ہوئے تھے' پھر اوپر سے یوم جمعہ بھی تھا جو خود یوم جامع ہے اور اس پر مزید یہ کہ حج نبوی ﷺ کا دن تھا جس میں ایک لاکھ سے اوپر صحابہؓ کے عدد کی اکثریت حج نبوی ﷺ کی وجہ سے شریک حج ہوئی۔

پس اس یوم جامع میں تمام جمع شدہ مسلمانوں کے روبرو ہیئت اجتماعی کے ساتھ عین وقت اجتماع میں ذات جامع پر یہ آیت اتاری گئی تاکہ بیکدم تمام مسلمین اولین اکمال دین کی اطلاع بھی پالیں اور اس کے نزول کا مشاہدہ کر کے ان کے دلوں میں یہ چیز اتر جائے کہ اب جبکہ یہ دین کامل ہو چکا ہے' تو اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی نیا نبی و دین آنے والا ہے اور نہ آئے ہوئے دین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ ہونے والی ہے پس یہ اکمال دین کی اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ اس کی تشہیر و دعایت اور نزول آیت کا مشاہدہ کرا کر اور علی روس الاشہاد اسے نازل فرما کر یہ خبر شائع بھی کرنی تھی کہ اب نجات کا انحصار اسی دین میں ہے اور بس۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

اکمال دین کے بارے میں ازالۂ تشکیک

اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی دعوئی (اکمال دین) عین یوم وفات نبوی ﷺ میں سب سے آخر میں نازل کیا جاتا تو قطع نظر اسکے بروقت اعلان عام نہ ہو سکنے کے ایک مفسدہ یہ بھی محتمل تھا کہ اگر اس دعویٰ کے اعلان میں کسی کو شبہ پیش آتا اور اس کی وہ شرح سامنے نہ آتی جو نزول آیت کے ۹۰ دن بعد تک ہوتی رہی تو اس شبہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی اور ہو سکتا تھا کہ خود غرض تکمیل دین کے بارے میں شبہات ڈال کر دین کے تمام و کمال کو مشتبہ بنا دیتے اور بعد میں آنے والے تین دجال جو بہ نص حدیث ادعاء نبوت کے ساتھ آنے والے تھے اپنا مطلب یہ کہہ کر نکال لیتے کہ دین کے آخری اور کامل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں کوئی نبی نہ آسکے یا اس دین کے بارے میں کوئی بیان اور شرح بھی نازل نہ ہو سکے لیکن جبکہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور نے ۹۰ دن اس دنیا میں قیام فرمایا اور اکمال دین کی حقیقت بعد کے کلمات سے اور زیادہ واضح فرما دی۔ صحابہؓ بھی اس کا آخری اور مکمل ہونا شرح صدر کے ساتھ سمجھ گئے اور گویا اس کی گنجائش دے دی گئی کہ اگر کسی کو اس اکمال میں شبہ یا شک ہو تو پیغمبر ﷺ بھی ابھی دنیا میں موجود ہیں اور ان پر وحی بھی آرہی ہے۔ وہ اس شبہ کو رفع کر سکتا ہے۔ اس چیز نے دعوائے اکمال کو ہر قسم کے احتمالی شک و شبہ سے بھی پاک کر دیا۔ ورنہ جیسے حدیث قرطاس یوم وفات نبوی ﷺ میں حضور ﷺ کی زبان مبارک سے صادر ہوئی' اور اس کے بارہ میں بعد کے بیان سے لوگ تشنہ رہ گئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی ہو گیا جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روافض نے اسے ملعبہ اور ایجاد فتنہ کا حیلہ بنا لیا' محض اس لئے کہ قرب وفات نبوی ﷺ کی وجہ سے اس کا کوئی بیان یا کوئی شرح سامنے نہ آسکی جو عوام کی زبان بندی کر سکے۔

ایسے ہی اگر یہ آیت بھی جس میں اسلام کی تکمیل اور مدار نجات ہونے کا بنیادی دعوئی تھا عین یوم وفات کے دن آخری ساعتوں میں نازل ہوتی اور بعد کی شرح سامنے نہ آتی تو ممکن تھا کہ اکمال دین کے بارہ میں احتمالات اور تشکیک پیدا کر کے عوام کو فتنے میں مبتلا کیا جاتا اور دجالین وقت اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے جبکہ

نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد تک حضور کو دنیا میں رکھا گیا۔ وحی اترتی رہی اور اس مقصد کی شرح حد تکمیل کو پہنچتی رہی۔ تو اس قسم کے احتمالات اور شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

بہرحال آیت کا نزول تو حجت الوداع کے موقع پر رکھا گیا تا کہ ایک وقت میں' ایک مکان میں مسلمانوں کے تمام خواص و عوام کے جمع شدہ مجمع میں اکمال دین کا اعلان ہو جائے کہ اس اجتماع کے بعد حیات نبویؑ میں پھر ایسا اجتماع ہونے والا نہ تھا۔ پھر بعد نزول حضورؐ کو کچھ عرصہ دنیا میں قائم رکھ کر متعلقہ شکوک و شبہات کے تمام احتمالات کو قطع کرنا منظور تھا کہ عین یوم وفات میں نزول ہونے سے ایسے محتمل شبہات قطع نہیں ہو سکتے تھے' اور پھر الیوم سے یوم خاص نہیں بلکہ دور حاضر مراد لیا گیا تا کہ بعد کے اترنے والی بھی ساری آیتیں اس دائرہ اکمال میں داخل رہیں اور دین پورا کا پورا اپنے اجزاء سمیت کامل پکارا جائے' اندریں صورت قرآن کی ترتیب میں خواہ وہ نزول کی ترتیب ہو یا تدوین کی ترتیب ہو' کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

خلق وکسب

سوال دوم :

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ آیت سے بندہ کے جبر اور اس کے مجرم نہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کفر خدا کی طرف سے ہے۔

جواب :

اس آیت سے بندہ مجبور محض ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہ ختم اور مہرزدگی اگرچہ خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق و ایجاد سے عمل میں آئی ہے' مگر اس کا یہ خلق مرتب ہوا ہے بندہ کے کسب پر یعنی بندہ نے کفریہ حرکات کرتے کرتے اپنی استعداد قبول حق فنا کرلی تو خدا کا آخری فعل اس پر بصورت ختم مرتب ہوا' پس بندہ اس فناء استعداد کا سبب ہے اور خدا خالق ہے' پھر نہ صرف اس آخری فعل پر بلکہ ابتداء سے لے کر انتہا تک یہ کسب و خلق جمع چلے آرہے ہیں جب بھی بندہ کوئی ایمانی یا کفری حرکت کا اکتساب کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے فعل کو وجود دے دیتے ہیں یعنی پیدا کر دیتے ہیں ____ وہ ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے کو وجود دیدیتے ہیں' ارادے کے بعد وہ فعل کرتا ہے تو اس کے فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا بندہ جیسے اپنے افعال میں آزاد ہے' ایسے ہی اس کے افعال قلب و قالب کے ظہور اور وجود پر بھی حق تعالیٰ نے کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ ورنہ اگر بندہ کے کسب پر اللہ کا خلق و ایجاد اور وجود بخشی مرتب نہ ہو تو بندہ مجبور محض ٹھہر جائے اور وہ کچھ کر ہی نہ سکے۔

اور اسی طرح اسکے اندر جو خلقی جوہر اور مادے رکھے گئے تھے وہ نمایاں نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ بخل بھی ہے اور خلاف عدل ایک ظلم بھی ہے کہ ایک شئے میں خدا تعالیٰ اچھے برے مادے تو رکھدے مگر انہیں نمایاں ہونے کا موقع نہ دے۔ حالانکہ اس کی بارگاہ بخل اور ظلم سے پاک اور بری ہے۔ پس بندہ کی مجبوری اس میں تو نکل سکتی ہے کہ وہ کسی فعل کا قصد کرے اور وہ فعل نمایاں نہ ہو' نہ اس میں کہ وہ جب بھی کوئی فعل کرنا چاہے تو اس کے ظاہری و باطنی قویٰ پر کوئی پابندی عائد نہ ہو بلکہ قدرت ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار ہے کہ ادھر اس نے عزم فعل کیا اور ادھر اچانک وہ فعل اس سے نمایاں ہو گیا۔ یعنی بندہ کے کسب اور خدا کے خلق میں کوئی فاصلہ یا وقفہ درمیان میں حائل نہیں ہوتا' ادھر کسب عبد ہوا ادھر معاً خلق ظاہر ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے بجلی کی روشنی میں سوئچ اور قمقمہ کی نسبت ہے کہ جیسے ہی سوئچ ہلایا ویسے ہی معاً آن کی آن میں قمقمہ

روشن ہو گیا۔

پس حرکت سوئچ کسب عبد کی مثال ہے اور قمقمہ میں روشنی خلق الٰہی کی مثال ہے۔ یعنی جیسے سوئچ ہلانے والے کا روشنی بنانے یا پاور ہاؤس سے اس قمقمہ میں لا کر جلوہ گر کرنے میں کوئی ادنیٰ دخل نہیں ایسے کسب افعال کرنے والے بندے کو ظہور افعال اور وجود نتائج میں کوئی دخل نہیں' اس کا کام صرف کسب ارادہ و فعل یعنی اکتسابی حرکت کرنا ہے' اس ارادے کی تخلیق و ایجاد اور اس فعل کو وجود دینا خود بندے کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔

پس ایک بد عمل نے ظالمانہ اور کافرانہ حرکات کا کسب شروع کیا تو خدا نے ان حرکات کو وجود بخشنا شروع فرمایا اور جب وہ اکتساب کفر کرتے کرتے اس حد پر آ گیا کہ اس کی قبول حق کی صلاحیت و استعداد ہی فنا ہو گئی۔ تو خدا نے اس فنا اور بطلان استعداد کو بھی وجود دے دیا اور پیدا کر دیا۔

بس اسی فناء استعداد کے فعل ایجاد کا نام ختم ہے کہ خدا نے اس پر مہر لگا دی کہ اب اس میں ایمان داخل نہ ہو گا۔

پس ایمان کے دروازے بندے نے خود اپنے اوپر اپنے کسب سے بند کئے خدا تو اس کی حرکات کو وجود بخشتا رہا نہ کہ خدا اس پر ایمان کے دروازے بند فرماتا رہا اور ظاہر ہے کہ جرم اور معصیت کسب شرور ہے نہ کہ خلق شرور کیوں کہ خلق کے معنی صرف وجود بخشنے اور عطاء وجود کے ہیں اور عطاء وجود کسی حالت میں بھی جرم یا برا نہیں ہو سکتا' ہاں خود شئے وجود یافتہ کبھی اپنی ذات سے بری ہو گی کبھی اچھی۔ مگر اسے وجود دینا کسی حال میں بھی برا نہ ہو گا کیونکہ عطاء وجود احسان ہی احسان ہے کہ وجود جیسی نعمت کسی شئے کو بخشی جائے' اور عدل ہی عدل ہے کہ ہر شئے کو اپنے چھپے ہوئے خلقی جوہر دکھلانے کا موقع دیا گیا ہے اور اس کی خاصیتوں کے ظہور پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پس مجرم اگر ٹھہرتا ہے تو یہ کسب و شرور کرنے والا بندہ ٹھہرتا ہے نہ کہ اس کسب کو وجود بخشنے والا خدا۔ حاصل یہ کہ اس بندہ کا کفر بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے مگر تخلیقاً نہ کہ اکتساباً اور مجرم کاسب ہوتا ہے نہ کہ خالق اور معطیٔ وجود۔

قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ

سوال سوم :

قرآن مجید حمد اور تسمیہ سے شروع کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کلام باری نہیں لوگ اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں مگر چونکہ اس تاویل کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس وجہ سے مخالف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا اور نہ دل کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

جواب :

تقریر اعتراض کو واضح نہیں کیا گیا کہ اس کے مطابق جواب دیا جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معترض خود بھی اپنے اعتراض کو سمجھے ہوئے نہیں ہیں۔ بظاہر تقریر شبہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بھلا کوئی خود ہی اپنے کلام کو اپنے نام سے شروع کیا کرتا ہے یا اپنے نام سے خود ہی برکت حاصل کیا کرتا ہے یا مدد چاہا کرتا ہے؟ یعنی یہ انداز کلام عرف عام کے خلاف ہے۔

اول تو شبہ یوں بے اصل ہے کہ عرف ہر جگہ کا ہر قوم کا الگ ہوتا ہے' اگر ایک جگہ ایک دستور نہ ہو تو دوسری جگہ ممکن ہے کہ وہ ہو' پس ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن کا عرف ہو کہ اپنے نام سے کلام کا آغاز کیا جائے۔

پھر یہ کہ شروع میں بسا اوقات متکلم اپنا نام ذکر کرتا ہے تاکہ بعد کے کلام کا تعارف اور نسبت مخاطبوں پر واضح ہو جائے جیسے اکثر خطوط اپنے نام سے شروع کئے جاتے ہیں تاکہ باول وھلہ مخاطب سمجھ لے کہ یہ فلاں کا مضمون ہے۔ اسے الجھن نہ رہے کہ لکھنے والا یا کہنے والا کون ہے؟

اس لئے آغاز کلام بہ تسمیہ الٰہی اس اصول پر قابل اعتراض نہ ہوا۔ مزید غور کیا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی عظیم مہم کلام کا کسی بڑے نام یا بڑی نسبت یا بڑی صفت سے شروع کرنا عقلاً مستحسن ہی نہیں بلکہ مطلوب سمجھا گیا ہے اور ایک فطری امر ہے چنانچہ اس پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ آپ اسے مستحسن اور معقول جانتے ہوں گے کہ بندے اپنے کلام کو خدا کے نام اور خدا کی ثناء وصفت سے شروع کریں جس سے اس امر کا فطری اور معقول ہونا واضح ہے۔

اور ظاہر ہے کہ فطرت اللہ کی ہے جس پر بندوں کو مفطور کیا گیا ہے۔ پس بندوں میں ہر فطرت خود اللہ ہی سے آتی ہے اس لئے اصل میں یہ ڈھنگ کہ آغاز کلام کسی بڑے نام یا بڑی نسبت وصفت سے ہو' اولاً خدا کے کلام کا ہونا چاہئے بندے تو محض اس کی نقل اتاریں گے کیونکہ نہ وہ خود اصل ہیں نہ ان کا وجود ہی اصلی ہے۔ نہ ان کی ذات وصفات اور افعال ہی اصل ہیں۔ اصل ہر چیز کی اللہ ہے۔ اسی کی ذات وصفات وافعال اصل ہیں اس کے سوا ہر چیز مجاز اور اس کا ظل محض ہے۔ اس لئے آغاز کلام کا یہ ڈھنگ اگر مستحسن ہے اور بلاشبہ ہے تو اولاً یہ ڈھنگ کلام الٰہی ہی میں مستعمل ہونا چاہئے بندوں میں یہ ڈھنگ محض ظلی اور مجازی طور پر خدا سے آئے گا وہ ناقل محض ہوں گے نہ کہ اصل۔

پس ادھر تو یہ اصول معقول کہ کلام کا آغاز کسی بڑے نام یا بڑی صفت وتوصیف سے ہونا چاہئے اور ادھر یہ مسلم کہ نہ خدا سے کوئی بڑا نہ خدا کے نام سے کسی کا نام بڑا نہ اس کے صفات وافعال سے کسی کے افعال وصفات بڑے اور نہ ہی اس کی توصیف وتعریف سے کوئی ثناء وصفت بڑی۔

اس لئے کلام الٰہی میں اس امر مستحسن کے استعمال کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہو سکتی کہ خدا اپنے کلام کو اپنی ہی صفات اور اپنے ہی نام اور اپنے ہی توصیف سے شروع فرمائے بلکہ اگر آپ غور کریں تو بندے بھی اپنے کلام کو خدا کے نام اور ثناء وصفت سے اسی لئے شروع کرتے ہیں کہ اس کے نام سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اور کلام کا بڑے ہی نام سے شروع کیا جانا فطری اور عقلی ہے۔ اس صورت میں بندوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے کلام کو بھی اور اپنے کام کو بھی اسی کے نام سے شروع کریں۔ چنانچہ حدیث نبویؐ میں اسکی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ :

کل امرذی بال لم یبدا بلسم اللّٰہ تعالٰی فھوا قطع۔

"جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے"۔

پس بڑے نام سے آغاز کلام عقلی بھی ہوا شرعی بھی ہوا اور عرفی بھی ہوا۔ اس لئے آغاز کلام خداوندی بنام خداوندی اسی فطرت کے ماتحت ہے کہ امر مہم کو بڑے نام اور بڑی ثناء سے شروع کیا جانا ہی فطرت ہے اور اس کے نام سے بڑا نہ کسی کا نام ہے اور نہ اس کی شان سے بڑھ کر کسی کی شان ہے ___ تو پھر آغاز کلام میں خواہ خود اس کا کلام ہو یا اس کے بندوں کا ہو اس کے نام کے سوا اور کس کا نام لیا جائے؟

فرق اتنا ہوگا کہ بندے اپنے کلام میں خدا کا نام لے کر برکت حاصل کریں گے اور خدا اپنے کلام میں اپنا نام لے کر برکت ظاہر فرمائے گا۔ وہاں حصول برکت کا سوال یوں نہیں کہ وہ خود سرچشمہ خیر وبرکت ہے اور یہاں اظہار برکت کا یوں سوال نہیں کہ بندے اپنی ذات میں کوئی خیر وبرکت نہیں رکھتے جسے ظاہر کریں' اس

لئے ہم بسم اللہ کہیں گے تو مقصد برکت ومدد کا حاصل کرنا ہوگا اور خدا بسم اللہ فرمائے گا تو مقصد برکت ومدد کا اظہار اور پھیلانا ہوگا۔ اس لئے تو ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم کو محض تعلیم پر محمول نہیں کرتے بلکہ عملاً اس فطرت پر محمول کرتے ہیں کہ آغاز کلام کسی پر عظمت نام یا لفظ سے کیا جانا ہی عقل سلیم اور طبع مستقیم کی خواہش ہے اور یہی عین فطرت ہے۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔

چونکہ سوال میں اعتراض کی کوئی تقریر اور بنا ظاہر نہیں کی گئی اس لئے یہ اجمالی تحقیق عرض کردی گئی، اعتراض کا کوئی موجہ پہلو سامنے آتا تو اس پر کچھ اور عرض کیا جاتا :

اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۔

سوال چہارم :

خدا کے مکانیت اور اس کے احتیاج الی المکان کو بتاتا ہے اور یہ جسم وحدوث کا خاصہ ہے، لوگ اسکو متشابہات سے کہتے ہیں۔

وَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِکَ۔

عقیدت مند دل تو اس کو مان لے گا مگر عقل حجت طلب کو کیونکر سمجھائیں کہ متکلم ہی اس کے مطلب کو جانتا ہے کہ ایسی صورت میں تخاطب ہی اس کا بیکار ہوگا اور ترجمہ بھی اس کا صاف ہے، یہ ضروری مسائل ہیں جن کے حل وانشراح کی جناب کو تکلیف دیتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

تعیین مراد میں احوال متکلم کا دخل

جواب :

ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اس کی حیثیت عرفی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ پس کلام کا مقصد سمجھنے کے لئے محض متکلم کے الفاظ ہی سامنے نہیں رکھے جاتے بلکہ اس کے احوال واوصاف اور شون کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، فرعون نے بھی انا الرب کہا اور منصورؒ نے بھی انا الحق کہا۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔

لیکن ایک کو اس دعوی کے سبب آپ ملعون قرار دیتے ہیں اور ایک کو اس دعوی کی بناء پر مقبول بتاتے ہیں۔ یہ فرق دعوی وکلام کے فرق سے نہیں جب کہ وہ دونوں کا ایک ہے بلکہ احوال کے فرق سے ہے۔ فرعون کے مجموعی احوال کفر وجحود اور اللہ ورسول ﷺ کی تکذیب وتردید کے ہیں اس لئے اس کا انا الرب کہنا بمقابلہ خدا اپنا استقلال وجود ثابت کرنا ہے یعنی خدا کا انکار اور اپنا اثبات ہے گویا فرعون کے متمردانہ احوال سے تو اس کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں از خود ہوں کسی اور کا محتاج نہیں میں اپنے اندر بھی خود ہوں اور اپنے سے باہر بھی میں ہی میں ہوں۔ نہ میرے اندر ہی کسی اور کا وجود ہے اور نہ میرے سے باہر ہی ہے اور منصور کے مطیعانہ احوال سے، جن کا حاصل خدا اور رسول کی تصدیق ومحبت ہے، ان کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں فانی محض اور بے ثبات ہوں، باہر تو باہر خود اپنے اندر بھی میرا اپنا کچھ نہیں، وجود ہے تو اس کا ہے اور بقاء ہے تو اس کی ہے گویا میں اندر بھی خود نہیں ہوں وہی وہ ہے۔ تو فرعون کے انا سے اثبات باطل اور نفی حق نکلتی ہے اور منصور کے انا سے اثبات حق اور نفی باطل نکلتی ہے۔ مگر دونوں کے کلاموں کے معنی کا یہ عظیم فرق، الفاظ اور دعوی کے فرق سے نہیں بلکہ صرف احوال کے فرق سے ہے۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہی

ان کے کلاموں کا مطلب لیا جا سکتا ہے' یہی وجہ ہے کہ مسلم و کافر کے افعال بالخصوص معاشی افعال یکساں اور بالکل ایک ہوتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں' وہ بھی رہن سہن کے وہی سامان فراہم کرتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ مگر ایک کے تمام افعال مقبول اور موجب زیادۃ اجر اور ایک کے تمام افعال مردود اور موجب زیادۃ وزر۔ فرق اگر ہے تو صرف احوال کا ہے۔

پس کسی کے افعال ہوں یا اقوال ان کا مطلب ان کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی لیا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی' جس کے عام احوال نیکی و تقویٰ کے ہوں' اگر اتفاقاً کوئی غلطی بھی کر گزرے تو اس کی بھی تاویل حسن کرتے ہیں اور ایک بد آدمی جس پر بدی اور فجور کا غلبہ ہو اتفاقاً کوئی نیک حرکت بھی کرے تو اسے بھی خود غرضی اور بدی پر محمول کرتے ہیں۔ بناءہی نکلتی ہے کہ کسی کے کام اور کلام کا مطلب اس کے احوال وشون اور اوصاف کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ ازخود ہے یعنی کسی کے بنائے سے وہ نہیں ہوا' بلکہ خود سے ہے' وجود صرف اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس لئے کہیں بھی کوئی ہو' وہ اسی کے دائرہ میں ہوگا۔ باہر نہیں ہوگا اور اس لئے لامحالہ اس کا وجود لامحدود بھی ہوگا۔ اگر محدود ہو' جس کی کوئی حد ہو تو حد سے باہر دوسروں کا وجود ہوگا۔ تو وجود صرف خدا کا نہ رہا اور معطیٔ وجود صرف وہ نہ رہا' دوسرے بھی بن سکیں گے اور اس سے خالقوں کا تعدد نکلے گا۔

اس لئے اگر وجود اصلی صرف اس کا ہوگا تو اسے لامحدود بھی ماننا پڑے گا اور ہر شئے کو اس کے وجود سے موجود اور اس کے احاطۂ وجود میں تسلیم کرنا پڑے گا' پھر اس سے دوسروں کا وجود اس شان سے نہ ہوگا کہ اس کے وجود کے ٹکڑے کر کر کے دوسروں کو بانٹے جائیں۔ ورنہ ٹکڑے ہونے کے بعد اس میں حد بندیاں ہوجائیں گی اور وہ لامحدودیت باقی نہ رہے گی جو اس کی خودی کے لئے لازم تھی بلکہ دوسرے جب اس سے وجود پائیں گے تو بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی سے جہان والے روشنی پاتے ہیں کہ خود سورج کی روشنی کے ٹکڑے نہیں ہوتے اور ہر چیز اس سے روشنی حاصل کرتی ہے' یعنی اس کی روشنی کے صرف پرتوؤں ہی سے منور ہوجاتی ہے۔ خود اس کا نور اسی کی ذات میں قائم رہتا ہے۔

پس خدا ازخود ہی ہے کسی کے بنائے نہیں بنا ہے۔ اس کا وجود اصلی ہے' کسی کا بخشا ہوا نہیں ہے اور وجود اصلی جب سب پر محیط ہے تو وہ ہر زمان و مکان میں ہے یعنی لامحدود ہے اس سے موجودات وجود پاتے ہیں۔ تو خود اس کے وجود کے ٹکڑے نہیں ہوتے' جو اس کے جسم اور جسمانیت سے بری ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ وجود خود لطیف ترین شے ہے' جو خود آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔

پس خدا کا ازخود ہونا' محیط الکل ہونا اور جسم نہ ہونا اس کی اصلی شان اور صفت ہے۔ اگر استوی اعلی العرش کا کلام سامنے آئے گا تو اسی سابقہ قاعدے سے' اس کلام کا مطلب اس کے الفاظ محض سے نہیں بلکہ ساری شانوں کو سامنے رکھ کر ہی لیا جائے گا اور شان اس کی یہ ہے کہ نہ وہ محدود ہے نہ جسیم ہے نہ کسی کے احاطہ میں ہے نہ کسی کی گرفت میں ہے' بلکہ سب اس کے احاطہ میں اور گرفت میں ہیں۔ تو الرحمن علی العرش استوی سے آخر اس کی جسمانیت کیسے ثابت ہوجائے گی اور اس کا حدوث کیسے مفہوم ہوگا؟ ہاں! جب ہوگا کہ اس پاک متکلم کے کلام کے صرف یہی الفاظ سامنے رکھ کر اور اس کی ساری ثابت شدہ شانوں اور صفات سے قطع نظر کر کے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کے معنی لئے جاویں۔ لیکن اگر الفاظ کے ساتھ احوال بھی ملائے جاویں جو عرض کردہ قاعدہ کے مطابق ضروری ہیں تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا جسمانیت اور حدوث سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔

عرش رحمت خاصہ کا مظروف ہے

بلکہ غور کیا جائے‘ تو عرش سے اگر ثابت ہوتا ہے تو اللہ کی صرف ایک ہی صفت یعنی صفت رحمت کا تعلق خاص ثابت ہوتا ہے نہ کہ ذات کا اور وہ بھی مظروفیت کا کیونکہ اللّٰہ علی العرش استوی نہیں فرمایا گیا‘ بلکہ الرحمٰن علی العرش استوی جس کا حاصل یہ ہے کہ عرش پر اللہ کی صفت رحمت پھیلی ہوئی ہے‘ اور وہاں اس کی اسی خاص شان کا ظہور اور تجلی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عرش محل تدبیر ہے اور تخت شاہی ہے جس سے سلطنت الٰہی کے کاروبار چلتے ہیں اور جہانوں کی تدبیر کی جاتی ہے۔

پس بتلانا یہ ہے کہ ساری سلطنت رحمانیہ ہے‘ رحم و کرم اور رأفت و ترحم پر مبنی ہے۔ غضب پر یا کورے قانونی داؤ پیچ پر مبنی نہیں ہے اور بالفاظ دیگر کائنات کی ہر چیز ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے حسی طور پر نمایاں اس طرح فرمایا ہے کہ عرش کو تو ساری کائنات پر محیط بنادیا کہ اس سے باہر کوئی جہان میں نہیں اور عرش پر صفت رحمت کو محیط کر دیا‘ تو گویا رحمت سارے جہانوں پر محیط نکلی‘ جس سے واضح ہو گیا کہ ہماری سلطنت قہر و سیاست پر مبنی نہیں‘ بلکہ رحمت و کرم پر مبنی ہے‘ اس لئے کہ بندے رات دن اور ہمہ وقت کفر و معصیت بھی کرتے ہیں مگر رزق اور باران رحمت بند نہیں ہوتا۔ گو کسی خاص وقت جبکہ اقوام کا ظلم و ستم انتہا کو پہنچ جائے‘ تو بطور تنبیہ سزا بھی ولائی جاتی ہے۔ سو اس کا منشاء بھی رحم و شفقت ہی ہوتا ہے۔

بہر حال کلمہ عرش پر استواء کے معنی جسمانی تمکن کے نہ ہوئے جو شون الٰہیہ کا مقتضٰی ہے اور وہ استواء معنوی بھی ذات کا نہ ہوا بلکہ صفت رحمت کا ہوا۔ تو اس سے خدا کی جسمانیت یا محدودیت یا حدوث سے کیا تعلق کہ یہ شبہات آیت پر وارد کئے جائیں۔

کیفیت استواء غیر معلوم ہے

ہاں! اس شان رحمت کے عرش پر چھائے ہونے کی کیفیت لامعلوم ہے کہ اس کا کیا انداز ہے اور کیا نوعیت ہے اور کیفیت ہی کی لاعلمی کی بناء پر اللّٰہ اعلم بمرادہ بذلک کہا جاتا ہے‘ نہ یہ کہ استواء علی العرش کا مفہوم نامعلوم ہے‘ استواء علی العرش صفت رحمت کا ہے اور یہ استواء محیط الکل ہے کیونکہ جسمانیت میں عرش تمام اجسام پر محیط ہے‘ تو صفت رحمت محیط الکل ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس انداز سے جیسے ہماری روح ہمارے بدن کو محیط ہوتی ہے اور بدن کا کوئی ایک جز بھی روح کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا‘ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کیفیت کا پتہ نہیں جس کیفیت سے روح بدن پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے اس ساری کائنات بدن کو گھیر رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم روح کے احاطہ کو نہیں جانتے یا اس کو یقینی نہیں سمجھتے ہیں۔ روح کے تعلق اور احاطہ کو یقینی جان کر اگر لاعلمی ظاہر کرتے تو اس کی کیفیت اور نوعیت احاطہ سے‘ نہ کہ اصل تعلق کے علم سے۔

پس ہم یقیناً جانتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ شان رحمت عرش پر اور بواسطہ عرش ساری کائنات اجسام اور ارواح پر محیط ہے۔ مگر ہم اس احاطہ کی کیفیت اور نوعیت کو نہیں جانتے۔ اللہ اعلم کہہ کر بحوالہ خدا کر دیتے ہیں۔

پس جتنا ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے ہم سے اس آیت میں تخاطب کیا گیا ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور جتنا نہیں جانتے اتنے سپرد بخدا کر دینے ہی کے مکلف بنادیئے گئے

ہیں۔ یہ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم اس نوعیت کی بھی کھود کرید کر کے اصلیت کا سراغ لگائیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پس خدا کی بھی شان رحمت ہے کہ بقدر استطاعت تو ہمیں تکلیف دی اور بغیر استطاعت ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

فسبحان اللّٰہ رب العرش العظیم

پس منظر

جناب محترم ومکرم زید فضلہم!

سلام مسنون، نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ موصولہ ۴ محرم الحرام ۷۳ ۱۳ھ باعث شرف ہوا۔ آپ کے سلسلہ تالیفات میں "داستان عمل" اور "اخلاق و آداب" جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافہ سے بے حد مسرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نور علی نور اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کر کے ان پر اضافہ و تشریح کا ایماء فرمایا ہے جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپ کا ہی ایماء کیا کم تھا اب جب کہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ تو اسے ضعیف کندھوں پر لادے پھرنے کی ناقابل برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تعمیل کروں، پھر بھی جو تاخیر ہوئی وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنؤ کا سفر پیش آگیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ سر پر آگیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو علی گڑھ کانپور کا سفر درپیش ہو گیا۔

اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعد عشاء جو کچھ بن پڑا بطور تعمیل ارشاد سطور ذیل قلمبند کیں اور بلا نظر ثانی ہی ارسال ہیں۔ مناسب ہو کہ جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ ان پر ایک اصلاحی نظر فرمائیں۔

یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے ان تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں۔ اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

علم کی غایت عمل ہے۔ اس کا جوہر تقویٰ ہے۔

اس کا زیور ادب ہے۔

شعراء کا ادب

لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شستہ کلامی اور بلاغت بیانی کے ہیں۔ حفظ اشعار، حفظ لغات اور حفظ اسماء و اصطلاعات اس ادب کی پونجی ہے۔ شاعری یا مرصع نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کے صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعی جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے معنویت یا واقعیت براہ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگزاری اور خیال آفرینی مطمح نظر ہوتی ہے۔

اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعیت جمع ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لفظی دنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض وغایت اکثر و بیشتر داد خواہی اور

زر طلبی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین و آفریں اور مدح سرائیوں پر ممدوحوں کی داد و دہش اس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ایک پرلے درجے کا بے ادب اور علم سے بہرہ حتیٰ کہ فاسق وفاجر بھی اپنی طبعی ذہانت وذکاوت اور موزوں طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہو سکتا ہے اس حال میں کہ اس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہ ہو۔ جہلاء عرب بلند پایہ شاعر پرگو' برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پتلے تھے۔ اس وقت کی دنیا میں ان کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کے لئے عجم (گونگا) کا لقب تجویز کیا تھا۔

مگر بایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی حتیٰ کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی ان کے زمانہ کا نام تک زمانۂ جاہلیت ہوا کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔

تا با دب و تقویٰ چہ رسد

اس ادب کے ہزارہا ادیب امراء وسلاطین کے درباروں میں نظر آتے تھے جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے۔ زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت ان کی گزر بسر ہوتی تھی ___ آج کی دنیا میں جب کہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے 'شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے تو قومی اسٹیجوں اور عوامی نشر گاہوں سے اسی ادب کے بار بردار سینکڑوں ادیب' مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیونکہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں' زیور علم کا تو سوال کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فریبی یا اپنی خواہش داد اور مخاطب کی رضاجوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے :

يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ۔

"وہ تمہیں اپنے مونہوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں"۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب اور اس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر سے الگ اور دور رکھا اور فرمادیا کہ یہ شاعری پیغمبرؐ کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقت الحقائق تک رہنمائی تھی۔ عارف وکامل شعراء جیسے عارف رومیؒ' سعدیؒ' عطارؒ اور سلف وخلف کے دوسرے شعر گو اکابر دلوں میں اگر باعظمت ہیں تو شاعری کی بدولت نہیں بلکہ معرفت کی بدولت یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمال باطن کے۔ اس لئے اس قسم کے اکابر سے مذکورہ بالا نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

عوام کا ادب

عوام الناس کے عرف میں ادب کے معنی احترام وتعظیم کے ہیں۔ مگر انہی کے مروجہ اقوال وافعال اور بندھی جڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ ان ہی رسوم تعظیم کے ساتھ جب کوئی ان سے پیش آتا ہے تو وہ اسے باادب اور مہذب کہتے ہیں۔ ورنہ بے ادب اور گستاخ کہہ کر خشمگین ہو جاتے ہیں۔

برادریوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا منڈی گود میں ڈال دینا یا اصطلاحی الفاظ میں تعظیمات وتسلیمات اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ

سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا یا ہاتھ جوڑ کر سروقد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا ان کے یہاں ادب اور ان الفاظ و ہیئات کو من وعن ادا کر دینے والا متادب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے کتنے ہی مناقشات اور عصبیاتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو جو اپنے وقت پر کافی جوش وخروش سے ابھرتے ہوں۔ اور محبت کے بجائے عداوات کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اسے متادب ہی کہا جائیگا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل دنیا سازی اور ظاہرداری ہے۔ جس کے نیچے حقیقت ومعنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی روح خود غرضی نفس اور رضاجوئی غیر تو نہیں ہوتی بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھرکم ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ مخاطب کی حقیقی عظمت وتوقیر کا اکثر بیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اسکی برائیوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اس رسمی شائستگی اور ظاہرداری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (القرآن)

"یہ لوگ دنیا کی زندگی کی صرف ظاہرداریوں کو جانتے ہیں اور انجام وعاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں"۔

تلبیس ادب

مدعیان علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں بلکہ خدا اور رسولؐ اور اکابرین دین ودنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال وہیئات اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں بشرطیکہ ان کے بارے میں انہیں صراحۃً لفظوں میں کوئی حکم مل جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جارہی ہو لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیان علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کئے ہیں۔ مگر اس کی حقیقی کیفیات سے ان کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پرواہ رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہواؤ ہوس کا غلبہ ہے۔

نیز جذبات نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی ان کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیات جھلکنی ناگزیر ہیں جو ان کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں۔ وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ وحسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں جذبات نفس اور جبلی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شرعی رسوم کی پابندی ان ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرف محض رسمی اور نمائشی ہو کر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے۔ فرق اتنا ہوگا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ عوام اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابل تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دنیا دار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ مدعیان علم بھی بلاخشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے' چنانچہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہل علم قلبی عقیدت وانقیاد جذبہ عشق وگرویدگی اور حقیقی نیاز مندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب واحترام اور رسمی آداب وتعظیمات سے گریز نہیں کرتے۔ مگر ان کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر وغرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں جس سے کبھی تو ان کی زبان قال پر فعلی شیخی اور اپنے علم وادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں گویا وہ خدا اور رسول پر اور ان کے نام لیواؤں پر احسان جتا رہے ہیں کہ وہ ان کا کتنا ادب کرتے ہیں اور کبھی وہ ان ہی مخاطبوں کے بارے میں جس کے ادب کے وہ زبان اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب ولہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔

پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور بباطن بے ادبی کیونکہ بظاہر تو وہ اتباع رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگ بے ادبی شامل ہوجانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداع بن جاتا ہے۔ کیونکہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انہیں اتباع نہیں بتلایا تھا بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی ویسے ہی ان کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگرچہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔

بہرحال اس رنگ تعلی وکبر اور عجب وریا کے ڈھنگ کے رسوم شرعیہ کی پابندی حقیقی ادب وتعظیم نہیں بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب وتقویٰ ہی سمجھتے رہتے ہیں مگر وہ تقویٰ کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔ پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلبیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے۔ جس سے ہزارہا بے بصر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہل علم کے لئے فرمایا ہے :

فساد کبیر عالم متهتک واکبر منه جاهل متنسک هما فتنة فی العلمین کبیرة لمن بهمافی دینه یتمسک ۔

"دنیا میں وہ عالم فساد عظیم ہے جو پردہ دری کرے اور بے ادب ہو اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادت کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا) یہ دونوں کے دونوں دنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اس شخص کے لئے جو دین میں ان سے رہبری حاصل کرے اور حجت پکڑے"۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے :

احذروا من الناس صنفین عالم قد فتنة هواه وصاحب دنیا قد اعمته دنیاه ۔

"دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اس عالم سے جو ہوا وہوس میں مبتلا ہو اور ایک اس دنیا دار سے جسے دنیا نے اندھا کردیا ہو"۔

ظاہر ہے کہ اس ادب کو اس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے کیونکہ اس ادب میں صورت تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقویٰ باطن ندارد ہوتا ہے کیونکہ تقویٰ باطن کے ساتھ دعویٰ' شیخی' کبر نفس'

غرور اور علم پر گھمنڈ نہیں ہو سکتا بلکہ فنائیت ' محویت ' کمال تواضع ' اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت و توقیر کے جذبات نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگ ادب سے خالی ہے اور ذوق ادب سے مبرا' یعنی صورت ادب ہے ' ادب نہیں حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوق ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

کمال ادب

لیکن اگر ادب کی شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں موجود ہو اور یہ صورت ادب ' بے روح ڈھانچہ ہو بلکہ باکیف رسم ہو تو یہ حقیقی ادب کہلائے گا اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متاؤب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر و احکام ہی کو پیش نظر رکھے گا بلکہ اس کے منشاء اور اشارۂ خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا ' بلکہ اس کی ذاتی عظمت و برگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ جس سے اس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گزر کر حقائق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئت بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا ' بلکہ دل و دماغ اور نفس و روح سے بھی ادب و توقیر کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز اس مقام کے لحاظ سے اس پر ادب و عظمت کے وہ دقیق دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیانِ علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آسکتے۔ بلکہ اس صاحب معرفت پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو باغ دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وہ اگر بدن کا ادب مانگے تو یہ روح سے بھی ادب کرے گا۔ وہ افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کردے گا یعنی ظاہر و باطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمال ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو ہم اہل تدین اور عالموں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔

پس عالموں اور دینداروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفاظی یا نقاشی یا لفظ و ہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز مندی باطنی اور قدوسیت روح و طبیعت کے سات شرعی آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندی احکام کے ساتھ ساتھ احکام کی آخری اور قدرتی حدود کو جو ذوق سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں۔ ہمہ وقت زیر نظر رکھتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اس میں ادعاء ہو نہ گھمنڈ نہ شیخی نہ اتراہٹ نہ اپنی توقیر ہو دوسروں کی تحقیر کی نہ روایت ہو نہ حکایت بلکہ محویت و گرویدگی ہو اور فناء نفس کے ساتھ رضائے حق کے جذبات کام کر رہے ہوں۔

پس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حسن و جمال زیور سے آراستہ ہو کر دہ گنا تگنا ہو جاتا ہے ایسی ہی علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب ان احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور انتہائی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرنا ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق و تکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت و اشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر ظواہر نصوص کے تعبیری حکم کو فتویٰ کہا جائے گا تو اس اقتضائی دلالتی اور اشاراتی حکم کو تقویٰ کہا جائے گا۔ پس صحیح معنی میں ایک متادب اسی وقت ادب داں بنتا ہے جبکہ عملی طور پر اسکے سامنے

ادب کے یہ تمام ظاہری و باطنی اور فتویٰ و تقویٰ احکام اور حدود موجود ہوں اور دل کی آمادگی اور امنگ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوقی حدود بھی اس پر منکشف ہو جائیں۔

زیور علم

یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فنافی الادب ہو جائے۔ یہی وہ ادب ہے جس کو علم کو زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اس کا ادب اس میں شامل نہ ہو اور وہ احتیاطی اور تقویٰ حدود زیر عمل نہ ہوں جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال و جمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور جوہر ہے۔ اس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینہ پیکر ہے جس کی طرف رغبت و شوق کی نگاہیں نہیں اٹھ سکتیں۔ اس سے بہ سہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور ان کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا' پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے۔

ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود تو نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارت میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان پر مستمراً عملدرآمد کی مشق سے جبکہ ذوق اور نیازمندی اور فدویت کا ملکۂ راسخہ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ادب کی ہی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارت سے گزر کر ان کی دلالت و اشارت میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ادب اسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ جن سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سرتاپا ادب بن جاتا ہے اور پھر اس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے سامنے نہیں آتے یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی محدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیاد استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیونکہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات کا ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کے لئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہو جانے ہی سے اصل مامور و منہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام "آداب شرعیہ" ہے۔ اس لئے یہی آداب درحقیقت امر و نہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جب تک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا۔ اصل احکام پر آنچ نہ آئیگی اور جونہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے۔ وہیں اصل مقاصد احکام کا قلعہ مسمار ہو جائے گا۔

حدود ادب

البتہ یہ حدود آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارت ہی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدان صحیح سے سامنے آتی ہیں لیکن ذوقی **بمعنی** اختراعی نہیں بلکہ بواسطہ ذوق ہو۔ ان ہی نصوص کتاب و سنت کی دلالت و اشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں البتہ ان کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے' جو ایک طرف تو فطرۃً سلامتی و صحت لئے ہوئے ہو اور

دوسری طرف شرعی اتباع، پیروئ سنت اور محبت نبوی اور عشقِ خداوندی نے اسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کردیا ہو۔ جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔

پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہوتے ہیں مگر شریعت میں سے ان کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا بلکہ صرف ان ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃً تشریعی ذوق سے مناسبت و قرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً ناد انوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور ان کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق انقیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعے اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب و دواعئ زنا سے بھی رک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہٖ چاہے ممنوع نہ ہوں مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آکر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے نامحرم عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، اس کی خوشبو پر ناک رکھنا، اس کی طرف چل کر جانا، اس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترک زنا کے آداب کہلائیں گی اور اگر فعل زنا کبیر گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب و دواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے، ان میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے ورنہ فی نفسہٖ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ اس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہو جائیگا جو اس شخص کو نامحرم عورت کے تصور سے بھی بچالے جائے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس نامحرم کے جمال کی طرف فکر و دھیان دوڑانا بھی جائز نہیں بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن زنا سے پاک رہے۔

اور جبکہ باطن کا عمل فکر و تصور ہے تو باطن کا زنا دراصل اجنبیہ کا دھیان اور خیال زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحۃً اسے زنا کے تصور و دھیان سے روکنے کا کوئی فتوی نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوال قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوق احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔ جب کہ ظواہر اعمال کی مشق و تکرار سے اس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اسے گناہ ہی سے نہیں خیال گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل سے بھی باز آجائے عمل یا شریعت یا شریعت حدود سے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ اسی سلسلۂ عمل ایک باطنی کفارہ تصور کیا جائے گا۔

اور جب کہ اسی باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اٹھتی ہے تو اسے اس شرعی ممنوع کی اساس و بنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آداب شرعیہ کہیں باہر سے لاکر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقع پر چسپاں کردیئے جاتے ہیں۔

تحفظ دین کا طبعی نظام

اسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اس سے بچانے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دیئے گئے، جو شراب خوری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے تاکہ ان کے سامنے نہ رہنے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے ___ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترک شراب) کو محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خوری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اس کے تخیل پر بھی لاحول پڑھے گا حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نظر نہیں آتا، لیکن جب وہ اصل ممنوع اور معصیت کبیرہ تک پہنچا دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اس لئے اس ذوقی حکم (ترک تخیل) کو بھی راہ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ انتظام شریعت کی لائنوں پر اسے احتیاطی حکم کہا جائے گا جس کے لئے فتویٰ کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تو تقویٰ کا کلمہ استعمال کریں گے۔

سطح پرست نگاہوں میں تقویٰ کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیالی نظر آئیں لیکن دوربین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظ دین کا ایک طبعی اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو محارم شریعت کی شاہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں تاکہ غیر محتاط چرواہے ان ڈول بندیوں سے بھی باہر ہی باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ پس عقلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے روکنے کا طریقہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے یہ دقیق حدود عمل بھی جو بظاہر کتاب وسنت کے الفاظ میں صراحۃً نظر نہ آئیں معانی کتاب وسنت کا جزبن کر مامورات ومنہیات کا ہی جز کہلائیں گی۔

ذوق ادب کا نتیجہ

فقہاء ومجتہدین رحمہ اللہ علیہم نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نور اجتہاد سے کھول دیا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے حالانکہ ان سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کر ان کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا وشراب کے جزیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ :

اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعل مباشرت اس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تخیل سے زنا کر لیا۔

پس اگر نصوص کتاب وسنت میں لفظوں میں اس خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا، بلکہ ممانعت زنا کی ان ہی کھلی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیر کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوق ادب اور ذوق تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کر دیا ہے۔ گویا یہ اسی ممانعت زنا کا ایک انتہائی مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے۔ جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مبصر نگاہوں نے اسے پالیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگین شربت پیتے ہوئے (جو بلاشبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی کیونکہ اس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی اور اگر اس پر قضاءً ظاہر شریعت کی رو سے شراب خوری کا حکم نہیں لگایا جائیگا تو دیانۃً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے

اس کے باطن کو ضرور شراب خور کہا جائیگا۔

مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات

ہاں پھر جیسے افعال زنا و شراب پر حد شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی۔ ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا۔ قضاءً نہ سہی تو دیانۃً ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دیجائیں گی تو انفسی ہی سہی یعنی فعل زنا و شراب پر اگر سنگساری اور درہ زنی کی حد جاری ہوتی تو اس ذہنی زنا کاری اور شراب خوری پر انفسی بیماریاں، آفات غم والم، تشویش وپراگندگی، فتنے اور پریشانیوں باطن پر ہجوم کر آئیں گی۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت و کدورت کے بادل امنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے ۔۔۔

"نیست بیماری چو بیماریٔ دل"

پس یہ تشریعی رنگ کی سزائیں نہ ہوں گی تو تکوینی رنگ کی ہوں گی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو باطنی وسائل سے دی جائیں گی کیونکہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکر و خیال) سے عمل میں آئے تھے۔ وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے من اللہ ہی ہیں۔ بہر حال ظاہر و باطن میں سے جس سے بھی شراب خوری و زنا کاری کا صدور ہو گا اور ان سے کسی پر بھی آدمی مؤاخذۂ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

"اور جو باتیں نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کرو گے یا کہ دل میں پوشیدہ رکھو گے، حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے۔ پھر بجز کفر و شرک کے جس کے لئے بخشنا ہو گا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہو گا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں"۔

حاصل یہ نکلا کہ :

قانون الٰہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور جسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب و ارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس ظاہری شریعت کی رو سے تو شراب و زنا کبیرہ گناہ تھے اور ان کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود تعزیرات جاری ہوتی تھیں لیکن حاکم حقیقی حق تعالیٰ شانہ کی عظمت و جلال اور ظاہر و باطن میں اس کے حاضر و ناظر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا و شراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبر الکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہو گی۔

وسائل عبادت پر اجر و ثواب

آداب کے سلسلہ میں یہ دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں۔ یہی صورت ماموارت کی بھی ہے کہ ان میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے۔ مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے لیکن اس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دواعی میں مثلاً جماعت ہے جو

موجب پابندی نماز اور باعث ترقی اجر و قرب ہے تو وہ سنت مؤکدہ قرار دی گئی پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی ٹوہ اور اجابت موذن (یعنی کلمات اذان سننا اور موذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے انہیں دہرانا مستحب قرار دیا گیا جس سے شرکت جماعت کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارت اور ضروریات سے فراغت ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت موذن اور حاضری مسجد کی توفیق ہو تو اس کی بھی ترغیب و تاکید کی گئی۔

غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت وسیلہ ہے اجابت موذن کا اور اجابت مؤذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اقدام جماعت کا اور یہ اقدام جماعت وسیلہ ہے پابندیٔ صلوٰۃ کا جو اصل مقصود ہے۔ اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔

طہارت کو نصف ایمان اور مزیل معاصی قرار دیا گیا اور اجابت موذن کے اہتمام پر قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا' حاضریٔ مسجد کے اقدام پر قدم قدم پر ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹادیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا۔ حاضریٔ مسجد اور انتظار صلوٰۃ کو حکم میں صلوٰۃ کے رکھا گیا۔ شرکت جماعت پر ستائیس درجہ اجر و ثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا اور اصل نماز کو نور اور دستاویز ایمان کہہ کر اسے فحش و منکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام امور چونکہ اس کی تحصیل و تکمیل کے وسائل اور حدود ہیں۔ اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو نماز قائم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی اور آدمی کو اس کی پابندی نصیب نہ ہوگی۔

تارک آداب تارک شریعت ہے

پس ادب کا حاصل یہ نکلا کہ وہ سلسلہ ماموارت میں تو محافظ فرائض ہے اور سلسلہ منہیات میں مدافع محرمات ہے۔ فرائض کے آداب امتثالی حدود کہلائیں گے اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔

محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجالانے سے فرائض میں جماؤ میسر آئے گا۔ فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی' اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تحلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے اور محرمات کے آداب تخلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جبلی عیوب ونقائص زائل ہوتے ہیں۔

اور اس طرح آداب کی ترکیاتی نوع تو نفس کو مانجھتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اس پر قلعی کرکے اسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات۔ گویا تارک آداب درحقیقت تارک فرائض و محرمات اور بالفاظ دیگر تارک شریعت ہے۔ اس لئے کتاب وسنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہرباب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے جن میں بعض آداب قرآن وحدیث کی عبارت میں صراحۃً موجود ہیں اور بعض ان کی دلالت واشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہاملت اور حکمائے امت کی مدد کے ہرکس وناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اسی لئے بطور مثال ہم نے تخیلاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب

کی توجہ رہے اور یہ بغیر فقہائے امت کا دامن سنبھالے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔

فقہاء کا مقام معرفت

الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جوا یا سرے سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کے الفاظ کی آڑ لے کر کم از کم اپنے باطن کو اس کی باطنی قیدو بند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو شرک فی النبوت وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے ان کی علمی کاوشوں اور توفیقی ریاضتوں کی بے قدری کریں۔ لیکن حقیقت شناس مبصر جوان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان فقہا نے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے بلکہ احکام کے ظاہری وباطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کردینے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری وباطنی مراتب احکام اور ان کی ان آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کردیتے ہیں جو بظاہر نظر شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر ان کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف با' کے بتیس حروف میں ہزار ہا کلمات وعبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف با' سے گذر جانے والا مبصر ہی ان حروف کی ترکیب و تحلیل سے مختلف معانی نمایاں کردیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ایسے ہی یہ معانی شرعیہ کے مبصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے ان میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔ پس یہ فقہاء امت کسی ناتمام طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آجانے پر محض دوا بتلادینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض پہچان کر نسخہ نویسی کردینے تک محدود نہیں رہ جاتے' بلکہ امت کے امراض کے ساتھ ان کے اسباب وعلل اور پھر آثار ونتائج سے باخبر رہ کر ہر شرعی دوا کی خاصیت اور اس کے درجہ تاثیر کو بھی جانتے ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزء کی تشخیص اور دواء مرض کے اجزا میں تطبیق دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں جس سے ان کا یہ مطب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا اور آج تک بھی دنیا اپنے مختلف امراض کا علاج ان ہی کے اصول وقواعد پر کرتی آرہی ہے تا آنکہ دوست دشمن کوئی بھی ان کی ان قابل قدر مساعی سے مستغنی بن کر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بننا نہیں کہ تجویز احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی ان کے سامنے روشن ہوجاتے ہیں اور وہ انہیں نمایاں کردیتے ہیں۔ اس لئے یہ راسخین فی العلم مجوز احکام نہیں بلکہ مظہر احکام ہیں۔ اختراع احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے ان کا اتباع ان کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے۔ اس لئے آداب شرعیہ کے سلسلے میں کتاب وسنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع وقیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرہ سے بھی پیش نظر رکھے جائیں گے۔ ورنہ ظواہر نصوص کو لے کر باطن نصوص کو ترک کردیا جانا اور فقہاء کی مساعی سے فائدہ نہ اٹھانا نہ صرف حرمان ہی ہے بلکہ خسران بھی ہے۔

ذوقی آداب

پھر ان چاروں شرعی حجتوں کے آداب سے متادب بن کر اور گویا ذوق ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب

پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں۔ جو دوسروں کے لئے خواہ حجت نہ ہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجیت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قال سے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جھک جاتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی سر ادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اس کے آگے بھی ادب سے گردن جھکا دیتا ہے اگر کوئی مکان اللہ و رسولؐ کے نامزد ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے۔ جیسے بیت اللہ و بیت الرسول یا آثار و مشاہد اہل اللہ۔

اگر کوئی شخص اللہ و رسولؐ کے نام لگ جائے تو وہ ان کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا و رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث و دینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے بطوع رغبت جھک جاتا ہے گو ظواہر شریعت میں ان آداب کے الفاظ دستیاب نہ ہوں۔

ہجرت کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دولت خانہ کے نچلے حصہ میں فروکش ہوئے۔ بالائی منزل پر وہ اور ان کے اہل و عیال فروکش تھے۔ تمام رات حضرت ابو ایوب مکان کے ایک ایسے کونے میں سکڑ کر بیٹھے رہتے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سیدھ میں نیچے ہوں گے۔

حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ انہیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوق ادب نے اس طرز عمل پر انہیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حدیبیہ کے موقعہ پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علیؓ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔ تو یہ ذوق ادب ہی مانع تعمیل ہوا، جو ہزار تعمیلوں سے بڑھ کر تعمیل و طاعت تھی۔

امام ابو حنیفہؒ زیارت مدینہ کے موقعہ پر گیارہ دن مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے مگر بول و براز نہ کیا محض اس جذبۂ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبیؐ اور مرقد صحابہؓ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا ___ امام مالک رحمہ اللہ علیہ نے جو امام دار الہجرت ہیں ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے حصۂ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جوتہ پہن کر کبھی نہیں گھومے کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اس مقام پاک پر پڑ جائیں جہاں حضورؐ کا قدم مبارک پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض جوش ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوش زن تھا ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے مکہ معظمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا کہ یہی رنگ غلاف کعبہ کا ہے۔ میں اسے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دار العلوم دیوبند، حضرت صابر کلیری رحمہ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو رڑکی سے پانچ میل پا پیادہ ننگے پیر سفر فرماتے ___ ظاہر ہے کہ

شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں، مگر متبعین اوامر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے جو ان کی ذات کی حد تک انہیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔

اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو روضہ اقدس کی گیلری کا جھڑاون (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس و خاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اس کی سلائی آنکھوں میں پھیرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں ذوقی جذبات ادب تھے جو آداب شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلا شبہ یہ تقلید و اتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بن جانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں کیونکہ یہ اس اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے اس لئے واجب الاحترام اور لائق صد ادب ہی نہیں بلکہ درجہ حال میں قابل اتباع و پیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اٹھے اور جن آداب کی دعوت شریعت اسلام نے پیش کی، خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا ان کی دلالت و اشارات میں مخفی ہوں یا اہل اللہ کے پاک ذوق وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ ان کی اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری، تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ و بیان کے مقررہ کلمات ادا کر دینا یا سرجھکا دینا ہوں بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزائے ترکیبی فکر و نظر کے ساتھ نصوص کے بعید سے بعید **محتملات** کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عملدر آمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال و تصور ریاضت نفس، مجاہدۂ عمل، تادیب جوارح، تزکیۂ باطن و تصفیۂ قلب اور لوجہ اللہ ترک شہوات ولذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا، صلحاء نے لیا، صدیقین نے اسے اپنایا اور اسی کے ذریعہ سے اپنے دین و دیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

سرچشمۂ ادب

اس مقام ادب پر پہنچ کر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے نہ تزئین الفاظ و فقرات نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے نہ سلاست بیانی کے نہ مروجہ رسوم ہیئت و بدن باقی رہتی ہیں نہ بناوٹی تعظیم و توقیر بلکہ سادگی و بے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت و ادب اور حقیقی اظہار ضمائر باقی رہ جاتا ہے جس میں زینت کے بجائے خلوص، آرائش کے بجائے فنائیت و محویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر بھرپور کلام و بیان کو حدیث نبویؐ میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت ورطۂ حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گنگ بنادیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عشق کے لئے زبان کی ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہار ہے اور وہاں اعلان ادب کی ضرورت نہیں کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب اور سرچشمۂ ادب ہے۔ ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است
عشق را خود صد زبان دیگر است

بوئے اور دلبر چو پراں می شود
ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

رسمی علم و ادب کو حدیث نبویؐ میں تجمل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے۔ علامات قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجمل اور زینت حاصل کرنے لگیں اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں' اسی طرح علم و ادب بھی محض رونق محفل کا آلہ بن کر رہ جائے نہ رونق باطن بنے اور نہ باطن نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔

پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسوم شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قائم رکھا جاتا ہے' رسوم شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں۔ مگر حقائق شرعیہ کلیۃً گم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے الفاظ و رسوم ادب کا یہ بے روح نقشہ' ایک مردار لاشہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ جس کا کوئی نفع نہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دل کا ادب ہے اور نہ ان کے شایان شان ہے اور نہ ہی اسے جوہر عمل کہا جا سکتا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جا سکے۔ جوہر عمل اور روح تقویٰ وہی ادب ہے جو ان رسمیات سے بالا رہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی روح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ' عامیانہ' رسمیانہ' متکبرانہ اور منافقانہ رسوم آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آداب واخلاق اور منکسرانہ حدود و رسوم پر لگا دے تاکہ انسان میں فناء نفس اور رضاء حق کے جذبات ابھر جائیں اور نفس انسانی صحیح معنوں میں شائستہ اور ربانی بن جائے جس سے اسے مطلوبہ سعادت حاصل ہو جائے اور شقاوت سے بچ کر حقیقی نجات سے ہمکنار ہو جائے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز پورے اسلام کی میزان

نماز میں عبادت کا پہلو

شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ نماز میں دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیئات جو اعضاء بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء سے فاتحہ، سورت تک، پھر **تسبیحات** سے لے کر التحیات تشہد تک اپنی عبودیت، غلامی، اور فدویت یا اللہ کی عظمت اور برتری اور لامحدود بزرگی کے کسی اور چیز کا بیان نہیں ہوتا اور ہیئات کے لحاظ سے نیاز مندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً ہیئۃً اعتراف ہے جو عبادت کا اصل مقصود یعنی خدا کے آگے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی ہے

نماز تمام کائنات کو جامع ہے

ارشاد ربانی ہے:

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ۔

یعنی ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض تصانیف میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے تاکہ اس کی نماز، اسکی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے۔ مثلاً درختوں کی نماز قیام ہے۔ ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کررہے ہیں۔ چوپایوں کی نماز رکوع ہے۔ وہ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں، جس سے انحراف نہیں کرسکتے۔ پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سنک کر چلنے والے کیڑوں مکوڑوں مثلاً سانپ، بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑے کی نماز بصورت سجدہ ہے۔ ان کی خلقی ہیئت سجدہ نما بنائی گئی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں۔ گویا کہ ہروقت اللہ کے سامنے سر بسجود اور سرنگوں رہتے ہیں۔ پہاڑوں کی نماز تشہد ہے۔ گویا ہروقت زمین پر دوزانوں جمے بیٹھے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے ہیں۔ جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ پرندوں کے انتقالات ہی عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔

پھر سیاروں اور آسمانوں کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر آجاتے ہیں، جیسا ایک نمازی ایک رکعت پڑھ کر پھر عود کرتا ہے، پھر زمین کی نماز تکوینی جمود اور سکون ہے۔ گویا ساکت اور صامت ہوکر اپنے مرکز پر جمی ہے جو انتہائی تذلل اور خشوع ہے۔

پھر جنت و نار کی نماز سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں ہمارے مکان کو پر کردے پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف یعنی صف بندی ہے کہ وہ قطار در قطار جمع ہوکر یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔

پھر یہی سب ہیئتیں جو ان جمادات و نباتات و حیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں بنی آدم اور دنیا کی مختلف

اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں۔ مثلاً کسی قوم کی نماز محض قیام' کسی قوم کی نماز نیم قیام کے گھٹنوں کے بل ڈنڈوٹ کھیلنا' کسی قوم کی نماز محض رکوع' کسی قوم کی نماز اوندھا لیٹ جانا' (یعنی سجدہ) اور کسی قوم کی نماز مجموعۂ صلوٰۃ اقوام ہے۔ ہیأت میں درختوں کا سا قیام' چوپایوں کا سا رکوع' فرشتوں کی سی صف بندی' آسمانوں اور سیاروں کی سی گردش اور پہاڑوں کا سا قعود ہے۔ اذکار میں ہر مخلوق کی تسبیح اور ذکر ان کی خلقت اور استعداد کے مطابق جدا جدا ہے۔ جس کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ۔

یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح ہر قوم کو اس کے مناسب ہی اذکار تلقین کئے گئے کسی قوم کو تعوذ کا حکم تھا' کسی پر سوال ودعاء کا غلبہ۔ چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل کردیا گیا۔ اس لئے مسلم کی نماز تمام اقوام کی جامع کردی گئی جو فطرت الٰہی نے اقوام عالم میں مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔

اوقات کی جامعیت

اوقات نماز بھی جامع ہیں یعنی جو وقت فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے۔ ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کرلیا ہے صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لیا۔ ظہر کا وقت سہل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کردی' عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلاب آفتاب کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا' عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے ختم بالخیر کردیا۔ پھر نفل نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیت کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کردیا۔

گویا اگر ایک انسان تمام اذکار واطاعت کی بجائے صرف ان مقررہ واجب ونفل اوقات میں نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔

نماز میں روزہ' اعتکاف' حج اور زکوٰۃ کی حقیقت موجود ہے۔

روزہ کی حقیقت ہے' صبح صادق سے کھانے پینے اور عورتوں سے متمتع ہونے سے بچنا' یہ چیزیں نماز میں بھی ممنوع ہیں بلکہ نماز میں ان کے علاوہ سلام' کلام' عورتوں کو چھودینا' ہنسنا' بولنا' چلنا' پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے۔ اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف صوم میں ضروریات بستر پہ پوری کرلینے' سوجانے' لیٹ رہنے اور کھانے پینے کی اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور مفسد صلوٰۃ ہیں بلکہ مسجد میں ٹہلنے نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں اس لئے نماز کا اعتکاف زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی ___ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔

نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط صحت وصلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوسکتی' پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کرکے گردش طواف شروع کرتے ہیں بعینہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کرکے تعظیماً رفع یدین کرکے نماز شروع کرتے ہیں۔ پھر جس طرح طواف اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے۔ نماز میں ہمہ قسم اذکار (تلاوت' درود شریف' تسبیحات وغیرہ) موجود ہیں۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تاحد عرفات یاد حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں رہ کر ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں پھر جس طرح حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے' بعینہٖ نماز کے ذریعے شیطان کے شر کو معنوی ہتھیار کے ذریعے دفع کیا جاتا ہے۔ پھر جس طرح حج میں طواف وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے بعینہٖ نماز میں سلام ودعاء کر کے دربار الٰہی سی رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بعینہٖ یا بمثلہٖ موجود ہے

زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے۔ یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا۔ نماز میں بھی تزکیۂ نفس اور تزکیۂ روح ہے کہ نفس ماسویٰ اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل ذکرہ کا ہو رہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت اس طرح نماز میں موجود ہے اور زکوٰۃ کی صورت یوں ہے کہ نماز کے لئے مسجد' چٹائی اور حوض پر فی سبیل اللہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح زکوٰۃ میں بھی فی سبیل اللہ مصارف لازم ہیں۔

نماز سے انانیت نفس کا ازالہ

نماز سے انانیت اور کبر نفس کا ازالہ ہوتا ہے جو ہزار ہا بد خلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس ہے کیونکہ کبر نفس جب تک باقی رہ سکتا ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو اور نماز سے حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجاتی ہے اور جب کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر وغرور پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

نماز میں فن تصوف کا موضوع

فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے یعنی نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوں۔ نماز میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں' نفس اور رب' نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی عظمت مطلقہ نماز سامنے کر دیتی ہے۔ تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنے فضائل سے نوازتا ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لئے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

روحانی اور اخلاقی مقامات

نماز چونکہ تزکیۂ نفس کر دیتی ہے۔ اس کی بعد نفسانی احوال ومقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہو جاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے۔ لیکن بلاواسطہ بھی نماز میں تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہو جاتے ہیں' آدمی بلند پایہ ہو جاتا ہے' شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے۔ صبر کو لو تو آدمی نماز میں ہر ایک لذت سے صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزے سے زیادہ مکمل ہے۔ اخلاص کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد للہ رب العالمین ہے جس کی حقیقت ماسوی اللہ کے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے۔

تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس سامنے ہے وہاں تواضع کی کیا حقیقت ہے۔ رضا بالقضاء کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا اور اس سے صبر کر لیتا ہے' شجاعت کو لو تو اس میں سخت ترین مقابلہ اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نزاع کا خاتمہ

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی۔

اجماعی مسلک

امابعد! برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ مشہور و معروف اور جمہور علماء کا اجماعی مسئلہ ہے۔ علماء دیوبند حسب عقیدہ اہل سنت والجماعت برزخ میں انبیاء کرام کی حیات کے اس تفصیل سے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام وفات کے بعد اپنی اپنی پاک قبروں میں حیات جسمانی کے ساتھ زندہ ہیں اور ان کے اجسام کے ساتھ ان کی ارواح مبارکہ کا ویسا ہی تعلق قائم ہے، جیسا کہ دنیوی زندگی میں قائم تھا۔ وہ عبادت میں مشغول ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ قبور مبارکہ پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ وسلام بھی سنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

علماء دیوبند نے یہ عقیدہ کتاب وسنت سے پایا ہے اور اس بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بھی متوارث ہی رہا ہے۔ حتی کہ بریلوی حلقوں سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ برزخ میں حیات انبیاء کے منکر ہیں اور اس افتراء سے علماء حرمین شریفین کو ان کی طرف سے بدظن بنا کر اور دھوکہ دے کر ان کے خلاف فتویٰ بھی حاصل کر لیا گیا۔ لیکن جب علماء حرمین پر اس دھوکہ دہی کی حقیقت کھلی اور انہوں نے اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں از خود ایک مفصل استفتاء مرتب کر کے علماء دیوبند سے جواب مانگا جس میں حیات انبیاء کا سوال بھی شامل تھا۔

تو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مفصل جوابی فتویٰ بنام المہند علی المفند مرتب فرما کر علماء حرمین کے پاس ارسال فرمایا جس میں مسئلۂ حیات النبیؐ اور مسئلۂ حیات انبیاء کرام کے بارے میں بھی علماء دیوبند کا نقطۂ نظر غیر مشتبہ اور واضح الفاظ میں تحریر فرمایا، جس کا حاصل یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور برزخ میں ان کی یہ حیات، حیات دنیوی ہے۔ نیز اسی ذیل میں اس نقطۂ نظر کو مزید واضح اور مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے رسالہ آب حیات کا بھی حوالہ دیا جو اس موضوع پر ایک مستقل اور پر از حقائق و معارف کتاب ہے جس کا مقصد اس مسئلہ کی ایک مستحکم تائید کے علاوہ بھی تھا کہ علماء دیوبند کا یہ عقیدہ (حیات انبیاء) انہیں ان کے اسلاف سے بطور توراث کے ملا ہے، کوئی انفرادی رائے یا وقتی اور

ہنگامی فتویٰ نہیں ہے، جو حوادث کے پیش آنے سے اتفاقاً سامنے آگیا ہو۔

مفاہمت کی بنیاد

پھر اس مسئلہ اور اس کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کے رسالہ کے حوالہ کی تائید میں اس وقت کے تمام اکابر علماء دیوبند کے توثیقی دستخط بھی اس میں ثبت کرائے جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ مسئلۂ حیات انبیاء کے بارے میں یہ مذکورہ عقیدہ صرف ان کے سلف ہی کا نہیں بلکہ خلف بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سلف قائل تھے اور اسی طرح یہ مسئلہ (اثبات حیات انبیاء) بطرز مذکورہ سلف سے لے کر خلف تک یکسانی کے ساتھ مسلمہ اور متفق علیہ رہا ہے اور تمام علماء دیوبند کا یہ اجماعی مسلک ہے جس سے کوئی فرد منحرف نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض دیوبندیا متقدمین میں سے بعض حضرات کی عبارتیں اس بارے میں کچھ مبہم یا موہوم ہوں، سو اگر اس سلسلہ میں ان کی کچھ صاف اور واضح عبارتیں بھی پائی جاتی ہوں تو ان کی مبہمات یا مجملات کو واضح عبارتوں کے تابع کر کے مبہمات کی تفسیر کی جاسکتی ہے، لیکن اگر صرف مجملات ہی ہوں جن سے مسئلہ کے دونوں پہلو نکل سکتے ہوں یا واضح ہوں مگر مخالف پہلو صاف اور نمایاں ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو پھر اپنے مفہوم کو سامنے رکھ کر مخالف پہلو اختیار کرنے والوں پر ایسی نکیر کی گنجائش نہ ہوگی جو مخالف پہلو کے ناممکن ہونے کی صورت میں کی جاسکتی تھی کیونکہ اس صورت میں یہ تفصیلاتی یا کیفیاتی اختلاف ایک علمی اور نظری اختلاف ہوگا جسے **مسلکی** اختلافات سے تعبیر نہیں کیا جاسکے گا، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں ایسے اختلاف کی گنجائش ہے جو علماء میں ہر وقت ہو سکتا ہے۔

البتہ عوام سے ایسے اختلافات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ صرف نفس مسئلہ اور اس کے قدر مشترک کے مکلف ٹھیرائے جاتے ہیں جو مسلک کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لئے مسئلہ حیات النبیؐ کے سلسلہ میں زیر نظر مصالحت اور مفاہمت باہمی کی بنیاد تفاصیل مسئلہ کے اختلافی پہلوؤں سے الگ رہ کر نفس مسئلہ کے قدر مشترک پر رکھی گئی جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوگی جیسا کہ آئندہ مفاہمت کی عبارت کے متن سے واضح ہوگا۔

اجتماعی نقصان

بخت و اتفاق سے وقت کے بعض فضلاء دیوبند نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں کچھ اس قسم کا اختلاف فرمایا جس کا مبنیٰ متقدمین کی ایسی ہی عبارتیں یا نصوص کے مدلولات کی اسی قسم کی تعبیرات ہیں، جن کے ہوتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش کلیۃً مسلوب نہیں سمجھی جاسکتی، جس کا ظہور تین چار سال سے ہوا۔ یہ اختلاف رائے مضر، لیکن سوئے اتفاق سے یہ اختلاف اسٹیج پر آگیا اور اس میں ردوقدح کی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور آخر کار اس مسئلہ کی بحث علماء سے گذر کر عوام میں ان کے رنگ سے پھیل گئی جس سے قدرۃً اس اختلاف نے نزاع وجدال کی باہمی صورت اختیار کرلی، گروپ بندی شروع ہوگئی اور یہ بحث آخر کار ایک جماعتی فتنہ کی صورت میں آگئی جس سے مسئلہ تو ایک طرف رہ گیا اور فساد آگے آگیا اور خود جماعت دیوبند میں تفریق و تفرق اور تخریب کے آثار نمایاں ہونے لگے، جانبین سے رسالے لکھے گئے، اخباری بحثیں چھڑ گئیں۔ جس سے جماعت کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ گیا۔

مساعی طیبہ

یہ صورت حال دیکھ کر اور اخبارات ورسائل سے ان مناقشات کی خبریں معلوم کر کے دل زخمی ہوتا رہا' اور جوں جوں یہ فتنہ بڑھتا گیا ووں ووں دل کا غم بھی ترقی کرتا گیا۔ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح فتنہ نزاع وجدال کی یہ صورت ختم ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ کو احقر کو پاکستان حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور اسی ماہ میں بزمانہ قیام لاہور' جناب محترم مولانا غلام اللہ خان صاحب اور محترم مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری احقر سے ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے' دوران ملاقات احقر نے اس نزاع وجدال کا شکوہ کرتے ہوئے اس صورت حال کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ یہ صورت بہرنہج ختم ہونی چاہئے جبکہ یہ مسئلہ کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اسٹیج پر لایا جائے اور اس کی وجہ سے تفریق وتفرق وتخریب کے ان مضر اثرات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے' کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مسئلہ یا تو اسٹیج پر آئے ہی نہیں یا اگر اتفاقاً آجائے تو اس کا عنوان نزاعی نہ رہے۔

اس پر ان دونوں بزرگوں نے نہایت مخلصانہ اور درد انگیز لہجہ میں کہا کہ ہم خود بھی اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں' کاش آپ (احقر) ہی درمیان میں پڑ کر اس نزاع کو ختم کرادیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے سوا یہ قصہ کسی دوسرے کے بس کا ہے بھی نہیں۔ اس بارہ میں آپ کی اب تک کی تحریرات نہایت معقول انداز سے سامنے آئی ہیں جن کو دونوں فریق نے احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اب بھی اس بارے میں آپ کی مساعی احترام وقبول کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

احقر کو ان مخلصانہ جملوں سے نزاع کے ختم ہونے کی کافی توقع پیدا ہوگئی اور ارادہ کرلیا گیا کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر کوئی مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے چنانچہ جواب میں یہی عرض کیا گیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ' شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان سے مل کر اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کروں گا۔

کراچی پہنچ کر احقر نے اس سلسلے میں مولانا غلام اللہ خان صاحب سے مراسلت شروع کی تاکہ معاملہ کے ابتدائی مبادی طے ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں مفاہمت کے معنی خلاف دیانت رائے تبدیل کردینے یا مسئلہ کو کم وبیش کر کے کسی اجتماعی نقطہ پر آجانے کے تو ہو ہی نہیں سکتے' اس لئے طریق مفاہمت اور فریقین کے لئے نقطہ اجتماع ذہن میں یہ آیا کہ اولاً یہ مسئلہ عوام میں لایا ہی نہ جائے اور اگر بیان مسئلہ کی نوبت آئے تو اس کا قدر مشترک پیش کر کے اس کے تفصیلات اور اختلافی خصوصیات پر زور نہ دیا جائے بلکہ عوام کو ان کی گہری خصوصیات میں پڑنے سے روکا جائے تو کم از کم عوام میں سے یہ نزاعی صورتیں ختم ہو جائیں گی' جو مضر ثابت ہو رہی ہیں۔ پھر اگر علماء کی حد تک تفصیلات میں کچھ اختلاف باقی بھی رہ جائے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو تو گروپ بندی کے مضر اثرات ختم ہو جائیں گے جو فتنہ کی اصل بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے احقر نے اپنی محدود معلومات کی حد تک اس مسئلہ کے قدر مشترک کا ایک عنوان تجویز کر کے مولانا ممدوح کو لکھا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں تاکہ دوسرے حضرات کی رائے بھی حاصل کی جاسکے۔

اس عریضہ کا جواب مجھے ملتان پہنچ کر مدرسہ خیر المدارس میں ملا۔ جس میں مولانا غلام اللہ خان صاحب نے احقر کے عنوان کو رد کئے بغیر خود بھی ایک عنوان لکھ کر بھیجا' اس موقعہ پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب'

مولانا محمد علی صاحب جالندھری اور دوسرے معتمد علماء جمع تھے، جن کے سامنے احقر نے اپنا منصوبہ اور یہ دونوں عنوان علیحدہ رکھ کر گفتگو کی، طے یہ پایا کہ قیام ملتان کی قلیل مدت اس مسئلہ کے لئے کافی نہیں ہے اور بعض ضروری افراد بھی یہاں موجود نہیں، اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو جہلم کے قیام میں رکھی جائے اور وہاں ایک مستقل دن اس کام کے لئے فارغ رکھا جائے اور ساتھ ہی احقر نے ملتان ہی سے اپنی تقریروں میں اس منصوبے کے لئے فضا ہموار کرنی شروع کردی۔

ملتان، جہلم، سرگودھا اور راولپنڈی میں خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں اصلاحی عنوانات اختیار کئے گئے۔ احقر نے اس سلسلے میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری سے جہلم تشریف لے چلنے کے لئے عرض کیا، جس کو ان حضرات نے بہ خوش دلی منظور فرمالیا، مقررہ تاریخ پر یہ سب حضرات جہلم میں جمع ہوگئے اور مسئلہ حیات النبیؐ کا قدر مشترک زیر غور آیا، طے یہ پایا کہ قدر مشترک کم از کم اتنی تفصیل ضرور لئے ہوئے ہونا چاہئے جس سے مسئلہ کے تمام بنیادی گوشوں پر روشنی پڑسکے اور عوام بطور عقیدہ کے اسے سمجھ سکیں۔

چنانچہ گفتگو کے بعد ایک جامع تعبیر احقر نے قلمبند کی اور ارادہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ان حضرات ممدوحین کی موجودگی میں دوسری جانب کے ذمہ دار حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا قاضی نور محمد صاحب، مولانا قاضی شمس الدین اور مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو جمع کرکے اس منصوبہ اور مجوزہ عنوان پر گفتگو کی جائے۔

قدر مشترک

چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ یوم جمعہ دونوں جانب کے یہ سب بزرگ احقر کی قیام گاہ (مدرسہ حنفیہ عثمانیہ) میں جمع ہوگئے، اس مجلس میں احقر نے اس معاملہ کی اول سے آخر تک ساری روداد بیان کرکے مسئلہ کا وہ منقح قدر مشترک دونوں جانب کے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے رکھا۔ گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور ختم مجلس تک الحمدللہ یہی ماحول قائم رہا۔ نہ اس میں ہار جیت کے جذبات تھے نہ غلبہ و مغلوبیت کے تصورات تھے بلکہ مسئلہ کو سلجھانے اور نمٹانے کے جذبات نمایاں تھے اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں نے احقر کی پیش کردہ قدر مشترک کے عنوان کو قبول کرلیا۔

اور اس قدر مشترک تحریری یادداشت پر جو احقر نے اپنے دستخط سے پیش کی، فریقین نے دستخط فرمائے۔

اس یادداشت کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

"عامۂ مسلمین کو فتنہ، نزاع و جدال سے بچانے کے لئے مناسب ہوگا کہ مسئلۂ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں۔ یہ (عنوان) مسئلہ کا قدر مشترک ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر اسی کو عوام کے سامنے پیش کردیا جائے گا، تفصیلات پر زور نہ دیا جائے۔ عبارت حسب ذیل ہے:
وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلوٰۃ و سلام سنتے ہیں"۔

احقر محمد طیب وارد حال راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

(مولانا قاضی) نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ۔

لاشئ (مولانا) غلام اللہ خان

ــــــ (مولانا) محمد علی جالندھری

اس مختصر عبارت کی کافی تفصیل چونکہ قاضی شمس الدین صاحب (برادر مولانا قاضی نور محمد صاحب اپنے مکتوب میں لکھ کر مولانا محمد علی جالندھری کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس لئے یہ عبارت بالا ان کی مسلمہ ہے' بناء بریں اس عبارت پر ان کی دستخط کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی' عبارت بالا ان کا مسلمہ سمجھا جائے۔

حق گوئی اور انصاف پسندی

چونکہ اس موقع پر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری بوجہ علالت راولپنڈی تشریف نہ لا سکے' اس لئے احقر کے عرض کرنے پر اور مسودہ پیش کرنے پر حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ صاحب نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر دستخط کر کے بندہ کو عنایت فرمائی جس کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے :

> "ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں' اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبیؐ میں اس تحریر کی حد تک ان سے برأت کا اعلان کردیں گے' نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبیؐ پر تقریر نہ کرائیں گے اور اگر اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے"۔

نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ

لاشئ غلام اللہ خان (۲۲جون ۱۹۶۲)

اس تحریر پر ہر دو دستخط کنندہ بزرگوں کی حق پسندی اور حق گوئی ظاہر ہے باوجود یہ کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ان بزرگوں کے قوی ترین تعلقات اور مخلصانہ روابط ہیں مگر اس بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں بے لوثی نمایاں ہے۔

سکوت مصلحت

تاہم سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں' ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود و سلام کے حضور کے سمع مبارک تک پہنچنے اور آپؐ کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے' بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل نہیں ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے اس لئے انہیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا بلکہ مؤول سمجھا جائے گا۔ گو ان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور اس ناچیز اور ہر دو دستخط کنندہ بزرگان ممدوحین بالا کے نزدیک قابل تسلیم نہیں لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے جبکہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے ان پر زبان طعن وملامت کھولنا یا تشنیع کرنا کسی طرح قریب انصاف وصواب نہیں بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں' اس لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر سکوت اختیار کرلیا جانا ہی قریب مصلحت اور جانبین کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے

محترم صدر رسید صاحب ممدوح سے بھی پوری توقع ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ مسئلہ حیات کی ان تفصیلات میں جمہور اہل السنت والجماعت کے مسلک کا احترام قائم رکھنے کے لئے اپنے کسی خصوصی مفہوم کو (خواہ وہ ان کی دانست میں مفہوم اہل اہلسنت والجماعت ہی ہو مگر جمہور علماء کے نزدیک وہ ان کا خصوصی مفہوم شمار کیا جارہا ہے اور خواہ وہ کتنی بھی دیانت پر مبنی ہو) ضروری الاشاعت نہ سمجھتے ہوئے سکوت کو کلام پر ترجیح دیں گے یہ مسئلہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی عقائد کا نہیں ہے کہ اس میں سکوت روانہ رکھا جائے۔

فروعی اختلاف کی حیثیت

اسی طرح عام مسلمانوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسائل اور ان میں علماء کے جزوی اختلافات کو مناقشات اور جدال ونزاع کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اس قسم کے اختلافات امت کے لئے آسانیوں کا ذریعہ بنائے گئے ہیں نہ کہ نزاعات اور مناقشات کا' اس لئے عملاً و اعتقاداً جمہور سلف وخلف کا دامن تھام کر دوسری جانبوں سے مصالحت اختیار کریں اور لڑنے اور لڑانے کی خو پیدا نہ کریں۔

آج امت کے بہت سے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جو ان کی ہیئت اجتماعی کے متقاضی ہیں اور یہ ہیئت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اسے اس قسم کے فروعی اختلافات میں بصورت گروہ بندی ضائع نہ کیا جائے۔

خوشی کی لہر

آخر میں میں دونوں جانب کے بزرگوں اور بالخصوص فریقین کے نامبردہ اکابر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گذارشات کو پوری توجہ اور التفات خاطر اور سمع قبول کے ساتھ سنا اور ملت کو بہت سے مفاسد اور مہالک سے بچالیا'

فجزاهم الله عني وعن جميع المسلمين خير الجزاء -

اس نئی اصلاحی صورت کا سب سے زیادہ شاندار مظاہرہ راولپنڈی کے اس عظیم الشان جلسہ عام میں ہوا جو احقر کی تقریر کے سلسلے میں مدرسہ حنفیہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک بڑے میدان میں زیر صدارت حضرت مولانا خیر محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان منعقد کیا گیا تھا۔

احقر کو منظوم سپاسنامہ دینے سے جلسہ کا آغاز ہوا اور احقر کی تقریر شروع ہوئی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی ___ تقریر کے آخر میں احقر نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس نزاع کے ختم ہونے کی بشارت تفصیل سے سنائی۔ جس سے عوام میں خوشی کی اک بے پناہ لہر دوڑ گئی اور ان ہزارہا انسانوں کے ہجوم نے بے تحاشا تبریک وتہنیت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے جس سے فضا گونج اٹھی۔

اعتراف شخصیت

ختم تقریر پر ایک جانب مولانا غلام اللہ خان صاحب نے اور دوسری جانب سے مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے اپنی تقریروں سے اس بیان کی توثیق کی اور نہایت فراخدلانہ اور مخلصانہ لب ولہجہ سے فرمایا کہ ہم نے مہتمم دارالعلوم کے درمیان میں پڑجانے سے اس مسئلہ کی نزاعی صورت حال کو ختم کردیا ہے اور جو چیز ہمیں ناممکن نظر آرہی تھی وہ اس شخصیت (احقر ناکارہ) کے درمیان میں آجانے سے نہ صرف ممکن ہی بن گئی

بلکہ واقعہ ہو کر سامنے آ گئی اور ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مہم کو مہتمم دارالعلوم ہی کی شخصیت انجام دے سکتی تھی جس میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے علمی و مذہبی مرکز کی سربراہی کی نسبت موجود ہے جو ہم سب کا مرکز قلوب ہے اور دوسری طرف بانی دارالعلوم حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی وہ قاسمی نسبت موجود ہے جو پوری قاسمی برادری کو اس پر متحد کئے ہوئے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے سوا دوسرے سے یہ مہم انجام نہیں پا سکتی تھی۔

جذبات مسرت

بہر حال ہم نے اس نزاع کو ختم کر دیا ہے اور ہم اس بارے میں عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں ___ ان دو تقریروں کے بعد یہ ہزاروں آدمیوں کا عظیم اجتماع جذبات مسرت سے ابل پڑا اور اس نے "مہتمم دارالعلوم زندہ باد" "دارالعلوم دیوبند زندہ باد" اور "علماء دیوبند زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کئے' کئی منٹ تک فضا نعروں سے گونجتی رہی اور مجمع میں جذبات مسرت کی ایک عجیب حرکت تھی جس سے مجمع متموج دریا کی طرح متحرک نظر آ رہا تھا اور نعروں میں تقریریں بند ہو گئیں۔

بالآخر جلسہ شاندار کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جو تحریک احقر کے قلم سے کراچی سے شروع ہوئی تھی وہ ملتان' سرگودھا اور جہلم میں اپنے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی راولپنڈی میں حد اتمام تک پہنچ گئی۔

خدائے برتر توانا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چار سال کی مکدر فضا صاف ہوئی اور اس کے المناک آثار روبہ زوال نظر آنے لگے۔

الحمد للّٰہ اولاً واٰخراً۔

حق تعالیٰ اس یگانگت کو پائیدار اور برقرار رکھے اور مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ دین ملت کے اہم کاموں کو جزئیات فرعیہ کے مقابلے میں اہم سمجھتے ہوئے اپنی جماعتی قوتوں کو ان پر لگائیں۔

احقر محمد طیب غفرلہ

(۲۴/۶/۱۹۶۲ء)

مولانا مدنی قدس سرہ

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں
اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم

آہ! صد آہ! کل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے' آج مولانا مدنی قدس سرہ کہہ رہے ہیں مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ' العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دار دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور وابستگان کو غم و اندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقام کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیا کی سب سے بڑی جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر' جمعیت علماء ہند کے صدر' جماعت دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعت دیوبند کی صد سالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی' دینی' روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمہ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۹۵۷ء ہی پر انتہا ہو گئی۔ اور

۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہو گیا۔

کمال جامعیت

حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے۔ جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور اٹھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم وثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ، علم وبصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی، آپ نے آج کے لادینی مادی دور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص وعوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون و آداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری وباطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے جو اس مرکز علم وفن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی، آپ اپنے اساتذہ وشیوخ کے ابتداء ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر وشیوخ انہیں اطمینان واعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے، اس لئے آپ مختلف ماہر فن اساتذہ وشیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، ادب وخطابت، منطق وفلسفہ کی مہارت وحذاقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی۔

آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔

باطنی سلسلوں میں پارسائی، پاکیزگیٔ نفس، تقویٰ وطہارت، ضبط اوقات، تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی وقومی مشاغل کے ان کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک سہل ممتنع مشغلہ تھا۔

حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ ”ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہو“ آپ کی ذات گرامی میں عملی صورت سے ہروقت نمایاں رہتی تھی۔

ایک حسین امتزاج

مادی دنیا سامان راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اس کی راہنما اور مربی نہ بنے، حضرت ممدوح کی ذات ان دونوں سائنسوں کا ایک معتدل امتزاج تھی، آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے رہتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درس حدیث وقرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے، ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ ان کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کر سکتا تھا۔ دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی، اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں سے

احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع ان کی کام نصب العین تھا۔ اسی لئے آپ نے درس و تدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کا میدان بھی سر کرلیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کر دکھلایا۔ اس جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندو بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا' اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتی کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا' ان کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عزت و عظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہر و باطن کے معترف رہے۔

شیخ العرب والعجم

حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب و عجم میں پھیلا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پاکر حرم نبویؐ میں درس قرآن وحدیث اور تدریس علوم و فنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمہ علوم نبوت میں بیٹھ کر علوم نبوّت کی خدمت کی۔ جس سے عرب و عجم کی لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے' آخر کار عمر کے آخری حصہ میں ۳۳ برس کامل دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر فائز رہ کر مشرق و مغرب کے لوگوں کو علوم کے آب حیات سے سیراب فرمایا۔

سیاسی نقطۂ نظر

ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے۔ جنہوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ آپ اس سلسلہ میں حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی سیاسی فلسفہ و حکمت کے امین اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے۔ جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور آخر کار جانشین شیخ الہند ہی کے لقب میں یاد کئے جانے لگے' آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں راہنما ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں ___ اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی جس کے لئے انہوں نے اپنی محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیا اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے۔ جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیا کے قصر آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔

چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیا بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔ پھر اس ترقیٔ آزادی کی وہ روح جو ان کی روح میں پیوست تھی، صرف سطحی آزادی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط و اقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی' لامذہبیت' دہریت' الحاد' بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستان کو اجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے کبھی نہیں مٹ سکتی اور اس فاسدہ مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تندرستی

اور اس کا اصل سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آسکتا انہیں یقیناً یہ احساس تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی۔ لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضا ہو گا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزوی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہر حال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی بھی اور اس کی روح اخلاقی اسی لئے جہاں آزادی کی جنگ ان کے دست وبازو کا اثر تھی' وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرت الہیہ کی عطا فرمودہ حدود وقیود کے دائروں میں انہیں محدود ومتقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی ان کے عمل کا ایک مستقل محاذ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق ومغرب کے مزاج الگ الگ ہیں لیکن فوجی اقتدار کے غلبہ نے مشرق کے مزاج کو فاسد کر دیا ہے۔ اگر یہ بیماری رفع ہوگئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلامؒ نے اپنے بزرگوں کی ظاہر وباطنی رہنمائی میں کام اور علم وتحقیق کا ایک نیا باب کھولا۔

اس طاقت ور نصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلادیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہر حال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیا ومشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ ان میں خاطر خواہ ابھر آیا۔

آج مغرب کی طاقتیں اگر کلیۃً نہیں ٹوٹیں تو ان کی توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والے ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال حضرت شیخ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی' ایشیا کی آزادی اور آخر کار اخلاق وانسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں ان کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جوہری قدریں کبھی نہیں ابھر سکتیں۔

مرکب نصب العین

اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے تو دوسری طرف جمعیت علماء ہند کے صدر بھی تھے اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دار العلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب وسنت کی ترویج میں بھی اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشیں بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح وتربیت اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم قانت بنانا ان کا نصب العین تھا۔

کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑے رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا جس کی سطح سیاسی اور ماہیت اخلاقی تھی۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کی بابت رائے قائم کی وہ رائے صحیح اور واقعاتی رائے ثابت ہوئی۔

منارۂ نور

بہر حال حضرت شیخ اس دور الحاد وبے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے اور اگر بقول امیر امان اللہ خان

سابق بادشاہ افغانستان :

"شیخ الہند مولانا محمد حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اس نور کی ضیاء اور چمک تھے"۔

یہ نوران سے منتشر ہو کر ان کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کار فرما ہوتی تھیں۔ منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تر یہ کہ اس جوش وجلال کے باوجود نہ ان کی محبوبیت میں فرق آتا تھا مطلوبیت میں۔ کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے تھے۔ جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۵۸ کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور ۲ بجے کے قریب روح پر فتوح اس جسد خاکی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاوداں ہو گئی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی۔ بعد مرون چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی ___ روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا' لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آسکتی' جو یقیناً مقبولیت عند اللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشاشت وطمانیت کی کھلی علامت تھی۔ جو مقبولیت زندگی میں وہی موت کے بعد بھی ہے مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔ حتی کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آناً فاناً ہوا پر دوڑ گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہند وبیرون ہند سے تعزیتی فون' تار' اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کے دار العلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے ابل پڑا' ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہو گیا' لوگ جس شخصیت کے اردگرد پروانہ وار جمع رہتے تھے اب اس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وابستگان حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقتہً مرتے ہی نہیں' صدیاں گذر جانے پر بھی دلوں میں ان کی روح دوڑتی رہتی ہے اور ان کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے۔ جس کی بناء ان کا پیکر یا جثہ نہیں ہوتا جو مٹ جاتا ہے۔ بلکہ ان کی معنویت ہوتی ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں' اس لئے موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مر کر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

معنوی معیت

آج حضرت مدنیؒ ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں جبکہ ان کا مشن موجود' ان کا نمونہ عمل موجود' ان کا علم موجود' ان کی مجاہدانہ کارنامے موجود اور ان کی محبوبیت موجود' اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبت عظیمہ ہے وہیں ان کی معنوی معیت وجہ سکون و قرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے' ان کی معنویت موجود' اس سے استفادہ اور اس کا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار و تسلی ہو گا۔ اور ایصال ثواب کے ذریعے حضرت

مرحوم کے لئے وجہ سرور وانبساط ہوگا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اور ان کے حق میں سکون وراحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گذر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اسے دعاء وایصال ثواب میں یاد رکھتا ہے اس لئے غم غلط کرنی اور حضرت اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہو سکتا بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمربستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہ حضرت رحمہ اللہ علیہ کے مراتب ودرجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل' اجر جزیل اور ذوق تعمیل عطا فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئیں کہ ان سطروں میں ان کے مناقب کب آسکتے تھے' بلکہ محض غم اور دل کو ہلکا کرنے اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے ذکر اور یاد سے **اذکروا محاسن موتاکم** کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرت مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روانہ رکھا جائے۔

وھو الباقی من کل شیٔ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انٹرویو

قندیل راہنمائی

انسانی عظمت کی تعریف اور تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کوئی دولت مند آدمی کو بڑا مانتا ہے' کسی کے نزدیک سیاست دان اور ارباب اقتدار بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کوئی بڑی بڑی علمی ڈگریاں اور فنی ڈپلومے حاصل کرنے والوں کو بڑا سمجھتا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عظمت کی کسوٹیاں بناتا ہے لیکن بڑائی کا جو معیار مولانا قاری محمد طیب کو دیکھ کر دستیاب ہوتا ہے وہ اتنا جامع اور واضح ہے کہ اس کے بعد عظمت کا مفہوم تشریح طلب نہیں رہتا اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ خدائے ذوالجلال سے جو شخص جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو سب سے بڑی لاثانی اور لافانی ہے۔

قاری محمد طیب عشق الٰہی کی تصویر اور خلق خدا کی ہدایت کے لئے راہنمائی کا نور ہیں۔ وہ علم و عمل کا جیتا جاگتا پیکر ہیں۔ دینی علوم پر ان کی نظر عالمانہ ہی نہیں محرمانہ بھی ہے۔ انہیں قدرت نے قرآن فہمی کی غیر معمولی استعداد بخشی ہے۔ علم حدیث میں ان کے ادراک کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ تاریخ کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ زمانے اور زندگی کا ہر اتار چڑھاؤ جانتے ہیں اور قدیم وجدید کا ہر تیور پہچانتے ہیں۔ خطابت ان کی لونڈی ہے۔ لاکھوں کے مجمع میں بولتے ہیں تو پورا مجمع خاموش ہو کر یوں گوش بر آواز ہو جاتا ہے جیسے دور دور تک کوئی متنفس موجود نہ ہو۔ کوئی سا موضوع ہو وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے بے تکان تقریر کرتے ہیں اور فکر و نظر کے دریچے کھولتے چلے جاتے ہیں۔

یہی محاسن ہیں جن کی بدولت وہ محض دارالعلوم دیوبند ہی کے لئے نہیں' پورے عالم اسلام کے لئے قندیل راہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلام پاکستان کی تقدیر ہے۔

پاکستان اسلام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

اسلام ہی زندگی کا وہ واحد اور کامل دستور ہے جو پورے اعتماد سے ہمارے مادی اور روحانی تقاضے پورے کرتا ہے۔

جب تک اسلام نافذ نہیں ہوگا۔ ہم زبوں حال رہیں گے۔

نفاذ اسلام کا مرحلۂ ترتیب

یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے خیالات کا اظہار بڑی مدت سے بھی مسلسل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اصل

سوال یہ ہے کہ اسلام کس طرح اور کس مرحلہ وار ترتیب سے نافذ ہو؟ یہ آج کے دور کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ خوش قسمتی سے قاری محمد طیب گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے۔ تو خیال گزرا کہ متذکرہ بالا سوال پر ان کے علم ونظر سے استفادہ کیا جائے۔

یہ خواہش ہمیں کشاں کشاں قاری صاحب تک لئے گئی۔ وہ ملتان روڈ کے ایک مکان پر تشریف فرما تھے۔ آس پاس بہت سے عقیدت مند بیٹھے تھے۔ میں نے قاری صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تو بڑی شفقت اور بے تکلفی سے میری سوالوں کا جواب مرحمت فرمانے لگے۔ اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں فرمایا :

"فی زمانہ اسلام کے نفاذ کا دارومدار دو باتوں پر ہے :

(۱) اجتماعی سطح پر حکومت وقت قدم اٹھائے، مروجہ قوانین کا جائزہ لے اور وہ تمام قوانین یک قلم منسوخ کردے جو قرآن وسنت کے منافی یا ان سے متحارب ہوں مزید برآں ایسے قوانین بنائے جائیں جن کا مقصد کلی طور پر دین کا نفاذ اور اس پر عملدرآمد ہو۔

(۲) انفرادی سطح پر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی جلوہ گاہ بنائیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام الٰہی پر دل کی گہرائیوں سے کاربند ہوں۔ رہن، سہن، شادی، بیاہ، خوشی، غمی، خرید و فروخت، لین دین غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہی احکام کی پابندی کریں، جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور ان چیزوں سے باز رہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے"۔

علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت

ان دونوں امور کی تشریح کرتے ہوئے قاری صاحب نے بتایا کہ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، اس لئے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ دینی علوم کو اس قدر عام اور سہل الحصول بنادیا جائے کہ کوئی بھی دین سے ناآشنا نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص عالم فاضل ہی بنے تاہم یہ ضروری ہے کہ دینی فرائض کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو بھرپور معلومات ہونی چاہئیں، اگر کوئی کسی معاملے کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو وہ اہل علم سے رجوع کرے اور درپیش معاملے میں راہنمائی حاصل کرے۔

قرآن کریم کے سترھویں پارے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

"اگر تم نہیں جانتے تو اہل دانش سے دریافت کرو"۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ لگن پیدا کی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھیں جب دلوں میں یہ لگن پیدا ہوجائے گی تو وہ یقیناً عالمان دین سے رجوع کریں گے، جب وہ دینی تقاضوں سے آگاہی حاصل کرلیں گے تو اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ اس طرح ماحول اور معاشرے میں خود بخود اصلاح کے رجحانات پیدا ہوں گے اور یہی رجحانات فلاحی برگ وبار لائیں گے۔ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی صحابہ کرامؓ کا طرز عمل یہی تھا۔ وہ جس چیز کے بارے میں لاعلم ہوتے تھے اس کا ایک ایک پہلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرتے تھے اور پھر اسے حرز جان بنالیتے تھے۔

قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ماحول ٹھیک نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں ہوگا اور ماحول اسی صورت میں سنور سکتا ہے جبکہ پوری قوت اور مکمل فرض شناسی سے کام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ماحول بہتر بنانے کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور دین پر عمل پیرا ہونے کا کام اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کرے۔

کسی محلے میں اگر ایک گھر عملاً اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن جائے تو وہ گھر چراغ راہ ہو جاتا ہے جس کی کرنیں پڑوس کے گھروں کو بھی منور کرنے لگتی ہیں۔ سعادت اور فلاح کے دیئے اس طرح دھیرے دھیرے جلتے ہیں۔ جب ایک گھر میں اسلامی تعلیمات کی برکتیں جلوہ گر ہوں گی تو دوسرے گھرانے اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے یوں گلی گلی، محلے محلے، قریہ قریہ اور شہر در شہر دین کا اجالا پھیلتا چلا جائے گا۔ حتی کہ پورا ماحول اور معاشرہ دینی رنگ میں ڈھل کر بقعہ نور بن جائے گا۔

نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری

قاری صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر چیز کی ذمہ داری حکومت وقت کے کندھوں پر ڈال دینا درست نہیں، نجی گھریلو، اور خاندانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا انقلاب لانا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے۔ جس میں کوئی خلل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر فرد اپنی ذات اور خاندان میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ اٹل کر لے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے یا اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ لہٰذا اسلام کے عملی نفاذ کی پہلی اور بنیادی ذمہ داری فرد پر ہے۔

قاری صاحب نے کہا کہ آج کل ایک افسوسناک حالت یہ ہے کہ

ہر یکے　　ناصح　　برائے　　دیگراں

لوگ خود تو نیک عمل کرتے نہیں۔ البتہ دوسروں کو نصیحت کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں، نیک عمل سے گریز مگر نیکی کی زبانی تبلیغ کار بے خیر ہے۔ کیونکہ قول مؤثر نہیں ہوتا، اصل اور مؤثر قوت عمل ہے، صرف عمل۔

لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ پہلے وہ اسلامی معاشرت، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا علم حاصل کرے اور پھر اس کا عملی نمونہ بن جائے۔ اکل حلال کو اپنی زندگی کے لئے لازم جانے اور حرام کی کمائی سے دور بھاگے ___ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائے گی اور جب مسلمان اچھی طرح دینی رنگ میں ڈھل جائیں گے تو پھر حکومت کا کام معمولی رہ جائے گا۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت ہی سے ہر مطالبہ کرنا سراسر غیر ضروری ہے۔ حکومت تو صرف اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کا اقدام یا اہتمام کر سکتی ہے۔ اولین ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو دینی معاشرت کا سچا نمونہ بنالیں۔

نفاذ اسلام میں حکومت کا کردار

جہاں تک اجتماعی سطح پر حکومت کے کردار کا تعلق ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف قرآن اور سنت کو ٹھہرایا جائے، عوام قانون پر چلتے ہیں لہٰذا ایسا کوئی قانون نہ تو برقرار رہنا چاہئے اور نہ

ہی آئندہ بننا چاہئے جو منکرات پر مبنی ہو یا قرآن وسنت کے احکام کی نفی کرتا ہو۔

ثانیاً حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس کے ابتدائی مدارج میں دینی عقائد' اخلاق اور معاملات کی کماحقہ' تعلیم دی جائے' پرائمری اور ہائی اسکولوں میں طلباء کو وہ دعائیں اور ان کا مفہوم یاد کرایا جائے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ اگر ہر بچے کو ایک ایک دعاء چار چار روز میں بھی یاد کرائی جائے تو چھ مہینے میں وہ ساری دعائیں اچھی طرح یاد کر لے گا۔ ان دعاؤں کی پہلی اور لازمی برکت یہ ہوگی کہ عملی توحید کا رنگ قائم ہو جائے گا اور ہماری نئی پود کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ شروع ہی سے راسخ ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ چیز اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطۂ نظر

اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ :

اسلام' انسان کی بنیادی ضرورتوں کا مکمل حل پیش کرتا ہے' شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب البدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے تین چیزیں لازماً درکار ہیں۔

(۱) کسرہ خبز ___ روٹی کا ٹکڑا۔
(۲) قطعہ ثوب ___ بدن ڈھانپنے کا کپڑا۔
(۳) قطعہ ارض ___ رہنے کے لئے زمین کا ٹکڑا۔

اسلام کسی فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضرویات سے محروم نہیں دیکھتا' لوگوں کو رزق رسانی کے سلسلے میں اسلامی نظام کا حال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کمر پر غلے کی بوری لاد کر ضرورت مندوں کے جھونپڑیوں تک پہنچایا کرتے تھے' جہاں تک کامل مساوات کا تعلق ہے تو وہ ایک غیر فطری چیز ہے۔ اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے۔ وہ کسی کا حد سے زیادہ امیر یا حد سے زیادہ غریب ہونا پسند نہیں کرتا' اس سلسلے میں اسلام کی غرض وغایت یہ ہے کہ جو لوگ دولت کے اعتبار سے بہت بلندی پر ہیں کچھ نیچے اتارا جائے ہے اور جو مفلوک الحال انتہائی پستیوں میں ہیں انہیں کچھ اوپر اٹھایا جائے اس طرح توازن اور اعتدال کی فضا قائم کی جائے۔

اتحاد مسلم

مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی ضرورت واہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ :

''مسلمانوں کے تمام فرقوں میں گہرا اتحاد بے حد ضروری ہے۔ ضمنی اختلافات کے باعث مسلمانوں کا آپس میں کوئی رنجش رکھنا سخت افسوسناک اور بے جواز چیز ہے۔ کیونکہ ہمارا دین ہمیں جڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کٹنے اور بچھڑنے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں وحدت کے اسباب بے پناہ ہیں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں مقابلہ ومجادلہ نہ کرو' لہٰذا ضروری ہے کہ ہر فرقہ مثبت اور معروف پہلو پر اکٹھا ہو جائے اور ملت اسلامیہ کے مشترکہ مشن میں تعاون کرے۔ جہاں

تک تمام فرقوں کے اپنے اپنے جداگانہ لیکن ضمنی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ ان پر اپنی اپنی حدود میں عمل پیرا رہ کر بھی مضبوط دینی وحدت بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے اہم شرط یہ ہے کہ منفی انداز فکر ترک کر کے تکفیر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخدلی اور وسعت قلبی کا تھا۔ آپؐ کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ سرداران قریش کی تکریم کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیا کرتے تھے' جب ہمارے آقائے نامدار کا یہ سلوک کفار کے ساتھ تھا تو ہمارا اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ محتاج وضاحت نہیں''۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کے حالیہ اقدامات کے بارے میں استفسار پر قاری صاحب نے کہا کہ جو شخص یا جو حکومت اسلام کے عملی نفاذ کا اہتمام کرے گی وہ ہر حال میں قابل تکریم قرار پائے گی۔

اکابر دیوبند کا مشن

مزید فرمایا کہ :

دین کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول مقبولؐ سے محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے :

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنی اولاد' والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے' مزید فرمایا کہ اکابر دیوبند کا مسلک اور مشن یہی تھا' جس کے لئے وہ مدت العمر کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی جانیں اس مشن کی خاطر کھپا دیں''۔

ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر

ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں قاری صاحب نے بتایا کہ دینی غلبے اور اسلامی حمیت کے لحاظ سے وہ روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آواز میں یکسانیت اور خود اعتمادی کا لہجہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ سابق بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی صاف صاف یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئیں کہ ہم مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔

بات مزید آگے بڑھی تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اہل پاکستان کی ترقی اور فلاح کے لئے دعا گو ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں سے ان کی محبت قدرتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ مسلمانان ہند پوری عالم اسلام کے لئے دردمندی کے جذبات رکھتے ہیں اور پاکستان عالم اسلام کا ایک اہم ملک ہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ایک دوسرے کے رشتہ دار شروع ہی سے موجود ہیں اس لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں کی خوشحالی کی دعاء مانگتے رہتے ہیں۔ پھر پاکستان کے لئے ان کی خیر اندیشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نہایت قریبی ہمسائے ہیں اور دو آزاد اور خود مختار ہمسایہ ممالک کو جس انداز اور اخلاق سے رہنا چاہئے۔ اس کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے

لئے خیر خواہی کے جذبات تازہ اور بیدار رکھیں۔

حضرت مدنیؒ اور قیام پاکستان

شاید بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قاری صاحب اپنے عظیم مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے انداز فکر کی پیروی میں قیام پاکستان کے حامی تھے ___ ماضی کی کچھ باتیں چھیڑیں تو راقم نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلامؒ کے سیاسی افکار کا تذکرہ کیا اور قاری صاحب سے عرض کیا کہ مولانا مدنیؒ اور مولانا ابوالکلامؒ اپنی دینی وجاہت اور جہاد حریت کے باعث ہمارے ماضی کی رونق ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں قیام پاکستان کے خلاف تھیں ___ آخر کیوں؟

اس پر قاری صاحب نے فرمایا کہ فکری اور نظری اختلاف کسی بھی معاملے پر ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ حضرت مدنیؒ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔ تاہم جب پاکستان بن گیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ اب پاکستان کو مضبوط بنایا جائے۔ حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اس کی ساخت بناوٹ اور موقع محل پر مختلف آرا ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر اس کی تقدیس کا خیال ہر دم لازم ہے۔ پھر مسجد کے بنانے یا نہ بنانے پر بحث نہیں کی جا سکتی یہی حال قیام پاکستان کا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ اب چونکہ پاکستان قائم ہو گیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میری رائے کا اختلاف بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب خدا تعالیٰ پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنائے۔

مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان

مولانا ابوالکلامؒ بٹوارے کے بعد پاکستان کے لئے کیا جذبات رکھتے تھے ___؟ اس سلسلے میں قاری صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی معرفت پیغام ملا کہ مولانا ابوالکلام مجھے یاد فرما رہے ہیں۔ میں دہلی پہنچا اور سیدھا ان کے دفتر گیا۔ مولانا اپنے روایتی اخلاق کے مطابق نہایت تپاک سے پیش آئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیوں یاد فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اب پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھے اور لائق لوگ پاکستان چلے جائیں اور اس نوزائیدہ مملکت کا نظام سنبھال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

اتنا فرمانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ اگر پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں بخوشی آپ کو بھجوانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ اس بارے میں آپ کو بلا جھجک اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہئے۔ لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ طور پر پاکستان ہائی کمشنر سے ملاقاتیں کی جائیں۔

قاری صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم کی یہ باتیں سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور ان سے کہا کہ یہ قطعی غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ اس پر مولانا ابوالکلامؒ سوچ میں ڈوب گئے میں نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی نے حکومت کو ہمارے بارے میں جان بوجھ کر یا نادانستگی میں غلط اطلاع دی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چندہ جمع کرنے والے سفیر چندہ کے سلسلہ میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اور اسی ضمن میں انہوں نے ہائی کمشنر سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔ سی آئی ڈی والوں نے اس بات کو زیب داستان کے لئے بڑھایا اور یہ افسانہ بنا ڈالا کہ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ جب یہ حقیقت مولانا کے علم میں آئی تو وہ بہت متأسف ہوئے اور انٹیلی جینس

کے عملے پر بڑا ملال ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ یہی سی آئی ڈی کے جھوٹے لوگ تھے۔ جو ہمارے بارے میں بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

خدا حافظ

قاری صاحب باتوں باتوں میں فکر و نظر اور علم وخبر کی پھول لٹا رہے تھے' خاص وقت بیت چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی پھیلتی چلی جارہی تھی اور راقم نے اجازت چاہی تو انہوں نے شفقت و مرحمت کے ایک نادر لمس کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور گراں قدر دعائیں دے کر خدا حافظ کہا اور میں یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ قاری صاحب ۸۶ برس کے لیل ونہار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ایسی عظیم اور فیض رساں شخصیتوں کو تادیر زندہ اور باعث برکت بنائے رکھے۔ (آمین)

از شاعر شیریں مقال جناب انور صابری (مرحوم)

حکیم الاسلام **حضرت مولانا محمد طیّب صاحب** (قدس اللہ سرہ العزیز)

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخش علوم تو ہے\
تری جبیں پر جبینِ قاسم کی دل نواز وحسین ضو ہے

تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کر دیا ہے\
"حکیم الامت" نے اک نظر میں حکیم الاسلام کر دیا ہے

خدا کے فضل وکرم سے دین کا مقامِ محمود مل گیا ہے\
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے

ترے تفکّر میں قرنِ اوّل کی عظمتوں کا نشان ملے گا\
تری خطابت میں عبرتوں کا تصوّرِ جاوداں ملے گا

مری نظر میں نئے زمانے کا فخرِ مصر و حجاز تو ہے\
کیا جسے منکشف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے

رشید کے باغِ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے\
ملا دوامِ بہار جس کو گلِ ریاضِ رسول تو ہے

فریضۂ حج کے بعد آ پنے وطن میں باعزّ و شان آیا\
لئے ہوئے دل میں معرفت کا تخیّل نوجوان آیا

جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگ اعزازِ دیں بڑھایا\
رہے گا تا عمر تیرے سر پہ خدا کی رحمت کا خاص سایہ

حوادثِ دہر تیری شہرت زندگی بھر مٹا سکیں گے\
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

افاداتِ علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز
کے علمی جوابات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

حامداً ومصلیاً

حُسنِ نیّت سے حرام، حلال نہیں بنتا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا۔ مثلاً لاکھ دو لاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطورِ قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے سودی قرض لیتا ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تاکہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

حضرت حکیمُ الاسلام نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اجتہادی یا فروعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے :

اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (القرآن)

”اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا“۔

سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہے گا۔ اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبالِ جان بنے گی دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ کسی عمل کے لئے محض نیّت کی خوبی کافی نہیں جب تک کہ وہ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو۔ اچھی نیت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیت کا کوئی اعتبار ہوگا۔

جب دو چیزیں تھیں بیع اور سود۔ ایک کو حلال قرار دیا اور ایک کو حرام۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں۔ خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا کریں، اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگادیں۔ خواہ ایک شخص وکیل بن جائے۔ سب کی طرف سے نفع و نقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو

رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ رأس المال کو بھی حرام اور ناجائز کردے تو اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہنچے گا۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو ___ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہنچے، لیکن وہ تو شریعت کے مکلف ہی نہیں مگر جو لوگ شریعت کے مکلف ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر بھی ہے۔

پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اور اس پر اعتماد بھی کر لینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کے بجائے دَرپردہ دشمنی ہے۔ دنیاوی بھی اور اُخروی بھی۔

عملِ مشروع میں ہی حُسنِ نیّت کا اعتبار ہے

لہٰذا کسی کام کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں۔ اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی نفع ہوگا۔ تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر ماردی جائیں گی تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے عمل کی خوبی بھی تو ضروری ہے۔ حسنِ عمل یا عملِ صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اخلاص اور حسنِ نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی ہو جو شریعت سے ثابت ہو۔

اسی لئے سورہ ملک میں فرمایا گیا ہے :

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (القرآن)

برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی وہ ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی۔

کسی کو وجود دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مردہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ ڈور۔

عالم میں یہ تغیّرات، موت، حیات، نعمت، سلبِ نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی :

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

تاکہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا برا۔

جب تم اس کے ملک میں ہو، اس کے اقتدار کے نیچے ہو، اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کے حکم کی اتباع کرو گے یا نہیں۔ اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیّرات رکھے ہیں تاکہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں احسن عملاً کون ہے۔

عملِ صالح کی دو بنیادیں

احسن عملاً کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے کی ہے کہ اَیْ اَخْلَصُهٗ وَاَتْبَعُهٗ، حسنِ عمل اور عملِ صالح وہ ہے کہ خالص ہو، رضاء خداوندی کے لئے اخلاص کے ساتھ ہو مخلوق کی رضاء یا اپنی رضاء نفس شامل نہ ہو۔

اگر رضاء خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت بالسّنَد ہو اور بطریقِ صواب ہو یعنی اس نہج پر ہو جس طرح شریعت نے بتلایا ہے۔ تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں۔ ایک اخلاص للہ اور ایک اتباعِ سنت۔

اخلاص للہ کو جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی برحق ہے۔ اسی کا حکم ماننے کے قابل ہے۔ اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جُز محمد رسول اللہ سے نکلتا ہے۔ اتباعِ سنت۔ اس لئے کہ بطریقِ صواب وہی ہے۔ جس کو سرکار دو عالمؐ نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپؐ کے متبعین حضراتِ صحابہؓ کا تعامل ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ شامل ہو گا وہی عملِ صالح ہو گا۔

عمل صالح اسے نہیں کہتے کہ میں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے۔ رفاہِ عام کا کام کیا۔ بہت ہی عمدہ کام کیا۔ ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عملِ صالح نہیں بنے گا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے بلکہ عملِ صالح بنتا ہے دو بنیادوں سے۔ ایک بنیاد ہے اخلاص لِلّٰہ اور دوسری بنیاد ہے اِتباعِ سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباعِ سنت بھی ہے وہ عملِ صالح ہو گا۔

شرک وبدعت کی بُنیاد

اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضائے خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہو گئی۔ یا نفس کی رضا مخلوط ہو گئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا۔ اس لئے جس درجۂ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہو گی۔ شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاوے گی۔ اور شرک فی العمل ہو جائے گا۔

محمد رسول اللہ کے معنیٰ ہیں کہ اتباع ہو رسالتِ خداوندی کا۔ اب جس درجۂ اِتباع میں کمی آتی جائے گی اسی درجۂ ابتداع اور بدعت کی بنیاد پڑتی جائے گی' جو شرک تک پہنچائے گی تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں اخلاص اور اِتباعِ سنت اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں۔ شرک اور بدعت۔ لا الٰہ الا اللہ میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا ہوتی ہے۔

اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ شامل ہے یا نہیں جس پر اس کا ایمان ہے۔ اگر ہے تو عملِ صالح ہے۔ نہیں تو پھر وہ عملِ طالح۔ تو ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحۃً ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا۔ وہ کام رضاء حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیرباد کہہ دیا کہ وہ رسالت کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہو گی۔

اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے اس لئے کہ معدہ ہی درحقیقت حوض بدن ہے۔ اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معدہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہو گی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو' پیروں کو' منہ کو ٹانگوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے۔ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے۔ عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی کس قدر خوشبو ہے۔

ابتداء سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو اور ہر عمل میں اِتباع کا دخل ہو' ایمان میں کمی آئی' شرک پیدا ہوا۔ اتباع میں کمی آئی اور بدعت پیدا ہوئی۔ اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پہلے ہی خیرباد کہہ دے۔ یہ ہمدردی کیا ہوئی۔ یہ تو نہ اپنی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

قوم کے اخلاق کا تحفظ

محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذائیں پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنانا' کمینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کون سی ہمدردی ہے۔ للذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع کیا محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہئے کہ تاکہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق پیدا نہ ہوں اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

اگر اس کی غذا لقمہ صحیحہ ہے تو اخلاق صحیح ہیں' لقمہ ناپاک ہے تو اخلاق بھی ناپاک ہیں۔ اس لئے ہم نے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں ہے کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو۔ پہلے اس سے توبہ کرو' جب بیعت کریں گے اس لئے کہ جب غذا ہی تمہاری مشتبہ ہوگی تو ذکر اللہ تمہارے اندر کیا اثر کرے گا۔ اگر اللہ کا نام لو گے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہوگی۔ اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی ظرف چاہتا ہے ناپاک ظرف کے اندر پاک چیز نہیں بھری جاتی۔ وہ بھی ناپاک بن جائے گی تو غذا پر اور اکل حلال پر دارومدار ہے اخلاق حسنہ کا۔

ظلمتِ اخلاق

اسلام نے سب سے زیادہ زور اَکلِ حلال پر دیا ہے۔ اس لئے جتنی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حُرمت پیدا ہو۔ کوئی ناجائز شکل پیدا ہو۔ ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا۔ سود کو حرام کردیا۔ اِحتکار کو حرام قرار دے دیا۔ اِحتکار کے معنیٰ ہیں گرانی کی امید پر مال کو روک رکھنا۔ اِحتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے۔ اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ "کرہی" ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اِشتباہ پیدا ہو۔ کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلِم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے۔ دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے۔ وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد میں بھی گندگی آجائے گی۔ وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہوگا۔ اسی لئے مقصودِ اصلی آخرت ہے۔ گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے۔ اس کے قواعد بنادیئے ہیں کہ جائز طریق پر کمائیں۔ جائز طریق پر خرچ کرو۔ ناجائز اور حرام' مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچو۔ نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی' اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے۔ عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے

اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کردیں' یا

صریح حرام چیزیں داخل کردیں تو اس سے برکت کیا ہوگی بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے۔ غلاظت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی خیر و برکت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تاکہ قوم کو فائدہ پہنچے۔

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے جائز شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔ مضاربت کی صورت کرلیں۔ دو چار افراد اپنی تجارت میں لگادیں اور حسب رقم اس کا منافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی ___ آخر اس کے کیا معنیٰ ہیں کہ مسلمان نفع کمائے تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے جبکہ وہ اللہ اور رسول ؐ کو مانتا ہے۔ اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز اور حلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو تو بھید یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب! سود سے کریں گے قوم کی خدمت کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی۔ ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

حرام میں شفا نہیں

بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے :

ان اللّٰہ لم یجعل شفاءکم فیما حرّم علیکم

اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی۔ جو دوائیں حرام ہیں۔ شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جوا ہے، ان میں شفا نہیں ہے۔ اگر ظاہری طور پر شفا ہوئی بھی تو روح اتنی بیمار ہوگی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہوگا۔ پھر بیمار پڑے گا جب مادی امراض کی شفا بھی حرام میں نہیں تو روحانی امراض کی شفا کیسے ہوجائے گی۔ حرام کے اندر، اور وہ بھی قطعی حرام، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہئے۔ نیت نیک ہے۔ جذبہ نیک ہے۔ پھر قومی خدمت کرے۔ تو کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت میں ہو۔ ذرا سا تغیر کردو وہی نفع رہے گا۔ مگر جائز بن جائے گا۔

متبادِل صُورت

تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سا تبدیل کر کے حدِ جواز میں لے لیا جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔

تو مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ معاملہ ہو۔ اطاعت ہو، عبادت ہو، اس میں حرام و مکروہ سے بچ کر حدِ جواز کی طرف آئے۔ یہی معنیٰ اس کے اسلام کے ہیں ورنہ تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا رہ گیا۔ وہ بھی سود خور، تم بھی سود خور، وہ بھی حرام خور اور تم بھی حرام خور۔ تو ہم تمہیں حلال خور بھی نہیں بنانا چاہتے (بر سبیلِ لطیفہ فرمایا) اور حرام خور بھی نہیں بنانا چاہتے۔ آدمی اکل حلال پر رہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نیت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک۔ ذرا سا تغیر کر کے اس کو حد جواز میں لے لیں۔ کیوں حرام کی طرف جا رہے ہیں کہ قوم کی روح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مواخذہ الگ کوئی بینک قائم کردیں یا کوئی ایسی صورت قائم کردیں کہ اپنی تجارت میں لگالیں، یا کوئی کمپنی تجارت کی بنادیں، اور اس میں شرکاء ہوں نفع نقصان کے شریک رہیں اور پھر

وہ رفاہِ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے رأس المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اسلام ہے جو اس پر آمادہ کر رہا ہے۔

مطالعہ کا علم لائقِ اعتماد نہیں

سوال : حضرت کہا جاتا ہے کہ **اضعافاً مضاعفۃً ربوا** ہے صرف ربوا حرام نہیں ہے اس پر حضرت نے دریافت کیا کہ یہ علماء کہتے ہیں۔ یا تاجر کہتے ہیں۔

سائل نے کہا کہ حضرت! یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہی تھی۔ رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے۔ اس کو بہانہ بنایا جا رہا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مضامین آتے رہتے ہیں۔ اہل حق کے بھی اور اہل باطل کے بھی مُاوّلین کے بھی و مُکذِّبین کے بھی کہیں ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدیّن علماء کا کام ہے اور تاجر جو متہم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو ایسی چیزوں میں حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدیّن ہوں۔ ملک و قوم کو جن کے دین و دیانت پر اعتماد ہو اور ان کا علم مستند ہو۔ قوتِ مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے۔ جو چاہے کرے اور نفس ہے نا تہذیب یافتہ اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں مسٹر صاحب نے یہ کہہ دیا۔

تو جس کے آخر میں "ٹر" ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے (بر سبیلِ لطیفہ فرمایا) کوئی عالم متدین کہے یا فتویٰ دے یا مستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دے دیں تو آپ بے تکلف کریں۔

فلاں نے کہہ دیا' اس نے کہہ دیا یہ قابلِ اعتبار بات نہیں ہے۔

مسلِم و حربی کے درمیان سودی معاملہ

سوال : ایک صاحب نے سوال کیا کہ حدیث **لاربوا بین المسلم والحربی** کے تحت مسلم اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ہو سکتا ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث **لاربوا بین المسلم والحربی** کہاں ہے؟ اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔ یہ ائمہ میں خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں' اب جو کہتے ہیں لاربوا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ربوا جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ربوا ہوتا ہی نہیں۔

مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دارالحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو' حالت امن نہ ہو۔ اس وقت کا یہ مسئلہ ہے۔ ایک دارالحرب کا یہ معنیٰ ہیں کہ شعائرِ اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔ اس کے مسائل دوسرے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دارالحرب مان لیا جائے تو دارالحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں؟

دارالحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا

دارالحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے۔ ملک چھوڑ کر دارالاسلام کی طرف جایئے۔ اس کی تو جرأت

نہیں کرتے کہ یہ دار الحرب ہے۔ اسے چھوڑ کر دارُ الامن اور دارُ الاسلام میں جانا چاہیئے اس کا دھیان کسی کو نہیں آتا۔ جب دھیان جائے تو پیسہ کی طرف جائے گا۔ تو دارُالحرب کا حیلہ مل گیا ہے۔ پیسہ بٹورنے کو۔ یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے۔

اگر دار الحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے۔ مثلاً تجارت ضروری ہے وہ قوت پیدا کرنی ضروری ہے جس سے دارُالحرب دارُ الاسلام بنے' کفار سے جنگ کرو' اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو' اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں' کوئی صاحب آمادہ نہیں۔ دارُالحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور اب تک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دارُالحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ ہجرت بھی ہے۔ جہاد بھی ہے۔ قومی معاملات بھی ہیں کتنے ہی مسائل دارُالحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دارُالحرب حیلہ ہے اور جذبات دوسرے ہیں۔ دارُالحرب کی آڑ لے کر پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی کا فتویٰ ہندوستان کے دارُالحرب ہونے کے بارے میں ہے۔ پھر ان کا کیا جواب ہوگا؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی فتویٰ ہے۔ تو کیا ان کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ سودی لین دین کرو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا۔ لیکن کیا انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کر دو۔

سُود پر دلچسپ مباحثہ

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ' حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور صحیح دین دار لوگوں میں سے تھے۔ بی اے بھی تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہیئے۔ بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا "سود مند" نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت وطباعت کی گئی۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لونڈے کی بات کا کیا اعتبار۔ ذکر کرنے والے نے کہا کہ حضرت! لونڈا ہے؟ وہ تو مولانا طفیل صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام طفیل ہے (طفیل کے معنیٰ ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لونڈا نہیں تو اور کیا ہے۔ تو خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہنچے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم (ایڈیٹر زمیندار) اور ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان صاحبؒ بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحبؒ کا تھا۔ انہوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مدلّل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے' ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا' ان کی بات تو ایسی تھی۔ فرمایا کہ :

"بھائی ہم پل نہیں بننا چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے۔ ہماری گردن پر پیر رکھ کر نہ جائے"۔

یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے علامہ اقبال بھی اور مولانا ظفر علی خان صاحب بھی۔ کسی کو بولنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ پھر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصّل تقریر کی جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حکمِ شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے

یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گزر بھی گئے اور دوسرے ہمدرد بھی پیدا ہوئے اور وہ بھی گزر گئے۔ اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ بھی گزر جائیں گے۔ مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خلجان ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ جو معتمد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کر لیں۔ اس میں منشاء ظاہر کر دیں کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشاء یہ ہے کہ قوم کی خدمت ہو اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے، جو وہاں سے مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کا فائدہ بھی ہو گا۔

مدارِ دین حجت ہے

ایک صاحب نے پوچھا اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کر دیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے۔ اس میں کچھ حرج نہیں تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار مجاریٹی پر یا سروں کی گنتی پر نہیں۔ یہ کوئی کونسل یا اسمبلی کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سر گنے جاتے ہیں۔ سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلے ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے۔ اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحبؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بترس از طرزِ جمہوری اسیرِ پیر دانا شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیر دانا کے قیدی بن جاؤ اگر دو سو گدھے جمع ہو جائیں تو انسانی فکر تھوڑا ہی ان کے دماغ میں سے نکلے گی۔ دو سو، چار سو گدھے جمع ہو جائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا۔ انسانی فکر کہاں سے نکلے گا۔ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے۔ تو بے وقوفی کا خیال ذہن سے بر آمد ہو گا۔

اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

زمین میں بے وقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اِتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کر کے رہیں گے۔ حق کے

راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہو سکے گا۔ خواہ پوری دنیا کے انسان فیصلے کو مل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہٰذا سُود حرام ہی رہے گا۔ جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پاخانے کو کتنا ہی دھولو' صاف کرلو وہ پاخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا۔ ناپاک ہی رہے گا اور اس پانی کو بھی ناپاک کردے گا۔ جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہوگی۔ اوپر سے ان اَذہان کو بھی اپنی رو میں بہا کر گندہ کردے گی جن اَذہان میں اس قسم کے تصورات آتے رہتے ہیں کہ اپنے مفاد کی خاطر ایک حرام شئے کو حلال کریں۔ اس لئے ایسے تصورات ذہن میں نہ جمانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہئیں۔ جب کوئی شئے حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں۔ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں۔ اس قسم کے خیالات سے۔

مراتبِ عصمت

سوال : ایک صاحب نے سوال کیا کہ انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسلام باجماعِ اُمّت معصوم ہیں ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں اور قبل البلوغ بچے اَزرُوئے شرع معصوم ہیں۔ کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعلِ شنیع پر دارو گیر نہیں کی۔ لہٰذا ان کی عصمت بھی متفق علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہوئے۔ تو اب حضور والا وضاحت فرمادیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی عصمت ایک ہی قسم کی ہے؟

جواب : اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں وہ ابھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ اُبھری ہوئی نہیں ہے صرف مادہ موجود ہے اور انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کر کے گناہ سے بچتے ہیں اور یہ کمال ہے۔

منشاءِ گناہ

فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشاء صرف دو چیزیں ہیں۔ حُبِّ جاہ اور حُبِّ باہ۔ اسی لئے بعض گناہ تو سرزد ہونے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے۔ تذلیل کرتا ہے' زبردستی دباتا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں۔ یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے۔ پھر چاہے دوسروں کا خون ہو مگر اسے کرسی ملی۔ اسے عزت ملی۔ ہزاروں مخلوق برباد ہوتی' کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشاء ہوتا ہے حبِّ جاہ اور حبِّ اقتدار۔

ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے لئے عار محسوس کرے گا' وہ چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں۔ میں بڑا آدمی ہوں۔ یہ چھوٹے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں۔

تو کبر کے معنیٰ فقط بڑا بننے کے نہیں ہیں بلکہ تحقیرِ ناس یعنی لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر اور بڑا جاننا۔ یہ حقیقت ہے کبر کی۔ اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے۔ اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں۔ لڑائی جھگڑا' گالم گلوچ' مار پیٹ' قتل وغارت گری اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے

عمل میں آتے ہیں۔ آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔

ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت ہے۔ ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔ ایک شہوتِ بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جائز وناجائز کی پرواہ نہ کرے گا۔ چوری ہو' رشوت ہو' سود ہو' بہرحال کسی طرح سے پیسہ جمع ہو۔ اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہو سکیں تو شہوتِ بطن کا حاصل ہے۔ مرغوباتِ نفس کو بٹورنا اور جمع کرنا۔ مال ہو' لباس ہو' سامان ہو۔ آدمی اسے حاصل کرے جس طرح سے بھی ہو سکے۔ جب اس قوت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کو حرام وحلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں۔ چوری کرنے والے چوری کرتے ہیں۔ ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بٹورا جاتا ہے۔ خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ کہ جُرم ہو نہ ہو اسے ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں۔

ایک شہوتِ فرج یعنی شرمگاہ کی شہوت ہے۔ اس سے آدمی بدکاری' زنا کاری' فحش' عُریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جیسے شہوتِ بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں اس طرح شہوتِ فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش

عالَمِ ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدم سے سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشاء تھا جاہ طلبی' جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں۔ یہ حکم عدولی کی۔ اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کر دی ہو۔ بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں "مین میخ" بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلاف فطرت ہے۔

خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ

آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدمؑ کو مٹی سے۔

اور آگ کی فطرت ہے سر اونچا کرنا اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سربلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا۔ میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں؟ یہ گناہ حکم عدولی کا سرزد ہوا ابلیس لعین سے۔ جس کا منشاء تھا جاہ طلبی' عزت' حسد' کبر' رعونت' فرعونیت۔

اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ حقیقتاً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی اور وہ یہ کہ شجرۂ ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس تک جانا ممنوع تھا۔ کھانا تو درکنار' وہ درخت حضرت آدم نے کھالیا لیکن حکم عدولی کا کوئی واہمہ بھی نہ تھا۔

تلبیس ابلیس

حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً وسوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کر کے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت اَبدی نہیں ہے۔ بلکہ خاص وقت تک تھی وہ وقت نکل گیا۔ اب تمہارا معدہ اس نعمت کو ہضم کرنے کا متحمّل ہے۔

اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھالے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اس نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔

جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی۔

وَقَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ

قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم کھالو گے تو اَبدی طور پر جنت میں رہو گے اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ اور ان کو سمجھایا کہ ابدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب وہوا آپ میں اتر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھالیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرّت تھی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں کیسے کھاؤں اور حکم خداوندی کے خلاف کیسے کروں؟

مگر ادھر تو اس کمبخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام پاک قلب ہیں۔ سچے قلب والے ہیں۔ نہ دھوکے سے واقف نہ فریب سے واقف۔ اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے یہ تو گویا ان کے وہم میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہی بات ہو اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو جھوٹ کو بہت بری چیز سمجھتا ہے۔ اسی لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔

اسی واسطے محدّثین لکھتے ہیں۔ **ان اکذب الحدیث حدیث الصالحین** کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (معاذ اللہ) وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا نام لے کر کوئی روایت کرے کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا ہے۔ تو ان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے مبتلا ہوجاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب دھوکہ سے، فریب سے پاک ہے تو ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سمجھائی بلکہ قسم بھی کھائی۔ ادھر آدم پاک قلب ہیں۔ دھوکہ سے فریب سے واقف نہیں۔ اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ تو حضرت آدم کا وہم بھی نہیں جھوٹ بولنے پر۔

ادھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا۔ ادھر حضرت حوا نے کہا کہ اجی کھالو! ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی سنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف بھی نہیں کرتا اتنا کہنے سننے سے حضرت آدمؑ کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہ ہی بات ہو کہ اس کی ممانعت اَبدی نہ ہو۔ ابتدا میں ہو اب جب کہ یہاں کی آب وہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھالینے میں کیا حرج ہے۔ اوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور

بیوی نے دَیا سہارا تو کھالیا درخت۔

خطاءِ اجتہادی اور عِصمت

اس لئے حقیقتاً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ حضرت آدمؑ جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہو سکتا ہو کہ حکم خداوندی کے معنٰی اور مطلب یہی ہو جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں آ کر مبتلا ہو کر وہ کھالیا۔ یہ لغزش ہوئی صورۃً اور حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ خطا فکری ہے' یا خطا اجتہادی ہے۔ یہ سرزد ہو گئی ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطا اجتہادی ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مطلع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کوئی مجتہد خطاءِ اجتہادی کرے تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھر اسے صواب سمجھتا رہے اور ہو وہ حقیقت میں خطا تو غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے وہ درخت کھالیا۔

لَغزش اور گناہ کا فرق

مگر اس کا منشاء کِبر اور جاہ نہیں تھا۔ خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروں لیکن معنٰی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیئے اور چیز تھی کھانے پینے کی اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوتِ باہ اور شہوانی قوت آگے بڑھتی ہے۔ کبر و نخوت اس میں نہیں ہوتا۔ شیطان کے گناہ کا منشاء کبر تھا اور تکبّر تھا۔ اور آدم کی لغزش کا منشاء حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر در حقیقت شیطان کی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے وہ معاف نہیں ہو سکتا جب تک متکبّر پوری توبہ نہ کرے۔ اس نے توبہ نہ کی اَبد الآباد کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور اَبدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدم سے جو لغزش سرزد ہوئی اس میں کِبر اور نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اوپر سے غلط فہمی اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سرزَد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے وہ تو آدم کی خصوصیت ہے اور کبر سے سرزد ہو تو وہ تکبّر ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے :

لایدخل الجنۃ من کان فی قلبہٖ مثقال ذرّۃ من الکبر

وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس میں ذرّہ برابر بھی تکبر موجود ہو' (جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے)۔

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کِبر و نخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کی منشاء حرص ہے۔ حرص سے سرزَد ہونا یہ تو آدمی کی جبلّت ہے' اور کِبر سے سرزَد ہونا یہ شیطان کا کام ہے' کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا کہ آپ بڑے ہیں' میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں۔ اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔

اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمتِ خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے۔ لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کِبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ادھر اس کم بخت کے

دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ اَبد الآباد کے لئے ملعون ہو گیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے حد توبہ و استغفار کیا۔ حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہرحال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔

عصمتِ اطفال

بچوں میں جاہ طلبی اور باہ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتیں' نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں صرف کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر اُبھرا ہوا بیدار نہیں ہوتا۔ بلوغ سے قبل اس میں اُبھار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی اُبھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشاء ہے۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام

انبیاء علیہم السلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں۔ پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے' جبر سے' کمالِ نیت سے اور کمالِ استقلال سے اور کمالِ عظمتِ خداوندی سے۔ یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام مجبور ہیں گناہ کرنے سے' وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا کمال یہی ہے کہ ہر قسم کی قوت ہے اور پھر بچتے ہیں حکمِ خداوندی کی عظمت میں' اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنیٰ مجبوری کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجۂ اتم موجود رہتے ہیں۔ مگر سارے مادوں کو وہ کلیتہً تابع کر لیتے ہیں حق تعالیٰ کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کریں گے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رُک جائیں گے۔ تو انبیاء میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان کے حق میں کمال ہے اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا۔

کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ دوسرا کہے گا کہ کم بخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے۔ تو مجبوری میں بچا ہوا ہے۔ تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو۔ اور پھر آدمی خوفِ خداوندی کی وجہ سے بچے۔ ایک لنگڑا لولا آدمی جو چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا۔ اس سے پاک ہوں۔ لوگ کہیں گے تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے۔ تجھے آج قوت مل جائے تو ڈکیتیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں۔ تو تو کرے گا کیا۔ محض چارپائی پر بیٹھا رہے گا۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم و عقل کی روشنی میں آدمی بچے اسے تو بچنا کہتے ہیں اور جہاں روشنی ہی نہ موجود ہو اور بچے اسے بچنا نہیں کہتے۔

عصمتِ انبیاء اور عصمتِ اطفال کا فرق

بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی صرف مادہ

موجود ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں۔ پھر وہ معصوم ہیں ارادے سے' اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے' مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔

یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم' وہ ناطاقتی سے معصوم اور انبیاء کمالِ طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں۔ اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے۔ اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے۔ لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ طاقت اس میں خدا نے اُبھاری نہیں۔ اس لئے وہ بیچارہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال۔

باعثِ تعجُّب ایمان

اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابلِ قدر ہے اور ایک یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی موجود ہیں۔ تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں' زیادہ قابلِ قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث بھی ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بتلاؤ **وایهم أعجب ایمانا** سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟

صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہو گیا جو وہ ایمان نہ لادیں گے عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے' جنت ان کے سامنے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہو گا؟ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر عرض کیا یا رسول اللہ انبیاءؑ کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انبیاءؑ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں گے۔ وحی ان کے اوپر آ رہی ہے۔ فرشتے انہیں نظر آ رہے ہیں۔ مشاہدۂ حق میں وہ مشغول ہیں۔ جلال و جمال کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے وہ بھی انکار کریں گے تو کون اقرار کرے گا اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب؟

پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبرؐ تمہارے سامنے موجود۔ وحی تمہارے سامنے اُتر رہی ہے۔ معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا۔ اس لئے تمہارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔

پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد میں آئیں گے۔ نہ رسول ان کے سامنے' نہ معجزے ان کے سامنے' نہ ان کے سامنے وحی اُتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ اور موانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے۔ کوئی دل میں تردد پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کفار' کہیں منافقین' کہیں نفس کے جذبات۔ ہزاروں رکاوٹیں موجود اور دواعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جمے ہوئے ہیں۔ تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

جبری عصمت

اس سے معلوم ہوا کہ کثرتِ موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابلِ قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ دواعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں ہوں گی، تو بچے اگر گناہ سے بچتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھے بوجھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کرکے بچتے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ نفس میں تو ان کے جذبہ ہی نہیں ہے گناہ کا۔ نہ شہوت کا جذبہ ہے۔ نہ کبر ونخوت کا جذبہ ہے۔ لہٰذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں کہ اسے بچنا نہیں کہتے ہیں وہ تو گناہ سے الگ تھلگ ہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ قوت ہو۔ ارادہ بھی ہو۔ قوی کی بھی اس پر قدرت ہو کہ اس کام کو کر گزرے اور پھر بچے، تو بچوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاء کے اندر عصمت ہے ارادی اور اختیاری۔ تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا ارادے کا اور غیر ارادے کا۔ خبر کا اور بے خبری کا۔

حفاظتِ اولیاء کرام

رہے اولیاء اللہ، صُلحاء، متّقین جو گناہ سے بچتے ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاء بھی بچتے ہیں اور بچے بھی اور اولیاء اللہ بھی۔ فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس معنیٰ کہ وہ معصوم ہیں اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں اس معنیٰ کر کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں۔ لہٰذا وہ بھی معصوم ہیں اب رہے اولیاء اللہ ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ حتیٰ الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے۔ منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔

اور بنا حفاظت کی کثرت ذکر ہے۔ رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ رہتا ہے ان کو جلال وجمال کا اور قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصوّر اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کر سکیں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار میں بعض دفعہ غلبۂ نفس ہوا اور معصیت سرزد ہو گئی۔ خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شبلیؒ کا عبرتناک واقعہ

حضرت شبلیؒ اکابر اولیاء میں سے ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ سرداران اولیاء میں سے ہیں اور ہزاروں خانقاہیں حضرت شبلی کی خانقاہ سے آباد تھیں اور تقویٰ وطہارت کا ایک کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔ وقت کے تمام اولیاء ان سے استفادہ کرتے تھے۔

ایک روز وہ مریدین کے ساتھ سیر وتفریح کو نکلے جب ایک بستی پر گزر ہوا جو نصاریٰ ومجوسیوں کی بستی تھی۔ دیکھا کہ وہ لوگ خنزیر چرا رہے ہیں۔ دل میں خیال آیا کہ :

> ”یہ کیا انسان ہیں۔ نہ ان میں ایمان ہے نہ انہیں گندگی اور پاکی کی تمیز۔ سور چرا رہے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں۔ اصل میں مؤمن ہم لوگ ہیں کہ ہر برائی سے اللہ نے ہمیں

بچالیا ہے اور ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں اور دین کے اندر ہم غرق ہیں"۔

دل میں یہ خیال پیدا ہوا ایک وسوسہ کے درجہ میں تھا ع

نزدیکاں رابیش بود حیرانی

کے اصول سے جو جتنا مقرب ہوتا ہے اس کے دل میں اگر خطرہ بھی آتا ہے تو اس پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ عمل پر اتنی گرفت نہیں ہوتی جتنی کہ مقربین کے خطرات پر ہوتی ہے اور عتاب ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بستی میں جب یہ پہنچے تو دیکھا کہ کنویں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں عیسائی کی ایک لڑکی بہت ہی حسین وجمیل تھی۔ شیخ کی طبیعت اس پر مائل ہو گئی اور اتنی مائل ہو گئی کہ ضبط نہ کر سکے جاکر اسے نکاح کا پیغام بھی دے دیا۔

اس نے جواب دیا کہ میں نکاح جب کروں گی جب میرا باپ اجازت دے دے۔ شیخ نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ گھر میں ہے۔ تو اس کے گھر پہنچے اس سے جاکر درخواست کی۔ اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر نکاح کر سکتا ہوں وہ یہ کہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنی ہوگی۔

شیخ نے کہا منظور ہے اور اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور مرتد ہو گئے۔ معتقدین اور مریدین نے آکر شیخ سے منت، لجاجت کی لیکن شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور شیخ مبہوت سے رہ گئے۔ خدام نے پوچھا کہ فلاں آیت آپ کے ذہن میں ہے۔ شیخ نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی آیت نہیں گویا پورا قرآن ذہن سے نکل گیا کوئی آیت ہی یاد نہیں آتی۔ پھر مریدین نے احادیث کے حوالے دے کر سمجھانا چاہا۔ شیخ نے اس پر بھی یہی کہا کہ مجھے کوئی حدیث بھی معلوم نہیں۔ گویا حدیث بھی ذہن سے نکل گئی اور اس کے عشق میں مستغرق ہیں۔ حتیٰ کہ کل جس لکڑی سے سہارا دے کر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تھے۔ آج دیکھا گیا کہ اسی لکڑی سے خنزیر چرا رہے ہیں۔ شیخ کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ رو دیئے۔ چیخیں نکل گئیں اور پورے ملک میں خانقاہیں غیر آباد ہو گئیں اور جہاں جس مرید کو پتہ چلتا رہا وہیں وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے، بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ خبر سنتے ہی اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ کچھ معمولی صدمہ نہ تھا کہ ایک شیخ وقت مرتد ہو گئے۔ فکر تھی کہ دوسروں کے ایمان کے کیا ہوگا۔ اس لئے سب لوگ دعا کر رہے ہیں۔ کہیں انفراداً کہیں اجتماعاً اور ایک خاص تعداد تو ہر وقت شیخ کے پاس ہی خدائے مالک الملک کے دربار میں دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد شیخ کو تنبہ ہونا شروع ہوا کہ میں کس حالت میں ہوں اور مریدین سے دریافت فرمایا کہ میں کس حالت میں ہوں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ عیسائیت میں ہیں۔ شیخ نے کہا معاذ اللہ، استغفر اللہ، توبہ واستغفار کی اور اسی وقت کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤ۔ کلمہ تو تھا ہی ذہن میں بس ایک چیز غالب آگئی۔ اب جو دھیان دیا تو پورا قرآن شریف ذہن میں موجود ہے۔ پوری احادیث محفوظ۔ کہا کہ میں یہاں آکر کیسے پھنس گیا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ واقعہ ہے فوراً توبہ کر کے وہاں سے واپس ہوئے اور استغفار میں مصروف رہے۔ تمام خانقاہوں میں خوشیاں منائی جانے لگی اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اللہ نے شیخ کو پھر اسلام میں لوٹا دیا۔

ادھر تو یہ واقعہ ہوا اور ادھر یہ ہوا کہ اس عیسائی گھرانے پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود اپنی لڑکی کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ حضرت اس کو مسلمان کر لیں اور اپنے نکاح میں قبول فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو نکاح کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو بیوی موجود ہے نہ وہ عشق، نہ وہ محبت۔ بعد میں جب سوچا تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو خطرہ آیا تھا ایک زعم کا تھا کہ اصل میں ہم ہیں انسان۔ یہ عیسائی کیا کرتے ہیں۔ اس کا جواب دیا

گیا جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے ولی سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔

حفاظتِ اولیاء کا طریق

چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ

جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو ورغلالیتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوتِ ایمانی سامنے آتی ہے تو لاحول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جارہا ہے۔ جیسے (معاذ اللہ) زناکاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں ___ اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا۔ البتہ ماحول سے متاثر ہو کر گھبرا کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو وہ ہزار توبہ کرے گا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہوگی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ و استغفار سے بلند ہوئے۔ اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کرلیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

وُجوہِ عصمت

مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہو جائے۔ ہاں خطاء فکری ہو سکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو۔ اس سے وہ بَری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں ___ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو بدن تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے۔

تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خمیر بھی پاک۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبیعت میں پاکی ہوگی اور ظاہریات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے۔ شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے' لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہوگا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہو کسی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گزرے گا۔ تو مادہ پاک ہے۔ بدن بھی پاک ہے۔ لازمی بات ہے کہ ان بدنوں سے جو اعمال اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

جب اَبدان ظاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہریات ہے ارواح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ترین ہیں اور ان روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالاتِ حق کا ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے حضوری ہے کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصور کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو۔ اس کی عظمت' اس کا جلال دیکھ رہا ہو' وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ انبیاء علیہم السلام تو ہر وقت مشاہدہ کی حالت میں ہیں۔ ملائکہ ان کے سامنے۔ وحی ان پر آرہی ہے۔

تو وہ بیچارہ نفس کرے گا کیا۔ گو مادے سارے موجود ہوں۔ نفس مغلوب ہی رہے گا تو مادہ بھی پاک' روح بھی پاک اور اوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالم غیب کا اور وحی کا نزول اور علم الٰہی براہ راست اتر رہا

ہے اوپر سے پھر حفاظتِ خداوندی بھی شامل ہے۔

چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لینا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہو تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات کو بَری رکھا گیا ہے' ان کے مادے پاک' روحیں پاک' احوال پاک' ماحول پاک اور اوپر سے مشاہدات اور ہروقت حضوری شاہی دربار میں اس لئے وہاں عادتاً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو۔ زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اولیاءاللہ سے صُدورِ گناہ خلافِ تقویٰ نہیں

اولیاء اللہ سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادتاً بھی اس لئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں۔ من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں۔ نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں اور نہ وحی ان پر اُتر رہی ہے۔ اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے۔ بعض ائمہ صحابہؓ سے گناہ سرزد ہوا۔ جیسے ماعز ابن مالک ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا اور ان کو رجم کیا گیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوئے بھی نہیں۔ ماحول سے متأثر ہو کر ایک حرکت سرزد ہو گئی۔

لیکن پھر اتنی توبہ کی اتنی توبہ کی کہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالکؓ نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلادی جائے تو سب کے گناہ معاف ہو جائیں اس ایک توبہ کے اثر سے' تو اولیاء کے اندر فقط امکانِ عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے کہ گناہ سرزد ہو جائے مگر حفاظتِ خداوندی شامل ہوتی ہے تو گناہ ہوتا نہیں اور اگر ہو جائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہنچائے۔ تہجد کے لئے آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا۔ حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں۔ اس لئے کہ اُمتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب۔ مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا اگر ایک تہجد بھی قضا ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آپڑا۔ تو حضرت امیر معاویہؓ اس تہجد کے قضا ہونے پر تمام دن روئے۔ استغفار کیا دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔

غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انگوٹھا ہلایا کہ :

"حضرت امیر! تہجد کا وقت ہو گیا ہے اٹھئے تہجد پڑھ لیجئے"۔

حضرت امیرؓ نے اجنبی آواز محسوس کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میری مجلس رائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنان خانے میں تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہے؟

اس نے کہا کہ "میں شیطان ہوں' تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہوں۔"

فرمایا کہ کمبخت تو اور تہجد کے لئے اٹھائے۔ اس نے کہا جی ہاں! خیر خواہی کا جذبہ ابھرا اور مجھے گوارہ نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا ہو۔

فرمایا کہ تو اور خیر خواہی کرے۔ اللہ نے فرمایا :

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا

شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو۔

وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا ہے اس لئے تو اور دوستی کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ سچ سچ بتا تو کیوں آیا ہے۔ ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ تیری گردن مروڑ دوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا۔ تب وہ اصلیت کھلی۔

اس نے کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے ہی کل ایسی حرکت کی تھی کہ آپ کا تہجد قضا ہو گیا۔ میں نے کچھ ایسے وساوس اور آثار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آگئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا تو تہجد سے اتنے درجے بلند نہ ہوتے۔ جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے۔ اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج قضا ہو گیا پھر توبہ کریں گے پھر درجے بلند ہوں گے۔ تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو یہی اچھا ہے کچھ تو درجات میں کمی ہو گی۔

جب یہ اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؓ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔

بہرحال اولیاء کاملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادتاً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھرا کر شاذ و نادر واقع ہو سکتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام سے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔

مقامِ عصمت اور شیطان

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ یہ خیر کے وعدے دیتا ہے اور شیطان شر سمجھاتا ہے۔ دونوں کی جنگ ہوتی ہے۔

صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے؟ فرمایا کہ

ہاں :

لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہو گیا۔

اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں کہ ہے وہ شیطان ہی، مگر میں اس سے بچالیا جاتا ہوں۔ اس کا کید و مکر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ان کی صورت بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر خواب میں کسی نے مجھے دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا۔ شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لے کر کہے کہ میں ہوں۔ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ صورت بھی نہیں بنا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کے حقائق میں اثر انداز ہو سکے۔

حفاظتِ اولیاء اور شیطان

شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے، لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آ کر یا تو اس گناہ سے بچادیتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

حاصلِ کلام اور درجاتِ عصمت

مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ عصمت اختیاری کے ساتھ اولیاء اللہ محفوظ ہیں۔ حفاظت خداوندی کے ساتھ اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادتاً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام میں عادتاً ممکن نہیں صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہوگا نہیں اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطاء فکری ہے۔ جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کردیا جاتا ہے ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ عصمت اضطراری کے ساتھ کیونکہ ان میں مادہ ہی ابھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا' نہ شہوانی قوتیں ابھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے۔ کھیل کود کرتے ہیں لیکن کوئی ارادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکروفریب کرکے دنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی طبیعتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں۔ تو عصمت دونوں میں ہے ایک میں خلقی عصمت ہے ایک میں ارادی عصمت ہے' ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں قوت و تمام و کمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی ناتمامی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بھی مگر یہ فرق ہے اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

بندۂ حکم پر انکشافِ اسرار ہوتا ہے

ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے اس پرچہ کو پڑھا۔ سوال یہ تھا کہ کفار و مشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کرجائے ان کا کیا حشر ہوگا۔ آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اسرار و حکم بیان کیجئے۔

سوال کا آخری جز "مع اسرار و حکم بیان کیجئے۔" حضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اس لئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے "مع اسرار و حکم بیان کیجئے"۔ اسرار و حکم ہم پر کب ضروری ہیں ہم تو ناقل ہیں احکام کے' حکم بیان کردیں گے۔ یہ اسرار و حکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالب اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتے۔ خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جاکر یوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے اور بیگمات شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں؟ تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو۔ یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا؟

اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع و فرماں بردار ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہوجاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا۔ حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہوجاؤ۔ وہ کہے بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ہروقت ماننے کو تیار ہے۔ بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر اطاعت کرتے کرتے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے۔ بڑا مطیع ہے۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرائے میں ہروقت آسکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں۔ تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔

اگر وہ گھروں میں آرہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح کی جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے۔ اسی طرح دو برس گزر گئے تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہوگیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے۔ اس پر بادشاہ خوش ہوکر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمہیں اپنے خزانے دکھلائیں گے' خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں یہ سونا ہے' یہ چاندی ہے لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری و ساری ہے' چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ

ہے اور یہ بھی ہے' اور یہ حکمت عملی ہے تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کا کان پکڑ کر باہر نکال دو' اس کو پھانسی دے دو یہ کون ہے اسرار طلب کرنے والا۔

تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتّب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ حکم معلوم کرے یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ! اس کا راز بھی بتاؤ؟ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے؟ جب اللہ کا حکم آگیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز معلوم نہ ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل میں راز سمجھ میں آگیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو رہ گئے۔ یہ نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتایئے حکم بتایئے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرتے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے۔ دین پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ فرائض و واجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم' عقل بھی خادم' اور ارادہ بھی اللہ کا غلام' مشیت بھی غلام' پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے۔ تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے۔

مشرکین کی نابالغ اولاد جنّتی ہے یا جہنّمی؟

اولاد مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدّثین ذراری مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں کہ مشرکین کی نابالغ اولاد آیا جنّتی ہے یا جہنمی؟ اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں۔ ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فطرت پر حکم لگا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا اور جنت و نار عمل کے اوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اس لئے فطرت پر حکم لگا کر داخل جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزا یا جزا کے طور پر نہ ہو گا بلکہ محض انعام و تکریم کے طور پر ہو گا اور انہیں خدمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خادم کے رہیں گے اور یہ ہی ان کے حق میں بڑے اعزاز کی بات ہو گی کہ انہیں جنت میں خدَمَہ بنا کر داخل کر لیا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقّف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنّتی ہیں یا جہنمی ہیں۔ ٹھیک نہیں' اس لئے سکوت اختیار کیا جائے معاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالٰی کے اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہو گا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا۔ ان کے آباؤ اجداد کے یعنی ملحق کر دیا جائے گا۔ اگر آباؤ اجداد جہنمی ہیں تو وہ بھی جہنمی ہیں اور اگر آباؤ اجداد جنّتی ہیں تو وہ بھی جنّتی ہیں تو وہ بھی جنت میں جائیں گے۔

اس دنیا میں جب مردم شماری ہوتی ہے تو نابالغ بچوں کو بھی گنتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہیں اسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ اہل مذہب قیاس کرتے ہیں۔ قرآن کی اس آیت پر :

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ۔

جو لوگ ایمان لائے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباؤ اجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے گا۔ گو عمل ان کے ٹھیک نہیں۔ تو جب مؤمن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں

کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جاویں گے لہٰذا وہ بھی جہنمی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار۔ وہ حقیقت میں نفس کا جز ہوتا ہے ماں باپ کے۔ ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں اور باپ کما کے کھلاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب کہا جائے گا کہ اب اس میں استقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا وہ مسلم ہیں تو یہ بھی مسلم۔ وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر و اسلام جب ہی معتبر ہوگا جب وہ عقل و ارادے اور اختیار سے قبول کرے گا۔ تو نابالغ اولاد ماں باپ کے توابع ہیں لہٰذا جو ان کا حکم ہے وہ ہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنتی ہیں نہ وہ دوزخی بلکہ وہ بیچ میں اعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ جنت ہے نہ دوزخ۔

ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائے گی اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی جانب سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ آگ میں کود پڑو تو جن کے مزاج میں سلامتی ہو گی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ بحکم خداوندی سے باغ و بہار بن جائے گی اور بعضے تأمل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں۔ ڈریں گے جھجکیں گے ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کودو، اور وہ کودتے نہیں۔

معلوم ہو گا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔

ایک مذہب یہ ہے اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا عمل سرزد نہیں ہوا۔ صرف جانچ کر لی جائے گی کہ فطرتوں کا رخ کیا ہے اسی اعتبار سے وہ جنتی یا جہنمی ہوں گے۔

اَسلم ترین مذہبؒ

بہر حال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقّف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگادیں، چاہے وہ عمل پر حکم لگادیں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ شریعت ظواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کاہے پر حکم لگادیں۔ رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا۔ اور ہم کون ہیں حکم لگانے والے تو اسلم طریق یہ ہی ہے کہ توقف کیا جائے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہلِ جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

نس بندی

سوال : آج کل مسلمانوں میں ضبط ولادت اور نس بندی کا رُجحان پایا جارہا ہے۔ شرع میں اس کی کیا گنجائش ہے؟

نس بندی شرعی اصول کے تحت ممنوع ہے اس لئے کہ شریعت کا منشاء تکثیرِ اولاد ہے۔ اسی بناء پر آپ ؐ نے ارشاد فرمایا۔ **تزوّجوا الودود الولود فانّی مکاثر بکم الأمم**

یعنی ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن سے اولاد زیادہ پیدا ہو تاکہ قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں۔ اسی لئے قانونِ عام تکثیرِ نسل ہے اور اسلام چونکہ جامع اور معتدل مذہب ہے اسی لئے اس نے دوسری جانب کی بھی رعایت رکھی وہ یہ کہ اگر خاوند اور بیوی اتنے کمزور ہوجائیں کہ اولاد ہوگی تو جان کا خطرہ ہے اور وہ آپس میں طے کرلیں اور اولاد نہ ہونے کی دوا کھالیں تو وہ کرسکتے ہیں۔

اِستثنائی حکم

استثنا کو کوئی قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے نس بندی کو جائز قرار دیا ہے تو یہ خیانت ہوگی۔ اور یہ ایسے ہوگا، جیسے کہ شراب حرام ہے اور نجسُ العین ہے اور نصِ قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کی جان بچ نہیں سکتی جب تک یہ شراب نہ پی لے۔ تو شراب پلانے کی اجازت ہے اس لئے کہ جان بچانا فرض ہے۔ یہ ایک استثنائی حکم ہے لیکن اگر کوئی اس کو قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے شراب جائز قرار دی ہے اور یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہوگی۔

اسی وجہ سے قانونِ عام اپنی جگہ ہوتا ہے اور استثنائی حکم اور ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں موجود ہے کہ اپنی زبان سے کلمۂ کفر مت نکالو اس قسم کا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن آگے فرماتے ہیں۔

کہ اکراہ کے وقت کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دل میں اطمینان کے ساتھ ایمان موجود ہو اور کسی نے گلے پر تلوار رکھ دی اور کہنے لگا یا تو کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دو ورنہ ابھی ذبح کردوں گا تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ کفر کا کلمہ کہہ دو اور دل میں ایمان رکھو اور مطمئن رہو تمہاری کوئی گرفت نہ ہوگی۔

اب کوئی کہے کہ اسلام میں کفر کا کلمہ کہنا جائز ہے اور قانونِ عام بنا کر پیش کرے تو سراسر خیانت ہے یہ صرف ایک استثنائی حکم ہے۔ خاص حالت میں اس کی اجازت ہوگی اسی بناء پر حکمِ عام اور قانونِ عام اور ہوتا ہے اور استثنائی احکام الگ ہوجاتے ہیں۔ استثناء کو استثناء رکھا جائے گا اور قانون کو قانون عام رکھا جائے گا۔

اسلام میں فرض ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھے اگر بیماری غالب ہے اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔ اب اگر اس کو کوئی قانون کے طور پر یوں کہہ دے کہ اسلام کا قانون ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کرو تو یہ خیانت ہوگی حکم عام وہی رہے گا کہ کھڑے ہو کر پڑھو اور اگر کوئی خاص حال پیش آجائے تو اس کی وجہ سے اجازت ہے مگر وہ شخصی بات ہوگی عام حکم نہ ہوگا یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک تو تکثیرِ نسل ہے یہ تو قانون عام ہے اور ایک ہے استثناء وہ شخصی حالت کے تحت ہوتا ہے اس لئے بھی فتوٰی ہوتا ہے اور اگر مفتی اجازت دے دے تو وہ حکم عام سے نکل کر اجازتِ شخصیہ کے اندر آجاتا ہے۔ قانون عام اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔ یہ تھی واقعہ کی قانونی بحث!

منظم فساد سے روٹی کی بچت

میرے پاس سہارنپور کے دو ڈپٹی کلکٹر آئے اور نس بندی کے سلسلے میں گفتگو کرنی شروع کی اس بارے میں انہوں نے سوال کیا جس کا ایک جواب میں نے ہنسی کا دیا اس سے وہ بے حد شرمندہ ہوئے۔

وہ یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ فکرلاحق ہے کہ اولاد اور آبادی بڑھتی جارہی ہے اور روٹی گھٹتی جارہی ہے اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط بہرحال آپ کو فکر آبادی کے بڑھنے سے روٹی گھٹنے کی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ مصیبت جو پیش آرہی ہے۔ موجودہ افراد سے یا آنے والوں سے خطرہ ہے؟ کہنے لگے کہ موجودہ ہی سے پیش آرہی ہے۔

اس پر میں نے کہا کہ آنے والوں کا راستہ تو بعد میں روکنا۔ ان کی پہلے (موجودہ) میں کمی شروع کردو اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ جو ملک میں فسادات پیش آرہے ہیں ان کو منظم اور باقاعدہ کردیجئے۔ ہر ایک شہر میں روزانہ ایک دو فساد ہوتے رہیں اور معتدبہ افراد قتل ہوتے رہے تو دس برس میں انشاء اللہ کافی کمی ہوجائے گی اور آپ کی روٹی بچ جائے گی اس جواب سے وہ جھینپ گئے۔

تقسیم دولت میں عدم توازن

اس کے بعد میں نے کہا کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ تو اصل میں آپ لوگ کرتے نہیں اور نہ کرنے کے کاموں میں آپ لوگ چل رہے ہیں۔ روٹی کی کمی اس لئے نہیں کہ آبادی بڑھ رہی ہے آج تو زمینوں میں اتنی کاشت ہو رہی ہے جتنے افراد بڑھ رہے ہیں رزق بھی بڑھ رہا ہے۔

پھر بھی جو کمی ہے اس کی بناء یہ ہے کہ آپ کے ملک میں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے جو غریب ہے وہ بے حد غریب ہے اور جو امیر ہے وہ بے حد امیر ہے ملک کے وہ خاندان جو اَربوں کھربوں کے مالک ہیں قانون پر ان کا قبضہ ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران ان کے ممنون ہیں وہ قانون ایسا بنواتے ہیں کہ ان کا سرمایہ بڑھتا رہے اور غریب فٹ پاتھ پر پڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ دولت کی تقسیم صحیح کردیں کہ امیر اور سرمایہ دار کو ذرا نیچے اتار دیں اور غریب کو ذرا اونچا اٹھائیں اس سے توازن پیدا ہوجائے گا اور یہ شکایت رفع ہوجائے گی۔ یہاں ہزاروں بورے غلے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔ جب وہ غلہ پُرانا ہوجاتا ہے تو معلوم ہوا کہ غلہ اور رزق کی کمی نہیں بلکہ نیتوں کی خرابی ہے۔ یا طرزِ عمل کی خرابی ہے آپ ان دولت مندوں پر اور سرمایہ داروں پر پابندی عائد کردیں اور ان کی دولت میں ایسے راستے نکالیں کہ غرباء پلیں اور ملک میں ایک بھی فٹ پاتھ پر پڑنے والا نہ رہے۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک میں غرباء کتنے ہیں ان کی کیا حالت ہے۔ نہ ان کے پاس روٹی نہ کپڑا نہ گھر نہ در۔

اور دوسری طرف دیکھو 'برلا' ٹاٹا' باٹا وغیرہ کو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ دولت کتنی ہے۔ وہ بڑھ رہے ہیں دولت میں اور یہ بڑھ رہے ہیں غربت میں یہ نظم کی خرابی ہے آپ اس خرابی کو ڈالنا چاہتے ہیں ماؤں کے پیٹوں کے اوپر کہ آنے والوں کو روک دو' اس کا ان سے کیا تعلق اپنا نظم صحیح کیجئے۔

اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے کچھ بیان حاصل کریں۔ میں ان کو بیان تو کیا دیتا' مگر وہ وہاں سے چپ ہی ہو کر اٹھے' میں نے ان سے کہا کہ بس دو ہی صورتیں ہیں یا تو فسادات کو منظم کرو۔ اچھے

خاصے افراد ہر روز قتل ہوتے رہیں دس بارہ سال میں کمی آجائے گی اور یہ نہیں کرتے تو نظام صحیح کرو، دولت کی تقسیم صحیح کرو۔

سرمایہ دار کا طریقِ واردات

اور میں نے یہ بھی کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان سرمایہ داروں نے اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ شوشے چھوڑ رکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نس بندی کرو یہ کرو اور وہ کرو تاکہ ان کی دولت پر زور نہ آئے، اور ان کے پیسے میں کمی نہ آئے۔ یہ اس کو چھپانے کے لئے چالاکی کرتے رہتے ہیں تاکہ پبلک دھوکہ میں مبتلا رہے۔ ہم دھوکہ میں آنے والے نہیں۔ اپنا نظم درست کیجئے آپ کا نظام صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی کیا تو بیس برس کے بعد سر پکڑ کر روئیں گے جب اولاد کی کمی ہو گی، نہ فوج میں آدمی ڈھنگ کا ملے گا اور نہ پولیس میں اور پھر بعد از خرابی بسیار اضافہ نس پر سوچیں گے۔

کثرتِ اولاد پر انعام

میں نے کہا کہ آپ یہاں رزق کی کمی کی وجہ سے آنے والوں پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ قانون ہے کہ جتنی اولاد زیادہ ہوگی اتنا ہی والدین مستحق انعام سمجھے جاتے ہیں یعنی اگر کسی کے یہاں دس بچے ہیں تو اتنے فی صد انعام دیا جائے گا۔ اور بارہ ہیں تو اتنا۔ یہ رزق کی کمی وہاں کیوں نہیں؟ وہاں لوگ کیوں فاقے نہیں بھرتے۔ اس لئے کہ دولت کی تقسیم میں نابرابری نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس مصیبت سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

اِستثنائی اجازت

سوال : استثنائی شکل میں نسْ بندی کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب : استثنائی شکل دوسری بات ہے اس میں نس بندی ہی کیا بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے کھانے سے اولاد نہیں ہوتی جب آدمی اس حال پر پہنچ جائے کہ بیوی اس قابل نہ ہو اور اس کی جان کا خطرہ ہو اور وہ کہے کہ مجھے تحمل نہیں اور آئندہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف سے جان جانے کا اندیشہ ہے تو اسے شریعت کی جانب سے اجازت ہے کہ کوئی ایسی دوائی کھا لے جس سے بچہ پیدا نہ ہو مگر استثنائی حکم استثنائی رہے گا اس کو قانون عام کی شکل نہیں دی جا سکتی ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

انٹرویو

ضبط و تحریر
حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدّ ظلہٗ

علّامہ قاری محمدّ طیّب صاحب قاسمی

سے

ایک ملاقات

حجّۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا مقامِ دعوت و تجدید علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارنامے۔

پچھلے دنوں جب حکیمُ الاسلام مولانا قاری محمدّ طیّب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بنا پر دارالعلوم حقّانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پُرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ "الحق" کے لئے مرکز اسلام کے مدیر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم واسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ ادھر یہ خواہش ادھر حضرت کی مصروفیات اردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تکانِ سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مُستزاد مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

دارالعلوم کا مستقبل

حضرت والا سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز ہی سہی لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں اور پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں ــــــ کہ

ع عشق ست وہزار بدگمانی

جس شجرۂ طوبیٰ کے لئے حجّۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی جس کی داغ بیل حجّۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطینِ اُمّت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار ومعارف کے امین اور بانیٔ دارالعلوم کے حفید رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا

سوال اسی دار العلوم دیوبند کے بارے میں تھا۔ جس کی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھرپور انداز میں جواب دیا :

"جی ہاں، اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے انشاء اللہ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا"۔

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکایک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر اوّل دار العلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھایا سنا تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دار العلوم اپنی زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوندی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سے اس بارہ میں پوچھا کہ :

"حضرت! کسی بزرگ غالباً مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دار العلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو"۔

حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکایک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہو گئیں۔ حضرت نے فرمایا :

"نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی امید باندھے ہوئے ہیں"۔

پھر حضرت نے فرمایا :

"یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک پوری ہوتی چلی آرہی ہے"۔

حضرت قاری صاحبؒ وضاحت فرمارہے تھے اور چشم تصوّر نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکت اسلام کے تصور ہی سے جھوم اٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں ___ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسرے پیرایہ میں دہرائی۔

تجدیدِ دین کا مظہرِ اَتم

حضرت! تجدیدِ دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے۔ تو یہ تو دین اور علوم دین کا ایک مجدِّد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔

ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی کہ حضرت نے ایسا امید افزاء اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدۂ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا :

"میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرّحمٰن صاحبؒ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے

کہ مجدِّد کے لئے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہیؒ حضرت نانوتویؒ اور ان اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدِّد ہیں جنہوں نے سنت و بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی' اور اس کے بعد فرمایا کہ :

ان حضرات کی تجدید کا مظہرِ اتم یہ دار العلوم ہے۔ اسی کو مجدِّد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمٰنؒ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے تجدیدِ دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دار العلوم' اور ہندوستان میں یہ دار العلوم قطب الرحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے۔ تو اس کے اردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں' اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے' وہی مولانا یعقوب صاحبؒ کا مقولہ کہ یہ دار العلوم چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آجائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے"۔

ظرافت آمیز شکوہ

حضرت ابھی اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انٹرویو نگاروں کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ :

"ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگو گے دن کو بھی نہیں سونا چاہئے آج بھی جاگنا چاہئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے"۔

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی ہے' اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری "قدر شناس میزبان حکومت" نے آپ کے تقریر و بیان پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دار العلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر و تمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کے بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ :

"جی ہاں یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضُعف' بڑھاپے' اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم' ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آرہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا"۔

عالم اسلام کے ایک جلیلُ القدر عالم دین سے اور مسلمانوں کے قابلِ فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس

"پذیرائی" کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علوم اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا اور ایک پرزہ جس میں عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگی دامن کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"ارے بھائی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے"۔

مگر ایک سدا بہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز وشاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

امامِ دعوت وعزیمت

سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا تعالیٰ نے ظلمت کدۂ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا اور جن کی مؤمنانہ بصیرت' مجاہدانہ جدوجہد' حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دورِ غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم وتہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرونِ اولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں' عمل میں' جہاد اور ریاضت میں' تدبّر اور سیاست میں' تصوّف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔

ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرتِ نانوتوی قدّس سرّہ' کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدیں کے نصف آخر میں بے شبہ آیۃ من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی' اخلاقی' اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ' شعرانی کا علم الکلام غزالی کا سوز وگداز' ابن تیمیہ کا صولتِ بیان' ولی اللہ کی حکمت ودانش' احمد سرہندی کی غیرت وحمیّتِ اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت۔ یہ سب چیزیں کس فیّاضی سے ایک شخص میں جمع کردی تھیں۔ اور بقولِ حضرت حکیم الاُمت مولانا تھانوی ؒ :

"ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے"۔

اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت وعزیمت' سرخیل ارباب صدق وصفا' علمبردار جہاد حریّت اور نابغۂ روزگار شخصیت کے مقامِ دعوت وعزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا ___ اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرمارہے تھے کہ :

تین بڑے کام

حضرت نانوتوی ؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے کام انجام دیئے سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی ؒ خلافتِ اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خان

خلیفہ تھے۔ گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالکِ اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی۔ اس لئے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے۔ مولانا محمد یعقوبؒ اور مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطبُ اللسان رہے۔ اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے، کہیں چندہ جمع کررہے ہیں، کہیں رائے عامّہ پیدا کررہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔

تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے ــــ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا، اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسۂ عام کیا۔

ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے، جو اورنگ زیب کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرت نے وعظ فرمایا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے تھے کہ کیا کہتا ہے؟ ــــ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجاء وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھی، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کررہے ہو؟ فرمایا میں بہرحال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آج ایک سنّتِ رسول زندہ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنّتِ رسول کی احیاء میری وجہ سے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کرلیجئے۔ فرمایا : کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں کمر جھک گئی۔ ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے۔ تو فرمایا کہ اگر سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے زندہ ہوسکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

تو ــــ ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور ان کے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنادئے گئے اس میں کچھ دیر لگ گئی، پھر حضرت نانوتویؒ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہئے، اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کررہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟

فرمایا، کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لئے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستّر، اسّی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہوگیا۔

روحِ دارُالعلوم

تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علومِ نبوّت اگر عام ہوئے اور

ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کرسکتے ہیں اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کرسکتے' اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جاچکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے' مراد آباد میں مدرسہ شاہی' امروہہ میں مدرسہ عربیہ بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم اینٹھ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور اگلاوٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہو گا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اصلاحِ معاشرہ اور خلافتِ اسلامیہ

ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرت کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی ـــــ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود نبود قائم رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا۔

افغانستان سے رابطہ

اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کررہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتی ہے مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ :

> "جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں۔ میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابرؒ کے تھے۔ جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا۔ امیر بڑی عنایت و شفقت سے پیش آئے جب میں قصرِ صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ شائد ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا۔ لیکن یکایک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آرہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معانقہ دایاں بایاں مونڈھا چومنا' پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا "بفرمائید" آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا "نے نے خلافِ ادب است" فرمایا نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے صدرِ اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاریؒ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو رسمی کرسی تھی' اس پر مجھے بٹھلایا اور

خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں' اور وجہ مختصر یہ ہے کہ ___ کابل کی یہ حکومت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان۔ یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہیؒ سے' اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے سے گنگوہ آکر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرما دیتے ___ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا "جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا"۔

انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟

امان اللہ کی حکومت تھی یہ لوگ بنی اعمام میں سے تھے' تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھی۔ مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی۔ امان اللہ خان معزول ہوئے۔ کیونکہ اسی نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے۔ وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔

پھر صدرِ اعظم نے فرمایا کہ :

"ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اوڑھاتی تھی اور ہمیں شفا ہو جاتی۔ آج ڈاکٹر رفقی بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی اور فرمانے لگے۔ کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا' لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہو گیا' لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدرِ اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں"۔

تُرکوں سے روابط

یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے' مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو' شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل ملا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرتؒ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور۔ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا' کچھ مجاہدین ناتربیت یافتہ تھے' نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تو گویا حضرت جوش جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک علمی کارنامہ تو دارالعلوم ہے' جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا' دوسرا معاشرتی کارنامہ

ہے' اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلہ میں سہی مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے۔

انگریزی دَور میں محکمہ قضا کا قیام

اس سلسلہ میں حضرتؒ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوبؒ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے اُلجھے ہوئے تھے منٹوں میں طے ہوئے لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا' یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر انگریز نے آخر میں توڑ دیا دیوبند میں ایک تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا چنانچہ وہ آیا۔ رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا۔ اس نے آکر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور بہت جرأت کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟

حضرت نے بڑی نرمی سے کہا کہ :

"یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے۔ ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیئے"۔

مگر اس نے کہا نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ :

"کان پکڑ کر اسے نکال دو"۔

طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ :

"جا ہم تیری رپورٹ کریں گے' نکال دو اس شیطان کو یہاں سے"۔

بہرحال عید کا دن آیا' تھانیدار کے ہاں دودھ کے بالٹے بھرے تھے' کپڑے تیار خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہوگئی ہے۔ اس کو فوری برخاست کیا جائے۔ اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی' پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جارہا تھا کہ :

"افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی"۔

تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا ___ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہوگئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔

تو حضرت چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو۔

اسی کے تحت دارالعلوم دیوبند کے اکابرؒ نے جب لنڈن سے مسٹرمانڈے وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا' تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمدؒ) علماء کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ :

"ہندوستان میں محکمۂ قضاء قائم کر دیا جائے جس میں شریعتِ اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح' طلاق' عدّت' میراث' اوقاف وغیرہ طے ہوں"۔

خیر اس نے ظاہر میں تو کہا اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ وقتی

بات تھی نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

تحفّظِ خلافت اور روابطِ اسلامیہ

مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سہی، قائم ہو جائے تحفظِ خلافت اور روابطِ اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ نے ایک یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی۔ وہاں جاکر مکّہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے تو علم ومعاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محوَر ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی شرکاء مجلس ذکرِ قاسمیؒ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکایک حضرت قاری صاحبؒ نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک پڑے اور حضرت کے ضعف نِقاہت کے باوجود ان کی توجّہ حضرت نانوتویؒ کی ایک مخصوص شان "علمی کمالات" کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے مگر دل بضد تھا کہ

ے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتویؒ کی علمی شانِ تجدید

حضرت نانوتویؒ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحبؒ گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرطِ نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرتؒ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرتؒ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ :

"سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرتؒ کی حکمت قلعی کھولنے کے لئے کافی ہوگی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کر سکتا۔ اتنی حجتیں جمع فرمادیں، تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں"۔

اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ :

"میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلَف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرتؒ ہی کا حصہ ہے"۔

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ :

"حضرتؒ کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی"۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحبؒ صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے اور ان کے ہاں اِخفاء تھا نہیں' جو واردات ہوتیں صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا' یہ الہام ہوا' یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ :

"بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی"۔

طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات پیش آئی؟

فرمایا کہ :

"قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا' ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا"۔

اس کے بعد خود فرمایا کہ :

"میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی۔ تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی میرٹھ میں میری طرف متوجّہ ہوئے' ان کی توجّہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا"۔

اور اس کے بعد خود فرمایا کہ :

"جس شخص کی توجّہ کا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہو سکے تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے"۔

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوب اور تمام اساتذۂ دار العلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمۂ فنون تھے ___ مولانا سعید احمد صاحب امام معقولات سمجھے جاتے تھے ___ ان سب نے مل کر حضرت نانوتوی سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمۂ علوم تھے۔ مولانا یعقوب تو صدر مدرّس تھے۔

عُلوم کا عُروج

تو حضرت نے منظور فرمایا۔ چھتہ کی مسجد میں حضرت نے درس شروع کر دیا۔ الم سے شروع فرمایا تو حروف مقطّعات پر کوئی دو اڑھائی گھنٹہ تقریر فرمائی اور عجیب وغریب علوم ومعارف ارشاد فرمائے۔

اور یہ عجیب بے نفسی کا دَور تھا کہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہٰذا تکرار کیا جائے۔ نودرہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا' مولانا یعقوب نے تقریر شروع کی۔ بیچ میں ایک جگہ رکے' بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی۔ تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا ___ تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آ رہے تھے تو مولانا یعقوب نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا۔ تو کھڑے کھڑے حضرت نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنیٰ اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ تو عرض کیا حضرت ذرا نازل ہو کر فرمایئے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر

معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمایئے۔ ہم وہاں تو نہیں پہنچے تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت آیئے گا۔ تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہوگا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آ رہا تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے ___ فرمایا۔ ہاں! ہم نے مجلس معارفُ القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ بھی چھاپہ بھی تسہیل بھی کی لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں۔ اس لئے کہ علماء کی توجّہ نہیں وہ کہتے کہ یہ مُعلّق مضامین ہیں۔ میں نے کہا بھئی حمد اللہ اور مُلّا حسن' اور قاضی سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے' تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا' اس کے مطابق کام کرنے کی صورت نکل آئے' حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی' پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔

الغرض بڑے عجیب و غریب علوم و حقائق ہیں۔

کچھ اپنی زندگی کے بارے میں

حضرت قاسم العلومؒ کی سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیمُ الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا' اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرأت کی گئی۔

پیدائش کا پس منظر

حضرت مسکرا کر فرمانے لگے۔ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی' جو شادی خود حضرت نانوتویؒ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تمنّا تھی کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل چلے' تو دوسری شادی دیوبند میں کرائی۔ اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہندؒ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو۔

تو فتح پور ہسوہ میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجابُ الدّعوات مشہور تھے۔ تو حضرت مولانا عبدالسّمیع صاحبؒ کو حضرت شیخ الہندؒ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحبؒ صاحب اولاد ہوں۔ وہ سفر کر کے گئے ___ جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ :

"رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا"۔

مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے' صبح آئے اور خوش ہوئے۔ فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔ اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا۔ جو حافظ اور قاری بھی ہوگا'

مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا ___ مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا اور میں جارہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔ اس تانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحبؒ تھے اور میں تھا۔ مولانا نے کہا کہ بھئی! میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ :

”جب تو حافظ قرآن ہوگیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمدللہ قبول ہوگیا پھر تو نے قرأت کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا۔ پھر تو نے فراغتِ تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا 'الحمدللہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا' آج تو حج کو جارہا ہے۔ تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہورہا ہے“۔

آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا :

میری پیدائش کے بعد کان میں آذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو بلایا گیا جو اکابرِ دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے' ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا' انہوں نے کان میں اذان دی ___ حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دیوبند تشریف لائے اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں' دعا کیا کروں' قبول کرچکا ہوں۔ اب اللہ جانے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہری صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی۔ ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی۔

حضرت حکیمُ الاسلام کی بسم اللہ

اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا۔ دور دور سے مہمان آئے۔ تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہند کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔ اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع۔ مطلع تو یہ تھا ۔

حبذا مکتب طیّب کی مبارک تقریب
کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے تھا ۔

ربّ یسّر جو کہا اس نے تو بے روئے ریا
فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمّم بالخیر

نازبرداری

بہرحال ان اکابر کی توجہات تھیں' میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے گزارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتوی کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر' حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اس طرح نازبرداری کرتے تھے

جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو‘ اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں‘ غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

مسلمانوں کے تنزّل کے اسباب

یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ ’’مسلمانوں کے تنزّل کے اسباب‘‘ ایک ایسا موضوع جس پر بحث و فکر تو مدّتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزّل کے اسباب و محرّکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی‘ منبر و محراب کو لیجئے یا میدان صحافت و انشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطّل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغریٰ نے ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے۔ مگر ___ ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کفِ ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔

یہی تصویر حضرت قاری صاحب مدّ ظلہٗ کے سامنے آچکی ہوگی کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا۔

’’مسلمانوں کے تنزّل کے اسباب؟‘‘

اور پھر اہلِ سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا :

اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے‘ ایک مُلّا کی رائے کیا معتبر ہوگی۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا حق سمجھتی ہے۔ حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا ___ تنزّل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کے بجائے اپنے معاشرہ کے چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحبِ بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا یہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کے بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

تنزّل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینی چاہی‘ اور نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی‘ جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کر سکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمّہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے؟

افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی مگر سہ کران کی ساری غور و فکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفہ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے ___ حضرت حکیم الاسلامؒ نے تنزّل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ___ کہ ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے‘ میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال۔ دار العلوم آئے اور بہت متأثر ہوئے۔ یہ

جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے' انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں میں نے کہا جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا۔ ہاں سبب ہے۔ کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی' تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور برسرِ اقتدار انسان آپ ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔

اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔

مذہبی نقطہ نظر سے اسبابِ تنزّل

تو میں نے کہا سن لیجئے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کر سکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کر سکتی ہے دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہو گا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے' اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیا کی وجہ سے پچتی ہوئی چلتی۔ وہ وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہو گی اس میں شرم و حیا اور غیرت ہو گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہیں یا جانور۔ اس قدر بے ہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بداخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا' گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں۔ سو پچاس اترے کسی نے سو گنے' کسی نے دو سو گنے' کسی نے پچاس' کسی نے گٹھڑی باندھ لی اور قطعاً انہیں یہ احساس نہیں کہ یہ ہماری چیز ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے' نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ ہے۔ تو جب تاجروں میں خیانت آجائے تو ملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حُکّام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی' جانب داری' اقرباء پروری' یہ ایک عام چیز بن گئی ہے اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آجائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا۔ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں

لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔

کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے۔ وہ آنہیں سکتی بیچ میں۔

نقطۂ نظر کا اختلاف

تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے۔ تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں' باقی یہ ہو گا نہیں' میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں' کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے' سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سے' جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزّل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں۔ اسلامی اخلاق چھوڑ دیں' تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب' دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں۔ بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔

برسرِ اقتدار طبقہ کی اِصلاح کا طریق

اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمد للہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے لیکن برسرِ اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں' یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ **مستغنیانہ** طریق سے ان لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے' نہ عہدہ نہ دولت' بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع' ورنہ اس سے ملک اور قوم تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے۔ کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آجائے حکومت' تو وہ پھر چڑ پر آتی ہے' تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی ___ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈال دی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حکومت سے کام لینے کا طریق!

حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

"پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے۔ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے کہا تھا کہ جو مفکر قسم کے لوگ چند علماء ہیں اور با اثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کردیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کی بقاء کے لئے فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک و قوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اسی سے قائم ہے"۔

اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ اصولی اور کلّی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے ــــــ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور بازیابی کا موقع ملا جاتا تو صدر ایوّب سے کہتا کہ مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں' ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو' نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد ہو' نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو' ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدّعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیّہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔

تو جان بچانے کے لئے آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ صالحین روحانی اطبّاء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے۔

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کردیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت مؤخّر ہے ــــــ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کردیں جو عقلی منکرات ہیں اور دنیا کی ہر قوم اسے بُرا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکرات شرعیّہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفاتِ شرعیّہ کو لیں مگر کم از کم منکرات تو ختم کردیں اور یہ بھی تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں ــــــ آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزو تمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں ــــــ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گنے چنے ہیں ان کے علاوہ عامتہ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا۔ اس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا ــــــ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسف" لگے ہوئے تھے ــــــ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا ــــــ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بارے میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں اُلجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانیؒ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

تو جب آپ اسلام کے نام پر ـــــ حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جاسکتا ہے تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں' آپ انہیں نہ جاگیر دیں' نہ عہدہ نہ وہ طلب کریں گے۔

حکّام اور اہلِ دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز

حضرت حکیمُ الاسلام اصلاحِ احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے' اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصرِ حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کرچکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جارہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے پر گھمنڈ اور غُرور) میں مبتلا ہوچکی ہو۔ پھر جب خوشامدی' خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیّت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنیٰ سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکّام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقتدار کی خاطر اس خلا کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہوسکتی ہے؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا۔

"حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملینِ اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہوجانا کب ممکن ہے ـــــ؟ حضرت نے فرمایا! ان کی یہ غلط فہمی دور کردینی چاہئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں حارج ہے۔ بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کارآمد ہو۔ اسلام اس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دنیا کی ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں ۔۔ کاری' جوا' سود' شراب نوشی قسم کی چیزیں جس کی قباحت مسلّماتِ عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ البتہ جو چیزیں منکَر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلام کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسیع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کو جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو"۔

پھر قاری صاحب نے فرمایا۔ مقصد اصلاح حال ہے۔ اور یہ کہ حالات سُدھر جائیں اخلاص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے' ایک دوسرے کو دور کرنے کے بجائے نزدیک کردے۔

تعمیری انداز میں اِصلاح

رات ڈھل رہی تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والی ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی مشین ہے جو ایک ایسے نامۂ اعمال کے اوراق

میں سب کچھ محفوظ کررہی ہے۔ جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "السّاعۃ" اور زلزلۃ السّاعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہوسکیں گی اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسّم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا۔

مَالِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا

ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل ودماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا' مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقّانیہ کا بھی آجائے اور پوچھ بیٹھا کہ "الحق" کے لئے کون سا طریقہ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا :

وہی پالیسی میں نے جو عرض کردی۔ توافق سے کام چلے گا' تقابل سے نہیں۔ تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہوسکیں گی۔

حضرت! جب الحاد اور بے دینی غالب ہوچکی ہے' پھر کیسی موافقت ___ ؟ برجستہ فرمایا۔ اسی کی اصلاح کے لئے تو توافق کی ضرورت ہے۔ اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹادیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھاگئی ہے۔ اصلاح کی مساعی بار آور معلوم نہیں ہورہیں ___ ؟

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ نے فرمایا۔

کام کے لئے اوّلین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوجائے آپ تو ورثہ انبیاء میں ___ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے۔ جب حضرت نوح نے بددعا کی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ ___ ساڑھے نوسو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

دیگر بلادِ اسلامیہ تو دہریت' مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آہی گئے اور ہوگئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلادِ اسلامیہ باوجود قوّت کے تباہ ہورہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوّت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیرباد کہہ دیا۔ وطنیّت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکوگے؟

ورثہ رسول صلّی اللہ علیہ وسلم

حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو اربابِ عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو ___ فرمایا۔ حضورؐ نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوسکوگے۔

ترکت فیکم الثّقلین لن تضلّوا بعدی ابدا ان تمسّکتم بھما

دارالعُلوم کی ترقی

حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقّانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا! آپ لوگ جو اختیار کئے ہوئے ہیں' بحمد اللہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہورہا ہے۔ مولانا موجود ہیں۔ ہروقت قال اللہ اور قال الرّسول ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیّت اور معنویّت ہوگی۔ خدا نے مدرسہ کو

ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو الحمد للہ دین مجسّم ہیں۔

حضرت! مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے اور بجٹ؟

فرمایا۔ انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے' انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا' مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے' پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیں شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ اڑتیں تھے' اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دار العلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں ___ ؟ فرمایا۔

اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرّجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں' چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دورانِ گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی سیاست اور دین میں بیر ہے۔ اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست' یہ بالکل تقابل پر ہیں دین کے جو چیزیں دین میں حرام ہیں۔ اس کے ہاں واجب ہیں۔ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ ___ "مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے"۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادلِ ناخواستہ اس پُر لطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

افادات علم و حکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی جوابات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا - ! اَمَّا بَعْدُ

وصول الی اللہ کے اصول

ان صلاحیتوں کا معیار ہے کہ علائق جتنے کم سے کم ہوں گے وصول اتنا جلد سے جلد ہوگا، جتنے علائق اور ...لقات بڑھ جائیں گے طبیعت اس میں بٹے گی یکسوئی کم ہوگی تو پھر دیر لگ جاتی ہے چاہے استعداد بھی ہو۔

اسی واسطے ان حضرات نے جو اصول رکھے ہیں وہ چار ہی ہیں۔ قلت طعام یعنی کھانا کم کھانا اور کم کا یہ ...طلب نہیں ہے کہ جو خوراک ہے اس سے بھی آدھا کردے یہی دو چار لقمے کم کردے، یہ کافی ہے ___ ...صوص اس زمانے میں ___ پہلا دور جو کہ حضرات صحابہؓ کا دور ہے کہ ان کی غذائیں سوکھا ٹکڑا وغیرہ ...یں۔ حتیٰ کہ جہاد میں جارہے ہیں۔ کسی کی زنبیل میں چند ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں کوئی سامان رسد نہیں تھا ... وہاں کیک وغیرہ ملیں ___ بعض کے پاس کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں، بھوک نے ستایا، وہ کھائیں ___ ...ں کو یہ بھی میسر نہیں تو چھوہاروں کی گٹھلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں ہی منہ میں ڈال لیا اور چوس لیا، دل کو ...لیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں ___ غرض غذا تو یہ تھی اور مجاہدات عظیم کہ دن بھر جہاد میں اور رات کو مجاہدہ ...ہیں اور غذا اکل یہ ___ غالباً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :

انهم يبعرون بعرًا وانتم تصلطون صلطًا۔

وہ فراغت کو جاتے تھے بمشکل دو چار مینگنیاں سی نکل آتی تھیں۔ غذا ہی نہیں اور تم تد کچے بھر دیتے ہو۔ ...پنے لوگوں کو جو کہ تابعین تھے، ان کو کہا ___ تو ہر زمانے کی قلت طعام الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی ان کو ...ت طعام کی حرص کرنے لگے تو چارپائی پر پڑجائے گا، اور اس کا انتقال بھی ہوجائے گا، برداشت نہیں کرسکتا۔ ...کے ظرف میں برداشت تھی، فیضان نبوت براہ راست متوجہ تھا۔ اس سے بڑھ کر طاقت نہیں ہوسکتی ___ ...حال کی قلت طعام یہی ہے جو ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا ___ ہم دو ...وں کو کسی ضرورت سے دہلی بھیجا، دو آدمیوں کی آمدورفت میں پانچ روپے لگ جاتے مگر ہمیں پچاس

روپے دیئے کہ خوب کھاؤ اور خوب کام کرو ___ غرض اس زمانے کی قلت طعام یہی ہے کھانے میں زیادہ کمی نہ کرے۔ معمول کو معتدل رکھے ___ ایک اصول یہی ہے ___ اور ایک ہے قلت منام یعنی سووو کم ___ اس میں بھی یہی بات ہے کہ ان حضرات کا سونا تو مجبوری تھا کہ وہ تو یہ چاہتے کہ سوئیں بھی نہ۔ بس ذکر اللہ میں ہی لگے رہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مسجد نبوی میں بیٹھ کر ذکر فرماتی تھیں ایک رسی چھت میں ٹانگ رکھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

یہ رسی کیسی ہے؟

عرض کیا "جب نیند کے جھکولے زیادہ آنے لگتے ہیں تو اپنے کو اس رسی سے باندھ لیتی ہوں"۔

فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آنے لگے پڑ کے سو رہو۔ جاگ جاؤ پھر اللہ کا نام لینا شروع کرو۔ طبیعت کو گھونٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو شریعت نے طبائع کی رعایت بہت زیادہ کی ہے۔ طبیعتوں کا معمول ہر ایک کا الگ الگ ہوتا ہے اس میں کمی ہو جائے گی تو اس کا برا اثر پڑے گا۔ اور بالخصوص اس دور میں' اس واسطے جس کا معمول سونے کا ہے اس میں کمی نہ کرے ___ اس لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا کہ **لاتفريط في النوم** 'نیند میں کمی مت کرو۔ جس کو جو عادت ہے اس کو پورا کر لے اور اپنا کام بھی کرے۔ مگر نیند میں اتنا وقت لگادے جتنا معمول ہو۔ تو طبائع الگ الگ ہیں۔ اس لئے ہر ایک کی قلت طعام و قلت منام مختلف ہوتی ہے' پھر زمانے بھی الگ الگ ہیں۔ حالات بھی الگ الگ ہیں' اس کے لحاظ سے ایک طبقہ پر دوسرے طبقے کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

تیسرا اصول ہے قلت کلام۔ کم بولو۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بلا ضرورت نہ بولو۔ ضرورت کے موقع پر کلام کرنا ضروری ہے۔ لیکن خواہ مخواہ کی فضول مجلسیں اور تفریحی باتیں ان میں وقت ضائع ہوتا ہے اور علائق کی کثرت ہو جاتی ہے پھر اپنے معمولات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔

اور چوتھی چیز ہے قلت اختلاط مع الانام۔ ملنا جلنا کم' بالخصوص مجاہدات کے زمانے میں۔ میل جول تفریحی مجلس' اٹھنا بیٹھنا' یہ چیزیں مضرت پہنچاتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ :

من سكت سلم ومن سلم نجا

جو چپ رہا وہ صحیح سالم رہا' اور جو صحیح سالم رہا اس نے نجات پالی۔ حاصل وہی ہے کہ بلا ضرورت بولنا اسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔ جیسے ایک روایت میں ہے کہ :

عجمیوں کے بکواس سے بچو۔ بے ضرورت بول رہے ہیں۔ بولے چلے جا رہے ہیں۔ یہ غلط چیز ہے ___ ضرورت کے موقع پر چپ رہنا برا ہے اور چپ رہنے کے موقع پر بولنا برا ہے ___ حسب ضرورت سکوت وکلام کرے' سب کا حاصل یہی نکلا کہ اختلاط اور علائق کی کمی ہو اس سے وصول جلد ہی ہو جاتا ہے ذکر کی تاثیر قوی ہو جاتی ہے۔

مجاہدات باطنیہ کی مثال

مجاہدات باطنیہ کی مثال ایسے ہے جیسے کہ مدارس میں طلباء تعلیم پاتے ہیں ان کے لئے بھی کثرۃ علائق بری چیز ہے۔ اگر وہ دوستیاں کریں۔ مجلسوں میں جائیں تو مطالعہ کون کرے گا؟ استعداد کس طرح پیدا ہو ___؟ غرض کسی بھی مقصد کے لئے ضروری ہے کہ دل میں مقصد کی لگن ہو اور مقصد کے لئے عشق ہو اور مقصد سے تنفر اور بعد ہو۔ پھر جا کے مقصد حاصل ہوتا ہے ___ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے۔

اور لوگوں کی آنکھوں میں گریہ طاری تھا۔ توجہ الی اللہ ہو رہی تھی۔ تو جوش عقیدت میں ایک شخص نے کہا۔

مقصد کی لگن

"اے موسیٰ! تم سے بھی بڑا کوئی دنیا میں عالم ہے؟ یعنی نہیں ہے"

فرمایا ___ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے ___ اور یہ حق تھا اس لئے کہ اپنے دور میں پیغمبر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوتا۔ انہی کے طفیل میں دوسروں کو علم پہنچا ہے۔ تو اپنے دور میں موسیٰ علیہ السلام افضل الخلائق ہیں۔ بلا کسی غرور نفس اور بلا کبر کے حق بات آپ نے فرمادی۔ کہ میں ہی بڑا عالم ہوں۔ اللہ نے بنادیا۔ یہ تکبر نہیں تھا۔ مگر کبر کی صورت پیدا ہو گئی' دعویٰ کہ صورت پیدا ہو گئی کہ "میں ہوں" یہ ناپسند ہوا ___ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں۔ بلٰی عندنا عبدنا ھو اعلم منک

ہمارا ایک بندہ ہے کہ جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس سے جاکے علم سیکھو۔ تو موسیٰ علیہ السلام چلے اور حضرت یوشع ابن نون کو ساتھ لیا۔ حق تعالیٰ نے علامت بتلادی کہ فلاں جگہ مجمع البحرین میں جب پہنچو گے تو اس بندے سے ملاقات ہوگی۔ اور یہ فرمایا۔ جو مجھے سنانا تھا کہ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ___ میں مجمع البحرین پر پہنچ کر رہوں گا' چاہے لاکھوں برس گزر جائیں' مجھے جانا ہے اور اس بندے سے علم حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصد کی لگن تھی کہ چاہے لاکھوں برس گزر جائیں۔

غرض ایک طالب علم کا جب انتہائی مقصد متعین ہو جائے' اس میں لگن ہونی چاہئے اور مقصد سے عشق ہونا چاہئے۔ جب اس میں منہمک ہو گا تو غیر مقصد کی طرف کبھی توجہ نہیں کرے گا۔ تو مقصد کی لگن اور دھن یہ اصل چیز ہے ___ جب علوم ظاہرہ میں اس کی ضرورت ہے۔ تو علوم باطنہ میں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے آدمی یہ سوچ لے کہ چاہے عمر نوح بھی گزر جائے مگر مجھے ہر صورت میں یہ مقصد حاصل کرنا ہے' پھر حق تعالیٰ بھی مدد فرماتے ہیں اور مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ غرض پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے مقصد سے لگن ہو۔ اس کے لئے پھر ایثار ضروری ہے کہ آدمی اپنی خواہشات مقصد میں فنا کردے۔ اگر رات دن اس میں ہے کہ کھاؤں گا یہ اور پیوں گا یہ' تو وہ آرائش کی فکر میں ہے۔ اسے مقصد سے کیا تعلق؟

جب آدمی مقصد میں لگتا ہے تو ہر چیز سے نگاہ ہٹ جاتی ہے۔ پھر مدد خداوندی آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "ہمت مرداں مدد خدا" ہمت کرو گے تو اللہ کی مدد شامل ہوگی' کم ہمت ہو کر گھر بیٹھ جاؤ گے اس کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔

اختلاف استعداد

تو اس میں احوال بھی ہیں' استعدادیں بھی مختلف ہیں۔ عزیمتیں بھی مختلف ہیں۔ بعضوں میں عزیمت ہوتی ہے کہ انتہائی لگن ہے۔ بعض میں کچھ ہلکی سی لگن ہوتی ہے اس کو مقصد کے حاصل کرنے میں دیر لگ جائے گی' اس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ قانونی بات اتنی ہے کہ نصاب پورا ہو گیا۔ تو فارغ التحصیل ہو گئے۔ اب یہ کہ تم میں کتنی علمی قوت آئی' یہ ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ یہی یہاں بھی ہے کہ جب وہ مجاہدات و افکار صحیح طریقے سے پورے ہو گئے شیخ کہدے گا کہ بھئی تم قانونی طور پر واصل ہو گئے۔ اب یہ کہ تمہارے اندر جذبہ کتنا ہے۔ عشق خداوندی کتنا ہے۔ یہ ہر شخص کے حالات الگ الگ ہیں۔

اعضاء کی پیوند کاری

یہ اصل میں اس پر موقوف ہے۔ پہلے یہ سمجھا جائے کہ اس جسم کے ہم مالک ہیں یا یہ جسم ہمیں بطور عاریت کے فائدہ اٹھانے کے لئے دیا گیا ہے ___ ظاہربات ہے کہ یہ جسم سرکاری مشین ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ اگر آپ مالک ہوتے یا آپ کے قبضے میں ہوتا تو آپ کبھی اس جسم کو بیمار نہ ہونے دیتے، کبھی کسی عضو کو اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیتے، مگر آپ مالک نہیں ہیں۔ بیماری آتی ہے تو آپ کو سر جھکا دینا پڑتا ہے۔ صحت آتی ہے جب بھی سر جھکا دیتے ہیں۔ غرض پہلا سوال یہ ہے کہ آپ اس بدن کے مالک ہیں یا بطور عاریت کے دیا گیا ہے؟ مالک تو ہیں نہیں بطور عاریت کے دیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ دیتے ہیں پھر لے لیتے ہیں۔ اگر مالک ہوتے تو کبھی بھی اپنے بدن کو دوسرے کے حوالے نہ کرتے۔ حتیٰ کہ اللہ میاں کے حوالے بھی نہ کرتے اگر وہ لینا چاہتے تو کہتے کہ حضور، جب آپ نے ہماری ملک بنا دی تو غیر کی ملک میں آپ تصرف کیوں کرتے ہیں؟ اس سے معلوم ہوا، ہماری ملک نہیں، جب ملک نہیں ہے تو مالک سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اجازت دے تو ہم کسی عضو کو منتقل کر سکیں گے۔ وہ اجازت نہ دے تو نہیں کر سکیں گے، تو اس اجازت کی ذمہ داری آپ کے پاس کوئی ہے یا نہیں؟ کہ آپ کو اجازت مل گئی ہے یا نہیں؟ اگر وحی یا الہام کے ذریعہ مل گئی ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ملی تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں ___ پھر اس میں ایک سوال تھوڑا ہی ہے۔ آپ نے ایک شخص کو اپنی آنکھ دیدی، قیامت کے دن اس نے کہا کہ اب چونکہ یہ میری ملک ہو گئی لہٰذا تم اندھے رہو۔ لہٰذا یہ اندھے کا اندھا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تو نے اپنا ایک عضو منتقل کر دیا۔ واپس لینے کا کیا حق ہے، جب واپس لینے کا حق نہیں تو اندھا رہ، وہاں پھر آپ کیا کریں گے۔ یہ جسم جو ہے، برزخ ہو یا آخرۃ ہو عذاب تو اب اسی پر واقع ہو گا تو آپ کو حق کیا ہے کہ آپ جسم کے کسی عضو کو دوسرے کو دیدیں۔ اول تو مالک نہیں۔ پھر مالک نہ ہونے کی صورت میں جو تصرفات برزخ میں یا حشر میں ہوں گے وہ اسی بدن پر ہوں گے۔ جب آپ یہ بدن دے چکے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی جلا کر بدن کو راکھ کر دے۔ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

دین کی بنیاد مسائل پر ہے مصالح پر نہیں

اب رہا یہ کہ مصلحت یہ ہے تو دین کی بنیاد مصلحتوں پر نہیں ہے۔ مسائل پر ہے۔ کونسی بری سے بری چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی مصلحت نہیں۔ شراب پینے میں بھی تو مصلحت ہے۔ صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ بدن میں قوت آجاتی ہے۔ جوئے میں بھی مصلحت ہے ایک دم تو مال بھی بڑھ ہی جاتا ہے۔ ایک پیسہ خرچ کیا اور ہزار روپیہ کما لیا تو نفع ہوا ___ اور قرآن کریم بھی اس مصلحت کو مانتا ہے ___

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔

لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوے کے بارے میں آپ فرما دیجئے ان میں کچھ نفع بھی ہے کچھ نقصان بھی ہے۔ مگر نقصان غالب ہے نفع مغلوب ہے ___ غرض قرآن کریم نے نفع کا اقرار کیا تو کونسی چیز ایسی ہے جس میں نفع نہیں، مگر اس نفع و نقصان پر اگر احکام کا مدار ہوتا تو شراب جائز ہوتی کہ اس میں ایک نفع بھی ہے۔ جوا جائز ہوتا، اس میں ایک نفع بھی ہے۔

لیکن باوجود منفعت کے ناجائز قرار دیا گیا، غرض آپ اگر تمدنی مصالح سے کوئی منفعت ثابت کریں تو دین کا مدار تو منافع اور مصالح پر نہیں ہے، وہ تو مسائل پر ہے۔ ورنہ آپ کل کہیں گے کہ صاحب تمدنی طور پر

شراب میں بھی تو منفعت ہے تو اس کی بھی اجازت دی جائے۔ اور جوئے میں بھی کچھ نفع ہے تو اس کی بھی تھوڑی بہت اجازت دی جائے۔ تو اس اجازت کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوسکتا ___ یہ فقط آنکھ' ناک تک نہیں رہے گا' یہ نفس کی خواہشات پر بھی آئیگا۔ طبعی تقاضوں پر بھی آئے گا کہ اس میں مصلحت یہ ہے۔ اگر میری اور آپ کی تجویز کردہ مصلحتیں جو ہم بتلاتے ہیں اس پر مدار ہوتا تو پھر اس کی اجازت دیدیجاتی مگر اس پر تو مدار نہیں البتہ مصلحت کلی پر مدار ہے کہ بنی نوع انسان کی مصلحت کیا ہے۔ زید' وعمر' بکر کی مصلحت نہیں دیکھی جاتی۔ قانون جب بنتا ہے تو مفاد عامہ کو سامنے رکھ کر بنتا ہے۔ زید' عمرو بکر کے لئے نہیں بنتا ___ مثلاً ریلوے کا قانون ہے کہ ایک ٹکٹ میں آپ ۲۵ سیر وزن لے جاسکتے ہیں۔ ایک آدمی یوں کہے کہ میں قوی ہوں میں دو من وزن اٹھا سکتا ہوں۔ میرے لئے ۲۵ سیر کی کیوں قید ہے ___ ؟ اس کی بات کو نہیں مانا جائے گا۔ اس لئے کہ مفاد عامہ کی رعایت پیش نظر ہے۔ زید' عمرو بکر کی نہیں کہ کون قوی ہے' کون ضعیف ہے۔ تو دنیا کے قانون میں بھی جو مفادات عامہ ہیں' مصالح عامہ ہیں جو بنی نوع سے متعلق ہیں ان کی رعایت ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کے چند افراد کی رعایت نہیں ہوتی۔

نس بندی یا کنبہ بندی؟

نس بندی تو باتفاق علماء ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں تغیر خلق اللہ بھی ہے اور بدن انسانی میں اس قسم کے تصرفات کرنا ہے جن کی فطرت اجازت نہیں دیتی ___ پھر یہ کہ نس بندی سے وہ مادہ تقریباً ختم ہوجاتا ہے جس سے آدمی کی اولاد ہو۔ کسی کو حق نہیں کہ کسی مادے کو ختم کردے کہ وہ اولاد بنانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اور مرد سے نامرد ہوجائے۔ اس کا کا کوئی حق نہیں ___ اور کنبہ بندی جو ہے وہ اختیاری ہے۔ اس میں یہ ہے کہ خاوند بیوی میں بعض مصالح ایسے ہیں کہ وہ اگر اولاد بند نہیں کریں گے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ مثلاً بیوی بہت بیمار ہے ___ اگر اولاد ہوگی تو اس کی جان کا خطرہ ہے ___ یا خاوند بہت بیمار یا جیسے فقہاء لکھتے ہیں کہ رزق کی اتنی کمی ہے کہ کوئی صورت نہیں بن پڑتی اور اولاد روز بروز ہورہی ہے تو تقلیل اولاد کے لئے خاوند بیوی مل کر باہمی معاہدہ کرلیں کہ اب ہمیں اولاد کم کرنی ہے۔ مگر یہ قانونی چیز نہیں یہ تو اخلاقی اور خانگی چیز ہے' قانون شریعت اس کے اوپر دباؤ نہیں ڈالے گا۔ البتہ شریعت حق دے گی کہ اگر ایسے حالات آئیں تو اس حق کو باہمی رضامندی سے استعمال کیا جائے گا۔ خاوند بیوی مل کر باہم معاہدہ کرلیں۔

غرض نس بندی میں مادہ زائل ہوتا ہے۔ اس کا کسی کو حق نہیں۔ کنبہ بندی اختیاری ہے کہ خاص حالات میں آدمی تقلیل اولاد کی طرف متوجہ ہو۔ مگر وہ قانونی چیز نہیں۔ اخلاقی چیز ہے کیونکہ ہر گھر کا الگ الگ معاملہ ہے۔

عمومی طور پر تقلیل اولاد کی صورت

تقلیل اولاد کا جو طریق ہے وہ یہ ہے کہ ان اسباب کا انسداد کیا جائے جن سے ہر وقت شہوات ابھرتی رہتی ہیں اور خواہی نخواہی اولاد ہو' حتیٰ کہ جائز ناجائز بھی۔

جب فواحش اور منکرات عام ہوں بے حجابی اور عریانی عام ہو' عورتوں اور مردوں کا اختلاط عام ہو' کوئی صورت تقلیل اولاد کی نہیں ___ آخر پہلے بھی تو لوگ تھے مگر اتنی اولاد نہیں ہوتی تھی' اس لئے کہ ہوسناک نہیں تھے' اب چونکہ رات دن عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ شب و روز اختلاط ہے تو شہوات اپنے مرکز پر قائم نہیں

ہیں وہ منتشر ہیں اس لئے لوگ جائز ناجائز میں مبتلا ہیں۔ اور جب کوئی چیز اپنے مرکز کو چھوڑ کر حد سے نکل جاتی ہے 'کوئی بھی قوت ہو وہ کسی حد پر رکتی نہیں۔ شہوات جب قبضے میں نہ رہیں تو ہر وقت آدمی شہوت رانی میں پڑا رہے گا۔ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ تو قدرتی طور پر اولاد زیادہ ہوگی ___ اس واسطے تقلیل اولاد کی ایک تو خاص صورت ہے کہ بیوی بیمار ہے۔ بے حد کمزور ہے۔ اندیشہ ہے کہ اب اگر اولاد ہوگی تو بچے گی نہیں۔ یہ تو ایک خصوصی بات ہے۔ لیکن عمومی طور پر اگر کوئی چاہے کہ اولاد زیادہ نہ ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب کو ختم کیا جائے جنکی وجہ سے شہوات اپنی جگہ پر قائم نہیں ہیں ___ بے پردگی' فحاشی اور عریانی روکی جائے ___ مرد وعورت کا اختلاط روکا جائے۔ قدرتی طور پر ہر قوت اعتدال پر آجائے گی۔

مقصود تکثیر اولاد ہے تقلیل کا تعلق عوارض سے ہے

تقلیل اولاد مقصود تو نہیں۔ مقصود تو تکثیر اولاد ہے۔ امت محمدیہ جتنی بڑھے گی' بہتر ہی ہے مگر تقلیل مقصود نہیں ہے۔ تقلیل عوارض کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ جب کوئی خاص حالت پیش آجائے جیسا کہ میں نے عرض کیا' بیوی بیمار ہے۔ یا مرد کے اندر صلاحیت باقی نہیں رہی یا اور اسباب پیش آئیں۔ غرض تقلیل مقصود اصلی نہیں وہ تکثیر ہی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس پر کیا حالات گزر رہے ہیں وہ اپنے گھریلو حالات دیکھ لے۔

اور ایک وہ عام چیز ہے وہ قانونی ہے۔ چاہے تقلیل ہو' تکثیر ہو کہ منکرات کو دنیا سے مٹایا جائے' عریانی' بے حجابی' بے حیائی اس کے کارخانے بند کئے جائیں۔ یہ قوت اعتدال پر آجائے گی۔

موجودہ تمدن جو مغرب کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک اسلامی تمدن کی ضد ہے۔ یہاں نگاہ بازی حرام' وہاں نگاہ بازی تمدن کی جز۔ یہاں اجنبیہ سے خلوت بالکل ممنوع' وہاں تمدن کا جز' وہاں اگر کسی شخص کی بیوی اندر ہے' اور باہر کسی غیر مرد کے جوتے پڑے ہوئے ہیں تو اسے حق نہیں ہے کہ وہ مداخلت کرے' اسے بیوی کو روکنے ٹوکنے کا حق نہیں ہے۔ اندر نہیں جا سکتا۔ ایک تمدن غرض اس بارے میں یہ اسلامی تمدن کی بالکل ضد ہے۔

تمدنی مشکلات

اب مشکل یہ ہے کہ تمدن تو وہ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہم اسلامی جزئیات کا جوڑ لگائیں۔ وہ جوڑ لگے کیسے؟ وہاں تمدن کی بنیاد نفسانیت اور نفسانی خواہشات ہیں۔ یہاں تمدن کی بنیاد اخلاق روحانیت پر ہے کہ اخلاق اعلیٰ ہوں کردار بلند ہو ہر شخص خوف خداوندی اور تقویٰ وطہارت کی تصویر ہو۔ غرض یہاں کی بنیاد الگ اور وہاں کی بنیاد بالکل الگ۔ وہاں مقصود اصلی عیش دنیا ہے۔ یہاں مقصود اصلی عیش آخرت ہے۔ بقدر ضرورت شریعت نے دنیا کمانے کی بھی اجازت دیدی۔ چونکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے ایک میں دوسرے کا جوڑ کیسے لگے؟

وعظ و نصیحت سے شخصی تبدیلی آتی ہے

اب وعظ و نصیحت آتی ہے کوئی بے چارہ اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ مان لیتا ہے' لیکن محض وعظ

و نصیحت سے تمدن میں انقلاب نہیں آسکتا۔ انقلاب تو قوۃ قہری سے آتا ہے۔ بعض چیزیں طاقت سے پیدا کی جاتی ہیں، محض وعظ و نصیحت سے پیدا نہیں ہوتیں ___ اگر یہ نہ ہوتا تو اسلام میں خلافت نہ رکھی جاتی۔ چونکہ جامع اور اجتماعی چیز ہے اس واسطے اسکے اندر خلافت ہے، حدود و تعزیرات ہیں غرض بہت سی چیزوں کا انسداد قوت کرتی ہے' وعظ و نصیحت نہیں کرتی۔

وعظ و نصیحت سے بہت سے بہت کوئی عبادات کی طرف متوجہ ہوگیا' معاملات سچے کر لئے لیکن یہ کہ زمانے کے اندر تمدنی انقلاب برپا ہو جائے یہ محض وعظ سے نہیں ہوتا' قوت سے ہوتا ہے۔

خلافت اخلاقی

ایک خلافت عامہ ہے جیسے خلفاء راشدین کی خلافت' جو طاقت ور خلافت ہے۔ اور ایک خلافت اخلاقی ہے جیسے کسی شیخ نے اپنے مریدین کو خلافت دیدی۔ وہ خلافت باطنی ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ قلوب کی اصلاح کرو لیکن زمانے کو بدل دو یہ قبضے میں نہیں ہے۔ اور یوں کوئی روحانیت والا اللہ تعالیٰ پیدا کرے جو سارے عالم کو بدل ڈالے' تو اسے قدرت ہے جیسا کہ ظہور مہدی کے بارے میں فرمایا گیا کہ اتنی عظیم روحانی قوت ہوگی کہ پوری دنیا کا تمدن بدل جائے گا اور انقلاب عام پیدا ہو جائے گا' سب میں خوف خداوندی' خدا ترسی پیدا ہو جائے گی اور سب اتقیا بن جائیں گے ___ چنانچہ فرمایا گیا کہ آدمی زکوٰۃ کا مال لے کر نکلے گا تو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملے گا کہ میرے گھر میں خوب تمول ہے۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک انگور کے خوشے میں پورا کنبہ سیر ہو جائے گا۔ تو عدل کامل جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو پھر دنیا میں برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ ظلم کے ساتھ برکات کا ظہور نہیں ہوتا ___ غرض خلافت عامہ اور چیز ہے۔ اسے خلافت کبریٰ کہتے ہیں۔ خلافت صغریٰ یہ ہے کہ ایک شخص پر آپ کو اطمینان ہوا کہ اس کا قلب صحیح ہوگیا اور یہ اپنی حد تک دوسروں کو بھی صحیح بنائے گا۔ آپ نے خلافت دی تو یہ خلافت باطنی ہے خلافت عامہ نہیں ہے۔

علامت ظہور مہدیؑ

ظہور مہدی کا وقت تو متعین نہیں کیا گیا اس کی علامتیں بتلائی گئی ہیں جب یہ علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوں سمجھو کہ ظہور مہدی قریب ہے۔ پہلی علامت یہ ہے کہ **ملئت الدنیا ظلماً وجوراً**

پوری دنیا ظلم و ستم سے لبریز ہوگی۔ عدل اور سکون قلب کا کہیں نشان نہیں ہوگا۔ آثار تک نہیں ہوں گے۔ ظلم و زیادتی سے دنیا بھری ہوئی ہوگی اور یہ حالت عام ہوگی۔ کسی خطے کے ساتھ مخصوص نہیں۔

یا جیسے فرمایا گیا کہ عرب میں سونے کا ایک پہاڑ ظاہر ہوگا۔ وہ ظہور مہدی کا وقت ہوگا۔ تو ایسی کچھ علامتیں بتلائی گئی ہیں۔ مدت متعین نہیں کی گئی وہ اللہ کے علم میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کب ظہور ہوگا ___ جیسے قیامت کی علامات بتلائی گئیں' وقت نہیں بتلایا گیا۔

ذرائع یقین

جس درجے میں آپ پہنچ سکتے ہیں پہنچئے' یہ جو منجم ہیں یہ انکل پچو کے تیر لڑاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جوانمردی تو یورپ والوں نے کی کہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر چاند پر پہنچ گئے۔ یا تو طاقت ہو وہاں پہنچ کر حالات معلوم کیجئے۔ باقی فنی اصول سے جو انکل پچو حالات بیان کرتے ہیں وہ ظنی چیزیں ہیں کوئی قطعی چیز نہیں ہے۔

اس سے روک دیا گیا ــــ اس لئے کہ یقین کا ذریعہ یا مشاہدہ ہوتا ہے کہ آنکھ سے دیکھ لے یا مخبر اسلام صادق کی خبر ہوتی ہے۔ جو آنکھ سے زیادہ یقینی ہے تو یا تو انبیاء علیہم السلام خبر دیں یا پھر آنکھ سے دیکھ لیں۔ باقی یہ کہ فلاں فلسفی یوں کہتا ہے فلاں یوں کہتا ہے یہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ اگر وہ کچھ کہے گا تو ہم بھی اس کے مقابلے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری رائے دوسری ہے۔ تو رائیوں پر دین کا مدار تھوڑا ہی ہے۔ یہ چیز فن نجوم سے تعلق رکھتی ہے اور اسے ظنی کہا گیا ہے کہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ صحیح بھی ہو جاتی ہی، غلط بھی ہو جاتی ہے۔ قطعی بات وہی ہے جو اللہ و رسول فرمائیں یا پھر آپ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ آدمی کیوں مخمصہ میں پڑے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا کہ :

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

دین کی جو بات بھی اللہ کی طرف سے آپؐ خبر دیتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے اس کا ماننا فرض ہے اس میں اس چیز کی نفی نہیں کہ آپؐ کی ذاتی رائے بھی نہیں ہوتی تھی۔ بہت سی چیزوں میں آپؐ نے ذاتی رائے بھی دی ہے جس کا تعلق وحی سے نہیں تھا۔ بہت سی تدابیر آپؐ نے لوگوں کو عقلی طور پر بتلائی ہیں۔ بہت سے مشورے ہیں جو آپؐ نے ذاتی طور پر دیئے ہیں ــــ تو اصول تو یہ ہے کہ جو آپؐ وحی سے فرمائیں وہ واجب العقیدہ ہے۔ ماننا فرض ہے اور جو رائے سے فرمائیں اس کا ماننا فرض نہیں ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ آپ عظمت اور محبت سے اسے بھی حکم ہی سمجھیں لیکن قانوناً اس کا ماننا واجب نہیں ہے۔

اس رائے پر عمل نہ کرنا یہ تو ممکن ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ رائے معاذ اللہ غلط تھی یہ بے ادبی ہے۔ اس سے بچنا لازمی ہے ماننا نہ ماننا اختیاری ہے۔ لیکن تنقید، توہین یا تنقیص وہ کسی طرح سے جائز نہیں خواہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہی ہو، وہ بھی عظمت کی وجہ سے سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔

جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باندی تھیں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے تھا۔ خاوند بیوی میں موافقت ہوتی نہیں تھی۔ حضرت عائشہؓ نے انہیں آزاد کر دیا اور مسئلہ یہ ہے کہ منکوحہ باندھی آزاد ہو تو نکاح اس کے قبضے میں آجاتا ہے چاہے نکاح باقی رکھے چاہے فسخ کر دے۔ مناسبت تھی نہیں، بریرہؓ نے ارادہ کیا کہ میں نکاح فسخ کروں اور حضرت مغیثؓ ان کے سو جان سے عاشق تھے وہ جگہ جگہ روتے پھرتے کہ نکاح فسخ نہ کرے مگر حضرت بریرہؓ نے نہیں مانا۔ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یا رسول اللہ! آپ ہی نے نکاح کیا تھا آپؐ ہی بریرہ کو حکم دیدیں کہ نکاح فسخ نہ کرے ــــ آپؐ نے بریرہؓ سے فرمایا۔ اے بریرہ! نکاح فسخ نہ کرو۔ وہ بہت ذہین تھیں۔ انہوں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کی ذاتی رائے؟

فرمایا۔ حکم شرعی نہیں۔ مشورہ ہے ــــ

عرض کیا۔ میں تو نہیں مانتی ــــ چنانچہ نکاح فسخ کر دیا

اس سے معلوم ہوا کہ اگر انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے پیش کریں تو ماننے نہ ماننے میں آدمی مختار رہتا ہے ــــ ایک ہے محبت کا تقاضا رائے کو بھی آپ حکم کے درجے میں مانیں مگر قانوناً ماننا لازم نہیں۔

تمدّنی چیز کے بارے میں آپؐ کی رائے کا حکم

بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کی باتیں ثابت ہیں۔ مشورے اور ذاتی رائیں بھی ا
آپ نے خود ظاہر بھی فرمایا۔ حدیث میں ارشاد ہے :

انسی کما تنسون

مجھے بھی ایسے بھول چوک ہوتی ہے جیسے تمہیں ہوتی ہے۔ میری ذاتی رائے میں تو آپ مختار ہیں لیکن
وحی خداوندی سے جو کہوں گا وہ قطعی ہے۔ اس میں غلطی ناممکن ہے۔ اس کا ماننا فرض ہے۔ جیسے "تابیر نخل
کے بارے میں عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ پیوند لگاتے تھے۔ اور انہوں نے نر و مادہ سمجھ رکھے تھے۔ اور جب
پیوند لگاتے تھے تو پھل آتا تھا۔ پیوند نہ لگائیں تو پھل نہیں آتا تھا۔ آپؐ نے خیال فرمایا کہ یہ کوئی عقیدہ ہے
انہوں نے جما رکھا ہے کہ یہ نر ہے یہ مادہ ہے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ قلم مت لگاؤ۔ اس کے بعد پھل نہ آیا۔
عرض کیا گیا۔ یا رسول اللہ! اس دفعہ تو پھل نہیں آیا؟

تب معلوم ہوا کہ معاشرے کی ایک تمدنی چیز ہے کہ درخت کو درخت سے ملا کر جو قلم باندھتے ہیں تو پھل
پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسباب حسیہ میں سے ہے آپؐ نے فرمایا :

انتم اعلم باموردنیاکم

بھئی! یہ دنیوی معاملہ ہے۔ تم اس میں زیادہ بصیرت رکھتے ہو۔ جو مناسب سمجھو کر لیا کرو ــــ تو آپ
نے منع فرمایا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی ٹوٹکا یا عقیدہ ہے۔ معلوم ہوا عقیدہ نہیں بلکہ یہ حسی اسباب میں سے
ایک چیز ہے اس لئے اجازت دے دی ــــ غرض ایک انبیاء علیہم السلام کی رائے اور ذاتی مشورہ ہے اس
میں انسان ماننے نہ ماننے میں مختار ہے۔ اور ایک ہے حکم شرعی۔ جو وحی سے ہوتا ہے۔ وہ واجب الاطاعت
ہے۔ تو بعض دفعہ انبیاء علیہم السلام ذاتی رائے سے بھی عمل فرماتے ہیں مگر جب وحی روک دیتی ہے رک
جاتے ہیں۔

نبوّت مجموعہ بشریّت وملکیّت

انبیاء علیہم السلام میں ایک حیثیت بشریّت کی ہے اور ایک ملکیّت کی۔ بشریّت میں جو عوارض بشر پر آتے
ہیں ان پر بھی آتے ہیں 'کھانا' پینا' سونا' جاگنا' صحت ومرض وغیرہ ــــ اور ایک ملکیت ہے کہ حق تعالیٰ وحی
اتاریں' اپنا مقرب بنالیں وہاں انبیاءؑ فرشتوں سے بھی بالاتر ہیں کہ فرشتوں کا بھی وہ مقام نہیں' ان دونوں
مقاموں کو فرمایا گیا کہ :

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ۔

میں تمہارے جیسا بشر ہوں' ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ نبوت کی عظمت ہے۔ ایک بشری
حیثیت ہے۔ ایک نبوت کی حیثیت ہے۔ بشری حیثیت میں سب لوازم بشریت ان پر آتے ہیں۔ اور ملکیت کی
حیثیت میں وحی خداوندی آتی ہے۔ اور وہ مقربان الٰہی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بشریت کو تو لے لے اور یوحیٰ
الی کو نہ لے اور معاذ اللہ گستاخی کرنے لگے یہ عین کفر ہے۔ اور اگر کوئی شخص محض یوحیٰ الی کو لے لے
اور بشریت کی نفی کردے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں تھے۔ یہ بھی کفر ہے۔ درمیان میں بات ہے کہ
بشر بھی مانے مگر عام بشروں جیسا بشر نہیں ایک خاص بشر جس پر اللہ کی عنایات نازل ہیں وحی ہے' معجزات ہیں۔

فرض آپ بشر ہیں پیدائش کے لحاظ سے اور نبی ہیں عطائے خداوندی کے لحاظ سے اس کی عظمت فرض ہوگی اور بشریت کے لحاظ سے آپ کو بشر ماننا بھی فرض ہوگا۔ دونوں چیزیں ہیں۔

حدیث ضیافت حضرت علیؓ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے :

قال اضافنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی الاسودین التمرو الماء (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ضیافت کی دواسودین پر۔ کھجور اور پانی پر کھجور آپؐ نے کھاکر اس مجھے کھلایا اور پانی پی کر مجھے پلایا اور یہ حدیث بیان فرمائی"۔

من اضاف مؤمناً فکانما اضاف اٰدم۔

جس نے اخلاص کے ساتھ کسی ایک مومن کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کی ضیافت کی اس پر جو اجر ملتا وہ اسے اجر ملے گا۔ آگے فرماتے ہیں :

ومن اضاف مؤمنین فکانما اضاف اٰدم وحواء۔

"جس نے دو مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے آدم وحوا دونوں کی ضیافت کی"۔

اس کے بعد فرمایا :

جس نے تین مسلمانوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسا جبریل ومیکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کو مہمان بنایا۔

اور جس نے چار کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جس نے توراۃ' انجیل' زبور اور قرآن کریم کو پڑھ لیا' یہ کتابیں پڑھنے پر اس کو جو اجر ملتا۔ اس نوعیت کا اجر اس کو ملے گا۔

جس نے پانچ آدمیوں کی مہمانی کی وہ ایسا ہے جیسے اس شخص کو اجر ملتا جو اول خلق سے برابر جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھتا رہا۔ ہزاروں برس نماز پڑھنے پر جو اجر مرتب ہوتا وہ اجر پانچ آدمیوں کی دعوۃ کرنے پر ملے گا۔

اس کے بعد فرمایا۔

جس نے چھ آدمیوں کی ضیافت کی وہ ایسا ہے جیسے اولاد اسماعیل میں سے چھ غلام شدہ انسانوں کو آزاد کردیا ___ جس نے سات آدمیوں کی دعوت کی تو گویا جہنم کے سات دروازے اس پر بند کردیئے گئے ___ گویا اس کا جہنم میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اجر مرتب ہوا۔ اور جس نے آٹھ آدمیوں کی ضیافت کی' اس کے لئے گویا جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے' جس میں سے چاہے داخل ہوجائے اور جس نے نو آدمیوں کی دعوت کی وہ ایسا ہے جیسے اول خلق سے گناہ گاروں سے جتنے گناہ ہوئے ہیں اس نے اتنے اجر کمالئے "گناہوں کی قید اس لئے لگائی کہ نیکیاں کرنے والے کم ہوتے ہیں "گناہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ تو مبالغہ اسی میں تھا۔ اور فرمایا جس نے دس کی ضیافت کی تو حق تعالیٰ اس کے لئے ان لوگوں کا اجر لکھیں گے جنہوں نے نمازیں پڑھیں' روزے رکھے' حج کیا' عمرہ کیا اور قیامت تک کرتے رہیں گے' اتنا عظیم اجر دیا

جائے گا۔

گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہمی تعاون اور باہمی امداد اور اعانت کا جذبہ پیدا ہو۔ ایک بے خود تنہا نماز پڑھ لیتا وہ سب اپنے لئے ہے۔ گویا نماز پڑھ کر اپنی نجات کمالی، اور ایک مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کا سامان کیا جس سے پوری امت میں قوت پڑتی ہے۔ اس کے اسباب میں سے بھی ہے کہ ضیافت و مہمانداری بھی ہو۔ تعاون اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو۔ جیسے کہ فرمایا گیا :

والله في عون العبد ماكان العبد في عون اخيه۔

اللہ اپنے بندے کی مدد پر رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے۔ تو نماز تو ذاتی فعل ہے اور دوسرے کی مدد کرنے کا تعلق امت سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت پیدا ہو۔ تفریق کی بجائے اتحاد باہمی ہو۔ جس سے قوۃ پیدا ہو۔ اعداء اللہ مغلوب ہوں۔ دین کا کلمہ بلند ہو۔ اس واسطے اس عمل کی زیادہ قدر و قیمت بیان کی گئی۔ ورنہ بظاہر دیکھنے میں سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے حج کیا، عمرہ کیا اور ایک نے دس آدمیوں کو کھانا کھلا دیا۔ بظاہر تو بڑی بات نہ تھی لیکن اگر بنیاد پر نظر ڈالی جائے تو ہزار نمازیں بھی پڑھے گا تو اس کی ذات کے لئے ہیں۔ مہمانداری، تعاون اور ہمدردی کرے گا، اس سے امت میں اجتماعیت عامہ پھیلے گی اور مقصود شریعت سے یہ ہے کہ امت کے اندر اجتماعیت، باہمی اخوت رہے تاکہ اعداء اللہ ضعیف ہوں اور ان کے سامنے قانون الٰہی پیش کیا جاسکے، اور اگر خدانخواستہ اعداء اللہ غالب آجائیں گے تو وہ اپنا کلمہ آپ کے سامنے پیش کریں گے آپ کا کلمہ تھوڑا سنیں گے۔ قوۃ کی وجہ سے آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے۔ تعاون تناصر اور باہمی قوت کا اثر پوری امۃ تک پہنچتا ہے۔ اور حج و عمرہ کا اثر ایک آدمی کی ذات تک پہنچتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عمل ہو۔ اس واسطے اس اجر کو بڑھایا گیا، اگر ایک آدمی نے ہزار حج کئے لیکن ایک کام ایسا کیا کہ اس سے امت مل گئی اس کا اجر ہزار حج سے زیادہ ہے۔ کیونکہ مقصود اجتماعیت ہے۔ اس واسطے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ کھانا کھلانا کیسے بڑھ گیا۔؟

غرض یہ حدیث ضیافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مذکور ہے کہ کھجور کھا کر انہیں کھلائی اور پانی پی کر بقیہ انہیں پلایا۔ پھر حدیث بیان فرمائی ___

حضرت علی کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ میری ضیافت کریں اور یہ حدیث مجھے بھی سنائیں۔ تو حضرت علیؓ نے ان کی ضیافت کی، کھجور کھلائی۔ پانی پلایا اور حدیث بیان کی۔ آگے شاگرد در شاگرد مولانا خلیل احمد صاحبؒ تک سلسلہ پہنچ گیا۔ تو مولانا عبدالقیوم صاحب نے مولانا خلیل احمدؒ صاحب کی ضیافت کی، کھجور کھا کر انہیں کھلائی اور پانی پلایا۔ حضرت مولاناؒ نے میرے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ کھجور کھا کے الس کھلایا اور اپنی پی کر پلایا اور یہ حدیث سنائی اور اس کی اجازت دی۔

اب یہ دو حدیثیں ہو گئیں۔ ایک مسلسل بالمصافحہ اور ایک مسلسل بالماء والتمر۔ قولی طور پر آپ نے حدیث سن لی اب عملی حصہ رہ گیا کہ ہر شخص جس کو اجازت دی جائے اس سے مصافحہ کیا جائے۔ اور کھجور کھا کر کھلائی جائے اور پانی پی کر پلایا جائے۔ اب یہاں اتنے آدمی ہیں کہ اتنی کھجوریں تو میں نہیں کھا سکتا کہ آدھی کھا کر انہیں کھلاؤں۔ اس واسطے ایک آدھ کھجور کھا کے میں ان کھجوروں میں شامل کردوں گا اس سے انشاء اللہ برکات شامل ہوں گی۔ پانی پی کر جگ میں ڈال دوں گا، اس میں سے سب حضرات پی لیں۔ ورنہ ہر گلاس میں سے ایک ایک گھونٹ پیوں تو پچاس گھونٹ میں معلوم نہیں پیٹ کہاں پہنچے گا۔

اسلام کا نظام اجتماعیت

حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا :

لااسلام الابالجماعۃ

اسلام نہیں ہے مگر اجتماعیت کے ساتھ۔ اسلام نام ہی اجتماعیت کا ہے۔ اسی واسطے کوئی عبادت ایسی نہیں جس میں اجتماعیت نہ ہو۔ نماز رکھی تو اس میں امام رکھا۔ اقتداء رکھی۔ اجتماع رکھا۔ تاکہ مل کر نماز ادا کریں۔

اسی طرح اگر زکوٰۃ رکھی۔ تو اس میں اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت ہو تو اسے بیت المال میں داخل کیا جائے۔ وہ عام غرباء میں اس کو تقسیم کرے۔ تاکہ پوری امت تک اس کا اثر پہنچے۔ اب حکومت اسلامی نہیں ہے تو علماء اور اہل فتویٰ کو اس کا قائم مقام بنادیا گیا تاکہ ان کی فتویٰ کے مطابق تقسیم کی جائے۔

اسی طرح حج ہے تو وہ بھی اجتماعیت کا نام ہے۔ اس میں بھی امام ہے۔ اور امام کے اشاروں پر سب حج کے افعال ادا ہوتے ہیں ___ جہاد ہے اس میں امام و امیر رکھا گیا' جب تک وہ حکم نہ دے نہ آپ آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے عام گھروں کے اندر فرمایا گیا کہ :

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

تم میں سے ہر شخص اپنے گھر کا بادشاہ ہے۔ اسی سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اپنی رعایا (گھروالوں) کا کس طرح سے بندوبست کیا' ان کی تربیت شرعی کی تھی یا نہیں؟ یہاں بھی اجتماعیت قائم کردی۔

اسی طرح سفر میں جائے تو اس بات کو سنت قرار دیا کہ چند آدمی ایک امیر بنالیں' اس کے احکام پر عمل کریں تاکہ سفر نظم کے ساتھ ہو ___ غرض اسلام نے ہر چیز میں نظم رکھا' تنظیم و اجتماعیت رکھی ہے۔ اس لئے فرمایا **لااسلام الابالجماعۃ** اسلام بن نہیں سکتا جب تک جماعتی رنگ نہ غالب آجائے۔ جتنی چیزیں اجتماعیت سے متعلق ہیں ان کے اجر کو انفرادی عبادتوں سے زیادہ بڑھادیا گیا ہے تاکہ پوری جماعت اس کی لپیٹ میں آجائے۔

منصب افتاء کی نزاکت

بہت سی جزئیات ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں اور احکام جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کے الگ اور اس کے الگ۔ مفتی پہچان سکتا ہے کہ ان جزئیات میں کون سا باریک فرق ہے جو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہو گیا ہے' چونکہ مفتی کے سامنے تمام جزئیات ہوتی ہیں اور فن سے واقف ہیں تو جزئیات میں امتیاز کرسکتے ہیں۔

سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا اور عمل کے طور پر مسئلہ بتلانا ہے۔ ہر پڑھا لکھا بلکہ ہر مدرس بھی یہ کام نہیں کرسکتا۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ یہ بصیرت دیتے ہیں۔

اسی لئے بزرگوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ فتویٰ دینے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا تو بتلادیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مسئلہ غلط بتلادیا گیا ___ سخت پریشان' گرمی اور بارش میں سارے شہر میں اسے ڈھونڈتے پھرے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شخص رات کو ملا۔ تب اس سے کہا کہ بھئی! میں نے مسئلہ غلط بتلایا تھا۔ اصل مسئلہ یہ ہے۔ جب جا کے انہیں تسلی ہوئی۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے یہاں رسالہ "النور" میں ایک مستقل باب "ترجیح الراجح" تھا۔ اگر کسی مسئلہ کے بیان میں کوئی غلطی ہوئی تو شائع کرتے تھے مجھ سے غلطی ہوئی اصل حکم یہ ہے اور یہی راجح ہے۔ لوگ اسی پر عمل کریں ___ بہرحال سب سے زیادہ مشکل چیز فتویٰ دینا ہے۔ یہ مفتی کا کام ہے۔ ہر مدرس یا ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

منصب تدریس و تبلیغ

اس سے زیادہ آسان درس دینا ہے۔ درس میں کتاب سامنے ہوتی ہے کتاب کے مطابق مضمون بیان کردیا، کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی، اس سے زیادہ آسان تقریر کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایک موضوع پر جو یاد تھا علمی طور پر کہہ دیا۔ اور اس سے زیادہ آسان ہے وہ تقریر جو علمی نہ ہو۔ محض دنیا داری کی باتیں۔ ادھر ادھر کے واقعات لیکچر میں کہہ دیئے یہ سب سے زیادہ آسان ہے۔ گزرے ہوئے واقعات یوں ہوا تھا، یوں ہوا تھا۔ بیان کردیا، اور اس سے بھی زیادہ آسان اعتراض کردینا ہے۔ اس کے لئے کسی تکلیف کی ضرورت نہیں جس پر چاہا اعتراض کردیا، جس پہ چاہا شبہ وارد کردیا۔ جاہل سے جاہل اعتراض کرسکتا ہے۔ اس میں کسی علمیت کی ضرورت نہیں ___ یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ بعض حضرات مسائل پوچھتے ہیں۔ میں عرض کردیتا ہوں کہ بھئی مفتی صاحب سے پوچھو۔ میں نہیں بتلاسکتا۔ مسئلہ کا علم بھی ہو تب بھی جرأت نہیں ہوتی کہ مسئلہ بیان کردوں۔ مفتی کے سامنے سب چیز مستحضر ہوتی ہیں۔ بعض لوگ برا مانتے ہیں کہ مسئلہ نہیں بتلایا۔ اگرچہ مسئلہ نہیں بتلایا مگر حوالہ تو دیدیا کہ مفتی سے پوچھو۔ کیا ضروری ہے کہ ہر ایک مسئلہ بتلائے ہی۔ جو بتانے والے ہیں وہ بتلائیں گے جن کو اس کا فن اور سلیقہ ہے۔ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اس سے بچتا ہوں کہ فتویٰ دوں۔ یہ کام میرا نہیں ہے۔

علم وعمل کا امتیاز

ایک ہے کسی مسئلہ کی علمی تحقیق کردینا، وہ الگ چیز ہے اس سے انکار نہیں ہوتا جو اپنے ذہن میں ہو وہ تحقیق کردی۔ لیکن یہ کہ عمل کیا کرو؟ یہ کام مفتی کا ہے وہ فتویٰ دے گا کہ فلاں پہلو پر یوں عمل کرو، فلاں پہلو پر یوں عمل کرو ___ اس لئے اگر بعض حضرات سوال کریں اور میں مسئلہ نہ بتاؤں وہ برا نہ مانیں۔ ضروری نہیں کہ مجھے مسئلہ کا علم بھی ہو۔ اور اگر علم بھی ہو تو میں احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ فقہی جزئیات پر میری زیادہ نظر نہیں ہے۔ یہ اس کی ہوسکتی ہے جو رات دن اسی میں پڑا ہوا ہو ___ یہ میں نے بطور تنبیہہ اور اصول کے عرض کردیا۔ اس میں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کا ایک مقام ہوتا ہے۔ میں نہیں ہوں اس قابل کہ مسئلہ بتلاؤں۔ کیا ضروری ہے زبردستی پوچھا ہی جائے، کسی اہل سے پوچھا جائے۔

حیات نبوی ﷺ اجماعی مسئلہ ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "حیات النبی" کا لوگ انکار کیوں کرتے ہیں؟ میرے خیال میں اجمالاً اتنی بات ہے کہ "حیات النبی" کا مسئلہ تو مجمع علیہ ہے۔ یعنی امت کے اندر کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ اس کی کیفیت میں گفتگو ہے کہ حیات ہے تو کس کیفیت اور کس نوعیت کی ہے۔ تو کیفیات میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اسے اصل مسئلہ میں اختلاف کنندہ نہیں کہا جاسکتا۔

جہاں تک انبیاء علیہم السلام کی حیات کا تعلق ہے تو صحیح حدیث موجود ہے :

الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون

"انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں"۔

یا فرمایا گیا :

ونبی اللہ حی یرزق۔

اللہ کے نبی زندہ ہیں۔ ان کو رزق دیا جاتا ہے ___ اب ظاہر ہے کہ اس حیات سے مراد اگر وہ عمومی حیات ہے جو برزخ میں عام طور پر ہوتی ہے تو پھر اس تخصیص ذکری کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی پھر یہ کہنا کہ :

نبی اللہ حی یا الانبیاء احیاء الخ

اس کی ضرورت نہیں۔ یوں کہا جا سکتا تھا۔ **المسلمون احیاء فی قبورهم یا الناس احیاء فی قبورهم** اس لئے کہ حیات برزخی میں سب کے سب شریک ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص کیا جانا اور اس پر حیات کا لفظ بولا جانا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی حیات ہے جو عوام کو حاصل نہیں۔

حیات کامل

پھر یہ کہ "حیات" کے لفظ کو مقید کر کے نہیں لایا گیا۔ یہ نہیں کہا گیا کہ انبیاء علیہم السلام بحیثیت اس کے حیات ہیں۔ یا فلاں جہت سے حیات ہیں بلکہ مطلقاً حی کہا گیا۔ تو جب بھی کوئی چیز مطلق بولی جائی گی' اسکا فرد کامل مراد لیا جائیگا پھر فرد کامل کی صورت سمجھنے کی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم جسے دنیا میں زندگی کہتے ہیں وہی وہاں سمجھیں کہ وہ حی اور زندہ ہیں اور وہ اسی انداز کی زندگی ہے جیسے دنیا میں زندہ ہوتے ہیں ___ ورنہ پھر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کی تخصیص اور حیات کے لفظ کا اطلاق ___ تو ایک تخصیص اور ایک اطلاق' تخصیص ذکری اور خصوصیت بیانی اور لفظ حیات کا اطلاق۔ یہ دونوں مل کر یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ کوئی خاص اور اعلیٰ قسم کی حیات ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ___ اب یہ کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟

قبض روح کا امتیاز

تو ہم کیفیت سے واقف نہیں۔ نہ ہم اس کا پتہ دے سکتے ہیں۔ نہ ہمارے بس کی بات ہے۔ اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی ممات بھی ہماری جیسی نہیں' ان کی حیات بھی ہماری جیسی نہیں ان کی ممات میں تو یہ بھی ہے کہ ملک الموت آکر ان سے اجازت لیتے ہیں اور جب تک وہ اجازت نہ دیں اور ان کے علم میں نہ لایا جائے کہ وقت آرہا ہے اور ہم قبض روح کے لئے آرہے ہیں۔ اس وقت تک ممات کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ عامۃ المؤمنین سے اس قسم کی کوئی اجازت یا استیذان نہیں کیا جاتا۔

دست نبوی ﷺ کا امتیاز

پھر یہ کہ انبیا علیہم السلام کی دنیا میں جو حیات ہے تو وہ اور لوگوں کی جو دنیوی حیات ہے۔ اس کے مشابہ نہیں۔ تو جب حیات مشابہ نہیں تو ممات بھی مشابہ نہیں ہو سکتی۔

یوں تو فرمایا گیا :

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔

میں تم جیسا ایک بشر ہوں ___ لیکن اس مماثلت کے باوجود آپ کی بشریت اور ہماری بشریت میں کتنا فرق ہے۔ یہ سیرت کے احوال دیکھنے سے واضح ہوگا۔ ہم بھی کہیں گے کہ ہمارے ہاتھ ہیں اور انبیا علیہم السلام کے بھی ہاتھ ہوتے ہیں اور جسمانی ہوتے ہیں کہ کوئی معنوی اور روحانی نہیں ___ لیکن ہاتھوں کے اندر خصوصیت سے امتیازی شان موجود ہے جو عام ہاتھوں کو حاصل نہیں۔ ہم اگر کسی کے چپت ماردیں تو چوٹ لگ جائیگی۔ انبیاء علیہم السلام اگر کسی کے چپت مارتے ہیں تو چوٹ لگے یا نہ لگے لیکن اس سے معنوی حیات پیدا ہو جاتی ہے ___ ہم اگر آپ کے سینے میں ہاتھ ماردیں تو آپ چوٹ کھائیں گے اور ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ حضور علیہ السلام نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سینے میں ہاتھ مارا تو ان کو شرح صدر نصیب ہو گیا اور ان کے سامنے آسمانوں تک کی چیزیں روشن ہو گئیں۔

جیسے کہ حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ غالباً حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ اپنے محلے کے امام تھے' انہوں نے نماز پڑھائی۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی قرآت سنی' تو انہوں نے اپنے قبیلے کے لغت پر قرآت کی۔ اور فاروق اعظمؓ لغت قریش کی قرآت جانتے تھے۔ وہ تو اشد هم فی امر الله ہیں۔ تو خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشکیں کس کے کھینچتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا۔

"یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے اس منافق کی گردن قلم کردوں' اس لئے کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتا ہے"

آپ نے حضرت خبابؓ سے فرمایا۔ پڑھو۔

انہوں نے وہ آیت اپنی لغت پر سنائی۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

هكذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔

انزل القران علی سبعۃ احرف۔

سات لغت پر قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جس میں بنی تمیم' بنی طے' قریش وغیرہ کی لغات شامل ہیں۔ یہ جو عرب میں سات فصیح لغات ہیں ان ساتوں میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ اس میں لفظوں میں تغیر ہوتا تھا۔ معنی اور مفہوم میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ تو فاروق اعظمؓ نے پڑھا۔ فرمایا :

هكذا انزلت۔ "یوں ہی نازل ہوا ہے"

حضرت خبابؓ نے پڑھا۔ فرمایا هكذا انزلت۔ "یوں ہی نازل ہوا ہے۔

اس سے فاروق اعظمؓ کے سینے میں کچھ ریب اور شک کی سی کیفیت پیدا ہوئی کہ یہ کس قسم کا قرآن ہے۔ جس طرح جو پڑھے اسے کہہ دیا جاتا ہے هكذا انزلت یوں ہی نازل ہوا ہے۔ جیسے شبہ یا وسوسہ پیش آتا ہے۔ ایسی کیفیت پیدا ہوئی۔ تو آپؐ نے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا :

یا ابن الخطاب ___؟

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ' فرماتے ہیں۔ سینے پر ہاتھ لگتے ہی اتنا عظیم شرح صدر ہوا گویا آسمان میرے اوپر روشن ہو گئے۔ اور وہ جو ریب وشک اور وساوس گزر رہے تھے وہ قطعاً ختم ہو گئے۔

تو میں اور آپ کسی کے ہاتھ ماردیں تو چوٹ لگے گی۔ اور پیغمبر نے ہاتھ مارا تو شرح صدر کی دولت نصیب ہو گئی۔ تو اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ مماثلت نوعیت کے اندر ہے۔ مگر شخصی فرق وہ اتنا

ہے کہ ہاتھوں تک میں نمایاں ہے۔

لسان نبوی ﷺ کا امتیاز

میری اور آپ کی زبان گوشت پوست کی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی زبان بھی گوشت پوست کی ہوتی ہے۔ لیکن میں اگر کوئی غذا کھاؤں تو اس سے کھٹے اور میٹھے کا پتہ چل جائے گا۔ جو ایک مادی ذوق ہے ___ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تناول فرماتے تھے تو زبان حلال و حرام کا بھی پتہ چلا لیتی تھی۔

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ انصار میں کہیں میت ہوئی آپ ﷺ بھی جنازے میں تشریف لے گئے۔ جب دفن سے فارغ ہوئے تو میت کے وارثوں نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! ہمارے گھر جا کر کچھ تناول فرمالیں"

آپ نے قبول فرمالیا ___ تشریف لائے۔ گوشت لا کے رکھا گیا اور لوگ بھی کھانے لگے۔ آپ ﷺ نے بھی چکھا۔ اور ارشاد فرمایا۔ یہ غصب کا مال معلوم ہوتا ہے۔

بات یوں کھلی کہ جس نے دعوت دی تھی اس عورت نے کہا میں نے خاوند کو بھیجا کہ فلاں جگہ سے جاکر بکری خرید لا' تاکہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں ___ لیکن وہاں سے بکری دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد میں نے ایک پڑوسی کے پاس دام بھیجے کہ تو خرید کرلا۔ اس کو بھی دستیاب نہ ہو سکی ___ تو میں نے پڑوسی کی بیوی سے کہا کہ تو کہیں سے بکری لادے ___ اس نے خاوند کی بکری جو اس کی ملک تھی، پکڑ کر بلا اجازت بھیج دی۔ میں نے ذبح کر کے پکادی'

اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک نے پہچانا کہ مال مغصوبہ ہے۔ جو بلا اجازت کے ذبح کیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا :

"قیدیوں کو کھلادو' ہم یہ کھانا نہیں کھائیں گے"۔

تو زبان کے اندر مماثلت بھی ہے یعنی گوشت پوست اور مادی ہونے میں' اور عدم مماثلت بھی ہے اس چیز میں کہ ہماری زبان فقط حاسۂ ذوق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ذوق کے ساتھ ساتھ حاسۂ معنویت بھی رکھتی ہے جس سے حلت و حرمت' جائز و ناجائز یا افضل و غیر افضل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تو مماثلت بھی ہے مگر مماثلت کے ساتھ عدم مثلیت بھی ہے۔

صوم نبوی ﷺ کا امتیاز

آپ فرماتے ہیں :

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

میں تم جیسا ایک بشر ہوں لیکن حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امت کو صوم وصال رکھنے کی آپ ﷺ نے ممانعت فرمائی کہ بلا افطار روزہ مت رکھو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے' متعدد روزے رکھتے ___ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا :

"یا رسول اللہ! ہمیں تو آپ ﷺ نے ممانعت فرمائی اور خود آپ رکھتے ہیں"۔

فرماتے ہیں :

اکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی۔

تم میں مجھ جیسا کون ہیں۔ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے تو آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے ___ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ میں تم جیسا بشر ہوں اور حدیث بالا میں فرماتے ہیں ایکم مثلی تم میں مجھ جیسا کون اور کون میرا مثل ہے۔ میرے ساتھ پروردگار کا دوسرا معاملہ ہے ___ تو مماثلت بھی ہے اور عدم مماثلت بھی ہے۔ مماثلت بھی ہے اور امتیازی شانیں ہر ہر عضو کے اندر بھی ہیں۔

چشم نبوی ﷺ کا امتیاز

میری اور آپ کی آنکھ دیکھتی ہے۔ مادی آنکھ ہے شکلیں ' صورتیں ہمیں نظر پڑتی ہیں ___ انبیا علیھم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مادی آنکھ دی گئی ___ لیکن حدیث میں واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نماز میں بعض لوگوں سے کچھ غلطیاں ہوئیں تو آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا ___ اور فرمایا :

انی اری خلفی کمااری بین یدی۔

تم یہ سمجھتے ہو میں دیکھتا نہیں۔ میں پشت کی جانب سے دیکھتا ہوں تو آپ کی بینائی دو طرف کام کرتی تھی۔ پیچھے سے بھی دیکھتی ہے اور آگے سے بھی دیکھتی ہے۔ تو آنکھ آنکھ ہونے میں تو مماثلت ہے مگر آنکھ کی خصوصیات میں کوئی مماثلت نہیں۔ پیغمبر کی آنکھ دوسری ہے' امتی کی آنکھ دوسری ہے۔

حیات نبوی ﷺ کا امتیاز

اسی طرح جب ایک ایک جز اور زندگی کے ایک ایک شعبے میں مماثلت کے دعوے کے ساتھ عدم مماثلت اور امتیازی شان بھی موجود ہے۔ تو اگر ہم یوں کہیں کہ مجموعہ حیات میں بے شک مماثلت ہے کہ ہم بھی زندہ اور حضور ﷺ بھی زندہ ہیں مگر آپ ﷺ کی زندگی میں جو خصوصیات ہیں وہ ہمیں میسر نہیں۔ تو یہ ہم کہہ سکتے ہیں کیونکہ زندگی کی ایک ایک جزئی میں امتیازی شان موجود ہے۔

حیات بعد الوفات کا امتیاز

اسی طرح سے ممات کے بارے میں بھی ہم کہیں گے کہ ممات اور موت کے بعد جو حیات آتی ہے اس میں بظاہر مماثلت ہے لیکن پھر امتیازات ہیں' مرنے کے بعد ہمیں وہ حیات میسر نہیں آسکتی جو انبیاء علیھم السلام کو برزخ کی حیات میسر آتی ہے۔

علامات حیات

اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ حیات اور زندگی کو پہچاننے کے لئے دو چیزیں ہیں جس سے آدمی پہچانا جاتا ہے کہ آدمی زندہ ہے ___ یعنی حسی زندگی ___ ایک تو معنوی زندگی ہے کہ روح موجود ہے وہ تو ہر انسان کو حاصل ہے جس کی روح موجود ہے۔ بس وہ زندہ ہے ___ اور روح کسی کی بھی مردہ نہیں۔

امام غزالیؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے۔ یعنی ہمیشہ سے تو نہیں تھا' پیدا کیا گیا' لیکن پیدا ہونے کے بعد اب مٹے گا نہیں بلکہ وہ زندہ رہے گا' اس کی حقیقت اور روح قائم رہے گی چولے اور جسم بدل جائیں گے مگر اصل نفس قائم رہے گا۔

تو زندگی کے پہچاننے کی دو ہی علامتیں ہیں۔ ایک تو کھانا پینا' کھاتا پیتا دیکھ کر ہم کھلے بندوں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی زندہ ہے' اور جس کا کھانا پینا بالکل چھوٹ جائے تو ہم یہی کہا کرتے ہیں کہ بھئی! اس کی زندگی کیا' یہ تو

عنقریب مرنے والا ہے' اس لئے کہ اس کی زندگی کے اسباب جب مفقود ہو گئے تو زندگی کیا رہے گی' آج مرجائے' تو کھانا حسی اسباب میں بقائے حیات کی علامت ہے۔

دوسری علامت زندگی کی یہ ہے کہ ہم نقل وحرکت دیکھیں۔ اگر ایک شخص بے حس وحرکت پڑا ہوا ہے۔ ہم اول وہلہ میں یہی سمجھیں گے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے ___ لیکن اگر وہ ھل رہا ہے حرکت کر رہا ہے' چلتا ہے پھرتا ہے' کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے کہ یہ میت ہے' اس لئے نقل وحرکت زندگی کی بڑی علامتوں میں سے علامت ہے۔ تو زندگی کی دو علامتیں ہوئیں۔ ایک خور دو نوش' کھانا اور پینا' ایک نقل وحرکت' چلنا پھرنا' یعنی مختلف افعال کا سرزد ہونا جو حرکت کی علامت ہے اور یہ زندگی کی علامت ہے۔

اب دیکھئے انبیا علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔

انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں حیات ہیں ___ کیوں حیات ہیں؟ اس کی علامت بتلائی گئی کہ نقل وحرکت پائی جاتی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں ___ تو ایک نقل وحرکت مادی ہے کہ ہم ترکاری خریدنے کے لئے بازار میں جائیں یا پڑھنے کے لئے کسی مدرسے میں جائیں۔ یہ مادی حرکت ہے اور نماز پڑھنے لگیں حرکت یہ بھی ہے مگر یہ روحانی اور عباداتی حرکت کہی جائے گی جو بازار میں جانے کی حرکت سے یقیناً افضل حرکت ہے۔ اور جو کھانے پینے کی حرکت سے یقیناً افضل ہے۔ کہ اللہ کے آگے جھک رہے ہیں ___ تو اس حدیث نے ثابت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں۔ اس لئے کہ حرکت بدن حیات کے آثار میں سے ہے۔ تو حرکت وہ ہے جو کامل ترین حرکت ہے۔ تو عباداتی حرکت ثابت ہوئی محض کھانے پینے کی حرکت ثابت نہیں ہوئی۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ:

کانی انظر الی موسیٰ یلبی۔

میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا ہوں کہ لبیک لبیک کہتے ہوئے میدان عرفات میں جارہے ہیں تو انبیاء علیہم السلام گویا حج کرتے ہیں۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھتا ہوں کہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں اور اون اور صوف کی لگام ہاتھ میں ہے اور لبیک لبیک پڑھتے ہوئے جارہے ہیں اور حج کر رہے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ مطاف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص طواف کر رہے ہیں۔ مربوع الخلق یعنی چوڑے چکلے بدن' ان کا سینہ نہایت چوڑا اور اس قدر خوبصورت اور اتنا شاداب رنگ کہ آپؐ فرماتے ہیں: کانہ خرج من دیماس۔

کہ یہ شخص ابھی غسل کر کے حمام سے آیا ہے اور گویا پانی اس کے بالوں سے ٹپک پڑے گا تو اتنی تروتازہ اور شاداب صورت' چوڑے بدن' میانہ اور ذرا پستی مائل قد اور طواف میں مشغول ہیں۔ آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟

"عرض کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں"۔

تو عیسیٰ علیہ السلام کو طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو لبیک لبیک پڑھتے ہوئے دیکھا۔ یونس علیہ السلام کو سرخ اونٹنی پر دیکھا کہ لبیک پڑھتے ہوئے جارہے ہیں۔ اور عام طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔

انبیاء اپنی قبور میں سب زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں ___ تو نماز بھی ثابت ہوئی، حج بھی ثابت ہوا ___ تو بدن کی نقل و حرکت ثابت ہوئی اور وہ حرکت جو عباداتی حرکت ہے۔ محض آنے جانے کی حرکت نہیں اس سے کہیں مکمل عباداتی حرکت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: ونبی اللّٰہ یرزق۔

اللہ کا نبی زندہ ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے ___ تو رزق کا دیا جانا خود دلیل حیات ہے کیونکہ کھانا، پینا دوسری علامت ہے۔ اب یہ کہ وہ رزق کیسا ہے؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس انداز کا تھا اس کی کیا کیفیت تھی؟ اس میں پلاؤ زردہ تھا یا کون سا رزق تھا۔ یہ اللہ جانے ___ لیکن رزق بتلایا گیا ___ تو رزق تناول کی چیز ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام گویا تناول بھی کرتے ہیں اور حرکات بدنی بھی ہوتی ہیں۔ تو جیسے حرکات بدنی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں، جو عباداتی حرکت ہیں، ممکن ہے کھانا پینا اعلیٰ ہی قسم کا ہو جو جنت کی غذا ہو۔ اس دنیا کی مادی غذا نہ ہو ___ تو جب نقل و حرکت بھی ثابت، خورد و نوش اور غذا بھی ثابت ہو تو اب حیات میں کوئی تامل باقی نہیں رہتا، کیونکہ آثار میں سے یہی دو چیزیں ہیں جو موجود ہیں۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی حرکت بدن اور ان کی حیات ہے۔

حیات شہدا

اسی طرح سے قرآن کریم نے شہداء کی بھی حیات ثابت کی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔

جو اللہ کے راستہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ یعنی مردہ تو ہے نہیں۔ تمہیں کہنے کی بھی اجازت نہیں کہ یہ ان کے حق میں بے ادبی ہے۔ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی حیات کا شعور نہیں رکھتے ___ یعنی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے کہ کس کیفیت کی زندگی ہے ___ تو قرآن کریم میں شہداء کی زندگی ثابت کی گئی۔

اب کسوٹی پر جانچیے جو ہم نے عرض کی تھی کہ حیات کے پہچاننے کے دو طریقے ہیں خورد و نوش اور نقل و حرکت کرتے ہیں اور وہاں کی غذائیں کھاتے ہیں ___ تو رزق بھی دیا گیا اور نقل و حرکت بھی پائی گئی ___ مگر فرق کیا ہے ___؟

انبیاء علیہم السلام کی نقل و حرکت عباداتی تھی، معاشی نہیں تھی کہ کھانے پینے کے لئے جائیں۔ شہداء کی نقل و حرکت کھانے اور پینے کی ہے کہ جاؤ اور جنتوں میں جاکے چرو ___

انبیاء علیہم السلام کو ان کی غذا وہیں پہنچتی تھی۔ شہیدوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے جنتوں کے میدان میں جانا پڑے گا۔ اور چونکہ انہیں بطور جزا کے جنت میں نہیں بھیجا جا رہا۔ اس واسطے پرندوں کا خول دیا گیا، ان کا اصلی بدن نہیں دیا گیا، وہ قیامت کو دیا جائے گا جب بطور جزاء کے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ تو دونوں چیزیں شہداء کے حق میں بھی ثابت ہوئیں۔ نقل و حرکت بھی اور خورد و نوش بھی۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں معاشی نقل و حرکت نہیں تھی بلکہ عباداتی تھی ___ یہاں معاشی نقل و حرکت ہے کہ کھانے پینے کے لئے جائیں۔ وہاں انبیاء علیہم السلام کے پاس رزق پہنچتا تھا شہداء کے پاس رزق نہیں پہنچتا، رزق کے پاس انہیں پہنچنا پڑتا ہے۔ چونکہ انہیں جانا پڑتا ہے تو یہ نمبر دو ہو گئے۔

حیات صلحاء

اب ایک عامۂ مؤمنین ہیں جن کو صلحاء امت کہا جائے گا۔ اس میں درجہ بدرجہ کچھ گناہ بھی ہیں، کچھ

نیکیاں بھی ہیں۔ مگر ان پر غلبہ نیکیوں کا ہے۔ ان کے بارے میں کیا فرمایا گیا ___؟

ان کو نقل و حرکت کی اجازت نہیں ہے بلکہ وہ علیین کے مقام پر اپنی جگہ موجود ہیں ان کو جانے آنے کی اجازت نہیں ہے اور رزق کھانے کی بھی ان کو اجازت نہیں ثابت کیا ہوتا ہے ___؟

ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب ایک میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور سوال و جواب میں وہ پورا اترتا ہے۔ تو پہلے جہنم کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے وہ ٹھکانا نظر پڑتا ہے۔ اسے بتلایا جاتا ہے کہ تیرا یہ ٹھکانہ تھا لیکن تو نے چونکہ صلاح اور نیکی اختیار کی۔ اللہ نے ہمیشہ کے لئے یہ تجھ پر بند کر دیا۔ پھر ملائکہ جنتوں کا دروازہ کھولتے ہیں۔ دور سے ان کی روح و ریحان اور نعمتیں نظر پڑتی ہیں اور اس کی خوشبوئیں اور لپٹیں آتی ہیں جو دماغ کو معطر کرتی ہیں اور قوت بخشتی ہیں۔ تو صلحاء مؤمنین کو کھلایا پلایا نہیں جاتا۔ دور سے دکھلا دیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی امید بندھ جاتی ہے اور کچھ خوشبوئیں آتی ہیں جن سے دماغ میں تاثر پیدا ہوتا ہے ___ تو معدے کے راستے کوئی غذا نہیں جاتی۔ بلکہ دماغ میں بسا دی جاتی ہے تاکہ دماغ میں اس سے عطریت اور خوشبوئیں پیدا ہو جائیں۔ نقل و حرکت نہیں کر سکتے کہ جنتوں میں جائیں لیکن دروازے کھولدئے جاتے ہیں دور سے دیکھتے رہیں تاکہ امید قائم رہے۔ تو یہ حیات ہے مگر یہ بہت ادنیٰ درجے کی حیات ہے۔

موت کفار

اب ایک کفار ہیں ان پر اتنی پابندی عائد ہے کہ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتے ہیں۔ نہ ان کو حرکت دی جاتی ہے۔ نہ غذا ___ حتیٰ کہ ان کے خیال میں بھی حرکت نہیں یعنی ان کی قوت خیالی بھی حرکت نہیں کر سکتی ___ قوت خیالیہ اگر حرکت کرے تو کم سے کم آدمی بیٹھ کر سوچتا ہے کہ میں گرفتار ہوں' میری رہائی کی یہ صورت نکل سکتی ہے۔ تو چاہے نہ نکلے۔ مگر دل میں ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کچھ امید کی رمق ہوتی ہے اگر میں نے یوں کر لیا تو شاید میں چھوٹ جاؤں۔ تو جہنمیوں کو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی کہ قوت فکریہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ ان کا خیال بھی محبوس اور مقید ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ رہائی کیا صورت ہو سکتی ہے ___ تو نہ بدن نقل و حرکت کرے گا' نہ خیال نقل و حرکت کرے گا۔ نہ غذا ملے گی اور نہ غذا کا تصور ملے گا۔ تو حقیقی معنی میں اگر میت کہا جائے گا تو کفار کو کہا جائے گا۔ کہ وہ صحیح معنی میں میت ہیں کہ نہ نقل و حرکت کی اجازت نہ معنوی نہ مادی نہ حسی اور نہ کھانے پینے کی اجازت۔

مراتب حیات

باقی حیات عوام مومنین کے لئے ثابت ___ شہداء کے لئے بھی اور انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی' لیکن درجہ بدرجہ۔ غرض انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ ان کی نقل و حرکت عبادتی ہے اور غذا ان کی خدمت میں پہنچائی جاتی ہے ___ شہداء زندہ ہیں ان کی نقل و حرکت مادی ہی ان کو غذا دی جاتی ہے۔ مگر غذا کے پاس ان کو جانا پڑتا ہے عوام مومنین کو نقل و حرکت کی اجازت نہیں۔ وہ اپنے مقام پر رہیں۔ مگر احترام سے رکھے جاتے ہیں اور جنت کی نعمتیں دکھلا دی جاتی ہیں تاکہ ان کی قوت خیالیہ منبسط ہو جائے اور اعلیٰ درجے کی توقعات باندھیں کہ اب قریب میں وہ وقت آنے والا ہے کہ ان شاء اللہ ہم ان نعمتوں میں پہنچیں گے۔ تو نعمت سے بڑھ کر امید نعمت ہوتی ہے توقع لگی ہوئی ہے کہ اب وہ نعمت چند منٹ کے بعد ملی' اب وقت آیا کہ یہ نعمت مجھے ملی' تو مومنین کی قوت خیالیہ پر پابندی عائد نہیں ہے۔ ان کی قوت خیالیہ آزاد ہے وہ اس سے لذت لیتے ہیں۔ تو یہ لذت انہیں ملتی ہے ___ یہ حیات کے تین درجے ہو گئے اس معیار سے زندگی کے

پرکھنے کا معیار اور کسوٹی نقل و حرکت اور خورد و نوش ہے تو اقوی ترین حیات انبیاء علیہم السلام کی ثابت ہوئی۔ متوسط حیات شہداء کی ثابت ہوئی۔ ادنیٰ حیات صلحاء کی ثابت ہوئی۔ جس جس درجے کی یہ حیات ہے اسی درجے کے اثرات بھی ہیں۔ دنیا تک اس کے اثرات پہنچے ہوئے ہیں ___ انبیاء علیہم السلام کی حیات اتنی کامل ہے کہ اقوی ترین ہے۔ دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ دنیا سے جا چکے ہیں لیکن ان کی بیویاں بیوہ نہیں ہوئیں۔ دوسرے خاوندوں سے نکاح نہیں کر سکتیں ___ دنیا سے جا چکے ہیں لیکن ان کی مالوں میں میراث تقسیم نہیں ہو سکتی' کیونکہ زندہ کے مال میں میراث تقسیم نہیں ہوتی' تو ان کے مال بھی میراث سے مستثنیٰ اور ان کی بیویاں بھی زوجیت اور نکاح سے مستثنیٰ۔

شہداء کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ ان کی بیویوں کا نکاح نہ ہو سکے۔ ان کی مال میں میراث تقسیم نہ ہو سکے' یہ تو سب ہو گا ___ لیکن ان کے بدنوں کو کچھ ایسی قوت دیجاتی ہے کہ دنیا کے اندر بھی ان کے کچھ ابدان محفوظ رہتے ہیں اور اگرچہ نص صریح سے ثابت نہیں مگر تجربات سے اتنا ثابت ہے کہ صلحاء کے بدن بھی محفوظ رہتے ہیں اور ا میں تغیر بہت کم ہے۔ کم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔

اور عوام مومنین کا دنیا کے اندر کوئی اتنا اثر نہیں ہے۔ ان کے بدن بھی مٹی ہو جاتے ہیں اور گل جاتے ہیں ___ تو جس جس درجے کے حیات برزخ میں ہے اسی اسی درجے کے آثار دنیا کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے دنیوی معیار سے دیکھا جائے تو حیات کے مراتب ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی حیات سب سے زیادہ قوی ہے۔ اسی طرح برزخ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حیات کے مراتب ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی حیات سب سے زیادہ قوی ہے

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی سی حیات برزخ میں نہیں ہے۔ جب کہ دنیا کے اندر بھی انبیاء علیہم السلام کی حیات عام لوگوں جیسی نہیں تھی۔ یہاں حیات کی نوعیت دوسری ہے۔

ولادت نبوی ؐ کا امتیاز

عام طور سے ولادت ہوتی ہے' بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آیا۔ روتا ہوا نکلا' اور اوندھا نکلا ___ اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس طرح سے ہوئی کہ ماں کے پیٹ سے برآمد ہوئے' چہرۂ مبارک آسمان کی طرف تھا' شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی تھی' گویا وحدانیت کا اعلان فرماتے ہوئے تشریف لائے' کوئی آلائش نہیں ہوئی۔ نو کے نو مہینے ماں کے پیٹ میں کوئی بوجھ نہیں رہا۔ ہلکا پھلکا رہا۔ پھر انوار و برکات ظاہر ہوئے کہ پیدائش کے وقت ایک اتنا نور نکلا کہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اس نور اور چاندنے کی روشنی میں شام کے محل دیکھ لئے۔ تو عام طور سے ولادت کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ ولادت آپ ؐ کی بھی ہوئی۔ لوگوں کی بھی ہوتی ہے۔ مگر باوجود اس مثلیت کے آپ ؐ کی ولادت میں اور عام لوگوں کی ولادت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

طفولیت کا امتیاز

اسی طرح سے طفولیت کی زندگی عام بچوں کی بھی ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ہوئی ___ لیکن اس طفولیت میں بھی وہ امتیازات ہیں کہ دنیا کے اطفال کو وہ نصیب نہیں ___ کہیں شق صدر ہو رہا ہے' کہیں برکتوں کے آثار نمایاں ہیں۔ کہیں حلیمہ سعدیہ کی وہ اونٹنی جس پر وہ سوار ہو کر جا رہی تھیں باوجود لاغر ہونے کے اتنی تیز دوڑنے لگی کہ بڑے بڑے گھوڑے۔ پیچھے رہ گئے ___ قحط سالی عام تھی' دودھ پلانے کے لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر پہنچیں تو اس سال اتنے پھل آئے کہ اس سے پہلے اتنے پھل کبھی نہیں آئے تھے ___ تو یہ برکات بھی ہیں جو عام نہیں ہیں۔

حیات برزخ کا امتیاز

اسی طرح سے آپ کی جوانی دیکھی جائے تو جوان اور بھی ہوتے ہیں۔ آپ بھی ہوئے لیکن پھر جوانی اور جوانی میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ کہ اس کے آثار و برکات جداگانہ ہیں۔

حواس کو دیکھا جائے تو جیسے میں نے عرض کیا کہ ہم حاسہ بصر سے سامنے کی چیز دیکھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمنا سامنا اور پیچھے کی دونوں چیزیں دیکھتے تھے۔ ہمارا حاسۂ بطش اور ہاتھ کی قوت فقط سختی اور نرمی کو پہچانتا ہے ___ آپؐ کے ہاتھ کی قوت، معنویت اور شرح صدر کی کیفیت بھی پیدا کردیتی تھی ___ ہماری زبان مادی زبان ہے مگر چکھتی ہے تو کھٹا میٹھا محسوس ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک حلال و حرام کا بھی پتہ چلا لیتی ہے۔ تو باوجود مثلیت کے بہت سی خصوصیات ہیں کہ جن پر نبی کو غیر نبی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح سے برزخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات نہایت قوی اور اکمل ہے کہ دنیا سے بھی قوی ہے ___ لیکن اس کے باوجود کیفیت ہم نہیں بیان کرسکتے۔ احادیث سے جتنے قرائن بیان کرسکتے ہیں۔ وہ بیان کردیئے گئے۔ اب اس کا ادراک کرنا کہ نوعیت کیا ہے، یہ ہماری قدرت سے خارج ہے۔ یہ خلاصہ ہے۔

نوعیت حیات

اب اس میں علماء کے دو مسلک ہیں۔ اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں۔ لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد پھر حیات دی گئی ہے۔ اور وہ ایسی دی گئی جیسے دنیا کی حیات تھی لیکن وفات اور قبض روح کے بعد دی گئی ___

اور وہ یہ کہ ہر انسان کو وفات دیدی جاتی ہے اور روح قبض ہو جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وفات دی گئی۔ اور روح قبض ہوئی اب جب قبر مبارک میں پہنچے تو وہاں جا کر عامہ مومنین کی شان یہ ہے کہ انہیں پھر زندہ کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو بھی کہتے ہیں کہ قبر میں پھر زندہ کیا گیا۔ عامۂ مؤمنین کا حال یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر موت دیدیجاتی ہے۔ پھر قیامت کو حیات دیجائیگی ___ انبیاء علیہم السلام اس موت سے مستثنیٰ ہیں۔ جب قبر میں زندہ ہوئے۔ اب قیامت تک بلکہ ابدالاباد تک زندہ رہیں گے۔ اب موت نہیں آئے گی۔ اسی کو صدیق اکبرؓ نے فرمایا :

> "اللہ نے آپ کو اس سے مکرم بنایا ہے کہ آپؐ کے اوپر دو موتیں طاری کرے، بس وہ ایک ہی موت ہے جو آئی۔ اس کے بعد اب جو زندگی آئی ہے تو ابدی زندگی ہے۔ پھر موت نہیں ہے"۔

اور عوام مومنین پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک یہاں جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ ایک عالم برزخ میں کہ زندہ کرنے کے بعد پھر موت دیدی جاتی ہے۔ اور فرمادیا جاتا ہے : نم کنومۃ العروس اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے۔

تو ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام حیات ہیں۔ ان کی بالکل دنیوی حیات ہے، مگر موت سے انقطاع واقع ہوا اور بعد میں جو حیات آئی وہ ویسی ہی تھی جیسی دنیا میں تھی مگر وہ ابدی ہے۔

اور ایک جماعت علماء کرام کی یہ کہتی ہے کہ بیچ میں موت کا واسطہ آیا۔ لیکن اس سے سلب روح نہیں ہوا۔ یعنی موت واقع ہوئی۔ اس واسطے کہ موت تو قطعی ہے قرآن کریم نے شہادت دی ہے :

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ

تو موت واقع ہوئی ___ لیکن موت واقع ہونا اور ہے اور سلب حیات اور ہے۔ موت واقع ہو اور حیات کلیہ سلب نہ ہو۔ یہ ممکن ہے اس واسطے کہ موت عارضی طور واقع ہوئی۔ اور حیات انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں ڈالدی گئی تھی۔ تو وہ کلیۃً سلب نہیں ہوئی گو موت بھی واقع ہوئی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کہ پانی ___ تو پانی کی ذات میں ٹھنڈک ہے کہ وہ آگ آئے تو اسے بجھا بھی دیتا ہے ___ لیکن پانی میں عارضی طور پر حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اسے آگ پر تپا دیں تو وہ کھول کر اتنا گرم ہو جائے گا کہ جو کام آگ کرتے ہے وہ پانی کرے گا ___ لیکن اس حالت میں بھی اگر اسی آگ کے اوپر ڈال دیں تو آگ کو بجھادے گا۔ معلوم ہوا پانی کے اندر ذاتی برودت باوجود انتہائی گرم ہونے کے موجود ہے۔ اگر انتہائی گرم ہو کر پانی کی حقیقت اس کے اندر سے نکل جاتی تو آگ کو بجھا نہ سکتا۔ لیکن کھولتا ہوا پانی بھی آگ کو بجھاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ برودت کا مادہ موجودہ ہے جو اس کے اصل جوہر میں قائم تھا وہ نہیں نکلا اور اوپر سے حرارت بھی موجود ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے جوہر میں حیات رکھی جاتی ہے۔ موت جب طاری ہوتی ہے تو کلیۃً حیات سلب نہیں ہوتی۔ تو موت بھی ہے اور حیات بھی ہے۔ دونوں جمع ہیں جیسے گرم پانی میں برودت بھی اور حرارت بھی دونوں جمع ہیں۔ ایک اصلی ہے اور ایک عارضی ہے ___ غرض ایک جماعت علماء کرام کی اس کی قائل ہے کہ موت واقع ہوئی مگر سلب حیات واقع نہیں ہوا بلکہ حیات موجود رہی۔ اس کے آثار موجود رہے کیونکہ وہ اصلی تھی اور موت صرف عارضی طور پر طاری ہوئی ___ تو اس میں دونوں کا اتفاق ہے کہ برزخ کے اندر حیات ہے اور ویسی ہے جیسے دنیا کی لیکن ایک کہتے ہیں کہ وہ مستمر حیات ہے اور ایک کہتے ہیں کہ وہ منقطع ہو کر پھر پیدا ہوئی ہے۔ نتیجۃً دونوں ایک رائے رکھتے ہیں کہ حیات وہی ہے جو دنیوی حیات ہے۔

سلامتی کا راستہ

یہ علماء کرام کا اختلاف ہے۔ اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہ ہم یوں کہیں برزخ میں انبیاء علیہم السلام اسی طرح حیات ہیں جس طرح ہم دنیا میں حیات ہیں۔ اب یہ کہ وہ حیات از سر نو آئی یا وہ پہلی ہی چل رہی ہے۔ یہ علماء پر موقوف ہے۔ ان کی آراء ہیں 'ان کی وجوہ ہیں۔ ان کے قرائن اور دلائل ہیں۔ نہ ہم انہیں توڑ سکتے ہیں نہ ان کا خلاف کر سکتے ہیں۔ ہم گردن جھکائیں گے۔ بس اس قدر مشترک کے قائل ہو جائیں گے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس طرح سے زندہ ہیں

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی موت طاری ہوئی اور اس کے بعد جو حیات آئی وہ مستمر اور دائمی ہے جیسا کہ وہ صدیق اکبرؓ کے مقولے سے استناد کرتے ہیں ___ وہ کہتے ہیں کہ یہ انبیا علیہم السلام کی خصوصیت ہے عوام مومنین کی یہ صورت نہیں ہے۔ ان پر دو موتیں طاری ہوتی ہیں ___ پہلی موت تو وہ جس کو ہم یہاں احتضار کہتے ہیں کہ ایک آدمی انتقال کر جائے۔ دوسری موت وہ جو قبر میں سوال وجواب کے بعد کہدیا جاتا ہے۔ نم کنومۃ العروس اور قرآن کریم میں جو فرمایا گیا:

وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔

یہاں موت کے معنی سلب حیات کے نہیں ہیں۔ یہاں موت کے معنی عدم ایجاد کے ہیں۔ یعنی تمہیں وجود نہیں ملا تھا۔ عرف عام میں تو موت اسی کو کہتے ہیں کہ حیات چھین لی جائے یا اس میں کمی کردی جائے۔ تو ظاہر ہے جو ابتدائی موت ہے وہ عدم ہے۔ اس کو آپ موت کہہ رہے ہیں اور قرآن کریم نے جو موت کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ حیات چھینی گئی 'بلکہ یہ ہیں کہ اس وقت تک حیات دی نہیں گئی تھی۔ البتہ۔

ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین۔

”دو موتیں مراد ہیں۔ ایک دنیوی موت اور ایک وہ جو قبر کے اندر حیات کے بعد واقع ہوگی“۔

انکشاف برزخ

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ علیہ نے انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سے ایک خادم جن کا نام عاشق ہے کے بارے میں لکھا۔ یہ وہی عاشق ہیں جو حجۃ اللہ البالغہ کے لکھنے کے محرک بنے ہیں۔

تو انفاس العارفین میں ایک واقعہ لکھا ہے جو شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں جنگل میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ چند سوار گھوڑوں پر اچھا فاخرہ لباس پہنے ہوئے اور بڑے اچھے شاندار گھوڑے اور چلے آرہے ہیں مگر ہر سوار کی کچھ ایسی شکل ہے جیسے کوئی متجس ہوتا ہے اور ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

میں قریب سے گزرا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر تشریف لائے ہیں؟

میں نے عرض کیا۔ کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہیں؟

انہوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ کون ہیں؟

اس نے کہا۔ میرا نام ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں عاشق کا قرآن کریم سننے کے لئے جارہا ہوں۔

ان کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔

یہ کہ وہ سوار غائب ہوگئے ___ تو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے یہ واقعہ اپنے والد بزرگوار کی طرف منسوب کیا ___ ہوسکتا ہے واقعہ عالم برزخ میں پیش آئے۔ لیکن بعض دفعہ عالم برزخ منکشف ہوجاتا ہے اور اس کی صورتیں ہمیں اس جہان میں بیٹھ کے نظر آتی ہیں ___ تو یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ برزخ سے نکل کر یہاں پہنچتے ہیں۔ بلکہ ہماری نگاہ برزخ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں کے احوال منکشف ہوجاتے ہیں۔

انکشاف بجین

جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ علیہ نے بہت محدثانہ روایات سے اس قسم کے واقعات کتاب الروح میں نقل کئے ہیں۔

ایک جگہ مثلاً لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ‘ایک اونٹنی پر سوار ہوکر سفر کررہے تھے جس وقت بدر کے اس مقام کے قریب پہنچے جس میں کفار کی لاشیں ڈالی گئی تھیں تو مغرب کا ساوقت ہوگیا تھا۔ تو دیکھا کہ بدر کے کنویں میں سے ایک نہایت ہی سیاہ فام اور بدہیئت شخص نکلا اور اس شان سے نکلا کہ بے حد ہی کریہہ المنظر اور ڈراؤنی صورت۔ اور وہ حضرت عبدابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دوڑا اور کہا۔

یا عبد اللہ اسقنی۔

یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کنویں کے اندر سے ایک زنجیر پیدا ہوئی اور اس کے پیروں میں جکڑی گئی اور اسے نیچے کی طرف جذب کرلیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس واقعہ کو دیکھ بے ہوش ہوگئے۔ اور اونٹنی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بالکل حمائل ہوگئے ___ اونٹنی وہاں سے بھاگی اور انہیں مدینے لے کر پہنچی۔

جب حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہوش میں لائے گئے تو واقعہ سنایا۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آرڈر جاری کیا۔ کوئی شخص رات کے وقت بالکل تنہا سفر نہ کرے۔ بالخصوص جب کوئی رفیق سفر ساتھ نہ ہو۔ اس قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں ___ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بجین سے نکل کر دنیا میں آگیا۔ لیکن بجین منکشف ہوگیا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ سارا واقعہ دیکھا جو بجین میں پیش آرہا تھا ___ غرض اس قسم کے واقعات حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بکثرت نقل کئے ہیں۔ اور محدثانہ انداز سے بھی نقل کئے ہیں۔

عالم منام

نیز بہت سے منامات بھی نقل کئے ہیں۔ جیسے ابن ابی الدنیا جو مشہور محدث ہیں ان کا واقعہ نقل کیا ہے۔ کسی عارف نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا ___ اور وہ شخص بھی عارفین میں سے تھا ___ ان سے پوچھا کہ تم پر کیا گزری؟ اور تم پر کیا گزرتی ہے۔ تو انہوں نے کہا۔

"اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو جزائے خیر دے کہ اجر و ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس بھیجتے ہیں۔ جو ہمارے پاس پہاڑوں کی طرح لگ جاتے ہیں"۔

اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔

ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم ہفتے میں ایک بار ابن ابی الدنیا کی مجلس میں حاضر ہوتے ہیں اور وہاں پہنچ کر یہ تحائف ہم کو ملتے ہیں جو دنیا والے ہمارے پاس بھیجتے ہیں ___ غرض کچھ خوابیں اور منامات اور کچھ محدثانہ روائتیں ان سے اس قسم کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

مقام میت کا انکشاف

ایک واقعہ میں نے اپنے فارسی کے استاذ مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سے خود سنا، جو آپ کے پاکستان کے مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع صاحب (مرحوم) ان کے والد ماجد تھے ___ وہ دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ تھے اور فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ تو وہ ہمارے بھی استاذ تھے ___ انہوں نے ایک واقعہ سنایا ___ اس واقعہ کا حاصل یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدرس تھے اور عالم جید تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ فنون معقولہ کے امام تھے اور بہت ہی ذکی تھے۔ آپ چھ مہینے تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بھی رہے ___ ان کے صاحبزادے تھے جن کا نام مولوی مصطفیٰ تھا۔ اور ہمارے ہی استاذ مولانا محمد یٰسین صاحب کے ہم جماعت تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مولوی مصطفیٰ صاحب نے ان سے اپنا واقعہ بیان کیا اور مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا ___ بس راوی بیچ میں ہمارے اور صاحب واقعہ کے مولانا محمد یٰسین صاحب ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ:

"مولوی مصطفیٰ جب دہلی وطن پہنچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب جمنا میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ اور جمنا کے کنارے کچھ قبرستان تھے تو ان میں سے بہت سی قبریں بہہ گئیں۔ ایک قبر جو ٹوٹی تو اس کی مٹی بہہ گئی اور اس کی لاش نمایاں ہوگئی ___ پانی تو ہٹ گیا لیکن وہ لاش رکھی ہوئی ہے مولوی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ اس لاش دیکھنے کے لئے آس پاس بہت سے دھوبی جو کپڑے دھو رہے تھے وہاں آکر جمع ہوگئے ___ اور شہرت جو ہوئی تو شہر سے بھی لوگ آئے"۔

"اس کی کیفیت انہوں نے یہ دیکھی کہ اس لاش کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا کیڑا بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ڈنک مارتا ہے جب ڈنک مارتا ہے تو لاش ایک دم لرز جاتی ہے اور ایک رنگ آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ اور کئی منٹ بعد لاش اصلی حالت پر آتی ہے ___ جب اصلی حالت پر آئی، پھر اس نے ڈنک مارا پھر اسی طرح لرز گئی ___ یہ انہوں نے تماشا دیکھا ___ اس میں کسی دھوبی نے اس لاش پر رحم کھا کر ایک کنکری زور سے کیڑے کے ماری۔ وہ کنکری کیڑے کے تو نہیں لگی ___ لیکن کیڑے کے پاس جا کر لگی ___ تو ایک دم اچٹ کر کیڑا اٹھا اور اس دھوبی کی پیشانی پر آبیٹھا اور اسے ڈنک مارا۔ اور اسے ڈنک مار کر پھر اس لاش کے اوپر جا بیٹھا"۔

مولوی مصطفیٰ صاحب کا بیان یہ ہے کہ وہ دھوبی چلایا اور اس نے کہا:

کچھ عجیب قسم کی آگ میرے اندر ہے کہ نہ میں یہ کہہ سکوں کہ سانپ نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ بچھو نے کاٹا۔ نہ یہ کہہ سکوں کہ آگ میں جلا، کہہ کچھ نہیں سکتا کہ وہ کس قسم کی گرمی ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر رگ میں ہزاروں بچھو پڑے ہوئے ہیں جو ڈنک مار رہے ہیں"۔

خیر اس کے ہاتھ وغیرہ باندھے گئے۔ اب مجمع بدستور ہے۔ تو مولوی مصطفیٰ صاحب کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے یہ سمجھا کہ کیڑا کوئی عالم مادی کی چیز نہیں ہے یہ کوئی عذاب خداوندی ہے جو اس میت پر ہے تو بجائے اس کے کہ اسے کنکر مارتا۔ میں نے اس میت کے قریب بیٹھ کر سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کی۔ اس کے علاوہ کچھ قرآن شریف کی آیتیں اور سورتیں جو مجھے یاد آئیں، جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں۔ وہ کیڑا مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے تلاوت کی۔ وہ کیڑا بالکل مضمحل ہو کر ایسا رہ گیا جیسے راکھ ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس میت کو دفن کردیا۔ اور وہ دھوبی دو تین دن زندہ رہا اور یہ کہتا تھا کہ میں اپنے کرب و بے چینی کا بیان نہیں کرسکتا۔

تو یہ اسی قسم کے واقعات ہیں کہ یہ معاملات تو برزخی ہیں لیکن برزخ دنیا میں نہیں آتا۔ نہ میت اپنے مقام کو چھوڑ کر آتا ہے۔ وہ اپنے مقام پر ہے لیکن کبھی کبھی حق تعالیٰ عالم برزخ کی چیزیں منکشف فرمادیتے ہیں اور انسان واقعات دیکھنے لگتا ہے ___ تو وہ برزخ کی چیزیں اسی طور پر دیکھ رہا ہے جیسا کہ خواب میں ہم دوسرے عالم کی چیزیں دیکھتے ہیں۔

جیسے عالم مثال خواب میں دنیا میں نہیں آتا۔ لیکن دنیا والے بعض اوقات سو کر عالم مثال کے اندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے واقعات دیکھتے ہیں۔

اسی واسطے فرمایا گیا النوم اخ الموت نیند جو ہے یہ موت کا بھائی ہے یعنی جو کیفیات موت میں آتی ہیں۔ وہی نیند میں طاری ہوتی ہیں۔ قوت و ضعف اور دوام وعدم دوام کا فرق ہے۔ تو سونے والا جب خواب دیکھتا ہے اور یہ دیکھے کہ میں کسی شدید عذاب میں مبتلا ہوں اور لوگ مجھے مار رہے ہیں اور ڈنڈوں سے خبر لے رہے ہیں ___ بعض مرتبہ وہ خواب میں چلاتا ہے اور چلاتے ہوئے بعض اوقات اس کی آواز جاگنے والے سن لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں! کیا ہوا۔؟

وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا۔ تو ہم نے نہیں جانا وہ کہاں گیا تھا حالانکہ وہ اس عالم میں گیا اور وہاں تکلیف اٹھائی مگر اس عالم میں اتنا چلایا کہ اس عالم کے اندر اس کی آواز منتقل ہو گئی۔ اور اس عالم والوں نے اس کی آواز کو سن لیا۔ اس لئے بعض برزخ کی آوازیں شروع وہاں سے ہوتی ہیں مگر ہمارے کانوں تک آکر منتہی ہو جاتی ہیں۔ تو جب بیداری میں یہ صورت ممکن ہے تو عبرت کے طور پر خواب والا ایک دوسرے عالم میں ہو اور وہاں کی چیزیں ہم یہاں دیکھ لیں یا سن لیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ میت اپنے مقام پر ہو اور اسکا عذاب یا ثواب بعض دفعہ دیکھنے والے دیکھ لیں۔ خواہ خواب میں دیکھیں یا کشفی نگاہ سے دیکھیں۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں ___ تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عالم برزخ سے کسی کی روح منتقل ہو کر دنیا میں آگئی۔ یا کوئی یہاں چلا آیا۔ یہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر ہے۔ البتہ اس کا مقام یہاں منکشف ہو گیا۔

تعدد ارض وسماء

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ۔

اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کئے اور اس کے مثل سات زمینیں پیدا کیں ___ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر میں یہ بات بھی ہے کہ ہر زمین میں آبادی بھی ہے اور انبیاء علیہم السلام بھی آتے ہیں ___ یہ روایت ہے اب یہ کہ وہاں یہی چاند سورج کام دیتا ہے یا وہاں کا چاند سورج الگ ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانے ___ جب کہ دنیا کے بہت سے خطوں کے بارے میں بھی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہاں اسی سورج کی روشنی پہنچتی ہے یا نہیں ___ اگر آپ قطبین کے قریب آبادیاں دیکھیں وہاں چھ چھ اور نو نو مہینے کی رات ہوتی ہے۔ سورج نکلتا ہی نہیں۔ وہاں لوگ اندھیرے میں بسر کرتے ہیں ___ اب رہا یہ کہ وہ چراغ جلاتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی کرتے ہوں بہر حال اس زمین پر بھی ایسے مواقع ہیں کہ وہاں اس سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ یا پہنچتی ہے تو کئی مہینوں میں جا کر ___ جو سورج اس زمین پر پورا کام نہ دے سکے' اس کے بارے میں آپ یہ کہیں کہ ساتوں زمین میں وہی کام دے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ کام دے۔ اللہ کے علم میں ہے کہ وہاں شاید کوئی اور سورج ہو۔

میت کا علم وادراک

مسند ابی حنیفہؒ میں امام صاحب سے خود روایت ہے۔ جہاں قبور کے آداب زیارت لکھے ہیں کہ میت کی زیارت اس طرح کی جائے کہ قبلہ کو پشت کی جائے اور میت کی طرف رخ کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے۔ اور درجہ بدرجہ تعارف بھی ہوتا ہے ___ اگر دنیا میں وہ شخصی طور پر پہچانتا تھا وہاں بھی شخصی طور پر پہچانے گا۔ کوئی عمومی طور پر پہچانتا ہے تو وہاں بھی عمومی طور پر پہچانے گا۔ جہاں مواجہہ ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کے ذریعے روح کو متوجہ کرا دیا جاتا ہو ___ جیسا کہ آپ مثلاً جاگ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی ہوئی ہے مگر خیال دوسری طرف ہے۔ تو باوجود یہ کہ آنکھ کھل رہی ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے ___ بعض دفعہ ہم بازار جاتے ہیں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور ایک بڑا تماشا گزر رہا ہے۔ جب گھر آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا گزرا؟ آپ کہتے ہیں کہ کیسا تماشا ___؟ کہ وہی جو بازار میں تھا ___ آپ کہتے ہیں کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ میاں تم آنکھیں کھولے ہوئے تو جا رہے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ واللہ' مجھے تو خبر نہیں ___ اس وقت آپ کہتے ہیں کہ اف! میرا دھیان دوسری طرف تھا ___ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے والی آنکھ نہیں ہے بلکہ دھیان دیکھتا ہے۔ اگر دھیان دوسری طرف ہو آنکھ کھلی رہے گی۔ آپ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے

متوجہ ہو جائیں وہی آنکھ دیکھنے لگے گی ___ اگر آپ غیر متوجہ ہیں۔ کان کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کو آواز نہیں آئے گی۔ توجہ کرلیں تو کانوں میں آواز آنی شروع ہو جائیگی بعض اوقات آپ اذان کی آواز نہیں سن پاتے۔ خیال دوسری طرف متوجہ ہے آپ اسی میں مستغرق ہیں تو قوت خیالیہ کو اگر ان حواس کی طرف متوجہ کرلیا جائے تو وہ ادراک کرنا شروع کرتی ہے۔ اگر متوجہ نہ کیا جائے تو وہ ادراک نہیں کرتی ___ تو ہو سکتا ہے کہ ملائکہ کے ذریعے سے میت کو توجہ دلادی جاتی ہو۔ جب متوجہ ہوا تو اس کی قوت خیال اور حسی کام کرنے لگتی ہے۔ نہ متوجہ ہوا نہیں کرتی ___

اور یہ جب ہوتا ہوگا جب کوئی جا کر سلام کرے۔ مطلقاً نہیں کہ جو قبرستان سے گزرے میت متوجہ ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔

علیین و سجین کا مقام

علیین کا آپ اپنے ذہن میں یہ جغرافیہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ ساتویں آسمان میں ہے۔ **علیین** اور سجین یہیں کھپا ہوا ہے' جیسا کہ ہماری روح بدن میں کھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن کو الگ کردیا جائے اور روح دیکھنے کا کوئی آلہ ہو تو روح کے واقعات آپ کو یہیں نظر آئیں گے۔ اسی طرح **علیین** اور سجین کے مقامات اسی عالم عنصری میں عالم روح کی طرح کھپے ہوئے ہیں۔ حجابات پڑے ہوئے ہیں۔ اگر حجابات اٹھادیئے جائیں۔ وہ سارا ثواب وعذاب آپ کو یہیں نظر پڑے گا۔ اوپر نہیں جانا ہوگا۔ غرض یہ تو ایک نگاہ کی چیز ہے کہ نگاہ جغرافیہ بنالیتی ہے کہ جب **علیین** اور سجین ہیں۔ تو وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہوں گے یہ ضروری نہیں وہ یہیں کھپے ہوئے ہیں' مادی حجابات میں غرق ہیں۔ اگر وہ اٹھادیئے جائیں آپ دیکھنے لگیں گے۔

حجیت کشف

بعض اہل اللہ پر عذاب قبر منکشف بھی ہو جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب شاہ عبدالقادرؒ کی وفات ہوئی تو اتنی مقبولیت تھی کہ مجھے منکشف ہوا کہ اس روز دہلی کی ساری قبروں میں سے عذاب قبر اٹھادیا گیا تھا۔ اتنی تکریم ہوئی ___ اب یہ انکشاف کی بات ہے کوئی حجت شرعی تو نہیں تھی۔ آخر انکشاف ہے۔ کشف بھی کوئی رد کرنے کی چیز تو ہے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ حجت شرعی نہیں۔ نفس وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اور صوفیاء تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کشف دوسرے کے لئے حجت نہیں مگر اپنے نفس کے لئے حجت ہے جب آدمی قطعی طور پر دیکھ رہا ہے۔

نیز یہ کہتے ہیں کہ اس حجت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کیا تو آخرت کا کوئی نقصان نہیں ___ اس لئے کہ آخرت کے نفع ونقصان کا تعلق نصوص سے ہے۔ کشوف سے نہیں لیکن دنیا میں کوئی نقصان ضرور پہنچ جائے گا۔ ایک چیز واقعی تھی اس کو دکھلائی گئی۔ اس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا تو اس کا نقصان پہنچے گا مگر دنیوی۔ اخروی کوئی ادنیٰ نقصان نہیں ہوگا۔

یہ **علیین** اور سجین کی بارے میں جغرافیہ کی بحث ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت اسلام کا تو یہ موضوع نہیں البتہ ارباب کشوف اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں وہ اگرچہ حجت شرعی تو نہیں ___ لیکن اگر خلاف میں کوئی دلیل قائم نہ ہو قابل رد بھی نہیں مانی جاسکتی ہے۔

جنت و جہنم کا جغرافیائی مقام

شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس بارے میں اتنا لکھا ہے کہ یہ آسمان سے لے کر زمین تک اور نچلی زمین

تک یہ سارا علاقہ جہنم کا ہے اور قیامت کے دن آگ سے یہی علاقہ تپے گا۔ اور اسی میں وہ سانپ اور بچھو اور وہ سارے عذابات ہوں گے۔ اور آسمانوں سے اوپر جنتیں رکھی جائیں گی۔ اور آسمان اور زمین کے درمیان جو پانچ سو میل کی مسافت ہے یہ اعراف ہے۔ تو قیامت کے دن اوپر جنت' نیچے نار ہوگی اب تو جنت ساتویں آسمان میں ہے۔

اس لئے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ سدرۃ المنتہٰی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لے گئے تو وہ ساتویں آسمان پر تھی جو مقام جبریلؑ ہے۔ تو سدرۃ المنتہٰی کا ساتویں آسمان پر ہونا حدیث سے ثابت ہوا۔ اور قرآن کریم کہتا ہے :

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى۔

"سدرۃ المنتہٰی کے پاس جنت الماویٰ ہے"۔

تو اس آیت اور روایت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جنتوں کی ابتداء ساتویں آسمان سے ہی۔ اور اوپر نیچے جنتوں کے سو درجے ہیں۔ گویا جنتوں کا علاقہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ اور جہنم کا علاقہ ساتویں زمین کے نیچے تحت الثریٰ میں ہے۔ قیامت کے دن جہنم کو کھینچ کر اوپر لایا جائے گا۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ستر ہزار ملائکہ ایک ایک باگ کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور ستر ہزار ہی اس کی باگیں ہوں گی۔ اس کو کھینچ کر اوپر لائیں گے ___ اور جنت کو کچھ نیچے اتارا جائیگا ___ اور اگر نہیں اتارا جائے گا تو آسمان توڑ پھوڑ دیئے جائیں گے۔ تاکہ جنت کے وہ پورے مقامات نظر پڑ سکیں جو اب تک حجابات میں ہیں۔ تو وہ بالا تر رہے گی۔ مگر نظر پڑے گی۔ اور جہنم اس زمین کے اوپر لائی جائے گی۔

اسی واسطے حدیث میں ہے کہ میدان محشر میں ہر انسان کے آگے دو چیزیں ہونگی ایک جہنم کی ہولناک آوازیں جو آرہی ہوں گی اور ایک اپنے اپنے اعمال جو مجسم کر دیئے جائیں گے۔ قطار باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ دو چیزیں ہر انسان کے سامنے ہوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہنم کو قریب لایا جائے گا۔ اور اس کی آوازیں ہیبت کے لئے سنوائی جائیں گی۔ غرض قیامت کے دن کچھ تغیر کیا جائے گا کہ جہنم کو اوپر لائیں گے اور جنت کو کچھ نیچے لائیں گے یا اوپر ہی رہے گی' مگر بیچ میں سے آسمان توڑ دیئے جائیں گے تاکہ وہ حجابات ختم ہوں۔ ادھر جہنم نظر آئے۔ ادھر جنت نظر آئے۔ اور ہر ایک کو اپنا ٹھکانہ محسوس ہونے لگے کہ یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔ تو اس وقت یہ زمین و آسمان حائل نہیں رہیں گے۔

فی الحال زمین و آسمان حائل ہیں۔ اس لئے کچھ نظر نہیں آرہا ___ اور اگر فی الحال ہی نظر آجاتا تو عقیدہ باندھنے اور ایمان لانے کی کیا ضرورت تھی۔ عقیدہ تو اسی کو کہتے ہیں کہ آدمی غیب کو سمجھے اور اسی پر ایمان لائے۔

مقام ارواح

جنت اور دوزخ میں داخلے سے پہلے پہلے ارواح اپنے اپنے مقامات پر رہیں گی اور وہ علیین اور سجین ہیں ___ اور اب یہ کہ شہداء کو جنت میں لے جائیں اور سبز پرندوں کے خول پہنائیں۔ یہ تو لے جانا ہوا ___ باقی داخلہ تو جنت میں قیامت کے دن ہوگا۔ اب تو قبر سے اس کو ٹھکانہ دکھلا دیا جائے گا۔ اور روح و ریحان اور نعیم کی خوشبو اور تعطر وہاں سے آنے لگیں۔

جنّوں سے نکاح کا حکم

حافظ ابن تیمیہ حرانیؒ نے ایک کتاب "آکام المرجان فی احکام الجان" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں

جنات کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ دنیا کے ہر مکان میں جنات بستے ہیں کوئی مکان خالی نہیں ہے فرق اتنا ہے کہ جو شری ہے اس کے شر کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جن ہے اور آسیب کا اثر ہے' جو بے چارے صالحین ہیں وہ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے۔ مگر ہر جگہ موجود ہیں ___ اور ان میں زیادہ شری ہوتے ہیں۔ نیک بہت کم ہوتے ہیں۔ ان میں شر کا مادہ ہی غالب ہے جبکہ انسانوں میں شر کا غلبہ نہیں بلکہ مادے برابر رکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثریت شر والوں کی ہے۔ خیر والے اقلیت میں ہیں۔

فقہاء نے اس میں بحث کی ہے کہ جنیہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ غیر جنس ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری یا گائے سے نکاح کرلے۔ وہ منعقد نہیں ہوگا۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ جب وہ صورت انسانی میں ہوں تو جنسیت کے اقرب ہو گئے لہٰذا نکاح جائز ہے۔

حضرت حکیم الاسلام سے ایک جن کی ملاقات

ایک جن سے تو خود ہماری ملاقات قندھاریہ میں ہوئی وہاں کسی شخص کے اوپر جن کا اثر تھا اور اس کی نسبت مشہور یہ تھا کہ جب اس پر اثر ہوتا ہے تو باوجود یہ کہ بے پڑھا لکھا تھا۔ اس کے باوجود قرآن شریف کے متعدد رکوع پڑھتا۔ مسائل اور علوم بہت بیان کرنے لگتا تھا ___ اور جب وہ اثر نہیں رہتا تھا تو جاہل مطلق ہوتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی کلام اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔

میرا وہاں جانا ہوا۔ صبح کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ وہ جن ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ جن کو میرے سے کیا کام ہے؟ میرے اوپر کوئی اثر ڈالے گا؟ خیر میں نے کہا اگر ملاقات کرنا چاہتا ہے تو اسے بلاؤ ___ تو وہ شخص آیا ___ اس کی حرکات کچھ ایسی تھیں جیسے ہوش میں آئے ہوئے انسان کی نہیں ہوتیں۔ جیسے مدہوش سا ہو ___ اور پھر جب بیٹھا تو اس کی آنکھیں اتنی چڑھیں کہ پتلیاں بالکل غائب ہو گئیں۔ اتنی اوپر چڑھ گئیں کہ سفیدی سفیدی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا تھا۔

اور پھر اس کا سانس کچھ چلا اور ابھرا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گرا۔ اس کے بعد اٹھا تو اس کا سانس ٹھکانے پر نہیں تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھی ___ لیکن اب اس نے کچھ بولنا شروع کیا اور اس کی آواز بھی ایک قسم کا کچھ ڈراؤنا پن سا تھا ___ اس نے مجھے سلام کیا میں نے وعلیکم السلام کہہ کر جواب دیا ___ اس کے بعد اس نے معانقہ کرنا چاہا ___ میں نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں جن سے کیا معانقہ کروں؟ لیکن طوعاً و کرھاً میں نے معانقہ بھی کیا۔ کوئی اثر وغیرہ تو ہوا نہیں اس کے بعد وہ بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے شاید عباس یا ایسا کچھ نام بتایا۔ میں نے کہا آپ رہتے کہاں ہیں۔؟

اس نے کہا بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے اس میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا' آپ اس شخص کو کیوں ستاتے ہیں؟

اس نے کہا نہیں۔ میں تو نہیں ستاتا۔ مجھے اس سے تعلق ہے۔ اس کو بھی میرے ساتھ تعلق ہے۔ جب میں نہیں آتا تو یہ خود مجھے ڈھونڈتا ہے۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ ہمیں کیا نفع پہنچا سکتے ہیں ___ ؟ اس لئے کہ ہم نے آپ کو بہت نفع پہنچایا۔

اس نے کہا وہ کیا؟

میں نے کہا کہ آپ لوگ ہمارے شاگرد ہیں۔ دارالعلوم میں ہمارے بزرگوں کے سامنے بہت سے جنات

نے پڑھا ہے۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کے زمانے میں کچھ ظاہر بھی ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ ہمارے استاذ بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں ___ شاگرد تو یوں کہ دار العلوم میں پڑھا ___ اور استاذ یوں کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ علیہ نے "حدیث الجن" نقل کی ہے وہ قاضی جن سے سنی ہے ___ میں نے کہا آپ لوگ استاذ بھی ہیں اور شاگرد کثرت سے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ دار العلوم کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔؟

وہ چپکا ہو گیا کہ میں تو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے کہا۔ پھر آپ جن ہی کیوں بنے؟ پھر وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا کچھ بولا نہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اس نے اجازت چاہی۔ میں نے کہا جایئے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو تو بہت بولتا تھا بولا کیوں نہیں؟ کہنے لگا بس کچھ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب واللہ اعلم وہ واقعی جن ہی تھا یا کیا تھا۔ مگر بہرحال قرائن تو ایسے تھے کہ وہ انسانی حرکتیں نہیں تھیں اس لئے کہ جب اس کا اثر ختم ہو تا تھا وہ آدمی بالکل اچھا خاصا ہوش و حواس قائم۔ اور جہاں وہ اثر شروع ہوا کہیں قرآن پڑھتا ہے۔ حالانکہ حافظ نہیں ہے۔ اسی طرح مسائل بیان کرتا ہے۔

اقسام محبت

علماء کرام محبت کی تین قسمیں لکھتے ہیں۔ ایک محبت طبعی ہے ___ ایک محبت عقلی ہے اور محبت عشقی ہے۔

محبت طبعی تو مادی محبت ہے جیسے باپ کو اولاد سے ہوتی ہے یا اولاد کو ماں باپ سے ہوتی ہے یا عزیزوں، رشتہ داروں میں ہوتی ہے۔

اور ایک محبت عقلی ہے ___ اسی کا نام فی الحقیقت ایمان ہے حدیث میں ہے کہ :

لایؤمن احدکم حتّٰی اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین۔

"تم میں کوئی بھی مومن نہیں بن سکتا جب تک میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ نہ اتنی محبت اپنے ماں باپ سے ہو نہ اولاد سے ہو"۔

ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے۔ وہ محبت عقلی ہوتی ہے۔ طبعی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ دلائل پر مبنی ہے۔ ایمان خود استدلالی چیز ہے اور ایمان کی حقیقت محبت ہے۔ تو وہ محبت عقلی ہے۔ اس محبت کی آدمی جب عملاً مشق کرے اور بڑھائے اور عشق کے درجے میں آجائے تو وہ محبت عشقی کہلاتی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا :

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔

تو اشد حب ہی وہی عشق ہے ___ محبت طبعی تو غیر اختیاری ہوتی ہے۔ جیسے اولاد سے محبت ہے اس میں ارادے اور اختیار کا دخل نہیں۔ خواہ مخواہ آدمی محبت کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن عقلی محبت وہ اختیاری ہے بایں معنی کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ جب اس کے اسباب اختیار کرے گا وہ محبت پیدا ہو جائے گی اور اس محبت کو جب تمرین میں لائے گا اس کی مشق کرے گا اور اس کے متعلقہ اعمال انجام دے گا وہ محبت بڑھ کر عشق کے درجے میں پہنچ جائے گی جیسا کہ مجاہدہ اور ریاضت کرنے والے کی کیفیت ہوتی ہے ___ اصل ایمان وہ تو محبت عقلی ہے ___ جب مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں تو محبت حال کے درجے میں پہنچ جاتی ہے وہ عشق کہلاتی ہے۔ یہ جو آپ نے سوال کیا کہ قیامت میں آدمی اس کے ساتھ ہو گا جس کے ساتھ محبت

کرے۔ یہ درحقیقت محبت عقلی کی طرف اشارہ ہے یعنی ایمان کی وجہ سے جس کے ساتھ محبت ہوگی۔ آدمی اس کے ساتھ ہوگا۔

مثلاً امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ سے آپ کو محبت ہے یہ طبعی محبت نہیں بلکہ عقلی محبت ہے۔ ان کے علوم اور کمالات کو دیکھ کر ہے۔ چونکہ آپ کو کمالات سے محبت تھی تو صاحب کمال سے بھی محبت ہے۔ سارے انبیاء اور سارے اولیاء نیز اھل اللہ سے محبت۔ یہ محبت عقلی ہے ___ آخرت کا تعلق زیادہ تر اسی محبت سے ہے جو امر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری امور پر تکوینی آثار مرتب ہوں گے' وہ دوسرا درجہ ہے۔ اختیاری محبت پر تشریعی آثار مرتب ہوں گے۔ اسی کے بارے میں ہے۔ **المرء مع من احب** اور اسی کو فرمایا گیا :

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان۔

"جس نے محبت کی تو اللہ کی خاطر' عدوات باندھی تو اللہ کے لئے' کسی کو دیا تو اللہ کے لئے' کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے' اس نے ایمان کو کامل کردیا ___ حب فی اللہ اور بغض للہ کے کمال پر ایمان کا کمال بتلایا گیا۔ یہ وہی اختیاری محبت ہے جو اعمال سے بڑھتی ہے۔ ترک عمل سے گھٹ جاتی ہے"۔

قیام میلاد اور عرس کی تحقیق

ایسا موقع تو میرے علم میں نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ ان مسائل میں ابتداء حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی رائے جواز کی تھی۔ قیام میلاد یا عرس۔ ان چیزوں میں توسع تھا۔ بعد میں جب تحقیق بدلی ہے پھر شدت پیدا ہوگئی۔

حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ' جو گویا پوری اس جماعت دیوبند کے شیخ طائفہ ہیں۔ ان کے سلسلہ میں بیعت میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں خود ان چیزوں میں توسع ہے ___ لیکن جماعت دیوبند کا عمل فقہاء کے اقوال اور نصوص پر اور کتاب وسنت پر ہے۔

اور ان حضرات میں (حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ علیہ وغیرہ) جو توسع ہے اور کچھ شدت کی کمی ہے۔ اس کو ذاتی حال پر محمول کرتے ہیں اور خود نص فقہی کو اختیار کرتے ہیں۔

قیام میلاد کی جو اصل بنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو قیام ہے ایک حرکت وجدی ہے اور حرکت وجدی صرف اسی صورت میں معتبر ہے کہ کسی حال کے تابع ہو۔ اگر رسم یا نقالی کے تابع ہو اسے حرکت وجدی نہیں کہتے ___ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت متمثل ہو اور وہ تعظیماً کھڑا ہوجائے پھر آگے یہ طریقت کا مسئلہ ہے کہ جتنے بھی ارباب طریقت موجود ہوں انہیں بھی کھڑا ہوجانا چاہئے۔ ورنہ اس پر قبض طاری ہوجاتا ہے۔

اب حقیقت میں یہ شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ذوقی اور وجدانی مسئلہ ہے اور طریق کا ایک معالجہ ہے اس کو جائز وناجائز کے نیچے لانا یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک حرکت وجدی ہے ___ اب جو ناجائز کہتے ہیں وہ ان لوگوں کے قیام کو کہتے ہیں کہ وہ وجدی نہیں ہے اور کسی حال کے تابع نہیں۔ محض نقالی ہے' رسوم کی اتباع ہے' کوئی صاحب حال نہیں ہے۔ تو جب رسم کی اتباع ہوگی تو رسم پیغمبر اولی ہے۔ اگر کسی پر حال طاری ہوگا' اور وہ مغلوب الحال ہے تو وہ عنداللہ معذور ہے۔ نہ آپ اسے کچھ کہہ سکیں گے نہ ہم کہہ سکیں گے ___

لیکن جو اپنے ہوش و حواس میں ہے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور آپ کے لائے ہوئے قانون کی اتباع کرنی پڑے گی۔ بحالت صحت حواس اگر رسوم کی اتباع کرنے لگے وہ نقالی سمجھی جائے گی۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کا تمثل ہوا اور مثالی صورت سامنے آئے۔ خواب میں بھی آپ دیکھ لیتے ہیں۔ اور آپؐ نے فرمایا :

من رأنی فقد رأنی۔

"جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا"۔

اسی طرح سے منام جو ہے وہ ایک ابتدائی درجے کا کشف ہے جو ہر انسان کو میسر آسکتا ہے ___ لیکن مجاہدہ اور ریاضت کرنے والوں کا کشف اس کا اور درجہ ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کسی مغلوب الحال کے سامنے آئے اور متمثل ہو اور وہ تعظیماً کھڑا ہو جائے۔ اس پر نہ آپ دارو گیر کریں گے نہ ہم کریں گے کیونکہ وہ اپنے حال میں نہیں، اپنے آپے میں نہیں ہے۔

ملت اسلامیہ کا ناسور

جامعہ ازہر میں شیعوں کے بارے میں مسئلہ تو چل رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ جو شیعہ سنی کے درمیان منافرت سی ہے اس کو ختم کیا جائے۔ اور جامعہ ازہر میں شیعوں کو بھی داخلے کا حق دیا جائے۔ یہ مسئلہ وہاں چل رہا ہے۔

وہاں کے شیوخ میں شیخ عبدالواحد واصلی ہیں ___ ایک دعوت میں ہمارا ساتھ ہوا تو اس مسئلہ پر کچھ گفتگو آئی۔ اس پر انہوں نے یہی کہا کہ ایک شیعہ تو وہ ہیں جو بالکل اصول اسلامیہ سے منحرف اور بالکل مختلف ہیں۔ جیسے کوئی تحریف قرآن کریم کا قائل ہے۔ یا بعض حلول خداوندی کے قائل ہیں ان سے تو بحث نہیں وہ اسلام سے خارج ہیں۔ لیکن جو لوگ محض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کے قائل ہیں ان سے اگر منافرت باقی نہ رہے تو کیا حرج ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت الگ ہے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر فقط اتنا ہی مسئلہ ہو، اہم تو یہ بھی ہے، اس واسطے کہ اب فضیلت شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر اور ان کی خلافت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اجماع کا خرق اور اس کا توڑ ڈالنا یہ بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو برداشت کیا جائے کہ ایک چیز پر اجماع ہو چکا ہے مگر اس کی جو جانب مخالف ہے وہ کوئی حرام یا ممنوع نہیں ہے۔ اگر فقط ایک مسئلہ ہو تو کچھ صبر کر لیا جائے۔

لیکن ان کے ہاں سارے فرقوں کا قدر مشترک وہ "مسئلہ امامت" ہے اور وہ امامت کو نبوت سے افضل جانتے ہیں۔ اور امام کو معصوم سمجھتے ہیں کہ امام کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا ___ تو یہ مسئلہ سامنے آئے گا۔ کیا آپ اس کو برداشت کریں گے۔؟

ظاہر بات ہے کہ جب بنیاد کے اندر ہی اختلاف ہو گیا کہ ہم تمام مسلمان اسکے قائل ہیں کہ نبوت سے اونچا کوئی مرتبہ نہیں۔ امامت تو ابع نبوت میں سے ہے۔ جب نبوت ختم ہو گئی تو وعدہ دیا گیا۔

الائمۃ من القریش۔

یا یہ کہ بارہ امام گزریں گے۔ یا آئمہ مجتہدین کے بارے میں کچھ پیشین گوئیاں آئیں ___ تو اس کا مطلب یہ کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد نبوت کی خلافت باقی رہے گی۔ وہ خلافت خواہ امامت کی صورت میں ظاہر ہو۔ خوہ علم کی صورت میں۔ خواہ کسی بھی کمال کی صورت میں ہو۔ بہرحال وہ فروعات نبوت میں سے

ہے۔

یہ امت کا ایک اجماعی مسئلہ ہے اس کے اندر اگر ایک فرقہ آکر یہ دعویٰ کرے کہ نبوت افضل نہیں بلکہ امامت افضل ہے۔ تو پہلے تو اجماع کا خرق ہوا ___ پھر یہ کہ ان کے نزدیک امام کے لئے عصمت لازم ہے جیسا کہ نبیؐ کے لئے عصمت لازم ہے۔ تو نبوت کے محاذ اور متوازی ایک دوسرا مقام لاکے کھڑا کردیا۔ تو ہم اس کو شرک فی النبوّت سے تعبیر کریں گے۔ جیسا کہ شرک فی الالوہیت ممنوع ہے اسی طرح شرک فی النبوت بھی ممنوع ہے۔ اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں۔ اس لئے کہ انبیاء سابقین میں چونکہ نبوّت ختم نہیں ہوئی تھی تو انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ جاری تھا ___ اس میں اگر کوئی دعویٰ نبوت یا دعویٰ عصمت کرے تو کچھ مناسب بھی تھا

ختم نبوت کے بعد جو بھی عصمت کا دعویٰ ہوگا یا نبوّت سے افضلیت کا دعویٰ ہوگا۔ تو وہ ختم نبوّت کے ٹھیک منافی پڑے گا ___ ایک ادھر دعویٰ خارق اجماع اور ادھر ایک اسلام کا جو اجماعی مسئلۂ ختم نبوّت کا ہے اس کے بھی یہ منافی ہے کیا آپ اسے برداشت کریں گے۔؟

تاریخی تخریبی فرقہ

پھر میں نے یہ عرض کیا کہ دوسری بات یہ ہے کہ ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیجئے یہ دیکھئے کہ ہر فرقے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس فرقے کا مزاج تخریبی ہے۔ اور تاریخ اس پر شہادت دے گی کہ مسلمانوں کو جتنے بھی صدمات اٹھانے پڑے ہیں، سیاست کو، یا خلافت کو۔ جہاں جہاں تباہی ہوئی پیچھے سے یہی فرقہ نکلتا ہے تو تاریخ کی روشنی میں یہ ایک تخریبی فرقہ ہے ___ جب اس کا مزاج یہ ہے تو ہوسکتا ہے کہ آج وہ آپ کی چاپلوسی کرکے آپ میں شامل ہوجائے۔ لیکن کل کو نوک پنجے نکال کر آپ کو ہی پنخ دے۔ آپ کے اوپر غالب آجائے اور آپ دیکھتے رہ جائیں۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے پھر آپ کیا کریں گے؟

ذوقِ دین کی کمی

آپ نے محض ایک عقیدہ سامنے رکھ لیا یعنی تفضیل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، یہ کوئی زیادہ اہم نہیں۔ اگر صرف اس مسئلہ تک بات ہوتی تو مضائقہ نہیں تھا مگر مسائل دوسرے بھی ہیں۔ پھر فرقوں اور طبقات کا مزاج ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کرلینا تو ٹھیک نہیں ہے ___ اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں ___ اخیر میں انہوں نے یہ کہا میں تو انہیں چیزوں کا قائل ہوں، میں تو نمائندگی کررہا تھا کہ یہ خیالات ہیں ___ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ اس کی نمائندگی کیجئے گا کہ یہ خیال نہ ہونا چاہئے تو اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسئلہ تو اٹھ رہا ہے۔ اور کچھ طبیعتیں ادھر چل رہی ہیں۔ اور جب اس ذوق میں کمی آتی ہے جو خالص دین کا ذوق ہے تو افکار میں اس قسم کی آزادی پیدا ہوتی ہے۔

بشاشتِ ایمان (ایمانی کیفیّت)

دراصل اس کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے کہ اس پر ہم پرکھیں ___ بلکہ صحیح بخاری کی جو روایت ہے اس میں ایک لفظ یہ ہے۔ جب ہرقل نے ابوسفیان سے مختلف سوالات کئے ہیں تو ان میں ایک یہ بھی تھا۔

هل یرتد احد سخطۃً لدینہ۔

”کیاان نبیؐ کے اوپر ایمان لاکران کے دین کو برا سمجھ کر کوئی مرتد بھی ہو جاتا ہے؟“۔

انہوں نے کہا۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مرتد ہو گیا ہو۔

ہرقل یہ کہتا ہے کہ :

ذٰلک اذا خالط بشاشۃ القلوب۔

یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب ایمان کی بشاشت قلب کے اندر رچ جائے۔ پھر ارتداد کا خطرہ باقی نہیں رہتا ___ تو حدیث میں اس کو انشراح تام اور بشاشت ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے ___ یہ مختلف الفاظ جو احادیث میں آتے ہیں۔ کہیں ”حلاوۃ ایمان“ فرمایا گیا۔ جیسے حدیث میں ہے :

من سرہ ان یجد حلاوۃ الایمان فلیلبس الصوف تذللاً لربہ عزوجل۔

جس کو یہ پسند ہو کہ میں ایمان کا مٹھاس چکھوں اسے چاہئے اللہ کے سامنے ذلت نفس اختیار کرنے کے لئے اون کا کپڑا پہنے۔ یعنی دکھلاوے کے لئے نہ ہو۔ تو اس کو ایمان کی حلاوت اور مٹھاس آجائے گا۔

اب یہ ایک کیفیت ہے کیفیت کو ہم الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کہیں اسی کو ”شرح صدر“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔

جب اللہ سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور شرح صدر نصیب ہو جاتا ہے تو اس کو ایک خاص نور عطاء کر دیا جاتا ہے۔

یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ اب قلب کے اندر ظلمت نہیں آسکتی۔ جب شرح صدر ہو گیا۔

تو کہیں حلاوۃ ایمان سے، کہیں بشاشت ایمان سے، کہیں شرح صدر سے، اس کی مختلف تعبیرات ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دین کے لئے سینہ کھل جائے اور اس پر طمانینت میسر آجائے اور رضائے کامل حاصل ہو جائے۔ پھر اندیشہ نہیں رہتا۔

کیفیّت مقام

لیکن یہ کہ اس کا قاعدہ کیا ہے۔ یہ قواعد سے متعلق چیز نہیں۔ یہ تو ایک مقام ہے جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے گا تو یہ ایک قلبی کیفیت ہے وہ خود محسوس کرے گا کہ میں کس مقام پر ہوں۔ لفظوں میں کیفیات ادا نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو ایمانی اور روحانی کیفیات ہیں۔ مادی کیفیات کو آدمی الفاظ سے نہیں سمجھ سکتا کتنی بلیغ تعبیر کیوں نہ ہو۔؟

میں آپ سے کہوں آپ ذرا مجھے سیب کا مزہ سمجھا دیجئے۔ تو آپ کتنی ہی فصیح وبلیغ تقریر کریں، آپ نہیں سمجھا سکتے۔ اس لئے کہ کیفیت الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ آپ یوں کہیں گے کہ صاحب! دو پیسے خرچ کرو، کھا کے دیکھ لو، مزہ معلوم ہو جائے گا۔ یہ مادی کیفیت ہے ___ یا مثلاً نفسانی کیفیت ہے۔ جیسے انسان کی عمر کے تین درجے ہیں۔ طفولیت، شباب اور کہولت ہے ___ بچہ اگر آپ سے یہ پوچھے کہ جوانی کی کیا کیفیات ہیں، مجھے سمجھا دیجئے۔ کیا آپ اس پر قادر ہیں کہ سمجھا دیں؟ کبھی نہیں سمجھا سکیں گے۔ یہ کہیں گے کہ بیٹا! ایک آٹھ دس برس کا انتظار کرو جب جوان ہو جاؤ گے خود محسوس ہو جائے گا کیا کیفیت ہے ___ یا ایک جوان آدمی یوں کہے کہ مجھے بڑھاپے کے کیفیت سمجھا دو۔ ممکن نہیں کہ آپ سمجھا دیں۔ جب تک وہ

کیفیت اس پر گزرے نہیں۔ اور وہ خود صاحب مقام نہیں بن جاتا۔ یا بوڑھا آدمی یوں کہے کہ مجھے محتضر کی کیفیت سمجھا دو کہ نزع کی حالت کیسی ہوتی ہے تو سوائے اس کے کوئی جواب نہیں کہ بھائی! جب یہ کیفیت آئے گی تو خود سمجھ لو گے یہ لفظوں میں میں ادا نہیں کر سکتے۔ جب مادی کیفیت کو لفظوں میں نہیں لا سکتے' نفسانی کیفیت کو نہیں لا سکتے' تو روحانی کیفیات جو مقامات قلب سے تعلق رکھتی ہیں وہ اتنی لطیف ہیں کہ ناممکن ہے کہ وہ لفظوں میں آسکتی ہوں اور جتنی آسکتی ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ بہتر کوئی نہیں بیان کر سکتا۔ اس کی علامتیں بتلادی گئی ہیں کہ جب اس درجہ پر پہنچ جاؤ گے تو سمجھ لو کہ صاحب مقام ہو گئے۔

کیفیت برزخ

کسی بزرگ کا واقعہ ہے انہوں نے کہا کہ ہزاروں آدمی مرتے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتلایا کہ مجھ پر گزرا کیا۔ انہوں نے کہا میرا جب انتقال ہو تو تم میری قبر میں کاغذ اور قلم دوات رکھ دینا۔ میں تمہیں ساری کیفیات لکھ کردوں گا۔ بس تم تیسرے دن آکر اس کاغذ کو اٹھالینا۔

اور کہا میں نے تیسرے دن کی قید اسلئے لگائی ہے کہ تین دن میں مجھے اپنا اندازہ ہو جائے گا کہ مجھ پر کیا گزرے گی۔ میں مقبول ہوں یا نامقبول ہوں۔ جب اپنی طرف سے اطمینان ہو تب میں دوسرے کو اطلاع دوں گا کہ یہ کیفیت میرے اوپر گزری۔

چنانچہ ان کے انتقال کے بعد تیسرے دن لوگ پہنچے تو وہ جو کاغذ اندر رکھا تھا' واقعی اوپر موجود تھا۔ اور اس کے اوپر لکھا ہوا بھی ہے — اور لکھا ہوا کچھ ایسے حروف میں ہے کہ وہ روشنائی بھی نہیں ہے۔ بس کچھ حروف سمجھ میں آتے ہیں۔

غرض لوگ شوق سے دوڑے کہ شیخ نے برزخ کے احوال سے مطلع کیا ہو گا۔ وہ وعدہ کر کے گئے تھے۔ اس میں انہوں نے ایک سطر میں سارا حال لکھ دیا۔ وہ یہ تھا کہ :

"یہاں کی حالت دیدنی ہے' شنیدنی نہیں ہے"۔

دیکھنے اور گزرنے سے تعلق رکھتی ہے سننے سے متعلق نہیں ہے۔ وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور جتنی بیان میں آسکتی ہے وہ انبیاؑ سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ تو حدیث میں عالم برزخ میں جتنے واقعات بیان کردئے گئے ہیں اس سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا — یہ انبیاء علیہم السلام کی قوت بیانیہ ہے کہ ان کی کیفیات کو پھر بھی لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان سے زیادہ کسی کو قدرت نہیں ہے۔ تو یہ جواب دیا کہ یہاں کی حالت دیدنی ہے' شنیدنی ہے نہیں — سننے کے لائق نہیں۔ بس دیکھنے کے لائق ہے — غرض ہر کیفیاتی مقام کا یہی حال ہے کہ آپ اس کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتے۔ خواہ نفسانی مقام ہو' خواہ مادی کیفیت ہو۔ صاحب کیفیت اور صاحب مقام بن جائیں۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

تعبیر کیفیت ناممکن ہے

اور بظاہر اس کی بناء یہ ہے کہ جس قدر بھی کیفیات ہیں وہ امور کلیہ نہیں۔ وہ شخصی چیزیں ہیں اگر امور کلیہ ہوں تو ان کو تو آپ تقریر و بیان سے بیان کر سکتے ہیں' جن کا تعلق سارے انسانوں سے ہے — وہ امور شخصیہ ہیں کسی کی کوئی کیفیت' کسی کی کوئی کیفیت ہے۔ کوئی کسی حال میں ہے۔ کوئی کسی مقام پر ہے۔ اور ایک کا مقام دوسرے کے لئے حجت نہیں۔ اپنے آپ کو آدمی خود ہی سمجھتا ہے اور خود ہی محسوس کر سکتا ہے۔

اگر کلیاتی چیزیں ہوں تب تو ان کی تعبیر ہو لیکن جب وہ امور جزئیہ ہیں اور ان کا تعلق بھی کیفیات سے ہے تو ان کے لئے تعبیر رکھی نہیں گئی اور جتنی ہو سکتی ہے بس وہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے بیان فرمادی ہے۔ آگے نہ کسی کی جرأت ہے نہ قوت ہے ۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
بس سخن کوتاہ باید والسلام

خام کبھی پختہ کار کی کیفیات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ جواب یہی ہوگا کہ تم پہلے پختہ کار بن جاؤ پھر خود سمجھ لوگے ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

کسی نے سوال کیا تھا کہ عاشقی کسے کہتے ہیں؟ عاشقی کیا ہوتی ہے؟ ۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چوں ماشوی بدانی

مجھ جیسے عاشق بن جاؤ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ عاشقی کیا ہے۔ لفظوں میں کیسے بتلا سکتا ہوں۔

انسان کی قوت بیانیہ کا عجز

اچھا یہ تو کیفیات ہیں جو باطنی چیزیں ہیں ___ انسان کے چہرے مہرے کی ایک آن اور شان ہوتی ہے۔ وہ لفظوں میں نہیں آسکتی ___ یعنی آپ چہرے کی تصویر کھینچ دیں گے لیکن چہرے کی جو آن بان ہے اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ وہ تو جب سامنے ہوگا۔ اس کی ادائیں سامنے آئیں گی۔ آپ سمجھیں گے یہ محبوب ہے۔ لیکن لفظوں میں یہ آئیں، یہ ناممکن نہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ۔

گر مصور صورت آن دلستاں خواھد کشید

آدمی صورت کھینچ سکتا ہے۔ ۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواھد کشید
لیک حیرانم کہ نازش واچساں خواھد کشید

صورت آدمی کھینچ سکتا ہے لیکن اس کے ناز و ادا کو کیسے کھینچے گا، الفاظ میں کیسے لے آئے گا ___ کاغذ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق احساسات اور ادراکات سے ہے۔ اور وہ ادراک باطنی ہے۔ بہت سی ادائیں جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں بیان نہیں کی جاسکتیں ___ اور کیفیات روحانی و نفسانی یہ تو آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتیں۔ ان کو آدمی کیسے بیان کرے گا۔؟ یہ تو آنکھوں دیکھی چیز ہے جب اسے بیان نہیں کر سکتا۔ غرض انسان کو بیان کی قوت نہایت محدود دی گئی ہے ہاں جو چیز جسمانی ہو۔ لفظوں میں بھی آسکتی ہو، آواز کی گرفت میں بھی آسکتی ہو، اسے ہم بیان کر سکیں گے، جو نہ آواز کی گرفت میں آئے، نہ لفظوں کی گرفت میں آئے، اسے کیسے بیان کریں ___ ؟ سوائے اس کے کہ سکوت کر کے صاحب مقام پر محول کر دیں کہ جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔

عدم احصاء ثناء باری کی وجہ

اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہ' کی مدح و ثناء اتنی انتہاء کو پہنچائی کہ عالم میں اتنی مدح و ثناء کرنے والا کوئی نہیں۔ جتنی حمد و ثناء حق تعالیٰ شانہ کی آپؐ نے کی ہے اور تعریف و توصیف آپؐ نے بیان کی ہے کسی نے نہیں کی ___ لیکن اخیر میں فرماتے ہیں :

اللھم لااحصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

"اے اللہ! میں تیری ثناء و صفت کا احاطہ کر ہی نہیں کر سکتا۔ بس مختصر یہ کہ تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے کو فرمایا ہے"۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ ثناء و صفت مقامات کمال کی ہوتی ہے۔ اور کمالات الوہیت انبیاء علیہم السلام جتنے دیکھ سکتے ہیں۔ اتنی ثناء کر سکتے ہیں۔ باقی کمالات الوہیت لفظوں کی گرفت میں تھوڑا ہی آسکتے ہیں۔ جب بندوں کے مقامات بندوں کے قبضے میں نہیں آتے تو الوہیت کے مقامات کس طرح سے بندوں کے قبضے میں آجائیں گے' تو سوائے اس کے کہ سپر ڈال دی جائے اور عجز کا اقرار کیا جائے' کچھ نہیں ہو سکتا ؎

نہ ہر جا مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر بایدانداختن

ہر جگہ گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا۔ بہت سی جگہ آتی ہیں کہ لگام روک لینا پڑتا ہے اور آدمی سپر ڈال دیتا ہے کہ اس خاردار جنگل میں میں نہیں گھستا' گھوڑا وہیں دوڑے گا کہ زمین سیدھی ہو' گھاس بچھی ہوئی ہو۔ اور جہاں اونچ نیچ ہو' پہاڑ ہوں' گھاٹیاں ہوں اور نشیب و فراز ہوں وہاں گھوڑا بیچارہ کیا دوڑے گا' وہاں تو خیال بھی نہیں دوڑ سکتا چہ جائیکہ گھوڑا دوڑے۔

میری ایک لمبی چوڑی نظم تھی وہ تو یاد نہیں ہے۔ اس میں ایک شعر یاد ہے وہ حق تعالیٰ کی ثناء و صفت کے بارے میں ہے ؎

خدا کی ثناء کامل یہی ہے
کہ ہم سے کچھ ثناء ممکن نہیں

جو یوں کہدے کہ میں آپ کی تعریف کر ہی نہیں کر سکتا۔ اس نے تعریف کی۔ جو تعریف کرنے کا مدعی بن کے بیٹھے' ممکن نہیں کہ کر سکے۔ ترک دعویٰ کر دینا ہی تعریف ہے۔

تسلیم عجز ادائیگی شکر ہے

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ :

اِعۡمَلُوۡٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا۔

"اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو"۔

اور داؤد علیہ السلام کا وصف اور خلق شکر انبیا علیہم السلام سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام پر شکر کا غلبہ ہے۔ تو امر کیا گیا کہ شکر ادا کرو ___ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے امر اور حکم کو انبیاء علیہم السلام سے

زیادہ کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا وہی سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور کیا مقصد ہے۔

تو عرض کیا کہ اے اللہ! یہ تو میرا فرض ہے کہ میں شکر ادا کروں اور جب حکم ہے تب تو میں شکر ادا کروں گا ہی ___ مگر حیران یوں ہوں کہ کس طرح شکر ادا کروں، اس لئے کہ نعمتوں کے اوپر جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا، جب آپ توفیق دیں گے جبھی تو ادا کروں گا۔ اور توفیق دینا یہ خود ایک نعمت ہوگی، تو اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا تو اس کے توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ یہ ایک اور نعمت بن گئی۔ تو پہلے اس نعمت کا شکر ادا کروں گا بعد میں اس کا۔ اور جب اس کا ادا کرنے بیٹھوں گا اس کی توفیق بھی آپ دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت ہوگئی تو پہلے اس کا ___ اس طرح ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو شکر کی ابتداء ہی نہیں کر سکتا تو کس طرح سے شکر ادا کروں، بس میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔ میرے قبضہ قدرت میں آپ کا شکر ادا کرنا ہے ہی نہیں۔

حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا ___

"اے داؤد! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تم ادائے شکر سے عاجز ہو، تو یہ اقرار کر لینا ہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو شکر کا ادا کرنا یہی ہے کہ عجز تسلیم کرلے"۔

اس لئے کہ کوئی بھی بندہ کمالات الٰہیہ کا حق ادا نہیں کر سکتا، یہی کہے گا کہ اے اللہ! عاجز ہوں۔ تو عجز مان لینا یہی ادائے حق ہے۔ ورنہ اگر واقعی شکر کی ادائیگی لازم ہو تو حقوق تو لامتناہی ہیں اور بندہ متناہی اور محدود ہے یہ کیسے کرے گا؟ لامتناہی کا حق متناہی نہیں ادا کر سکتا ___ تو حق تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ لامحدود شکر کی ادائیگی یہ ہے کہ اپنا عجز مان لے کہ ہم عاجز ہیں ___ بس ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے شکر ادا کر دیا۔ یہی ثناء وصفت کا حال ہے۔ **لاحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔**

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ثناء کرنے والا عالم میں کوئی نہیں اور آپ سے زیادہ عارف باللہ کوئی نہیں کہ آپ معرفت کے اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ انبیاء اور ملائکہ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اخیر میں آکر آپ بھی یہ فرماتے ہیں کہ :

لاحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

یاجوج ماجوج میزان تحقیق پر

یہ امر حق ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا، یاجوج ماجوج ایک قوم ہے جو قرب قیامت میں نکلے گی۔ اور ان کے اوصاف بیان کئے کہ وہ پورے عالم پر چھا جائیں گے اور دریاؤں کا پانی پینے پر آئیں گے تو دریاؤں کو خشک کردیں گے لوگوں کے اموال پر اس درجے غاصب بنیں گے ساری اشیاء ان کے قبضے میں آجائیں گے، اس طرح کی علامتیں یاجوج موجوج کی بیان فرمائی گئی ہیں۔

لیکن زیادہ تفصیل نہیں فرمائی گئی کہ کون ہوں گے؟ اتنا معلوم تھا کہ وہ انسانوں میں سے ہی ہوں گے کوئی جنات میں سے نہیں ہیں۔

صحیح روایات اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو آیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک قوم ہے۔ جو قوی ہوگی پوری عالم پر چھا جائیگی۔ پورے عالم کے خزائن اور دفائن پر قبضہ کرلے گی۔ اور انسانوں کو عام طور سے قابو میں لے لے گی۔ چاہے ختم کردے، چاہے باقی رکھے۔ پورے عالم میں اس کا اقتدار پھیل جائے گا اور ساری زمین کے خزائن اور دفائن ان کے قبضے میں آجائیں گے۔ جسے چاہیں دیں۔ نہ چاہیں نہ دیں۔ تو روایات میں اس قسم کے احوال اور ان کی صفات آتی ہیں۔ اب آگے یہ کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے۔ یہ

سب اسرائیلی روایات ہیں مستند روایات نہیں ہیں۔

اقوام یورپ کو یاجوج ماجوج قرار دیا جاسکتا ہے۔؟

اب اس میں علماء کی بحثیں ہیں ___ بعض محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ یورپ کی اقوام کو "یاجوج ماجوج" قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جتنی علامتیں فرمائی گئی ہیں یہ سب ان کے اوپر منطبق ہوتی ہیں۔ پورے عالم اسلام پر ان کا تسلط بھی ہے پورے عالم کے خزائن اور دفائن بھی ان کے ہاتھ میں آگئے۔ دنیا کی ہر قوم گویا ان کے قابو میں ہے جسے چاہیں نیچا کے ختم کردیں۔ چاہیں آگے بڑھادیں۔ تو پورے عالم پر اس طرح سے ان کا اقتدار چھایا ہوا ہے۔

سد سکندری

اب آگے جو چیزیں آتی ہیں کہ وہ سد سکندری کے پیچھے ہیں ان کو وہ چاٹتے ہوں گے اور چاٹ چاٹ کر خستہ کردیتے ہیں اور قرب قیامت میں وہ انشاء اللہ کہہ کے بڑھیں گے تو وہ ختم ہوجائیگی اور وہ باہر نکل پڑیں گے۔

اس میں پھر تاویلیں کی گئی ہیں ___ اس کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ' ان کے اوپر ایک روک ڈالی گئی ہے۔ وہ قرب قیامت میں اٹھادی جائے گی یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دیوار مادی ہو۔ اور پہاڑوں کے اندر بنائی گئی ہو۔ بہرحال بعض حقیقت کے قائل ہیں کہ واقعے میں دیوار ہے اور قوم اس کے پیچھے ہے اور وہ اسے چاٹتی ہے۔ چاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے توڑنے پھوڑنے کی فکر میں ہے۔ مگر قابو نہیں ملتا۔ جب ان کے خروج کا وقت آئے گا تو مجانب اللہ قدرت دیدی جائے گی۔ توڑ کر نکل پڑیں گے۔

اور جو اس کے قائل ہیں کہ یہ موجودہ یورپ کی اقوام ہیں۔ یہی "یاجوج ماجوج" ہیں۔ وہ اس کی مجازات پر محمول کرتے ہیں۔ حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔

آیت قدرت

لیکن قرآن کریم اور احادیث کے الفاظ سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک حقیقت بن سکے' مجاز لینا یہ اصول کے خلاف ہے۔ اس میں کوئی عقلی اشکال نہیں ہے کہ کوئی قوم ہو اور وہ پہاڑوں کے آگے پیچھے بند ہو اور واقعے میں سد سکندری ہے۔ جس تک ابھی ہماری نگاہیں نہیں پہنچیں۔ اور وہ اس کو توڑنے پھوڑنے میں لگے ہوئے ہوں اور اخیر زمانہ ایسا آئے کہ وہ نکل پڑیں' اس لئے کہ قرآن وحدیث سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی قوم ہے۔ عام طور پر جیسے انسان ہوتے ہیں اس انداز کے نہیں ہیں۔ چاہے وہ بشری ہوں مگر غیر معمولی ہیں ___ اور ان کے اسباب و وسائل بھی کچھ غیر معمولی ہوں گے ___ اس کا ایک ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ ان اقوام کو نہ مانا جائے بلکہ وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو محبوس کرر کھا ہے وہ اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔ جیسے دجال کا ظاہر ہونا اس کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ قرب قیامت میں آگ کا ظاہر ہونا قدرت کی نشانی ہے۔ اسی طرح سے اس قوم کا ظاہر ہونا یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ مگر غیر معمولی چیز ہے ___ لیکن صحیح کیفیت کی تفاصیل زیادہ موجود نہیں ہیں بس قیامت کی علامات میں سے ہے جہاں اور غیر معمولی سینکڑوں چیزیں ظاہر ہوں گی ان میں ایک یہ بھی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ۔

ادھر سے ادھر ہر گھاٹی میں سے نکلتے ہوئے نظر آرہے ہوں گے۔ یورپ والوں کی یہ صورت تو نہیں ہے۔ ان کا تو ایک مستقل ملک ہے وہ آتے ہیں' جاتے ہیں مگر تجارت کی لائن سے دنیا پر قبضہ کرر کھا ہے۔

لیکن یہ کہ وہ ایک غیر معمولی انداز سے اس طرح سے خروج کریں کہ عالم میں ہر گھاٹی سے نکل کر ایک نئی قوم آرہی ہو یہ صورت نہیں ہے۔ بہر حال الفاظ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدرت کی غیر معمولی نشانی ہے جو قرب قیامت میں ظاہر ہوگی۔

اب اس غیر معمولی کو غیر معمولی سمجھ کر ایسے اوصاف بیان کرنا کہ وہ بالشت بھر کے ہوں گے یا ان کے کان لمبے ہوں گے۔ یہ سب اسرائیلیات ہیں۔

حضرت کشمیری کی رائے

ہمارے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کی رائے بھی کچھ اس طرف مائل تھی کہ شاید یہ قومیں مراد ہوں۔ قطعی طور پر تو نہیں فرماتے تھے مگر خیال ظاہر فرماتے تھے کہ شاید یہی مراد ہوں۔ کیونکہ بہت سی علامتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اقوام یورپ کے مورث اعلیٰ کا نام

اور کل ہی یہ ذکر ہو رہا تھا کہ انگلینڈ میں جو اسمبلی ہال ہے جو بہت پرانا اور قدیمی ہے اس کے دروازے پر پتھر سے کندہ ہے۔ یاگوگ ماگوگ۔ اس کو اگر معرب کیا جائے تو یاجوج ماجوج بنتا ہے۔ گویا وہ خود اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ ___ ہاشمی صاحب بیان کر رہے تھے کہ روس والے کہتے ہیں کہ ہمارا مورث اعلیٰ، جس کی ہم اولاد ہیں اس کا نام "ماگوگ" تھا ___ اس قسم کی علامتیں دیکھ کر بعض علماء کا رجحان اس طرف ہو گیا کہ شاید یہی یاجوج ماجوج ہوں۔

ظہور خاتم الدجالین کے آثار

آفتاب کے نمایاں ہونے سے بہت پہلے اس کے آثار نمایاں شروع ہونے لگتے ہیں۔ پھر پو پھٹی ہے ___ اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع سے پہلے قلوب کے اندر آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ تو جس طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار نمایاں ہوئے تاکہ صلاحیت اور استعداد ان کے دین کے قبول کرنے کی پیدا ہو ___ یہی صورت بعینہ دجال کی ہے کہ اس کے ظہور سے پہلے قلوب میں دجل وفساد، ڈپلومیسی، مکاری وعیاری اور دغابازی اس کے آثار اور صلاحتیں پیدا ہونی شروع ہوں گی ___ اس درجہ کو ہر انسان اپنی اپنی بساط کے مطابق محسوس کرے گا کہ قلب کے اندر کچھ ظلمت اور کدورت اور کچھ فریب ہے اور دنیا کے تمدن کی بنیاد بھی فریب اور دکھلاوے پر نمایاں ہونا شروع ہوگی۔ تو اس قسم کی چیزیں نمایاں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جب وہ ظہور کریگا اس وقت ہزاروں قلوب اس کو ماننے کے لئے مستعد ہوگے۔ سوائے اس کے جن کے قلوب کے اندر ایمانوں کی صلاحیت بہت اقویٰ ہے۔ وہ جھکیں گے لیکن عام طور سے اثر پیدا ہوگا ___ تو جس طرح سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل صلاح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے تو ضروری ہے کہ خاتم الدجالین سے پہلے قلوب دجل وفساد اور مکر وفریب کو قبول کریں گویا دنیا سے اخلاص مضمحل ہونے لگے اور مکر وفریب دنیا پر غالب آنے لگے یہاں تک کہ وہ ظاہر ہو جائے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے دجال کا تقابل

چونکہ خاتم النبیین کمالات سے بھرپور ہیں اور ختم کرنے والے یعنی سارے کمالات کے منتہیٰ ہیں ___ تو دجال سارے فسادات کا منتہیٰ ہوگا۔ اور اس درجہ کو کہ جیسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں

فرمایا گیا ہے کہ آپؐ کے بائیں مونڈھے کے قریب مہر نبوت تھی، جس پر یہ لکھا ہوا تھا جیسے کہ بعض روایات میں ہے۔ سر حیث شئت فانک منصور۔

''تم جہاں بھی جاؤ، نصرت خداوندی تمہارے ساتھ ہوگی''۔

بعض روایات میں ہے کہ لفظ خاتم الانبیاء یا محمد کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسا کچھ مترشح ہوتا ہے اس کی ہیئت احادیث میں آتی ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اس درجہ آپ کمالات نبوت سے بھرپور ہیں کہ وہ چھلک کے اوپر آگئے اور نمایاں ہوگئے، اسی طرح سے خاتم الدجالین دجل و فریب میں اتنا بھرپور ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا ک۔ف۔ر۔ یعنی کفر مجسم۔ تو علامت اوپر آجائے گی غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھیک تقابل ہے۔

تقابل اضداد کی حکمت

اس امت میں جس درجہ کمالات ظاہر ہوئے اسی درجہ فسادات کا ظاہر ہونا ضروری ہے ___ اول تو کمال سے فساد کا تقابل ہوتا ہے۔ ہر کمال کی خوبی تب کھلتی ہے جب اس کے مقابلے میں نقص آتا ہے۔ ایمان کی قوت تب کھلتی ہے۔ جب اس کے مقابلے میں کفر آجائے۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھوزاھق

ہم باطل کو ٹکرا دیتے ہیں حق سے اور جب وہ حق سے ٹکر کھا کر پاش پاش ہوتا ہے تو حق کی قوتیں نمایاں ہوتی ہیں ___ اگر باطل نہ رکھا جائے تو حق کی قوت نمایاں نہ ہو۔ تو اضداد رکھی گئیں۔

اس لئے انبیاء علیہم اسلام کے مقابلے میں دجال رکھے گئے جس درجے کا نبی اسی درجے کا دجال ___ بہر حال میری غرض یہ تھی کہ جیسے شیاطین کا مقابلہ ملائکہ سے ہے دجالوں کا مقابلہ انبیاء علیہم السلام سے ہے۔ انبیاء کے متبعین میں جو مقبول لوگ ہیں انہیں آئمہ ہدایت کہتے ہیں۔ ادھر کفر کے سلسلہ میں آئمۃ الکفر ہیں۔ تو آئمہ ہدایت کا آئمہ ضلالت سے مقابلہ ہے۔ اسی طرح اتقیاء کا مقابلہ فجار سے ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک تقابل چل رہا ہے ___ بہر حال انبیاءؑ سے دجالین کا مقابلہ ہے۔ اسی لئے خاتم النبینؐ سے خاتم الدجالین کا مقابلہ ہے۔

استدراج دجال

ظاہر بات ہے کہ جس پر دجال کے سارے مراتب ختم ہوں گے معمولی قسم کی روحانیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ___ بڑے بڑے اولیاء کاملین بھی اس کے مقابلے سے عاجز ہوں گے ___ اسی لئے حدیث میں حکم فرمایا گیا کہ دجال ظاہر ہو تو سیر و تماشے کے طور پر بھی اسے دیکھنے کے لئے مت نکلو۔ وہ ایمانوں کو اس طرح سلب کرے گا جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے۔ تو تماشہ دیکھنے کے لئے بھی مت جاؤ۔ بلکہ مقفل اور محبوس ہو جاؤ۔ اس کے سامنے مت جاؤ۔ گویا یہ اس کی علامت ہے کہ کوئی کتنا ہے بڑا صالح ہوگا، روحانیت والا ہوگا لیکن اس کا دجل اور فریب اور جو اس کے ہاتھ پر کرشمے استدراج کے طور پر ظاہر ہوں گے وہ اتنے بڑے ہوں گے کہ ولایت کام نہیں دے گی کوئی کتنا ہی بڑا ولی کامل ہو کہ اس کا مقابلہ کرے ___ جب تک نبوّت کی قوت مقابلہ پر نہ آئے۔ کیونکہ اصل دجال کا مقابلہ ہی نبوّت سے ہے۔

قتل دجال کی صورت

اب ایک صورت یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو آپؐ کو شکست دینی چاہیے۔ تب تو وہ قتل ہو۔ عام ولایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

غرض ایک صورت تو یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دجال کو ظاہر کر دیا جاتا، آپ اسے قتل کردیتے ___ وہ قتل تو ہو جاتا ___ لیکن اگر وہ اس زمانے میں ظاہر ہو کر قتل ہو جاتا تو اس کے دجل وفریب کے جو مراتب اور مقامات ہیں وہ نہ کھلتے کہ ان سے تقابل ہو کر ایمان کی قوتیں ظاہر ہوتیں۔ بلکہ وہ یکدم سامنے آتا اور ختم ہو گیا ہوتا ___ اور مقصد یہ تھا کہ دجال ظاہر ہو اور اس کے سبب باطل کی استعدادیں پیدا ہوں۔ اس باطل سے پھر حق کی قوتیں ٹکرائیں۔ اور حق کی قوت نمایاں اور واضح ہو، اگر اسوقت ظاہر ہوتا تو یہ تقابل ختم ہو جاتا بس وہ ہاتھ کے ہاتھ قتل ہو جاتا۔ اس لئے اس کا دور آخر دور میں رکھا گیا تاکہ اس کے قلب کے اثرات سے امت میں باطل بھی ظاہر ہوتا رہے۔ اسلام اس کا مقابلہ بھی کرتا ہے۔

اب دوسری صورت قتل کی یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک باقی رکھا جاتا کہ وہ ظاہر ہو اور آپؐ اسے قتل کردیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے فروتر بات ہے کہ محض قتل دجال کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم میں باقی رکھا جاتا ___ نیز یہ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھا جاتا تو دجل وفساد کے مراتب سامنے نہیں آسکتے تھے ___ نبوت کی قوتیں اتنی پھیلی ہوئی ہوتیں کہ دجل کچھ نہ کرسکے تو اسے بھی موقع دینا تھا تاکہ وہ نمایاں ہو اور پھر شکست کھلتے تاکہ دجل کا ضعف حق کے مقابلے میں واضح ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو قاتل دجال بنانے کی حکم

اب کئی چیزیں پیدا ہو گئیں۔ دجال کا قتل بغیر نبوت کی طاقت کے نہیں ہو سکتا۔ اور نبوت بھی معمولی نبوت نہیں بلکہ ختم نبوت کی قوت ہو جب وہ ختم ہو۔ ولایت کام نہیں دے سکے گی۔ اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا باقی رکھا جانا بھی مصلحت کے خلاف تھا کہ محض اس کے قتل کے لئے باقی رہیں۔

اب اس کے جمع کی صورت حق تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دجال کا قاتل قرار دیا۔ ان میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں متعدد مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں جو اور انبیاء علیہم السلام میں نہیں ہیں۔

وصف خاتمیت میں مماثلت

مثلاً پہلی بات یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور خاتمیت کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا ___ تو ایک گونہ خاتمیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی ہے کہ وہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل گویا جو سب سے بڑا دور جو نبوت کا ہے وہ اسرائیلی نبوت کا ہے۔ ہزارہا انبیاء اس کے اندر پیدا ہوئے اور فرمایا گیا وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔

ہم نے اس خاندان کو جہانوں پر برگزیدہ کیا۔

اور اس خاندان میں ہم نے نبوت بھی دی اور بادشاہت بھی دی :

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ

نبوت کی دولت دی، ملوکیت کی دولت دی اور وہ نعمتیں دیں، جو عالم میں ان سے پہلے کسی قوم کو نہیں دی گئیں، ایک عظیم انسانی خاندان جس میں ہزارہا انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ اس کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان پر آکر اسرائیلی نبوت منتہی ہو گئی۔ تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق نبوت کے خاتم ہیں۔ مسیح علیہ السلام خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ تو خاتمیت کے مقام میں ایک گونہ گویا مناسبت ہوئی

وصف رحمت میں مماثلت

پھر جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت مجسم فرمائی گئی :

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ۔

یہی رحمت مجسم حضرت مسیح علیہ السلام کی شان بتلائی گئی ہے۔ جہاں ان کے پیدائش کا ذکر ہے اس میں فرمایا گیا ہے : وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا۔

جب حضرت مریم علیہا السلام نے کہا کہ :

اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا۔

"میرے بیٹے کہاں سے ہو سکتا ہے۔ بشر نے مجھے چھوا نہیں، زانیہ وباغیہ میں نہیں ہوں"۔

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا۔ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔

یوں ہی ہوگا۔ اللہ کا حکم ہو چکا ہے۔ اور یہ اس لئے ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام کو ہم نے اپنی قدرت کی نشانی بنانا ہے بطور نشان قدرت کے ہم نمایاں کریں گے کہ بلا باپ کے بھی ہم پیدا کر سکتے ہیں۔ اور یہ امر طے شدہ ہے۔ ایسے ہی ہوگا۔

جو رحمت مجسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا۔ وہی رحمت مجسم ہونے کی شان مسیح علیہ السلام کی فرمائی گئی۔

تربیت اتباع میں مماثلت

جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی شان فرمائی گئی رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ خود ان صحابہؓ میں رحمت کا غلبہ ہے۔

وہی شان متبعین عیسیٰ السلام کے بارے میں فرمائی گئی۔ فرمایا گیا :

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً۔

"ان کے اتباع کرنے والوں کے قلوب میں ہم نے رأفت اور رحمت بھر دی"۔

اتباع عیسوی میں غضب کا غلبہ نہیں تھا بلکہ رحمت کا غلبہ تھا۔ تو جو غلبہ اصحاب محمدی میں فرمایا گیا وہی غلبہ اصحاب عیسوی کے اندر فرمایا گیا۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ تربیت کے اندر مشابہت ہے۔ جو شان تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے وہی شان تربیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ہے۔ جو شان رحمت آپؐ میں ہے۔ اسی کے قریب شان رحمت حضرت مسیح علیہ السلام میں ہے غرض یہ مناسبات ہیں۔

زہد وشوکت کی زندگی میں مماثلت

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوی مناسبت یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دو زندگیاں عطا کی گئیں۔ ایک مکی زندگی کہلاتی ہے۔ ایک مدنی زندگی کہلاتی ہے۔ مکہ کی زندگی تیرہ سالہ اور مدینہ کی زندگی دس سالہ ہے۔ اس طرح نبوت کے تئیس برس ہوتے ہیں۔ تو مکہ کی تیرہ سالہ زندگی انتہائی زہد اور قناعت کی ہے

جس میں تشدد کی اجازت نہیں۔ مار کھاؤ۔ سہو اور جواب نہ دو۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ۔

اے نبی درگزر اختیار کرو ___ کہیں فرمایا :

اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ۔

اگر یہ بک بک بھی کریں تو تم اعراض کرو۔ درگذر کرو۔ جاہلوں کی باتوں کی طرف دھیان مت کرو۔ اگر یہ تمسخر بھی کرتے ہیں تو انہیں ہم پر چھوڑ دیں۔ انہیں ہم نپٹ لیں گے۔ آپ انہیں جواب نہ دیں۔
کہیں فرمایا :

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا۔

اگر یہ ایذائیں پہنچائیں تو آپ تحمل کریں اور صبر جمیل اختیار کریں۔ کیا یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا انجام کچھ دور ہے۔ حالانکہ وہ بہت قریب آگیا ہے۔ عنقریب ان کو پتہ چل جائے گا کہ ان کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

غرض جگہ جگہ حکم ہے کہ نہ تلوار اٹھاؤ۔ نہ زبان کھولو' نہ ہاتھ ہلاؤ' ماریں تو مار کھاؤ' گالیاں دیں تو چپ ہو جاؤ۔

ہاں کیا کرو ___ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا

ان کے ساتھ جہاد کبیر کرتے رہو۔ اس کے راستے میں مار کھانی پڑے تو مار کھالو۔ پٹنا پڑے' پٹ لو ___ گویا تلوار کے جہاد کو جہاد صغیر کہا گیا۔ اور زبان سے اعلائے کلمہ اللہ کو کہا گیا کہ وہ جہاد کبیر ہے' وہ جہاد کرتے رہو' لیکن مار کھانے کے لئے تیار رہو' مقابلے میں اف نہ کرو۔ تیرہ سال اس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گذری۔

جب مظالم کی انتہاء ہوگئی کہ گالیاں بھی دی گئیں' ساحر بھی کہا گیا' کذاب و مجنون بھی کہا گیا اور اشر بھی کہا گیا' اونٹ کا اوجھ بھی ڈالدیا گیا' کانٹے راستے میں بچھائے گئے۔ کتے بھی پیچھے لگائے گئے' پتھر بھی مارے گئے اور اخیر میں وطن سے نکلنے پر مجبور کردیا ___ تو وطن سے بے وطن بھی کیا۔ جب ظلم کی انتہا ہوگئی تب یہ آیت نازل ہوئی : اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ۔

اب ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن کی مظلومیت کی حد آگئی ہے کہ اب وہ مقابلہ کریں اور جواب دیں ___ بہرحال دس سالہ زندگی شوکت کی زندگی ہے۔ اور تیرہ سالہ زندگی درویشی اور انتہائی فقر و قناعت کی زندگی ہے۔ تیرہ سالہ زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے ___ مدینے کی زندگی میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے لیکن شوکت کا پیش خیمہ یہی تیرہ سالہ زندگی بنی اس لئے اس تیرہ سالہ زندگی میں آپ نے اپنے اصحاب کی تربیت کی زہد' قناعت' صبر' حیاء' شجاعت' سخاوت بھردی تاکہ تیرہ برس کے بعد جب یہ مجاہد قوم نکلے تو حظ نفس کی وجہ سے جہاد نہ کرے' نفسانیت کی وجہ سے نہ کرے بلکہ خالص للہیت کے جذبہ سے میدان میں آئے۔

تو تیرہ برس تربیت کی تاکہ مخلص مجاہد پیدا ہو جائیں۔ اخیر میں جاکے انہوں نے تلوار اٹھائی اور قتال کیا ___ پھر فتح مکہ ہوئی' شوکت کا آغاز ہوا اور یہ سارے کام ہوئے۔ غرض یہ دو زندگیاں ___ اور یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ السلام میں پائی جاتی ہیں۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام کی چالیس سالہ زندگی ہے یعنی پیغمبری کی ابتداء۔ ان کی تاریخ یہ ہے کہ اگر تمہارے بائیں گال پر کوئی تھپڑ مارے۔ داہنا سامنے کردو' اف نہ کرو' جواب نہ دو' مسیح علیہ السلام کی شریعت میں انتقام لینا جائز نہیں ہے بلکہ عفو اور درگزر واجب ہے' غرض تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی مارے تو اور گردن جھکادو کہ بھئی! ایک اور مار تا جا' خدا تیرا بھلا کرے' یہ گویا مکہ کی زندگی کے مشابہہ ہے کہ جس کے اندر نہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت' نہ زبان کھولنے کی اجازت ___ لیکن جب مظلومیت

کی انتہاء ہوئی۔ یہود نے یہاں تک کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا دو ___ تب حق تعالیٰ شانہ نے دوسرا بندوبست کیا کہ جو پھانسی پر چڑھانے کے لئے اندر گھسا۔ اس پر عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈالدی اور وہ پھانسی پا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انتہائی عزت کے ساتھ اوپر اٹھالیا گیا ___ دنیا چاہتی تھی کہ انتہائی طور پر ذلیل کریں کہ اس دنیا کے اندر ان کا وجود نہ رہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنی عزت دیں گے کہ آسمانوں پر قیام کرائیں گے اور زندہ رہیں گے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے ہاتھ سے مارے جائیں گے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔

نفی کی گئی ہے کہ نہ انہیں پھانسی دی گئی ہے نہ انہیں قتل کیا گیا۔ جو قتل یا پھانسی کے مدعی ہیں وہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس شخص کے اوپر شبیہہ ڈالی گئی ہے جو لینے کے لئے اور پکڑنے کے لے گیا تھا۔ اس کو قتل کیا گیا ___ انہیں علم نہیں ہے۔ اور اخیر میں پھر مؤکد طریق سے کہا کہ انہیں قتل نہیں کیا گیا ___ تو جب قتل نہیں کیا اور پھر موت کے سامان نہیں ہوئے تو رفع کا مطلب یہی ہے کہ جسم کے ساتھ انہیں اٹھایا گیا اگر قتل کردیئے جاتے اور پھانسی دے دیئے جاتے۔ پھر روح محض کا رفع ہوتا۔ لیکن قتل اور پھانسی کی نفی کرکے فرمایا گیا کہ اللہ نے انہیں اٹھالیا تو وہ اٹھانا زندگی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور جسم کے ساتھ ہوسکتا ہے اس کا حاصل یہ کہ جیسے مظلومیت کی انتہاء پر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ہجرت کرو اور وطن چھوڑو ___ عیسیٰ علیہ السلام کو مظلومیت کی انتہاء پر حکم دیا گیا کہ زمین سے آسمان کی طرف ہجرت کرو' اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم چاہتی تھی کہ یہ اس مکہ شہر میں نہ رہیں۔ تو ملک میں ہجرت کرائی گئی۔ یہود چاہتے تھے کہ اس دنیا میں نہ رہیں۔ اس واسطے آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی گئی۔ تو ایک جگہ ہجرت یثرب کی واقع ہوئی ہے اور ایک جگہ آسمان کی واقع ہوئی۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد لوٹایا گیا اور دس سالہ شوکت کی زندگی ہے کہ اس میں تلوار ہاتھ میں ہے اور فاسقین ومنافقین اور فاجرین کے مقابلے پر تلوار بھی ہے حدود بھی ہیں اور قصاص بھی ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ لائیں گے تاکہ اس زہد کی زندگی کے مقابلے پر اب ان کے ہاتھ میں تلوار بھی ہوگی دجال کا مقابلہ بھی ہوگا۔ دجال کے متبعین کے مقابلے میں تلوار لئے ہوئے ہوں گے قتل وقتال بھی ہوگا۔ جہاد میں بھی کھڑے ہوں گے اور استیصال کریں گے۔ جیسا کہ مشرکین مکہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جزیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے یا اسلام تھا یا قتل تھا ___ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے۔ اس وقت دنیا کے قوموں کے لئے یا اسلام ہوگا یا قتل ہوگا۔ جزیہ کا واسطہ بیچ میں نہیں ہوگا۔ جزیہ منسوخ کردیا جائے گا ___ تو ٹھیک مشابہت اور مناسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے۔ شان رحمت میں بھی' وصف خاتمیت میں بھی اتباع اور متبعین کی شان رحمت کے اندر بھی' ہجرت کے اندر بھی' دونوں زندگیوں کے اندر بھی۔ ابتدائی زندگی عدم تشدد کی ___ انتہائی زندگی تشدد کی' ان سب چیزوں میں مشابہت تامہ آپ کو حاصل ہے۔

ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں شبیہ محمدی کا دخل

اور اس میں لطیفے کے طور پر ایک چیز اور بھی ہے وہ یہ کہ شیخ عبدالغنی نابلسیؒ نے بعض تابعینؒ کا ایک اثر نقل کیا ہے۔ وہ اس درجے میں تو نہیں ہے کہ اسے بہت بڑی حجت شرعیہ سمجھا جائے ایک تو اثر ہے۔ اور وہ

بھی تابعینؒ کا۔ مگر لطیفے کے درجے میں اور مؤیدات کے درجے میں اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں جس کا واقعہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام ظاہر ہوئے :

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔

ایک بشر تام الخلقت و کامل الخلقت نوجوان جس کے کسی جوڑ و بند میں فرق نہیں تھا نہایت حسین و جمیل صورت کا انسان نمایاں ہوا۔ جس کو دیکھ حضرت مریم علیہا اسلام گھبرا گئیں۔ اور فرمایا :

اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔

"اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو متقی آدمی ہے"۔

تو کہاں ایک نوجوان عورت کے پاس تخلیہ میں آیا ___ ؟

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ۔ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۔

"گھبرانے کی بات نہیں، میں تیرے پروردگار کا رسول اور قاصد بن کے آیا ہوں تاکہ تجھے ایک بیٹا عطا کردوں"۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا۔

میرے بیٹا کدھر سے ہوجائے گا، بشر نے آج تک مجھے چھوا تک نہیں۔ بقول شخصے کسی مرد کی آج تک صورت تک میں نے نہیں دیکھی۔ اور ویسے بھی اپنی ذات سے میں کوئی بغیا اور زانیہ نہیں۔ عفیفہ اور پاکدامن ہوں۔ کبھی کوئی ایک چیز عفت کے خلاف مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ غرض اپنی ذات سے پاک دامن ___ اور مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ زنا کا احتمال تک نہیں، پھر کیسے بیٹے آجائے گا؟ گویا عادت عامہ کے اعتبار سے حضرت مریم علیہا السلام نے ظاہر کیا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آنے والے تھے۔ وہ خرق عادت کے طور پر تھے۔ عادت کے طور پر نہیں تھے۔

تو جبریل علیہ السلام نے کہا :

قَالَ كَذٰلِكِ۔ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔

"یوں ہی ہوگا اور تیرے رب پر آسان ہے"۔

جو نر اور مادہ کو ملا کر اولاد دے سکتا ہے وہ فقط مادہ سے بھی دے سکتا ہے وہ فقط نر سے بھی پیدا کرسکتا ہے۔ دونوں نہ ہوں، ہوا سے پیدا کردے۔ اب میں کہتا ہوں کہ یہ ہزاروں جاندار بھنڈے اور مچھر پسو ہیں وہاں نر اور مادہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ ہوا سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو پروردگار بلا نر و مادہ کے جاندار پیدا کرسکتا ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام کو بلا ماں باپ کے پیدا کرسکتا ہے۔ جو حضرت حوا علیہا السلام کو بلا واسط عورت پیدا کرسکتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلا باپ کے کیوں پیدا نہیں کرسکتا؟ ___ چونکہ خرق عادت کے طور پر پیدا کرنا تھا۔ مگر حضرت مریم علیہا السلام کو عادت کے طور پر اشکال تھا اس کو دفع کردیا کہ :

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔

"تیرے رب پر یہ آسان ہے۔ اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں۔ غرض انہوں نے پھونک ماری اور وہ حاملہ ہوگئیں"۔

اس پر شیخ عبدالغنی نابلسیؒ لکھتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جو بشر سوی یعنی کامل الخلقت بشر کی صورت میں

ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے بارے میں بعض تابعین کا اثر نقل کیا کہ وہ شبیہہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، یعنی صورت محمدی بن کر نمایاں ہوئے ___ تو حقیقت جبریلی تھی اور صورت محمدی تھی۔ نفخہ تو جبریلی ہوا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہوا ___ اس کا حاصل یہ نکلا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں شبیہہ محمدی کو کچھ دخل ہے اور کچھ مناسبت ضرور حاصل ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے اوصاف میں مناسبت ہے۔ وصف خاتمیت میں بھی، وصف رحمت میں بھی۔ اتباع کی شان تربیت میں بھی۔ اور زندگیوں کے ادوار میں بھی۔ یہ اس شبیہہ مبارک کا اثر ہے کہ ساری مناسبتیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔

زوجیت حضرت مریم علیہا السلام

اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حضرت مریم علیہا السلام بطور زوجہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جائیں گی ___ یہ روایات میں موجود ہے ___ اس سے گویا مناسبت نکلتی ہے کہ شبیہہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت مریمؑ مثل زوجہ کی تھیں۔ اب اس شبیہہ کے ساتھ میں وہ حقیقت اور وہ ذات بھی پیش کردی گئی کہ اب وہ اس کے لئے زوجہ بنے ___ بہرحال یہ چیزیں لطیفے کے طور پر عرض کررہا ہوں ___ یہ تو حجت ہے کہ آپؐ کو زوجہ بنا کر دی جائیں گی ___ لیکن یہ جو اثر میں نے نقل کیا ہے یہ اتنی قوی حجت نہیں، مگر لطائف اور مویدات کے درجے میں پیش کیا جاسکتا ہے ___ بہرحال اتنی مناسبتیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام تجدید

جب اتنی مناسبتیں ہیں اور وصف خاتمیت میں بھی مناسبت ہے تو قتل دجال کے لے زیادہ مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جب کہ وہ بمنزلہ بیٹے کے بھی ہوئے۔ تو باپ کے دین اور مشن پر جب آفت آئے تو بیٹا ہی زیادہ احق ہوتا ہے کہ باپ کی طرف سے مدافعت کرے اور باپ کی طرف سے حمایت کرے۔

یہ دجال گویا دین محمدیؐ کے اوپر آفت لائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ مستحق تھے کہ دین کی حمایت کے لئے بطور مجدد کے بڑھیں اور قتل کریں اور دین محمدیؐ کو دنیا کے اندر برپا کریں ___ چنانچہ اسے قتل کریں گے۔

غلبۂ اسلام

اور حدیث میں ہے دجال کے ساتھ کثرت سے یہود ہوں گے۔ جن کے اندر تھوڑی بہت سعادت ہوگی وہ حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ایمان قبول کریں گے۔ اس لئے کہ مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ تبرکات نکالیں گے جو "تابوت سکینہ" میں ہیں۔ اور تابوت سکینہ کی روایات میں ذکر آتا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پگڑی ہوگی۔ اور "الواح تورات" ہوں گی۔ یہ تابوت جو دفن کیا تھا اس کا پتہ نہیں ہے۔ لیکن حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منکشف ہوگا، اس میں سے وہ چیزیں دکھلائیں گے ___ تو جس جس یہودی کے اندر ذرا بھی سعادت ہوگی وہ ایمان قبول کرے گا۔ اور جس نصرانی میں سعادت ہوگی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کرے گا۔

تو دنیا میں تین ہی قومیں بڑی ہیں۔ ایک مسلمان، ایک یہود، اور ایک نصاریٰ ___ یہی عظیم قومیں ہیں جو مستند ہیں۔ یہود کا وجود اس طرح ختم ہو جائے گا کہ جن میں سعادت ہے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوں گے۔ جن میں نہیں ہے وہ دجال کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور مقتول ہو جائیں گے۔ ایک قوم ختم ہوگئی۔

نصاریٰ کے بارے میں ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوپر ایمان لے آئیں گے۔ یہ قوم یوں ختم

ہوئی۔ اب ایک ہی قوم مسلم رہ جاتی ہے۔

فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا ___ پورے عالم میں ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب اور ایک ہی پلیٹ فارم ہو گا۔ اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نقطۂ نظر ہو جائے گا ___

غرض جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دس سالہ شوکت قائم ہوئی اور حجاز کے بارے میں فرمایا گیا۔

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔

"فوج در فوج اسلام میں داخل ہو جائیں گے"۔

تو مسیح علیہ السلام کے سامنے پوری دنیا کے انسانوں کا بھی یہی نقشہ ہو گا۔ کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔

مراتب تکمیل دین کی صورتیں

فرق کیا ہو گا ___ ؟

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ___ دین کو کامل کر دیا گیا۔ تو تکمیل دین کی دو صورتیں ہیں ایک کیفی طور پر ایک اور کمی طور پر ___ ایک تو کیفیت کے لحاظ سے اتنا مکمل ہو کہ ہر ہر فرد دین کا ایسا مجسمہ بن جائے کہ گویا اسلام مجسم ہے۔ یہ تو کیفیت کے لحاظ سے ہے ___ اور کمیت و تعداد کے لحاظ سے اسلام کی تکمیل کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہے۔ ساری تعداد مسلمانوں ہی کی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ عدد کے لحاظ سے اب مکمل ہوا اور کیفیت کے لحاظ سے یوں تکمیل ہے کہ چاہے آدمی تھوڑے ہوں مگر ہر ایک اسلام مجسم ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اسلام کی کیفی تکمیل کی ___ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب قریب ایسے صحابہؓ پیدا کئے جو آپؐ کی ذات کے نمونے تھے۔ اور ایک ایک فرد اسلام مجسم تھا ___ اس لئے امت کا اجماع ہے کہ نیت، عدل، کمالات و اخلاق اور علم و معرفت کے لحاظ سے۔

الصحابة كلهم عدول۔

"ان سے زیادہ متقی اور پارسا دنیا میں نہیں ہے"۔

امت میں بڑے بڑے غوث پیدا ہو جائیں۔ صحابیتؓ کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ براہ راست آفتاب نبوتؐ نے ان کی تربیت کی ہے۔ اور بلاواسطہ آفتاب نبوت کا نور ان کے قلب پر پڑا ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تکمیل کیفیت کے لحاظ سے کی۔ تعداد تو تھوڑی تھی کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب نفوس قدسیہ نمایاں ہوئے۔ مگر ایک ایک فرد ایک ایک امت کے برابر تھا ___ لیکن کمی تکمیل باقی تھی کہ عددی طور پر اسلام اتنا پھیلے کہ دنیا غیر مسلم کا وجود باقی نہ رہے۔ یہ تکمیل آخری مجدد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہو گی۔

فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

ہر قوم ختم ہو کر ایک قوم رہ جائے گی۔ اور وہ اسلامی قوم ہو گی۔ تو پورے عالم میں دین واحد پھیل جائے گی۔

اسلام کا غلبۂ تام

اس لئے دعویٰ فرمایا گیا ہے :

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔

اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجا اور ہدایت بھیجی تاکہ تمام ادیان پر اس دین کو غالب کردے۔ اور غلبۂ تام کا حاصل یہ ہوتا ہے۔ مغلوب چیز کالعدم اور صفر کے درجے میں ہوجائے غالب ہی کا وجود رہ جائے۔ تو ایک ہی دن غالب آجائے گا جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہوگا اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گونا گوں مشابہتیں اور مناسبتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہیں۔ اوصاف میں بھی' افعال میں بھی۔ وجود میں بھی' ذات میں بھی۔

اور سب سے زیادہ زمانے کے لحاظ سے اقرب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں۔ کیونکہ آپ کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں کوئی نبوّت نہیں آئی۔ تو عہد کے لحاظ سے اشبہ ترین بھی وہی ہیں۔ تو وہ زیادہ احق تھے کہ دین محمدیؐ کی خدمت اور مدافعت کریں اور اس دجال اعظم کو قتل کریں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قتل نہیں کرایا گیا بلکہ آپؐ کے شبیہہ کے ہاتھ سے قتل کرایا گیا۔ جس میں وہی طاقت رکھی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کی حکمتیں

اور اس کے ساتھ میں ایک فائدہ اور مصلحت یہ بھی حاصل ہوئی کہ یہ جو آپؐ نے فرمایا :

لو کان موسی حیا لما وسعہ الا اتباعی۔

اگر آج کے دور میں موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو میرے اتباع کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میرے ہی دین میں داخل ہو کر رہنا پڑتا۔ تو حق تعالیٰ نے اس کو عملی طور پر نمایاں کردیا کہ جس قوم کی ابتداء موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی ہے اس کا نچوڑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کو امتی بنا کر لایا گیا تاکہ کل اسرائیلی پیغمبر امتی شمار کئے جائیں۔ خاتم سے جو چیز سرزد ہوتی ہے وہ پورے دائرے کی شمار کی جاتی ہے۔ تو یہ بھی اس سے نمایاں ہوگیا

غرض خاتم الدجالین کا ظہور خاتم النبیین ہی کے دور میں ہونا چاہئے تھا۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کے دور میں نہیں ہونا چاہئے تھا ___ اس کا حقیقی تقابل آپؐ سے ہے۔ ولایت کی روحانیت اس کے مقابلے کے لئے کافی نہیں ہے نبوّتؐ کی روحانیت ضروری تھی۔ اور اس میں بھی ختم نبوت کی کچھ نہ کچھ شان موجود ہو تاکہ وہ خاتم الانبیاء کی طرف سے قاتل بنے۔ اس واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع کیا گیا۔

اور اس لئے بھی رفع کیا گیا کہ یہود نے انتہائی تذلیل کا ارادہ کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انتہائی اعزاز دیا۔ تم ان کو زمین میں بھی رکھنا نہیں چاہتے' ہم ان کو آسمانوں میں محفوظ رکھیں گے۔ تم ان کی موت چاہتے ہو۔ ہم زندگی کے ساتھ آسمانوں میں باقی رکھیں گے۔

اب آگے روایتی مسئلہ ہے تو احادیث ان مضامین سے بھری پڑی ہیں۔ یہ چیزیں لطائف اور اسرار کے درجے میں ہیں کہ اگر کوئی یوں پوچھے کہ مصلحت آخر کیا تھی؟ تو یہ مصالح تھیں ___ لیکن معاملے کی بنا مصالح کے اوپر نہیں ہے۔ بنا تو روایت کے اوپر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو' حکم اپنی جگہ حق ہے۔

اسلام کی شان خاتمیت

لیکن یہ اسلام کی ایک خاتمیت کی شان ہے کہ جو حکم آیا اس میں حکمت ضرور ہے جو کوئی امر آیا اس میں کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے۔ جو ہدایت دی گئی اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔

عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَاوَمَنِ اتَّبَعَنِیْ۔ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَا اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

جس کو آپؐ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے صحابہؓ معاذاللہ معاذاللہ صماو عمیانا' اندھے بہروں کی طرح سے نہیں گرتے بلکہ حجت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ دین میں بصیرت ہے۔ دین اسلام رسوم کا مجموعہ نہیں ہے کہ چند رواج جمع ہوگئے جن کی نہ مصلحت معلوم نہ کچھ اور۔ باپ دادا سے سنتے آئے بس عمل کرلیا۔

جیسا کہ دوسرے مذاہب میں رسوم غالب ہیں۔ ان رسوم کی مصلحت پوچھی جائی تو جواب یہ ہوتا ہے کہ :

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآئَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ۔

باپ دادوں کو اسی طرح سے کرتے ہوئے دیکھتے چلے آئے ہیں ___ کوئی علت یا کوئی حکمت جو منجانب اللہ نازل کی گئی ہو۔ نہیں ہے ___ تو اسلام ایسی چیز نہیں ہے۔ اس میں جو حکم بھی ہے اس میں حکمت ہوگی ___ جو امر ہے اس میں کوئی نہ کوئی علت ہوگی۔ جو ہدایت ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ تو مصالح اس طرح سے عارفین نے بیان کی ہیں۔ حکم کی بنا مصالح پر نہیں ہے ___ اگر ایک بھی مصلحت ہمیں معلوم نہ ہو ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ جو اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا۔ اس سے ایک طمانینت حاصل ہوجاتی ہے جب مصلحت حاصل ہوجاتی ہے۔ کہ چلو مصلحت بھی سامنے آگئی ___ لیکن نفس ایمان مصالح کے اوپر موقوف نہیں۔

تعوّذ دجّال کی دعاء کی حکمت

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی دجال پیدا ہوجاتا تو اس کا فتنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر معاذاللہ کارگر تھوڑا ہی ہوسکتا تھا ___ اس دعاء میں دجال کے پیدا ہونے یا نہ ہونے کا ذکر نہیں۔ جس میں دجال سے پناہ مانگی گئی ہے ___

اللھم انی اعوذ بک من فتنۃ المسیح الدجال۔

"اے اللہ! میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتا ہوں"۔

اس میں امت کی تعلیم مقصود ہے۔ یعنی جن لوگوں کو دجال سے سابقہ پڑے گا ان کا فرض ہے کہ وہ یہ دعاء مانگیں ___ یا جیسے فرمایا گیا جو شخص سورۃ کہف کثرت سے تلاوت کرے گا بالخصوص جمعہ کے دن تو فتنہ دجال سے محفوظ رہے گا۔

دوسرے یہ کہ ایک دجال ذات ہے اور ایک دجالیت ہے اور اس کے اوصاف اور اس کا فتنہ ___ اوصاف اور فتنہ اس کے ظہور پر موقوف نہیں' اس کی آمد کے قرب میں دجل و فساد کے آثار شروع ہوجائیں گے۔ وہ اس کے ظہور کا اثر ہوگا۔ جیسے آفتاب کا اثر دو گھنٹے پہلے کچھ نہ کچھ سفیدی اور کچھ چاندنا شروع ہوجاتا ہے۔ یا جیسے حدیث میں فرمایا گیا :

اذا اراد اللّٰہ شیاھیاٰلہ اسبابہ۔

جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب کا ایک سلسلہ بچھاتا ہے کہ تدریجا رفتہ رفتہ ایک مدت میں جاکے وہ چیز ظہور کرتی ہے مگر پہلے سے اسباب بچھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ تو دجال کے ظہور سے پہلے اسباب مہیا ہوں گے۔ قلوب میں اس کی باتیں قبول کرنے کی استعدادیں پیدا ہوں گی تو دجل اور فسادات اس کے آثار میں سے ہیں۔ باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دعاء مانگنا تاسی کے لئے ہے تاکہ امت کو اسوہ معلوم ہوجائے کہ یہ دعاء کرنی چاہئے۔

عبدیت عیسوی علیہ السلام

احادیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسجد اقصیٰ کی چھت کے اوپر ملائکہ کے کندھوں کے اوپر ہاتھ ٹیک کر آئیں گے ___ اور لباس یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اوپر دو چادریں ہوں گی۔ ایک زرد اور ایک گیرو رنگ کی۔ گویا جو زہد و قناعت کا مظاہرہ ہے اسی رنگ کا لباس ہوگا۔ اور آکر فرمائیں گے کہ سیڑھی لگاؤ۔ گویا جو اور فضا میں تو بواسطہ ملائکہ آئے۔ یعنی باطنی اسباب کے تحت۔ اور جب چھت کے اوپر آکر ٹک گئے۔ اب مادی دنیا کا معاملہ شروع ہو گیا۔ تو اب مادی اسباب کی طلب ہوئی کہ سیڑھی لگاؤ کہ میں اتروں۔ ورنہ ملائکہ کے واسطہ ہی سے نیچے اتر سکتے تھے لیکن ملائکہ نے جو اور فضا تک پہنچایا جہاں اسباب نہیں پہنچتے۔ اور جہاں سے اسباب شروع ہوئے وہاں سے اسباب اختیار کئے' کیونکہ عبدیت کا ظہور اسی میں ہوتا ہے کہ اسباب کو قطع نہ کیا جائے' بلکہ اختیار کیا جائے ___ جب آئیں گے تو نماز کا وقت ہوگا اور حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تواضع کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیں۔ فرمائیں گے۔ نہیں۔ یہ امت اللہ کے ہاں بڑی معظم ہے :

وامامکم منکم۔

تمہارے امام تمہارے ہی اندر سے ہوں گے۔ آپ ہی احق ہیں کہ نماز پڑھائیں چنانچہ حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھائیں گے۔ بہرحال یہ سارے واقعات تفصیل سے آتے ہیں۔

مدفن حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبر مبارک کے درمیان میں جگہ خالی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں دفن ہوں گے۔ اولاد بھی ہوگی۔ اس واسطے کہ جب آسمان پہ گئے ہیں جب تک تو نکاح نہیں ہوا تھا۔ آئیں گے تو نکاح بھی ہوگا' اولاد بھی ہوگی۔ پھر وفات ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن ہوں گے۔

یہ تمثیلی طور پر ایسا ہے جیسے کسی کی اولاد کوئی عظیم کارنامہ کرکے باپ کے اوپر سے آفت کو ٹلائے اور فاتح بن کے آئے کہ میں نے آپ کے مشن کو بالکل محفوظ کردیا تو باپ شاباشی کے طور پر بغل میں لے لے کہ میرے قریب آجا ___ دجال کو قتل کیا' عالم میں دین پھیلایا ___ فرمایا گیا کہ اب میرے پہلو میں آجاؤ جو تمہارا حق ہے۔

علامات ظہور مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جیسی تفصیل حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے ویسی ہے ظہور مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بھی ہے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں وہ ساری حدیثیں جس میں بعض صحیح ہیں' بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف ہیں ___ مگر ساری قابل احتجاج ہیں۔ وہ سب نقل کردی ہیں۔ اس میں تمام علامات ذکر کی ہیں۔ حضرت امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسب نامہ ان کا حلیہ اور ان کے ظہور کے نوعیت پھر علامات قریبہ اور علامات بعیدہ بھی بیان کی ہیں۔ بعضی وہ علامات ہوں گی جو

بالکل ظہور کے قریب میں آئیں گی۔

قریب ترین علامت مثلاً یہ فرمائی گئی کہ حجاز کے اندر سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا' تو سونے کی کان تو حجاز میں نمایاں ہو چکی ہے ___ یہ بھی فرمایا گیا زمین اپنے خزائن اور دفائن اگلنا شروع کر دے گی' تو آج کوئی حجاز کو جا کر دیکھے تو وہاں پانی بھی ہے' سبزی بھی اگ رہی ہے۔ اسی طرح معدنیات کے بھی آثار ہیں وہ بھی نکل رہے ہیں ___ واقعہ یہ ہے کہ سرزمین حجاز نے سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا کے ملکوں کے پاس آج اتنی دولت نہیں جتنی عربوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کر دے رہے ہیں ___ یہ علامتیں ہیں۔

منیٰ میں جنگ عظیم

مگر قریبی علامت یہ فرمائی گئی کہ جس سال ظہور ہوگا وہ مکہ میں ہوگا اس سال منیٰ میں حجاج میں باہم جنگ عظیم ہوگی اور اتنا قتل و قتال ہوگا کہ جمرۂ عقبہ خون سے بھر جائے گا اور ہزاروں انسان آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ عدد بھی مذکور ہے کہ ۳۱۳ آدمی باقی بچیں گے۔ باقی سب قتل ہو جائیں گے۔ اب انہیں فکر پڑے گی کہ کوئی تو ہمارا سرگروہ ہو ورنہ ہماری زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اب ہم کہاں جائیں؟ ___ پھر وہ مکہ مکرمہ میں آئیں گے۔ اور وہ اس علامت کو پہچانتے ہوں گے کہ منیٰ میں قتل ہونا اور جمرہ عقبہ کا خون سے بھرنا یہی ظہور مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی علامت ہے۔ تو انہیں یقین ہوگا کہ مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظاہر ہوں گے اور وہ مکے میں ہوں گے۔ تو حدیث میں ہے کہ وہ حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف رجوع کریں گے۔ تو مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے چھپ کر مدینے کا راستہ لیں گے یہ لوگ وہاں پہنچیں گے پھر وہ چھپ کر مکے میں آئیں گے۔ پھر مطاف کے اندر نہیں پکڑیں گے۔ وہ فرمائیں گے کہ میں ایسی قوم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا جو اس درجہ آپس میں خونریزی کرے ___ تم لوگوں کا کیا اعتبار ہے ___ یہ انہیں بھی دھمکی دینا شروع کریں گے۔ پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوگی ___ اسی کے بارے میں وہ روایت ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ ایک آواز بھی غیب سے ظاہر ہوگی کہ :

هذا خليفة الله المهدي۔ فاسمعوا له واطيعوه۔

"یہ خلیفۃ اللہ مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں ان کی سمع وطاعت کرو ___"۔

شام کی جنگ عظیم

جب وہ ان سے بیعت لے لیں گے پھر یہ آواز پھیلے گی اور شہرہ ہوگا تو پھر نجائب عراق ابدال شام اور اقطاب ہند تمام طرف سے جو مسلمان منتشر ہوں گے اور انتہائی کمزوری کی حالت میں ہوں گے' وہ سب سیاہ جھنڈوں کے نیچے خراسان کی طرف سے شام کی طرف بڑھیں گے تاکہ مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر میں داخل ہوں گے ___ اور حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کو اپنا مرکز بنائیں گے اور شام ہی میں وہ ملحمۂ کبریٰ اور جنگ عظیم نمایاں ہوگی جس کے بارے میں احادیث میں فرمایا گیا کہ اتنا لمبا چوڑا محاذ ہوگا کہ کوا جو سب سے زیادہ اڑتا ہے یہ دن بھر اڑے گا اور لاشیں ہی لاشیں اس کے نیچے ہوں گی۔ یہ دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ اتنا لمبا محاذ ہوگا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جنگ محض تیر و تفنگ کی جنگ نہ ہوگی۔ ہزاروں میل کا لمبا محاذ جنگ

جبھی ہو سکتا ہے جب مشین ہو' ورنہ اگر ایک میدان میں جنگ ہو جائے چاہے دولاکھ آدمیوں کی ہو۔ وہ میل دو میل یا دس میل میں ہو گی لیکن ہزاروں میل مقتولین کی تعداد ہو جائے اور پھیلے ہوئے پڑے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی عظیم الشان اور لمبا چوڑا محاذ ہو گا۔

مغرب کی طاقتوں کی شکست

وہ ملحمہ کبریٰ جس کے بارے میں علماء لکھتے ہیں۔ کہ مغرب کی طاقتیں ان کے ہاتھ پر ٹوٹیں گی۔ اور پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہو گا اور دین واحد ہو جائے گا۔

اس وقت سب سے زیادہ طاقت نصاریٰ کی ہو گی۔ پورے عالم پر انہیں کا غلبہ ہو گا۔ یہ طاقت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ٹوٹے گی۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دوامی مقابلہ اگر کسی قوم سے ہے تو وہ عیسائی قوم ہے۔

مشرکین سے اسلام کا مقابلہ

اس لئے کہ سب سے پہلے اسلام کو مشرکین عرب سے مقابلہ پڑا' لیکن وہ ختم ہو گیا اس واسطے کہ جب فتح مکہ ہوئی یا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے یا قتل ہوئے یا جلاوطن ہو گئے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ آج شیطان مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں اب اس کی پوجا کی جائے۔ یعنی اب دوسرا دین نہیں آئے گا مگر مسلمانوں میں آپس میں تفریق اور گروہ بندیاں ہوں گی ___ مگر یہ کوئی دوسرا دین اسلام کے مدمقابل آجائے یہ نہیں ہو گا ___ گویا مشرکین سے حجاز میں دوامی طور پر مقابلہ ختم ہو گیا۔

مجوس سے اسلام کا مقابلہ

دوسرا مقابلہ مجوس سے پڑا ان کی بڑی عظیم شوکت تھی' کسریٰ کی سلطنت تھی اور پورا ایران اور خراسان گویا ان کے ہاتھ میں تھا۔ تو حدیث میں ہے کہ آپؐ نے کسریٰ کے نام فرمان لکھ کر بھیجا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔ اس نے آپؐ کے نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور چاک کر کے پھینک دیا۔ جب آپؐ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا ___

"جس طرح میرا فرمان ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے خدا اس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے کرے"۔

یہ پیشین گوئی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں پوری ہوئی ___ اور وہ یہ ہوا کہ کسریٰ پرویز جو ایران کا بادشاہ تھا وہ اپنے دوائی خانے میں قوت باہ کی دوا کھانے لئے گھسا ___ مگر غلطی سے وہ معجون کھا گیا جو سمی تھا اور وہیں ختم ہو گیا ___ اس کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے حکومت کا دعویٰ کیا' سرداروں نے الگ حکومت کا دعویٰ کیا' بھائی بھتیجوں نے الگ دعویٰ کیا ___ پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ___ یہ پیشین گوئی فرمائی گئی تھی اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں پورا ایران اور خراسان فتح ہو گیا۔ اس طرح مجوس سے مقابلہ دوامی نہ رہا اور ختم ہو گیا۔

یہود سے اسلام کا مقابلہ

تیسرا مقابلہ حجاز میں یہود سے مدینے اور خیبر وغیرہ میں ہوا۔ یہاں یہ لوگ آباد تھے اور دو ان کے بڑے عظیم قبیلے بنو قریظہ اور بنو نظیر تھے ___ جب انہوں نے پے در پے غدر کیا اور معاہدہ شکنی کی۔ تو آخیر میں یہ ہوا کہ بنو قریظہ قتل ہو گئے اور بنو نظیر جلاوطن کر دیئے گئے جو مختلف بلاد میں جا کر آباد ہوئے۔ تو حجاز میں یہود سے بھی مقابلہ ابدی طور پر ختم ہو گیا۔

عیسائیوں سے دوامی مقابلہ اور اس کا انجام

اب رہ گئے نصاریٰ ___ ان کی روم وغیرہ کی طرف مستقل قوت تھی اور قیصر حکمران تھا۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا مقابلہ ان سے ختم ہو جائے گا بلکہ یہ فرمایا۔

الروم ذوات القرون اذا هلك قرن خلفه قرن الحرب بيننا وبينهم سجال ينالون منا وننال منهم۔

روم جو ہیں ان کے درجات و قرون اور طبقات ہوں گے ان کے اور ہمارے درمیان لڑائی ایسی رہے گی جیسے ڈول رسی کہ کبھی ڈول نیچے جائے گا، کبھی اوپر آئے گا، کبھی ہم غالب، کبھی وہ غالب۔ کبھی وہ مغلوب کبھی ہم مغلوب۔

ہزار برس تک مسلمان غالب رہے۔ اس کے بعد ان کا غلبہ شروع ہوا۔ تین چار سو برس سے ان کا غلبہ ہے مسلمان مغلوب ہیں۔ ظہور مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو خبر دی گئی ہے اس وقت مسلمان پھر غالب ہوں گے اور یہ مغلوب ہوں گے۔ اور مغلوب بھی ایسے کہ مدغم ہو جائیں گے اور اسی پر دور دنیا ختم ہے۔

غرض ان کے بارے میں دوامی مقابلہ فرمایا گیا۔ ورنہ اور کسی قوم سے دوامی مقابلہ نہیں۔ وقتی مقابلے ہوں گے لیکن یہ رہے گا کہ کبھی وہ غالب اور کبھی ہم غالب۔ ایک مجموعی طور پر اور ایک جزوی طور پر کہ کسی علاقے میں وہ غالب آ گئے اور ہم مغلوب ہو گئے۔ کسی علاقے میں وہ مغلوب ہو گئے اور ہم غالب آ گئے۔ بلقان کی ریاستیں میں کبھی وہ مغلوب، ہم غالب، کبھی ہم مغلوب وہ غالب، کافان میں کبھی ہم مغلوب وہ غالب، کبھی وہ مغلوب اور کبھی ہم غالب۔

ٹرکی کے علاقوں میں یہی ہوتا رہا، ہندوستان میں یہی رہا۔ عراق میں یہی رہا۔ یہ غلبہ و مغلوبیت چلتی آ رہی ہے۔ آخری طور پر اس کے ختم کا نتیجہ ظہور مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت نکلے گا۔ اس وقت اس قوم سے بھی مقابلہ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اور اقوام سے ختم ہوا۔

مقام تجدید

جو بھی مجدد ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کے علم میں ہو کہ میں مجدد ہوں مگر جذبہ تجدید تو اس میں ہوتا ہے اور عمل بھی وہ وہی کرتا ہے جو ایک مجدد کرتا ہے اور بعد میں اسکے اعمال سے کھل جاتا ہے کہ یہ مجدد تھا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مجدد کو اپنے بارے میں معلوم ہو۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مجدد دعویٰ کرے کہ میں مجدد ہوں بلکہ اس کا عمل تجدیدی ہوتا ہے خود بخود دل میں آ جاتا ہے کہ یہ دین کی تجدید کر رہا ہے سوائے اس کے جو لوگ مامور من اللہ ہوں اور ان کو اجازت دی جائے کہ تم دعویٰ بھی کرو، وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن نفس مقام تجدید کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجدد کو یہ معلوم ہو کہ میں مجدد ہوں مگر کام اس سے وہی نمایاں ہوں گے جو ایک مجدد کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمال عدل

حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عظیم الشان جنگ کریں گے ___ اس جنگ کی تفصیل آتی ہے۔ تین جنگیں ہوں گی۔ عظیم ترین جنگ "ملحمۂ کبریٰ" اس میں اتنے مقتولین ہوں گے کہ مسلمان فاتح تو ہو جائیں گے مگران کے لئے کوئی خوشی اور مسرت باقی نہیں رہے گی۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کا عروج شروع ہوگا اور حدیث میں ہے کہ ساٹھ برس حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمرانی کریں گے اور ان کے دور میں اس درجہ گویا امن وامان ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوگا۔ جیسا کہ روایت میں فرمایا گیا کہ سانپ اور انسانوں کے بچے ایک جگہ کھلیں گے' نہ سانپ کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ مجھے ماردیں گے نہ انسانوں کے دل میں یہ خطرہ ہوگا کہ یہ کاٹ لیں گے۔ نیز یہ کہ بھیڑ اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ اتنا امن ہوگا کہ بکری اپنے اندر امن محسوس کرے گی' عدل کی اتنی برکات ہوں گی کہ فرمایا گیا کہ انگور کا ایک خوشہ اتنا پھلے گا کہ پورا گھرانہ اور قبیلہ اس سے سیر ہو جائے گا۔ ایک بکری اتنا دودھ دے گی کہ پورا قبیلہ اس کے دودھ سے سیراب ہو جائے گا۔ برکات اتنی ہوں گی کہ ایک مالدار زکوٰۃ صدقات دینے کے لئے نکلے گا تو جس کو دے گا وہ کہے گا کہ میرے گھر میں ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ تو ہی آ کے لے لے۔ جسے دے گا' کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا کہ میرے گھر میں خود بہت موجود ہے' اس درجہ گویا فراوانی اور برکات ان کے کمال عدل کی وجہ سے ہوں گی۔

اس لئے کہ عدل کا اثر طمانینت ہے۔ اور جب قلوب میں اطمینان ہوتا ہے تو ہر چیز میں آدمی کو برکت محسوس ہوتی ہے۔

اسی واسطے جو بادشاہ اور حکومت عادل ہوتی ہے۔ اس کی علامت ہے کہ قلوب کے اندر اطمینان سا ہوتا ہے ورنہ بے چینی رہتی ہے۔ ظلم میں کبھی امن واطمینان نہیں ہوتا۔ عدل میں اطمینان ہوتا ہے۔ تو جب کسی حکومت میں آدمی محسوس کرے کہ قلب میں تسلی کی کیفیات ہیں تو سمجھ لے کہ حکمران نیک نیت ہے اور عدل کر رہا ہے۔

عدل کی حسی برکات

اور حسی طور پر بھی اس کی برکات ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہارون الرشید کے واقعات میں لکھا ہے کہ یہ شکار کھیلتے ہوئے کسی جنگل میں دور تک چلے گئے اور فوج ولشکر سے بھی الگ ہو گئے' پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور پیاس کا غلبہ ہوا۔ تو ایک باغ نظر آیا۔ اس میں گھس گئے ___ باغ کا مالک بوڑھا تھا۔ اس سے انہوں نے جا کر کہا کہ بھئی! پانی ہو تو دو۔ وہ لباس سے اور چہرے مہرے سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے کوئی امیر ہے۔

اس نے بہت تہذیب سے بیٹھنے کو جگہ دی اور بٹھلایا۔ اور ایک انار توڑا' اور اس کو دبایا تو اس کے عرق سے پورا گلاس بھر گیا۔ وہ ہارون الرشید کو پلایا وہ نہایت شیریں تھا ___ ہارون الرشیدؒ کے دل میں خیال یہ پیدا ہوا کہ اتنا عظیم باغ میرے پاس بھی نہیں۔ یہ کون امیر ہے جس کا یہ باغ ہے ___ اب جو میں جاؤں گا تو اس باغ پر قبضہ کروں گا۔ یہ باغ بادشاہ کے لئے مناسب ہے' غیر بادشاہ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ خواہ مجھے قیمت دینی پڑے یا دباؤ سے لینا پڑے مگر باغ میرے پاس آنا چاہئے۔

پھر کچھ ستائے اور آرام کیا۔ اس کے بعد جب اٹھنے لگے تو مالی سے کہا کہ بھئ! پانی اور پلاؤ۔ اس نے پھر ایک انار توڑا اب وہ اس کو خوب دباتا ہے مگر آدھے سے زیادہ گلاس بھرتا ہی نہیں ___ ہارون الرشیدؒ نے کہا۔ درخت بھی وہی ہے۔ انار بھی وہی ہے۔ یہ کیا بات ہے گلاس بھرتا کیوں نہیں ___؟ اس بوڑھے مالی نے کہا کہ :

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت کی نیت میں فرق آیا ہے''۔

ہارون الرشید سمجھ گیا۔ بادشاہ تو وہ خود ہی تھا۔ فوراً اپنے دل میں توبہ کی اور استغفار کیا۔ اور کہا کہ اے اللہ! میں مجرم ہوں۔ میں ہرگز قبضہ نہیں کروں جس کا باغ ہے اسی ہی کو مبارک رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو بقیہ عرق تھا وہ بھی نکل آیا اور گلاس بھر گیا تو بوڑھا کہتا ہے معلوم ہوتا ہے بادشاہ وقت کی نیت درست ہوگئی۔ غرض نیت کا اتنا اثر پڑتا ہے۔

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس قدر بشاشت و طمانینت اور اس قدر برکات کا ظہور ہوگا کہ جو فطری طور پر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان میں بھی دشمنی کا احساس باقی نہیں رہے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلفاء سبعہ

یہ جو کلی خیر وبرکت کا زمانہ ہے یہ چالیس برس رہے گا۔ اور اس چالیس برس میں عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خلفاء حکمرانی کریں گے ___ لیکن پھر رفتہ رفتہ فساد کی طرف زمانہ بڑھتا جائے گا۔ جب ساتویں خلیفہ نمایاں ہو کر ختم ہونگے اب گویا فساد کا غلبہ شروع ہوگا اور پھر اتنا غلبہ ہوگا کہ لوگ اس درجہ پر آجائیں گے کہ ''شر محض'' رہ جائیں گے اور ایمان والے گنے چنے ہوں گے جو اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی کھوہ میں جاکر پناہ لیں گے۔ شہروں میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہوگی ___ یہ گویا بالکل قرب قیامت کا وقت ہوگا۔ اور یہ علامت ہوگی کہ اب اس کائنات کے خیمہ کو ختم کرنا اور فنا کرنا ہوگا۔

دابۃ الارض

اسی وقت دابۃ الارض ظاہر ہوگا یا ''نار حجاز'' ظاہر ہوگی جو منتشر جگہ سے ہنکا کر مومنوں کو ایک سمت میں لے آئے گی' دابۃ الارض کا جو خروج ہوگا تو یہ عجیب شکل وشباہت کا جانور ہوگا کہ چہرہ انسانوں جیسا اور ہر جانور کی شباہت اس میں ہوگی۔ یہ نشان بناتا جائے گا۔ مومن کے چہرے پر مومن کا اور کافر کے چہرے پر کافر کا۔

پھر ایک وباء بھیجی جائے گی جس سے دو تین دن کے اندر اندر جتنے ایمان والے ہوں گے سب ختم ہوجائیں گے اور انتقال کرجائیں گے۔

جن پر قیامت قائم ہوگی

اب شرار الخلق باقی رہ جائیں گے۔ جو شر محض ہوں گے ان کی شان فرمائی گئی نہ ان کا کوئی دین ومذہب ہوگا۔

لا یعرفون معروفًا ولا ینکرون منکرًا۔

نہ اچھے برے کی تمیز باقی رہے گی۔ گدھے' کتے کی طرح سے سڑکوں پر بدکاریاں کرتے پھریں گے۔ کوئی

انسانیت کی حس نہیں ہوگی محض شہوانی جذبات ہوں گے ان پر قیامت قائم ہوگی' یوں عالم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

عالم کی بنیاد

اس سے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ عالم ذکر اللہ سے تھما ہوا ہے۔ ایک بھی جب تک اللہ اللہ کہنے والا رہے گا۔ عالم مٹنے والا نہیں ہے۔ غرض عالم کی روح ذکر اللہ ہے۔ جب روح نکل جائے گی تب لاش بن کے پھولے گا' پھٹے گا اور سڑے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ حدیث ہے :

لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللہ اللہ۔

قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا عالم میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا اب شر محض رہ جائے گا۔ اس وقت قیامت قائم کر دی جائے گی۔

قبولیت بعدد

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جہاں چالیس آدمی جمع ہوں وہاں ایک نہ ایک ان میں مقبول ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجے کی بھی قبولیت ہو۔ تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں کوئی بھی مقبول نہ ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مقبولین ہوں گے۔

کیا اہل دنیا آسمان سے آگے جاسکتے ہیں؟

دیکھئے آسمان میں جانے کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔ نہ شرعی اصول اس کی اجازت دیتے ہیں نہ یہ واقعہ ہو گا۔ آسمان سے نیچے فضا ہے۔ یہ اس دنیا کا دائرہ ہے۔ تو دنیا والے اپنے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اپنے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ آسمان کا دائرہ وہ انسانوں کا دائرہ نہیں ہے۔ وہ ملائکہ کا دائرہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو ____ پھر شریعت نے آسمانوں کے دروازے بتلائے ہیں ان پر بڑے مستعد دربان ہیں۔ جن میں مقبولین کو بھی بغیر اجازت کے جانے کی صورت نہیں بنتی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو دروازے بند تھے' حضرت جبریل علیہ السلام نے گویا دروازہ کھٹکھٹایا تو بواب کی طرف سے اندر سے یہ جواب آیا :

من انت۔

"تم کون ہو؟"۔

حالانکہ جبریل علیہ السلام سید الملائکہ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملائکہ ان کی آواز بھی بھول گئے۔ ان کا تو ہر وقت کا آنا جانا ہے ____ پوچھنا اس کی دلیل ہے کہ ڈیوٹی پر اتنے مستعد ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی آئے گا تو وہ قانون کے مطابق ڈیوٹی ادا کریں گے۔ اس لئے پوچھا گیا :

من انت؟

"تم کون ہو؟"۔

حالانکہ جبریل علیہ السلام سید الملائکہ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملائکہ ان کی آواز بھی بھول گئے۔ ان کا تو ہر وقت کا آنا جانا ہے ــــ پوچھنا اس کی دلیل ہے کہ ڈیوٹی پر اتنے مستعد ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا بھی آئے گا تو وہ قانون کے مطابق ڈیوٹی ادا کریں گے۔ اس لئے پوچھا گیا :

من انت۔؟

''تم کون ہو؟''۔

فرمایا :

جبریل۔

پھر پوچھتے ہیں

ومن معک؟

''اور ساتھ میں کون ہیں؟''۔

یہ اس کی دلیل ہے کہ ان کی علم میں ہے کوئی ساتھ میں آرہا ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن ادائے فرض میں اتنی مستعدی کو یہ پوچھا کہ ساتھ کون ہیں؟ ــــ جبریل علیہ السلام نے کہا۔ ــــ

محمد

پھر یہی نہیں کہ دووازہ کھولدیں۔ تیسرا سوال اور کیا گیا۔

بلائے ہوئے آرہے ہیں یا ویسے ہی خود بخود آگئے ہیں؟

تو حضرت جبریلؑ نے جواب دیا :

وقد اوسل الیہ ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بلائے ہوئے آرہے ہیں ــــ تب دروازے کھولے گئے اور کہا گیا :

مرحبا بکم نعم المجیئی جاء۔

''بہترین آنا ہے جو آپ آئے۔ خوش آمدید''۔

جب مقبولین کے لئے آسمان میں جانے میں اتنی پابندیاں ہیں تو مردودین وہاں کیسے جائیں گے؟ وہ خود بخود ہی پہنچ جائیں گے؟

سیارات کا تعلق اہل دنیا سے ہے

۔اس کی بنا یہ ہے کہ جو اس دنیا میں بسنے والے انسان ہیں وہ اپنی دنیا کے دائرے میں رہتے ہیں لیکن دنیا کے دائرے سے نکل کر ایک دوسرا عالم شروع ہو جاتا ہے اس عالم میں یہ دخل نہیں دے سکتے۔ رہے ستارے تو وہ اس دنیا کے عالم میں ہیں اس لئے کہ قرآن کریم نے فرمایا گیا :

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ۔

آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں سے آراستہ کر رکھا ہے۔ یہ ستارے اس آسمان کی زینت ہیں۔ اور زینت ہمارے لئے بنائی گئی۔ یہ زینت جبھی ہو سکتی ہے جب یہ ستارے آسمان کی نچلی سطح سے نیچے ہوں۔ اگر اوپر کی سطح پر ہوتے تو ہمارے لئے زینت نہ بنتے۔

معلوم ہوا یہ ستارے زمین ہی سے متعلق ہیں۔ سورج اور چاند جو گردش کرتے ہیں یا یہ رات اور دن یہ دنیا ہی کے لئے ہیں۔ آسمانوں اور جنتوں کے لئے تو رات اور دن نہیں ہیں۔ یہ رات دن کی گردش اسی دائرہ

دنیا کے اندر ہے اور اس کا تعلق ان سیارات سے ہے۔ یا مثلاً جڑی بوٹیاں ہیں۔ تو ہر جڑی بوٹی میں کسی نہ کسی ستارے کی تاثیر ہے جس سے وہ دفعیہ امراض میں مؤثر ہوتے ہیں۔ گل بنفشہ میں فلاں خاصیتیں ہیں۔ وہ جب جڑی بوٹیوں پر روشنی ڈالتے ہیں تو ویسی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ویسے ہی امراض کا دفعیہ ہوتا ہے۔ تو یہ سارے ستارے گویا ہمارے لئے بنائے گئے ہیں۔ دنیا سے ان کا تعلق ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا :

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ۔

”ستاروں سے ہی لوگ راستہ پاتے ہیں“۔

یہ جہاز رانی کا فن ستاروں ہی کے ذریعے سے ہے۔ سمندروں میں سڑکیں تو نہیں ہوتیں ـــــ ستاروں سے سمتیں متعین کر کے جہازوں کو چلاتے ہیں۔ معلوم ہوا ستارے ہمارے لئے بنائے گئے ہیں۔ دائرہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسمان سے تعلق نہیں ہے۔ آسمان کی چھت میں جس طرح سے بھی لٹکا دیئے گئے ہیں۔ غرض جب یہ دنیا سے متعلق ہیں تو دنیا والوں کا ان تک پہنچنا ممکن ہے لیکن اپنی دنیا کے دائرے سے نکل کر کسی اور عالم میں پہنچ جائیں۔ انسان میں یہ طاقت نہیں ہے۔ دعوے کوئی کتنے ہی کرے‘ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے چاند‘ سورج اور مشتری میں چلے جائیں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے جلدی چلے جائیں تاکہ زمین میں کچھ فساد کم ہو۔ ہمارا اس میں کیا نقصان ہے؟

توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت

حدیث میں آتا ہے کہ آفتاب جب مغرب سے طلوع کرے گا اور نصف النہار تک آئے گا اور پھر لوٹ جائے گا اور معمول کے مطابق طلوع کرے گا‘ جب یہ آیت کبریٰ ظاہر ہوجائے گی تب توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ اس واسطے ایمان لانے سے مقصود قلوب کی آزمائش ہے۔ اور جب اتنی نمایاں خرق عادت ظاہر ہوجائے گی۔ اب اس کے بعد آزمائش کا موقع نہیں رہے گا اب تو وہ چیزیں سامنے آگئیں جن کی خبریں دی جارہی تھیں جن کو محض پیغمبر کے اعتبار پر ماننا چاہئے تھا۔ مشاہدے سے مانا تو اس کا نام ایمان نہیں ہے۔ پیغمبر کے اعتماد پر ماننا چاہئے۔ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ آنکھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ ماننا کہ پیغمبر غلط نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایمان ہے۔ تو اپنی عقل سے کسی چیز کو سمجھ لینا یہ ایمان نہیں۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ میں ایمان لے آیا کہ دو کا دگنا چار ہوتا ہے۔ اسے ایمان نہیں کہتے۔ یہ تو قضیہ عقلیہ ہے۔

التفات حقائق کا اسلام موضوع ہے

اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو‘ حقائق کی طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں ـــــ اسی واسطے تصویر کی ممانعت فرمائی گئی‘ ہوسکتا تھا کہ اس زمانے میں بھی مصور ہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک رکھتے ہوں۔ مگر ممانعت فرمادی گئی کہ صورتوں میں الجھ جائیں گے اور حقیقت رہ جائے گی‘ اس لئے مسلمانوں کو صورتوں سے ہی الگ رکھا ہے۔ آج کل سب کچھ مظاہروں اور نعروں میں آگیا ہے۔ حقیقت گم ہوگئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کا مذہبی فائدہ

(ہندوستان) سارے مسلمان اکٹھے ہوگئے۔ اور یہ طے پایا کہ مشترک معاملات میں مل کر متفقہ طور پر گورنمنٹ سے مطالبہ کیا جائے۔ جو اپنی خصوصیات ہیں وہ آپ اپنے گھروں میں انجام دیں۔ اس میں کوئی دوسرا دخل نہیں دے گا۔ لیکن جب گورنمنٹ کے سامنے آئیں تو مل کر آئیں اور وہ یہ نعرہ ہو کہ پرسنل لاء اور عائلی قوانین میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ نہ گورنمنٹ کو نہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کو ___ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا ___ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندرا گاندھی کو اعلان کرنا پڑا کہ :

"ہم کوئی دخل دینا نہیں چاہتے۔ مسلمان چاہیں گے کہ دخل دو' تب ہم دخل دیں گے"۔

ہم نے کہا وہ مسلمان کون ہے جو چاہے گا۔ سب تو یہاں آگئے' سب کے نمائندے یہاں جمع ہیں۔ شیعہ وسنی بھی' اہلحدیث بھی۔ اب وہ کون سے مسلمان ہیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب دب دبا گئے۔ اور وہ جو نعرے لگا رہے تھے کہ ترمیمات ہوں گی سب چپکے ہو کے بیٹھ گئے۔

دیوبندی و بریلوی حضرات کے باہمی قرب کا فائدہ

اس موقع پر ہم نے بریلوی حضرات سے بھی خواہش کا اظہار کیا کہ آپ بھی آئیں عام طور پر وہ مذہبی معاملات میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے نہیں ___ مگر اس موقع پر شریک ہوئے۔ اس لئے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم نہ گئے تو سب نکھٹو بنیں گے اور ہماری بات گر جائے گی تو اپنا ایک نمائندہ بھیجا ___ سب سے بڑے مفتی' مفتی برہان الدین صاحب جو جبل پور کے رہنے والے ہیں' وہ آئے ___ مجھے اس موقع پر صدر بنا دیا تھا۔ میں نے انتہائی ان کی آؤ بھگت کی' جب وہ تشریف لائے تو بیس قدم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرنا' ہر پانچ منٹ کے بعد پان پیش کرنا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد چائے پیش کرنا۔ اور ان کی باتیں بھی بڑی عقیدت کی نگاہ سے سنیں کہ جو بات کہے اسے ماننا چاہئے ___ وہ بہت متاثر ہوئے۔

جب جلسہ ختم ہوا تو انہوں نے کہا۔ میں نے سنا ہے آپ حج کے لئے جانے والے ہیں؟

میں نے کہا ارادہ تو ہے ___ انہوں نے کہا

"روضۂ اقدس پر میرا اسلام عرض کر دینا"۔

میں نے کہا ان شاء اللہ ضرور عرض کروں گا۔

خیر میں نے کہا تکفیر تو ختم ہوئی۔ کسی کافر کے ذریعے روضہ اقدس پر کوئی تھوڑا ہی سلام پہنچاتا ہے۔

غرض ملنے سے بھی سینکڑوں شبہات رفع ہوتے ہیں۔ بہت سے منافع ان کے ہاں ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔ اور بہت سے منافع ہمارے ہاں ہیں جن سے وہ محروم ہیں' رلے ملیں گے تو ایک' دوسرے سے فائدہ تو اٹھائے گا۔

باہمی نفرت اسلام کا ذوق نہیں

یہ باہمی نفرتیں پیدا کرنا یہ اسلام کا ذوق نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا گیا :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

"یہ کفار جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو بھی برا مت کہو کہ وہ چڑ میں آکر تمہارے

بڑوں کو برا کہیں۔ اس لئے انہیں بھی گالی مت دو"۔

اب یہاں گالم گلوچ بھی ہے اور یہ کہ فلاں کافر، فلاں کافر۔ وہ ایسا وہ ویسا۔ تو اسلام کا یہ ذوق ہی نہیں۔ یہ ایک مصیبت ہے۔ بس جہل عام ہے۔ آدمی دین کچھ پڑھے لکھے تو ذوق پیدا ہوا اور پتہ چلے، بس بھیڑ چال ہے، جس نے جو رسم ڈالدی اور دو تین برس کے بعد وہی دین کا جز بن گیا۔

رسوم کا غلبہ

چنانچہ میرا امریکہ جانا ہوا تو ___ قوم کے کچھ لیڈر ملنے کے لئے بیچارے نیک طینت اور نو مسلم آئے ___ میں نے حسب معمول پان کھایا ___ وہ یوں سمجھے کہ کوئی دینی چیز ہے۔ کہنے لگے اب ہم سب پان کھایا کریں گے اور ڈبہ بٹوہ رکھیں گے۔ میں نے کہا! یہ کوئی دینی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک عادت کی بات ہے۔ ایسا مت کرنا۔ اتنے سیدھے سادھے لوگ ہیں اب اگر وہ پان کا ڈبہ رکھتے اور اسے دین سمجھ کر رائج کرتے تو ان میں یہ رائج ہو تا کہ پان کھانا دین اسلام کا رکن ہے اور جو نہیں رکھے گا وہ کافر ہو جائے گا اس لئے کہ وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

اختلافی مسائل کا آسان حل

ورنہ اگر مسائل میں نگاہ ہو تو قرآن کریم کا صاف حکم ہے :

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

اگر تم میں تنازع ہو تو اللہ و رسول کو حکم بنا کے رجوع کرو، صحابہؓ کا عمل موجود ہے، رجوع کرو ___ جب وہ عمل پیش کیا جائے تو کہتے ہیں، صاحب! یہ تو سر آنکھوں پر ہے۔ مگر رواج یہی ہے۔ تو رواج پر چلیں گے۔ نہ صحابہؓ کے تعامل پر، نہ نبیؐ کے تعامل پر، اس کا کوئی علاج نہیں۔ بس جہالت ہے اور اسلامی ذوق نہیں ہے۔

بریلوی عالم کی توہین بھی درست نہیں

اب مولانا احمد رضا خان صاحب ہیں ___ ایک دن حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی مجلس میں ___ غالباً خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے یا کسی اور نے یہ لفظ کہا کہ :

"احمد رضا یوں کہتا ہے"۔

بس حضرت بگڑ گئے۔ فرمایا :

عالم تو ہیں۔ ہمیں توہین کرنے کیا حق ہے؟

کیوں نہیں تم نے مولانا کا لفظ کہا؟

غرض بہت ڈانٹا ڈپٹا ___ بہرحال ہم تو اس طریق پر ہیں کہ قطعاً ان کی بے حرمتی جائز نہیں سمجھتے۔ کافر فاسق کہنا تو بڑی چیز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو خلاف سنت امور ہیں۔ انہیں ظاہر کرتے ہیں کہ بدعات ہیں۔ خلاف سنت ہیں انہیں ترک کرو۔ لیکن کرنے والوں کی توہین کریں۔ یہ نہیں ہے۔

مولانا احمد رضا خان صاحب دیوبند کے فیض یافتہ ہیں

مولانا احمد رضا خان دیوبند کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ وہ اس طرح کہ مولانا محمد یٰسین صاحب رحمہ اللہ علیہ جنہوں نے بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم قائم کیا یہ ان کے شاگرد ہیں۔ اور وہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں مگر اسے ظاہر نہیں کرتے ___ اور ابتداء ابتداء میں مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کو مولانا احمد رضا خان جو خط لکھتے تو نہایت تعظیم سے لکھتے' ایسے جیسے کوئی اپنے شیخ کو لکھ رہا ہے ___ بعد میں ان کے خیالات بدلے۔ کیا بات پیش آئی' وہ اللہ ہی جانے۔ پھر تو کافر سے ورے کوئی چیز ہی نہیں تھی۔

اپنے کام سے کام

ہم تو یہ کہتے ہیں کہ نہ ہم مولانا احمد رضا خان صاحب کو کوئی برا بھلا کہنا جائز سمجھتے ہیں نہ کبھی کہا ___ دار العلوم میں آپ آ کے دیکھیں کوئی ذکر یا چرچا ہے ہی نہیں۔ کون بریلوی اور کون وہ۔ سب اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں ___ اور ادھر دیکھو تو ابجد کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ وہ کافر' وہ کافر' وہ فاسق ___ وہاں کفر واسلام کا یہ قصہ نہیں۔ سب تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ برسہا برس نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ اپنا مشغلہ ہی بہت ہے' کہاں اس جھگڑے میں پڑے کہ فلاں کافر' فلاں کافر۔ ہو گا وہ ہمیں اس میں سے کیا؟

وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ : ـ

لعمری ان فی ذنبی لشغلاً
بنفسی عن ذنوب بنی امیہ

میرے اتنے گناہ ہیں کہ مجھے شمار کرنے کے فرصت نہیں۔ نبی امیہ کے گناہوں کو کہاں شمار کروں ___؟ برسوں نام بھی نہیں سنیں گے۔ کون ہے بریلوی اور کون ہے رافضی ___؟

مسجد دھلوانے کا قصہ

بمبئی میں یہ کیفیت تھی کہ کوئی دیوبند والا مسجد میں چلا جائے تو مسجد دھلوائی جاتی تھی' حالانکہ مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کفار آتے تھے لیکن دھلوائی کبھی نہیں گئی' جب کہ وہ صحیح کافر تھے۔ اس لئے کہ نجاست اعتقادات کی ہے' بدن کی نجاست نہیں ہے۔ جو مسجد آلودہ ہو۔

پھر بمبئی میں جانا آنا ہوا۔ اب قصہ برعکس ہو گیا' ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی جو معتدل ہے اور ان خرافات کو سمجھ گئی۔

حضرات دیوبند اور پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم

پیر مہر علی شاہ صاحب نے دیوبند سے کوئی استفادہ نہیں کیا' مگر دیوبند کے لوگ ان کی معتقد تھے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ ان سے بڑی عقیدت سے اور بڑی نیازمندی سے ملتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ ایک تو کچھ رسوم ہیں۔ ان بزرگوں میں اگر کوئی رسم بھی ہے تو وہ صرف اس لئے ہے کہ

ہمارے بزرگوں نے کیا ہم بھی کریں گے ___ لیکن دوسروں کی تکفیر نہیں کرتے اور برا بھلا نہیں کہتے۔ چونکہ ان میں اخلاص تھا اس لئے دیوبند کے حضرات بھی ان سے عقیدت سے ملتے تھے۔

ایک بریلوی بزرگ سے ملاقات کے اثرات

ملتان میں انقلاب سے پہلے ایک دفعہ میرا جانا ہوا۔ مولانا خیر محمد صاحبؒ نے خیر المدارس کا جلسہ کیا تھا۔ میں نے جا کے پوچھا یہاں کوئی بزرگ کوئی عالم اور بھی ہے جس سے ملیں ___ انہوں نے کہا۔ مولانا محمد بخش صاحب ہیں اور بریلوی فرقہ کے ہیں ___ میں نے کہا ہم انہیں فرقہ ہی نہیں سمجھتے۔ نہ ہم فرقہ' نہ وہ فرقے ___ مولانا عبدالخالق صاحبؒ نے بہت روکا کہ ان کے خلاف تو جلسہ کر رہے ہیں اور تم جا کے ملوگے ___ میں نے کہا خلاف کا وقت آئے گا خلاف بھی کریں گے۔ اور وہ مسئلہ کی بات ہوگی لیکن ملنے میں کیا حرج ہے۔

ان سے چھپ چھپا کر' میرے ساتھ حافظ شریف احمد تھے' مغرب کے وقت ان کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہ مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک لوٹے میں برف کا پانی بھی رکھا ہوا تھا۔

کسی نے میرے آنے کی انہیں اطلاع کردی ___ بڑی شفقت سے پیش آئے اور اس پانی کے لوٹے کو منہ سے لگا کر پہلے خود پیا اور مجھے کہا تم بھی پیو' میں نے بھی پانی پیا۔

اس کے بعد کہنے لگے' دیوبند کے بزرگوں کے کچھ احوال تو سناؤ۔ میں نے وہاں کے بزرگوں کے حالات سنائے ___ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو دارالعلوم میں تعلیم کے لئے بھیجا' مگر ایک کو تو وہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔ واپس چلا آیا۔ اور ایک البتہ سال رہا۔ مگر امتحان سے پہلے وہ بھی چلا آیا۔ خدا جانے کیا مجبوری پیش آئی ___ بہرحال ان کے گھرانے سے تکفیر نکل گئی۔ اس لئے میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھئی منافرت مت پیدا کرو۔ اپنی رائے ہے۔ اگر آپ دیانۃً صحیح سمجھتے ہو۔ اس پر عمل کرو' لیکن نفرتیں پیدا کرنا یہ صحیح نہیں۔

سنت و بدعت کا تاثیری امتیاز

مگر مشکل یہ ہے کہ حدیث شریف میں بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا :

ما اوتی قوم بدعۃ الا اوتوالجدل۔

جس قوم میں بدعت آئے گی اسمیں دنگا فساد اور جھگڑا ضرور آئے گا۔ یہ بدعت کا خاصہ ہے۔ سنت میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سنت تو ایک ہی ہے جس کا جی چاہے عمل کرے اور بدعات ہر جگہ کی الگ الگ ہیں۔ تو بدعت کا خاصہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اصل دین ختم ہو جائے گا۔ نزاع و جدال اور گروہ بندی و پارٹی بازی یہ شروع ہو جائے گی۔

تقسیم ہند کے بارے میں علمائے دیوبند کا اختلاف

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ علیہ تو کانگریس کے حامی تھے کانگریسی تھے اور کانگریس کے کٹر قسم کے حامی تھے۔ انہوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اس میں خون خرابے مچیں گے۔ اور مسلمان ادھر سے ادھر ہو جائیں گے۔ تو جانیں تلف ہونگی۔ اور اسی طرح کے دیگر مصالح ان کی پیش نظر تھے۔

لیکن یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو فرمایا اب اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں، اب ہماری آبرو اسی میں ہے کہ وہ قوی ہو اور مضبوط رہے یہ تو ان کا حال ہے، جو مخالف تھے۔

اور مولانا شبیر احمد صاحب ؒ دیوبندی نہیں تھے؟ حضرت تھانویؒ دیوبندی نہیں تھے؟ مولانا ظفر احمد صاحبؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی نہیں تھے؟ یہ سارے پاکستان کے حامی تھے۔ تو یہ کہدینا کہ دیوبند مخالف تھا ___ رائیں ہوتی ہیں، کسی کی کچھ، مگر بن جانے کے بعد مخالفین کی رائیں بدل گئیں کہ اب ہم کسی قسم کا نزاع یا اختلاف نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو ہماری عزت اس میں ہے کہ پاکستان قوی اور مضبوط ہو۔

دیوبند کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اشخاص کے اندر اختلاف تھا، دیوبند تو ایک ادارہ ہے وہ نہ لیگی نہ کانگریسی، ہمیشہ غیر جانبدار رہا۔ تو دیوبند اور چیز ہے۔ افراد اور چیز ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حامی تھے اور حامی ہونے کی بنا یہ تھی کہ یہ نعرہ لگایا جارہا تھا کہ ہمیں ایک اسٹیٹ چاہئے جس میں اسلامی قوانین جاری کرسکیں، سارے مسلمان اس کی حامی تھے کہ اس سے بہتر کیا بات ہے ___ تو جس نے رائے دی وہ یہ سمجھ کر دی کہ وہاں اسلام رائج ہوگا۔

دوسرے حضرات کی رائے یہ تھی کہ یہ ہوگا نہیں اس لئے کہ جو لوگ بنا رہے ہیں انہیں خود دین سے مناسبت نہیں ہے، وہ نیک نیتی سے بھی چاہیں کہ اسلام رائج ہو، تب بھی نہیں ہوسکے گا۔ اس لئے کہ ان کی اندر اسلامی ذوق ہی نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ جب ملک تقسیم ہوگا تو یہ بھی ہوگا کہ کچھ لوگ ادھر آئیں کچھ لوگ ادھر جائیں اس میں خون خرابے بھی مچیں گے۔ تو انھوں نے کہا کہ ہمیں تو خون کے دریا نظر آتے ہیں۔

اور یہ ہوا ___ لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا ___ لاکھوں مسلمان عورتوں کی آبروئیں بھی گئیں اور مالی نقصان بھی ہوا۔ تو یہ چیزیں ان کی پیش نظر تھیں جس کی بنا پر ان حضرات کی رائے تھی کہ نہ بننا چاہئے۔

اور جن کی رائے تھی کہ بنے تو وہ اس پر تھے کہ جب ایک اسٹیٹ بنے گی اس میں اسلامی قانون جاری ہوگا۔ تو نہ سہی پورے ہندوستان میں ایک جگہ تو اسلامی اسٹیٹ ہوجائے۔ ان کی نگاہ اس پر تھی۔

اور ہم رات دن دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ ملک مضبوط ہو اور ہم وہاں بیٹھ کر دعاء ہی کرسکتے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں۔؟

اور اس کے متمنی ہیں کہ اس ملک کو سب متفق و متحد ہوکر ملک سنبھالیں، اللہ نے جب ایک ملک دیدیا ہے، باہمی لڑائی سے اسے ختم نہ کریں اور ان لوگوں سے عبرت پکڑیں جن میں نزاع ہوا۔ اور تیسرا آکر غالب ہوا۔ افغانستان میں یہی ہوا کہ بیس پارٹیاں خلاف میں کھڑی ہوگئیں، باہمی نزاع ہوا۔ تو روس نے آکر غلبہ پایا، اسی طرح سے اور جگہوں پر بھی ہوا کہ جب باہمی نزاع ہوا تیسرا غالب۔

مسلمانوں کا باہمی اختلاف غیروں کو غلبہ دلاتا ہے

ملک ابن سعود کا ایک مقولہ ہے جب ان سے کہا گیا کہ یہود بڑی قوت پکڑتے جارہے ہیں اور ممالک اسلامیہ کے لئے خطرہ بڑھ رہا ہے ___ ملک نے جواب دیا۔

> "ساری دنیا کے یہود ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوجائیں مجھے ذرہ برابر فکر نہیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم ہی آپس میں لڑوگے اور غیروں کو موقع دوگے کہ وہ آکر غالب ہوں اور دخل دیں"۔

غرض یہ واقعہ ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت تباہ ہوئی ہے باہمی نزاع اور باہمی رقابتوں سے تیسرے کو موقع ملا۔ اور دوسری قومیں ہمیشہ اس کی ساعی رہی ہیں کہ ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو مغلوب کرو اور جب وہ مغلوب ہو جائے تو پھر غالب آجاؤ۔

حضرت امیر معاویہؓ کا کلب روم کو جواب

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جب جنگ ہوئی تو قیصر روم کا پیغام امیر کا پیغام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچا کہ :

''میں نے سنا ہے کہ علی تمہارے مقابلے پر ہیں اور میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ فوجی مدد، مالی مدد''۔

اس کا مقصد یہ کہ امیر معاویہؓ کا ساتھ دے کر حضرت علیؓ کو مغلوب کرو اور جب مغلوب ہو کر ختم ہو جائیں تو انہیں بھی مغلوب کر دینا آسان ہوگا۔ یہ گویا اس کی ذہنی کیفیت تھی۔

امیر معاویہؓ نے اس کا جواب لکھا :

اس میں لقب لکھا الی کلب الروم رومی کتے کی طرف یہ خط پہنچے، اور لکھا کہ :

''تو یہ سمجھتا ہے کہ میں علیؓ کا دشمن ہوں۔ میرا ان کا اختلاف مسئلہ کا اور حجت کا اختلاف ہے۔ ذاتی اختلاف نہیں ہے، اگر تو نے یہاں آ کے قدم رکھا تو میں علیؓ کا ادنیٰ سپاہی ہو کر تجھ سے جنگ کروں گا''۔

اور اس کی ساری امیدیں ختم کر دیں ___ اور اگر وہ معاذ اللہ دب جاتے وہ قیصر ہی غالب آتا۔ اسی کی حکومت ہو جاتی۔

غیر قوموں کا طریق واردات

غرض ان قوموں کا خاصہ یہی ہے کہ پہلے ملک میں اور قوم میں تفریق ڈلواتی ہیں اور سینکڑوں معاملات میں اختلاف پیدا کرتی ہیں۔ اسلام نے اخوت اسلامی سکھلائی تھی کہ مشرق و مغرب کے مسلمان ایک ہوں۔ انہوں نے کیا کیا ___ وطنیت کا رشتہ الگ ڈالا۔ اب جغرافیائی خطوط پہ لڑائی کرائی، نسلیت کا رشتہ الگ ڈالا کہ گورے الگ اور کالے الگ، غرض اس قسم کے سینکڑوں اختلاف پیدا کر دیئے۔ اور لوگ لڑ رہے ہیں جغرافیائی خطوط پر کہیں لڑ رہے ہیں، کہیں رنگ و نسل کے مسئلہ پر لڑ رہے ہیں، کہیں زبان کے مسئلے پر لڑ رہے ہیں ___ لیکن وہ جو اصل وحدت کی بنیاد تھی اس کو سب چھوڑے ہوئے ہیں جس میں سارے مسلمان ایک ہوتے ہیں۔

ایک تو اختلاف آ رہا ہوتا ہے اور حجت کا اختلاف ہوتا ہے وہ علماء و عقلا میں آ رہا ہے وہ مضر نہیں ہے اس اختلاف کو نزاع و جدال اور جھگڑے پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا یہ مضر چیز ہے۔ یہ جذبات کا کام ہے۔ مسئلہ کا کام نہیں ہے مسئلہ لڑائی نہیں سکھلاتا۔ ہم مسئلہ کو آڑ بناتے ہیں اور جذبات اپنے نکالتے ہیں پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

اجلاس صد سالہ

اجلاس صد سالہ کو "جشن" کہنے سے ہم ہر جگہ احتیاط کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے جشن کا نام نہ دیا جائے۔ یہ ایک دستار بندی کا اجلاس ہے جبکہ جشن ایک رسم ہے۔

دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ میں شرکت کے لئے یہاں کے لوگوں کا کام ہے کہ وہ صدر پاکستان سے ملیں اور اس کی اہمیت ان پر واضح کریں۔ پھر جو وہ فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے ___ معلوم ہوا ہے ایک وفد ان سے ملا ہے تو انہوں نے پانچ سو آدمی کی اجازت دیدی ہے ___ ان پانچ سو کا انتخاب کرنا بھی یہاں کے لوگوں کا کام ہے۔

گروہی خصوصیت کی دعوت کا نقصان

دعوتیں مختلف ہوگئیں۔ اپنی اپنی خصوصیات کی لوگ دعوتیں دیتے ہیں اور اسے اسلام پکارتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سب سے زیادہ بلند چیز ہے۔ جماعتی خصوصیات کا نام اسلام تھوڑا ہی ہے۔ ہر شخص اپنی گروہی خصوصیات کو اسلام کے نام سے تعبیر کرتا ہے اسلام کو مسلمانوں سے خطرہ ہے اور کسی سے نہیں ہے۔

اسباب اتحاد

دوسرے میں نے ہر جگہ کہا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو اتحاد واتفاق کی ضرورت ہے۔ سب مل کر باہم متحد ہو کر اپنے ملک کو مضبوط بنائیں۔

اور یاد رکھئے! اتحاد جو قائم ہوتا ہے کبھی تو وہ قوت عقیدت سے قائم ہوتا ہے کوئی ایک بزرگ شخص ہے لوگ اس پر جمع ہوگئے۔ ان میں باہمی اتحاد قائم ہوجاتا ہے۔ کوئی عالم ربانی یا شیخ طریقت ہے۔ اس کے متوسل جمع ہوجاتے ہیں۔ مرکز ایک ہوگیا۔ مگر وہ اتحاد محدود ہوتا ہے۔

ایک قوت قہری یعنی حکومت کی قوت ہے وہ بھی ایک مرکز پر جمع کرتی ہے ___ اس لئے میں نے کہا کہ سب لوگ جمع ہوجائیں اور اتفاق کریں اور حکومت کو مضبوط بنائیں۔ اور بیرونی خطرات پہ نگاہ رکھیں ___ اس لئے کہ آپ کے اختلاف سے غیروں کو دخل اندازی کا موقع ملے گا۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سارے مسلمان متحد ہو کر ملک کو اور حکومت کو مضبوط کریں۔

عشرہ فنڈ

میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ (زادھا اللہ شرفا وکرامۃً) میں حاضر ہوں۔ اور حضرت ام المومنین صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آدمی میرے پاس پہنچا' اور اس نے دس روپے دیئے کہ یہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارسال فرمائے ہیں کہ یہ دارالعلوم میں داخل کردیئے جائیں ___ میں نے اس آدمی سے عرض کیا کہ یہ زکوٰۃ ہے یا عطیہ ؟ اس نے کہا یہ عطیہ ہے۔ خواب ہی میں یہ بات دل میں جم گئی کہ میں اس مبارک رقم کو اجلاس صد سالہ کے سلسلہ میں داخل کروں گا۔

چنانچہ صبح کو میں نے یہ مفصل خواب لکھ کر اور دس روپے کا نوٹ نتھی کرکے دفتر اجلاس میں بھجوادیا۔ وہاں شہر کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو خواب سنا تو بہت سے لوگوں نے کسی ماں کی طرف سے' کسی نے بیوی کی طرف سے' کسی نے بہن کی طرف سے دس دس روپے دیئے' جس سے دو ڈیڑھ سو روپے جمع ہوگئے' اس کے بعد گھر میں تذکرہ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو میاں سالم' اسلم اور اعظم تینوں نے ایک ایک بچے اور ایک ایک عورت کی طرف سے دس دس روپے دیکر دو سو سے کچھ زائد

انہوں نے جمع کر دیئے ___ پھر طلباء میں چرچا ہوا تو کچھ طلباء میرے پاس آئے کہ اس قسم کے خواب کا چرچا ہے۔ اس کی کیا اصلیت ہے؟ طلباء چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ طلباء کا اجتماع ہوا ڈیڑھ دو ہزار طلباء جمع ہوئے۔ اور میں نے خواب بیان کیا۔ پھر جو پیسوں کی بارش ہونا شروع ہوئی حالانکہ بے چارے غریب اور غریب الدیار طلباء مگر چودہ سو روپے انہوں نے اسی مجلس میں جمع کر دیئے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تھا تو ہاتھ کی گھڑی اتار کر مجھے دے دی ___ اب شہر میں یہ چیز پھیلی جو آرہا ہے دس روپے کا نوٹ لئے آرہا ہے صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام کی برکت ہے کہ نام آتا ہے تو لوگ اُمڈ پڑتے ہیں۔ اور عشرہ فنڈ میں خوب پیسہ جمع کراتے ہیں۔

اس پر میں نے دفتر اجلاس کو لکھا کہ جتنی بھی رقم آئے وہ حضرت ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف سے داخل کی جائے اور دینے والے کا نام معرفت میں لکھ دیا جائے کہ معرفت فلاں کی اور من جانب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ___ اس طرح بہت سا روپیہ جمع ہو گیا ___ اس کے بعد میرا مدراس جانا ہوا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ یہاں بھی خواب کا چرچا ہے۔ وہاں بیان کیا تو کوئی چھ سات ہزار روپیہ لوگوں نے دس دس روپے دیکر جمع کر دیا ___ تو میں نے کہا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لاکھوں روپیہ دے سکتی تھیں مگر دس روپے اس لئے دیئے کہ ہر ایک کو دس دینے آسان ہیں۔ اور سو' ہزار دینے مشکل ہیں۔ اس لئے دس روپے عنایت فرمائے۔ تو اس کا نام ہم نے "عشرہ فنڈ" رکھ دیا۔ اس کا یہاں پاکستان میں لاہور میں ذکر ہوا تو یہاں لوگوں نے دینا شروع کیا۔ اب تک "عشرہ فنڈ" میں پندرہ' سولہ ہزار روپیہ جمع ہو چکا ہے یہ اس خواب کی حقیقت ہے۔

عطیۂ رحمت

اسی طرح دو روپے کے بارے میں یہ ہے کہ الہٰ آباد کے ڈاکٹر صلاح الدین صاحب انہوں نے خواب دیکھا اور مجھے خط لکھا۔

> "مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپؐ نے مجھے دو روپے عنایت فرمائے اور میرا نام لیا کہ اس کے پاس بھیج دو کہ ایک دارالعلوم میں داخل کرے' ایک صد سالہ اجلاس کے فنڈ میں داخل کرے ___ چنانچہ وہ خود لے کر پہنچے"۔

میں نے اس پر کہا ___ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ تو ایک روپیہ اس لئے رکھا کہ ہر شخص کو دینا آسان ہے۔

انفاق محبوب کا التزام

اگر خرچ کرو تو محبوب ترین چیز خرچ کرو' محبوب چیز ہو۔ یہ نہ ہو کہ جسے اپنے نزدیک ردّی سمجھ رکھا ہے اسے اللہ کے نام پر دیدو' اچھی چیزیں خود رکھو۔ غرض دو وہ محبوب چیز ہو ___ یہ نہیں فرمایا جو محبوب چیز ہو وہ دے ہی دو ___ اس سے لزوم ہے کہ جو دو وہ محبوب ہو۔ جو محبوب ہو وہ سب کچھ دیدو یہ نہیں ہے ___ کسی کے پاس اگر دس چیزیں ہیں اور وہ محبوب ہیں ایک چیز دے دے وہ بھی کافی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ دس کی دس دیدے ترغیب ہے حکم نہیں ہے۔ جو ترغیب پر عمل کرے گا درجات ملیں گے۔ امر نہیں ہے کہ اگر نہیں دے گا تو گنہگار ہو گا۔

نعمائے جنت

جنت میں جو نعمتیں ہیں وہ' وہ ہیں کہ :

لاعین رأت ___ نہ کسی آنکھ نے دیکھی ___ ولا اذن سمعت ___ نہ کسی کان نے سنی ___

ولا علی قلب بشر خطر ـــــ نہ کسی قلب پر ان کا خطرہ گزرا ـــــ اس لئے کہ آدمی نے دیکھا تو ہے نہیں جو کچھ سمجھے گا عقل سے سمجھے گا۔ تو یہ سمجھے گا کہ جیسی دنیا میں نعمتیں ہیں ایسی ہی جنت میں ہو نگی۔ حالانکہ وہ اس سے بالاتر ہیں۔

یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو عقل محض سے سوچتے ہیں ـــــ لیکن جو "وحی خداوندی" سے سوچتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا معائنہ کرایا گیا' آپؐ نے ساری نعمتیں دیکھیں۔ آدم علیہ السلام جنت میں رہے جنت کی ساری نعمتیں دیکھیں' تو ایک ہیں انبیاء علیہم السلام اور مقربین۔ وہ محض عقل سے نہیں سوچتے وہ تو وحی خداوندی اور مشاہدے کے ذریعے سے دیکھتے ہیں۔

یہ حکم عوام کے لئے کہ عقل سے جتنا سوچو گے اس کی چیزیں عقل سے بالاتر ہیں اس لئے انبیاء علیہم السلام اس میں داخل نہیں ہیں۔

انسان ہر طرف سے عدم میں گھرا ہوا ہے

انسانی صفات بہت محدود ہیں۔ ہر طرف سے انسان کو عدم نے گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ صفت علم کی بات ہے۔ ایک انسان کو چار سو پانچ سو مسائل کا علم ہوگا' ہزار کا ہوگا' اس کے بعد وہی عدم العلم ہے۔ تو جہل نے گھیر رکھا ہے' بیچ میں تھوڑا سا علم ہے۔

یا مثلاً ہماری قدرت ہے۔ ہم آپ سے کہیں گے کہ اگالدان اٹھالاؤ۔ آپ اٹھالائیں گے' قدرت ہے۔ یا آپ سے کہیں گے چارپائی اٹھالاؤ' مشقت سے سہی' آپ اٹھالائیں گے' ہم کہیں گے مکان اٹھالاؤ۔ آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں۔ تو بیچ میں قدرت ہے چاروں طرف عدم القدرت ہے۔ زیادہ تر چیزیں وہ ہیں جو قدرت سے خارج ہیں تھوڑی ہیں جو قدرت میں داخل ہیں۔

اسی طرح سے دیگر صفات میں بھی۔ مثلاً آپ حافظ ہیں اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔ ایک بچے کی کریں گے دو بچے کی کریں گی۔ گھر والوں کو ساتھ ملا کر دس کی حفاظت کریں گے۔ ہم کہیں گے سارے شہر کی حفاظت کرو' آپ کہیں گے مجھ میں تو قدرت نہیں' امیر اور پریذیڈنٹ جو ہے وہ کرسکتا ہے۔ ہم اس سے کہیں گے ساری دنیا کی حفاظت کرو' سمندروں میں جو مچھلیاں ہیں ان کی بھی حفاظت کرو' وہ کہے گا میرے اندر تو قدرت نہیں تو پھر عدم القدرت آگئی ـــــ تو بیچ میں تھوڑی سی حفاظت اور قدرت ہے ـــــ غرض ہر انسان کی ہر صفت کمال کو عدم الصفات نے گھیر رکھا ہے' عدم چاروں طرف سے محیط ہے۔ بیچ میں تھوڑا سا وجود دیا گیا ہے۔

خود ہماری ذات جو ہے پہلے نہیں تھے۔ بعد میں نہیں ہوں گے۔ بیچ میں تھوڑے سے ہیں۔ تو دو طرف سے عدم میں گھرے ہوئے ہیں۔ بیچ میں تھوڑا سا وجود ہے جب وجود ہمارا تھوڑا سا ہے تو صفات وجود بھی تھوڑی سی ہیں۔ کمالات بھی تھوڑے سے ہیں۔ لامحدود کمالات نہیں ہوسکتے۔

وجود حقیقی

لامحدود کمالات اسی کے ہوسکتے ہیں۔ جس کا وجود لامحدود ہے۔ جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ اور وہ اللہ کی ذات برکات ہے۔

یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ حق تعالیٰ کا علم محیط' اس کی قدرت محیط' اسی لئے فرمایا :

وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا۔

" ہر چیز اس کے علم کے احاطے میں ہے"۔

اور قدرت کے بارے میں فرمایا گیا۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

" وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

کہیں فرمایا :

عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ۔

" اس کا اقتدار ہے۔ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے"۔

کہیں فرمایا :

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔

" مالک الملک وہی ہے۔ جسے چاہے ملک دیدے، جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے بادشاہ بنادے۔ جسے چاہے گدی سے اتار دے"۔

غرض سب کی بادشاہتیں تو حد رکھتی ہیں کہ ہوئیں اور ختم ہو گئیں لیکن جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کی بادشاہت بھی ازلی اور ابدی ہے۔ تو وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

اسلام میں انتخاب امیر کا ایک طریق

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت کے وقت چھ نام منتخب کئے اور فرمایا کہ ان میں سے کسی کو امیر بنالو، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ــــ فرمایا ان سے زیادہ کوئی مستحق خلافت نہیں ہے۔ ان میں سے کسی کو منتخب کرلیا جائے۔ مگر انتخاب میں تین دن سے زیادہ دیر نہ کی جائے۔

چنانچہ یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے فرمایا۔ چھ میں سے تین کو سب اختیار دے دیئے جائیں، تو حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کو، حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کو اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے اپنا اختیار حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کو دیدیا۔

پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا۔ حضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے جو خلافت نہ چاہتا ہو انتخاب کا اختیار اسی کو دیدیا جائے۔ اس پر دونوں حضرات خاموش رہے۔ تو حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ میں اپنے لئے خلافت نہیں چاہتا لہٰذا معاملہ میرے سپرد کردیا جائے۔ چنانچہ انہیں یہ اختیار ان دونوں حضرات کی طرف سے سونپ دیا گیا۔ اور انہیں تین دن مہلت دی گئی۔

پھر آراء کی کثرت حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہوئی تو ان کو امیر منتخب کیا گیا۔ اور اہل حل وعقد نے تسلیم کرلیا ــــ گویا اسلام میں دونوں طریقے ہیں۔ نامزدگی بھی ہے اور انتخاب بھی ہے۔

انتخاب کا مغربی طریقہ

مگر انتخاب کا ایک تو موجودہ طریقہ ہے کہ جتنے بالغ ہوں سب سے رائے لی جائے، اور امیر کے بارے میں

کیا رائے دیں گے۔ اس میں غیر عالم بھی ہیں، جہلاء بھی ہیں، جنہیں یہ ہی پتہ نہیں امارت کے معنی کیا ہیں ___ یہ مسئلہ اہل حل وعقد کے اوپر رکھا گیا کہ جو قوم کے اندر علم اور دیانت کے لحاظ سے نمایاں طریق پہ بڑے ہیں اور ان کی تقویٰ وطہارت پر لوگوں کو اعتماد ہے وہ مل کر جسے منتخب کرلیں، قوم اس کو مان لیتی ہے۔ اس لئے طریقہ تو سہل ہے اور ایک معقول طریقہ ہے۔

لیکن اس میں نقصان اس سے ہوتا ہے کہ لیڈر اس فکر میں رہتا ہے کہ میں بنوں اور وہ اپنے مناقب وفضائل خود بیان کرتا ہے کہ میرے یہ کارنامے ہیں۔ لہٰذا مجھے منتخب کرو، ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں تو ووٹ حاصل کرنے والا ہی تو اپنے مناقب بیان کرتا ہے کہ میری کارگزاریاں یہ ہیں اور فلاں نے مجھے یوں کہا ___ اس کے بارے میں صراحۃً اسلام نے فرمایا:

لانولی امرنا هذا من طلبه۔

جو خود کسی عہدے کا متلاشی اور خواہاں ہو ہم اس کو عہدے دار نہیں بنائیں گے اس کی جڑ کٹ گئی۔ یہیں سے نزاع شروع ہوتا ہے۔ اب اہل حل وعقد جو سیاسی امور سے بھی واقف ہوں اور ان میں دیانت بھی ہو ___ ایک تو ہے کوری سیاست یعنی جوڑ توڑ ___ اور ایک یہ کہ ضمیر کی سچائی اور دیانت وتقویٰ اور قلب کی طہارت اور ضمیر کی صداقت۔ اس سے جو وہ رائے دیں گے وہ خیر وبرکت کی ہوگی، قوم بھی قبول کرے گی۔

امیر تغلّب

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی تغلب کے ساتھ امیر بن گیا۔ زور اور قوت کے ساتھ اس نے قبضہ کرلیا ___ پھر اس میں لکھتے ہیں کہ وہ بھی امیر بن جاتا ہے اس لئے کہ ہٹانے میں فتنہ ہے اور فتنے سے بچانا ضروری ہے اس لئے کہ والفتنه اشد من القتل ___ اگر خود بھی بن گیا ہو اور اس میں صلاحیت بھی موجود ہو۔ قوم کا فرض ہے کہ اسے مان لے جھگڑے نہ ڈالے۔

اقتدار میں رسہ کشی کا سبب

جھگڑے جو پڑتے ہیں وہ اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں خرابی ہے۔ خرابی سے تو کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ ہر ایک میں کمزوری ہوتی ہے۔ بلکہ اس لئے پڑتے ہیں کہ ہر ایک خواہاں ہوتا ہے کہ میں اس عہدے پہ آجاؤں۔ یہ اقتدار پسندی جھگڑے کی بنیاد ہے ___ تو اس نے لے پہلے ہی فرمادیا کہ جو طالب ہوگا ہم اسے عہدہ نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ وہ خود غرض ہے اس کے اندر اغراض پوشیدہ ہیں۔

اب اہل حل وعقد جو ہوں جن کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ہو۔ یا قوم کو ان کی دیانت وتقویٰ پر اعتماد ہو۔ اور یہ کہ وہ خود غرض نہیں ہیں۔ ان کو جمع کرکے کسی کا انتخاب کردیا جائے۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری قوم سے کہا جائے۔ جو اوپر کے لوگ ہیں ساری قوم کا وہی تو خلاصہ ہیں۔ وہ حقیقت میں قوم ہی کی نمائندگی ہوتی ہے۔

رائے عامہ کی ہمواری

اس میں البتہ یہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں خلاف ہو اسے رفع کیا جاتا ہے کہ میاں، یہ واقعہ یوں نہیں یوں ہے۔ قوم سنبھل جاتی ہے۔

اب جیسے حضرت عثمانؓ کو امیر بنایا گیا تو اسی چھ آدمیوں کی مجلس میں طے تو ہو گیا تھا، لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے گھر گھر جا کر پوچھا کہ کس کو چاہتے ہو ___؟ چونکہ بنی امیہ کی

تعداد زیادہ تھی اور ان میں اقتدار بھی بڑھا ہوا تھا' اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بجائے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند کیا اور اکثریت کی رائے ادھر ہی آئی اور ان کو امیر بنادیا گیا ــــ لیکن حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے رائے لی۔ حتیٰ کہ لوگوں کے گھر جا کر رائے لی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ رائے عامہ کو ایک حد تک ہموار کرنا ضروری ہے اور وہ یہی ہے کہ جو امیر ہے اس کے واقعی فضائل بیان کئے جائیں کہ اس میں اہلیت ہے۔ اس کے خلاف کوئی جذبہ ہو اس کو دفع کیا جائے۔

امیر کی غلطی کا حکم

اب ایسا کوئی آدمی جو بالکل مزکی اور مقدس ہو جس میں غلطی کا نشان نہ ہو' عالم بشریت میں کوئی نہیں ملے گا۔ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی غلطی اور خطا ہوتی ہے اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اس کے بارے میں تو یہ فرمادیا گیا کہ اگر امیر کوئی غلطی بھی کرجائے تو حتی الامکان نصیحت کرو' کچھ نہ ہو تو اس کا اتباع کرو' فتنہ نہ پیدا کرو اگرچہ وہ رائے غلط بھی ہے۔

بنیاد سب کی یہ نکلتی ہے کہ خود غرض نہ ہو۔ دیانت اور تقویٰ قلب میں موجود ہو۔ پھر سب آسان ہے ورنہ جھگڑے پیدا ہوتے رہیں گے۔

یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص میں ملک کے سنبھالنے اور چلانے کی اگر فی الجملہ صلاحیت ہے تو اس کے خلاف نہ کیا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے اور اگر وہ غلطی بھی کرے تو اس غلطی کو اچھالا نہ جائے۔ الا یہ کہ وہ اسلام کی تخریب کے لئے کام کرے پھر بے شک اس کو بدل ڈالو۔

افراط و تفریط فرقہ واریت کی بنیاد ہے

مولانا احمد رضا خان اور بریلویت کے بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو آج تک کہیں ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بہرحال وہ مسلمان ہیں۔

ایک ہے کسی چیز میں غلو اور مبالغہ کرنا اور تشدد کرنا' اس کو دنیا میں بھی پسند نہیں کیا گیا' اور دین میں بھی پسند نہیں کیا گیا ــــ دین کے بارے میں فرمادیا گیا :

لاتغلوافی دینکم۔

دین کے اندر غلومت کرو۔ سادہ سادہ طریق پر چلتے رہو۔ جس قوم نے غلو کیا ہے وہ افراط و تفریط سے ہوتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہود نے تو یہی افراط کی کہ انہیں ولد غیا کہا کہ معاذ اللہ ولد الزنا ہیں۔ انتہائی گستاخی کی۔ نصاریٰ نے کہا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ تفریط کی ــــ تو ایک ادھر بڑھ گیا اور ایک ادھر بڑھ گیا۔ جو اصلیت تھی کہ اللہ کے پاک بندے ہیں اور اس کے پاک رسول ہیں۔ اس کی طرف کوئی نہیں آیا۔ یا خدا بنایا یا معاذ اللہ ایک بدکار انسان ثابت کیا۔ یہ ہے وہ افراط و تفریط سے جس سے فرقے بنتے ہیں۔

یا جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ــ

ان فیک مثل عیسی ابن مریم

تم میں عیسیٰ ابن مریم کی مثال پائی جاتی ہے بعض فرقے تمہاری محبت میں پڑکر تباہ ہوں گے اور بعض تمہاری عداوت میں پڑ کر تباہ ہوں گے۔ تو خوارج نے تو عداوت کا راستہ اختیار کیا۔ اور یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کو قتل کردیں اور روافض کے بعض فرقے ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان میں خدا حلول کئے ہوئے ہے اور امام تسلیم کیا اور امام کے معنی معصوم کے لئے۔ اور کہا امام شریعت میں تصرف کر سکتا ہے۔ اگر وہ یوں کہے کہ پانچ نمازوں کو تین کرو' تو اسے کردینے کا حق ہے ___ حالانکہ اس کا رسول کو بھی حق نہیں' قرآن کریم میں فرمایا گیا : قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ۔

"مجھے اس کا حق نہیں ہے کہ میں قرآن کریم میں اپنے نفس کی رائے سے کچھ تبدیلی کردوں۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور میں امین ہوں"۔

غرض نبی کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ شریعت میں تصرف کرے اور وہاں امام کو حق دیدیا گیا ___ یہ ادھر غلو ہے اور وہ ادھر غلو ہے۔ یہیں سے فرقہ بندی شروع ہو گئی ___ یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے کہ بعض مسائل مختلف فیہ ہیں یعنی اختلافی مسائل میں اگر غلو نہ کیا جائے اور اعتدال سے چلا جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کچھ بھی اختلاف نہیں۔ اب اس اختلاف کو لڑنے جھگڑنے کا ذریعہ ہی بنایا جائے' یہ جذبات کی بات ہوئی۔ مسائل کی بات تو نہ ہوئی۔

عرس کا مسئلہ

اس میں دیوبند کے حضرات معتدل ہیں ___ ہاں لیجئے عرس کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرس اپنی ذات سے کوئی بری چیز نہیں۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ اہل اللہ میں سے کسی شیخ طریقت کا انتقال ہوتا تو جو متوسل ہوتے وہ جمع ہو جاتے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ جو لوگ ضعیف النسبت ہوتے انہیں قوی النسبت لوگوں سے قوت پہنچتی تھی اور تقویت حاصل ہوتی تھی' ان کی نسبت مضبوط ہوتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان کو مختلف ولایات میں بھیجا جاتا تھا کہ تم وہاں جاکے اصلاح کرو' تم وہاں جاکے اصلاح کرو ___ اور تم وہاں جاکے اسلام پھیلاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام حضرات صوفیاء کی بدولت پھیلا ہے۔ ان کے ہاں عرس کا موضوع ہی یہ تھا کہ سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر ہدایت اور تبلیغ حق کے لئے وفود بھیجے جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہاں ہر قصبے اور ہر ضلع میں تقریباً شاہ ولایت کی قبر ہے' سہارن پور میں بھی شاہ ولایت کی قبر۔ دیوبند میں بھی شاہ ولایت کی قبر۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہوں میں سنا گیا۔

وہ اصل میں یہ تھا کہ جس وفد کو بھیجا جاتا اس کا ایک امیر بنادیا جاتا۔ اس کا نام شاہ ولایت ہوتا تھا۔ وہ جہاں انتقال کر گیا وہاں دفن ہوا ___ تو شاہ ولایت کے طور پر دفن ہو گیا ___ وہ شاہ ولایت ہو گیا۔

غرض وہاں ولائتیں تقسیم ہوتی تھیں کہ تبلیغ دین کرو' مسلمانوں کی اصلاح کرو' حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں عیسائیوں کی شہادت ہے۔ مسٹر آرنلڈ نے پریچنگ آف اسلام کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یعنی اسلام کی دعوت کس طرح سے پھیلی ___ اس میں لکھا ہے کہ :

"ہندوستان میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے اور ننانوے لاکھ آدمی بلا واسطہ ان کی ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ اور جو ان کے خلفاء کے ہاتھ پر ہوئے ہیں ان کی تعداد الگ ہے"۔

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نو سو خلیفہ دکن میں پہنچے۔ وہاں جا کے اسلام پھیلایا' ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا ___ وہاں جا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں ایسی تنگ جگہ کہ آدمی کا جانا مشکل' مگر کوئی نہ کوئی مسجد موجود ہے یا مزار موجود ہے۔ وہاں تک یہ حضرات پہنچے ہیں۔ نو سو خلفاء بھیجے جنہوں نے دین پھیلایا۔

تو اصل میں عرسوں کا یہ مقصد تھا لیکن وہ ہوتے ہوتے مثل مشہور ہے۔ الولایۃ سردہ آمد رفتہ رفتہ کچرہ شد آیا تھا سردہ بن کر ہو گیا کچرہ' اب عرسوں کے معنی میلے کے ہو گئے' عورتیں اس میں' ناچ گانا اس میں' دکانیں اس میں۔ ہر طرح کی خرافات۔ اس کو کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں عرسوں کو روکتے ہیں۔ وہ عرسوں کا روکنا نہیں ہے۔ وہ خرافات کا روکنا ہے جو خلاف سنت ہی نہیں بلکہ بدعات ہیں۔ جو رسمیں پڑی ہوئی ہیں اور جہلاء کی ایجاد کردہ ہیں ___ میں کہتا ہوں اگر عرس ان چیزوں سے پاک ہو جائے وہاں سے تبلیغ کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مواعظ ہوں' تقریریں ہوں اور تلاوت ہو کوئی بھی نہیں روکتا۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے' ہر سال سرہند شریف عرس میں جاتے تھے اور دیوبند والا کوئی انہیں نہیں روکتا تھا' اس لئے کہ وہاں یہ خرافات ہی نہیں تھیں ___ یا تلاوت ہے یا تبلیغ ہے ___ یا مواعظ ہیں۔ غرض اصل میں عرس کو نہیں روکا جاتا بلکہ ان خرافات کا روکا جاتا ہے۔ عوام ان خرافات کے خوگر ہیں وہ اس پر عار دلاتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! عرس کو روک دیا۔ حالانکہ بزرگوں نے یہ رسم ڈالی ہوئی ہے ___ کیا بزرگوں۔ نے ناچ گانے کی رسم ڈالی تھی؟ اس کا منشاء تبلیغ و موعظت اور دین حق پھیلانا تھا۔ وہ تو رہا نہیں' ناچ گانا رہ گیا۔ بہرحال بہت سی چیزیں جہالت سے پیدا ہوئی ہیں۔ جب شریعت کا علم ہی نہ ہو تو خرافات ہی ہوں گی۔

اسلام کے نام پر رائج رسوم

اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ ان بزرگوں کی دیانت و تقویٰ اور پاکیزہ اعمال کو دیکھ کر قومیں متوجہ ہوئیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں لیکن تعلیم کا بندوبست نہیں ہوا ___ تو جن لوگوں کے گھروں میں ہندوانہ رسمیں تھیں۔ انہیں صورت بدل کر اسلامی رسوم قرار دیدیا۔ وہ گوگال کا جھنڈا نکالتے تھے۔ انہوں نے شیخ سدو کا جھنڈا نکالدیا' وہ ستیوں پر پرشات چڑھاتے تھے' انہوں نے قبروں پر چڑھانا شروع کر دیا ___ ساری ہی اس میں ہندوانہ رسمیں ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ اسلام کے نام سے رائج ہیں ___ یہ عرسوں پہ ہونے والی چیزیں در حقیقت کچھ ہنود سے آئی ہوئی چیزیں ہیں۔ کچھ ادھر کی کچھ ادھر کی۔ وہ پھیل گئیں۔ اب انہیں کوئی روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوں کی تعظیم نہیں کرتے۔ بزرگوں نے یہ چیزیں تھوڑا ہی پھیلائی تھیں۔ وہ مقدس لوگ تھے۔

ذکر میلاد یا جشن میلاد

اسی طرح مثلاً میلاد شریف ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ولادت تو طاعت و عبادت ہے اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ذکر میلاد کے معنی جشن میلاد کے ہو گئے ہیں۔ اب دیکھیں گے جگہ جگہ سبز مینار سے بنے ہوئے ہیں۔ روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ یہ سیرت پھیل رہی ہے۔ سیرت تو ان تکلفات کو مٹانے کے لئے آئی تھی۔ نہ ان کو رواج دینے اور مظاہرے کرنے کے لئے آئی تھی' تو دل میں تو سیرت کا نشان نہیں' بازاروں میں جھنڈوں کے اوپر' میناروں اور برجوں کے اوپر گھوم رہی ہے' سیرت آدمیوں

کے لئے آئی تھی یا جھنڈوں اور قمقموں کے لئے آئی تھی ___ ؟ مگر اس میں لگے ہوئے ہیں اور مظاہروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب اس سے روکو تو کہتے ہیں کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی نہیں اور محبت کے معنی یہ ہیں کہ یہ خرافات کرو تب تو محبت ہے۔ نہ کرو تو محبت نہیں ہے۔ اب انہیں کس طرح سمجھایا جائے۔ حدود قائم ن"ہیں رہیں۔

اب اس میں علمائے کرام اگر ان خرافات سے ٹوکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نیا اسلام کہاں سے لا رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی نزدیک تو ان کی گھروں سے جو اسلام آیا ہے۔ وہ یہ رسوم ہیں۔ اور جو لوگ رسوم سے روکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ نئے لوگ کہاں سے رسوم کو روکنے کے لئے آگئے ہیں۔ حالانکہ ان رسوم کو روکتے ہیں جو جاہلانہ طریق پر مروج ہیں۔ اصل شئے کو نہیں روکتے۔ اس کو کوئی نہیں سمجھتا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ نے ایک تجربہ لکھا ہے کہ جو لوگ قبروں پر طواف اور سجدے کرنے جاتے ہیں انہیں حج کی توفیق کم ہوتی ہے اس لئے کہ جو جذبہ ادھر خرچ کرنا تھا وہ ادھر خرچ ہو گیا۔

جو لوگ گانے بجانے میں رہتے ہیں انہیں تلاوت قرآن کریم کی کم توفیق ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ جذبہ ادھر لگ گیا۔ اور اسلام اس لئے آیا تھا کہ یہ جذبات دین کے بارے میں صرف ہوں ___ قرآن وحدیث کے بارے میں صرف ہوں تو نہ تو تعلیم ہے کہ مسائل معلوم کریں جس سے سیرت کی حقیقت معلوم ہو اس پر عملدرآمد کریں۔ نہ تمرین و ٹریننگ ہے۔ بس جو رسمیں چل پڑیں جس نے بھی ایجاد کردیں۔ بس سبحان اللہ بہت عمدہ چیز ہے۔ چند دن کے بعد وہی دین بن گیا۔ تو ان چیزوں کو روکتے ہیں نہ کہ اصل دین سے روکتے ہیں۔

دیو بندی بریلوی کوئی فرقہ نہیں

اس لئے میری سمجھ میں اب تک بھی نہیں آیا کہ وہ اختلاف ونزاع ہے کیا چیز جس کو بریلویت اور دیوبندیت کے نام سے کھولا جارہا ہے۔ دیوبندیت کوئی فرقہ تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو اہلسنت والجماعت ہیں۔ دیوبندیت کی جو نسبت ہے وہ تعلیمی نسبت ہے کہ دیوبند میں تعلیم پائی' دیوبندی مشہور ہوگئے' جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم وہ علیگ کے نام سے مشہور ہوگئے ___ ندوہ میں تعلیم پائی وہ ندوی کے نام سے مشہور ہوگئے' باقیات صالحات مدراس میں تعلیم پائی تو وہ باقوی کے نام سے مشہور ہوگئے ___ اب یہ فرقہ تھوڑا ہی ہیں کہ ندوی ایک فرقہ' باقوی ایک فرقہ اور دیوبندی ایک فرقہ۔

یہ تو تعلیمی نسبت ہے مگر فرقہ بنادیا۔

انگریز کا انتقام

بنیاد اصل میں ساری یہ ہے کہ دیوبندی جماعت انگریزوں کے مقابلہ میں کھڑی ہوئی تھی۔ تلوار لے کر جہاد کیا۔ تو انگریزوں کے دل میں اس جماعت سے عداوت تھی مگر یہ قوم بہت دانش مند ہے ___ کھلے بندوں مقابلہ نہیں کرتی۔ تدبیر ایسی کرتی ہے کہ وہ آپس میں الجھ جائیں' اور باہمی نفرتیں پیدا ہوجائیں ___ اس نے لوگوں کو ہموار کیا کہ ان کو بدنام کرو' چنانچہ جو لوگ رد بدعات کرتے تھے تو ان کے مقابلہ میں جو بدعات میں مبتلا تھے۔ ان کے لئے موقع ملا کہ تم ڈنڈا لے کر کھڑے ہوجاؤ' وہ کھڑے ہوگئے ___ اب یہ بدعات کا رد کرتے ہیں۔ وہ لوگ مقابلہ پر آگئے بس پھر فرقہ بندی کی ٹھن گئی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بدعات رد کرنے کی ہی چیز ہے۔

ردبدعات اور اتباع سنت

مسلمان تو اتباع سنت کے لئے آیا ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اس نمونے پر میں عمل کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ صلوا نماز پڑھ لیا کرو' یہ فرمایا :

صلوا کما رایتمونی اصلی۔
''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو''۔

اس طریق پر نماز ہوگی' مقبول ہے' نہیں ہوگی نامقبول ہے۔
حج کرو جس طرح مجھے کرتے ہوئے دیکھو۔ خود ساختہ طریق پر کرو گے وہ حج نہیں ہوگا غرض ہم تو پیروی سنت کے لئے آئے ہیں۔ قرآن سے علم لیا' حدیث سے عمل لیا' فقہ سے اس کی تشریح لی۔ بس اس پر عمل کرو۔ اس کے جو خلاف ہے ظاہر بات ہے کہ وہ عمل کے قابل نہیں۔ جو ان کے خلاف کہے گا وہ اسے بدنام کریں گے اس لئے کہ وہ ان کی رسوم کی خلاف پڑتا ہے۔ اور لوگ رسموں کے عادی ہو گئے' دین کی حقیقت قلوب میں نہیں۔ یہ ساری بنیاد ہے۔ ورنہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نزاع کیا ہے۔ اللہ و رسولؐ کے ماننے والے تم بھی۔ بیعت وارشار کا سلسلہ تمہارے ہاں بھی' طریقت تمہارے ہاں بھی۔ یہ ساری چیزیں مشترک ہیں۔ آخر نزاع کیا ہے۔؟۔ عرس و میلاد' یہ نزاعی مسئلے ہیں؟ فروعی چیزیں ہیں۔ ان میں جو خرافات آئی ہیں وہ جاہلوں کے راستے سے آئی ہیں۔ جو واقعی چیزیں ہیں اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کرو۔

اتباع آباء

اب مثلاً جنازے کی نماز ہے۔ تو اس میں سنت طریق یہ ہے کہ نماز پڑھ لی۔ اور میت کو لے جا کر دفن کرو اب اس کے بعد مستقل ایک دعاء مانگی جاتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی تو دعاء ہے اس نماز میں یہ تو نہیں ہے کہ اس میں رکوع و سجدہ ہو وہ تو شفاعت و سفارش اور دعاء ہے۔ اب اس کے بعد پھر دعاء اور بعض نے قبروں پر اذانیں دینی شروع کر دیں ___ سنت سے کہیں اس کا ثبوت نہیں۔
اب اگر کہو تو کہتے ہیں یہ دین تو ہم نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے۔ تو کفار مکہ جو کہا کرتے تھے :

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا۔

باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا ہے ___ تو قرآن کریم نے جواب دیا۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔

''کہ تمہارے باپ دادا چاہے نہ علم رکھتے ہوں اور نہ راستے پر ہوں۔ پھر بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ یہ تو تعصب ہے''۔

حق پسندی تو یہ ہے کہ حکم رسول بھی آجائے تو اسے مانو۔ اور اتباع سنت کو غالب رکھو۔

غلبۂ آداب شریعت

ہم نے تو ان دیوبندی بزرگوں میں یہ دیکھا جو صاحب حال بھی تھے' دلوں میں سوز بھی تھا' مگر شریعت کا ادب غالب ہے۔ اس سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ کوئی سنت ترک ہو جائے۔ خواہ جان پہ بن جائے۔ مگر سنت ترک نہ ہو۔
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ علیہ جو انگریز کے خلاف ہونے والے جہاد میں امیر جہاد

تھے۔ گورنمنٹ عدل وانصاف کی تو تھی نہیں۔ ذرا ذرا سے حیلوں پر علماء کو پھانسیاں دی جارہی تھیں۔ اور حضرت کھلے بندوں پھرتے، چھتے کی مسجد میں گئے، مخبر نے خبردی کہ اس وقت چھتے کی مسجد میں موجود ہیں تو پولیس نے آکر مسجد کو گھیر لیا۔ ایک سارجنٹ اندر آیا۔ آکر حضرتؒ سے پوچھتا ہے کہ مولوی محمد قاسمؒ کہاں ہوں گے۔؟

دو قدم پیچھے ہٹ کر حضرت نے فرمایا :

"ابھی تو یہیں تھے۔ دیکھ لیجئے یہیں ہوں گے"۔

وہ دیکھتے رہے اور آپ شاہ رکن الدین کی مسجد میں پہنچ گئے۔ وہاں پولیس نے گھیرا ڈالا تو وہاں سے نکل کر شاہ ولایت کی مسجد میں پہنچ گئے۔ بس یوں ہی چکر دیتے رہے ___ ان کے سالے شیخ نہال احمد صاحب مرحوم جو گاؤ گیاؤں کے مالک تھے۔ دیوبند سے کوئی آٹھ دس میل پہ جو چکوالی گاؤں ہے وہ ان کا تھا۔ انہوں نے منت خوشامد کی۔ کہ ٹھیک ہے تم یہاں تو رکتے نہیں۔ میں تمہیں لے جاکے گاؤں میں رکھوں گا ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔

چنانچہ مخبر نے پھر خبردی کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ چکوالی میں ہیں۔ تو پولیس نے آکر سارے گاؤں کا گھیرا ڈال لیا۔

اب وہ یورپین افسر تھا۔ وہ اندر آیا۔

حضرتؒ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ فرمایا :

آیئے، تشریف لایئے۔ فرمایا، چائے بنواؤ۔

چنانچہ ان کے لئے چائے بنی ___ اس نے کہا کہ آپ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے واقف ہیں ___ حضرت نے فرمایا :

جی ہاں خوب واقف ہوں۔

اس نے کہا کیسے آدمی ہیں ___ فرمایا :

نیک آدمی ہیں پڑھے لکھے ہیں۔

اس نے کہا میں تلاشی لینا چاہتا ہوں ___ فرمایا :

شوق سے لیجئے۔

تو جس کی تلاش تھی وہی تو تلاشی دلا رہے تھے۔

ایک ایک کمرہ دیکھا، پتہ نہیں چلا ___ خیر وہ شکریہ ادا کر کے واپس ہوا۔ باہر جاکے اس نے کارڈ نکال کر حلیہ دیکھا تو اس نے کہا کہیں یہی تو نہیں تھے؟ واپس ہوا تو حضرتؒ نانوتہ جاچکے تھے، وہ نانوتہ گیا۔ تو حضرت دیوبند آچکے تھے، آخر کار عزیزوں نے مل کر مجبور کیا کہ چند روپوش ہو کر گھر میں رہیں ___ تو حضرتؒ کی سسرال دیوبند میں تھی، دیوان کا محلّہ ہے۔ بہت بڑا محل ہے۔ وہ بڑے رئیس لوگ تھے انہوں نے مجبور کرکے ٹھہرایا۔

تین دن بعد پھر گھر سے نکل آئے۔

لوگوں نے کہا کہ حالات مخدوش ہیں۔

فرمایا۔ تین دن سے زیادہ چھپنا خلاف سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو ہجرت کے لئے تشریف لے گئے ہیں تو تین دن غار ثور میں چھپے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کا اتباع بھی نصیب ہو گیا۔ تو انہیں جان کی پرواہ نہیں تھی 'اتباع سنت غالب تھا۔ میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کو دیکھا کہ سبق پڑھا رہے تھے' جتنی طالب علم عبارت پڑھ رہا ہے' اتنی ذکر کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کون ذکر کر رہا ہے ___ وہ خود حضرتؒ ذکر کرتے تھے۔ جب وہ عبارت پڑھ چکا۔ تقریر کی' مطلب بیان کیا' اس نے اگلا صفحہ پڑھا' پھر ذکر میں مشغول ہو گئے۔

اور اس میں کیفیت یہ تھی کہ رقت قلب سے آنسو آئے تو اس کو اس طرح پیتے تھے کہ دوسروں پر نہ کھلے کہ آنسو آئے ہیں۔ بالکل ضبط کرتے تھے۔ اداب شریعت اتنا غالب تھا کہ وہ اپنے حال قال کو آگے نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ شریعت کو امام رکھتے تھے۔ یہی طریقہ ہم لوگوں کا ہے کہ حال بھی پیدا کرو' سوز و گداز بھی پیدا کرو۔ ذکر اللہ بھی پیدا کرو' قلب میں رقت بھی ہو' مگر ادب شریعت کا غالب رہے۔

اب کوئی اگر بالکل ہی مغلوب الحال ہو جائے تو مستثنیٰ ہے۔ ہو معذور ہے' اس پر کوئی گرفت نہیں ___ لیکن جہاں تک ارادے اور حواس کا تعلق ہے تو حال کو مغلوب کرو' اور شریعت کو اس پر غالب کرو۔

ابو الحال اور ابن الحال

اس لئے ان حضرات کے ہاں دو لقب ہیں۔ ایک ابو الحال اور ایک ابن الحال' ابو الحال تو وہ ہے جو حالات پر غالب آئے اور سنت کو غالب کر رکھے' یہی ان کا طریقہ تھا' اور ابن الحال وہ ہے جو حالات سے مغلوب ہو جائے غرض ان کے ہاں بیعت و ارشاد بھی تھی' حال و قال بھی تھے ساری چیزیں تھیں مگر اتباع سنت کا غلبہ تھا۔ دین کی عظمت' دین کا ادب یہ ہر چیز سے مقدم تھا۔

اور ہم تو مختصر لفظوں میں یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ایک ہے قانون عام جو سب کے لئے عام ہے' وہ قانون شریعت ہے ہر کس و نا کس کے لئے پیغام ہے۔ اور ایک طریقت ہے' وہ شخصی احوال کا نام ہے۔ اور ایک شخص کا حال دوسرے پر حجت نہیں ہوتا' اس واسطے وہ نظیر میں نہیں پیش کیا جائے گا کہ فلاں ایسا ہے تم بھی ایسے کرو' ہر ایک کا حال الگ الگ ہے۔ جو سب کے لئے یکساں ہے وہ قانون شرعی ہے ___ تو طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ کوئی بہت بلند پہنچ گیا' کوئی نیچے رہ گیا' نیچے والا یہ چاہے کہ میں کود پھلانگ کر اس تک پہنچ جاؤں' فطرت کے خلاف ہے۔ کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ پہنچا دے' پہنچ جائے۔

بس یہ فرق ہے ورنہ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا اختلاف ہے؟ ایک طوفان برپا ہے اور تکفیر جاری ہے' فلاں کافر' فلاں کافر' لوگوں نے اپنی خصوصیات کا نام اسلام رکھ لیا ہے۔ حالانکہ اسلام بہت بلند و بالا چیز ہے۔

مدارس کی صورتحال پر ایک فکر انگیز انٹرویو‘

مختصر پس منظر

بیس سال قبل ۱۳۹۴ھ (مطابق ۱۹۷۴ء) میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ مدینہ پاک تشریف لائے۔ اس موقع پر محترم و مکرم جناب قاری بشیر احمد صاحب دام مجدھم کے مکان پر (جو اس زمانہ میں پاک و ہند کے بزرگوں کی اقامت گاہ تھی) حضرت رحمہ اللہ سے مدارس عربیہ کی موجودہ صورتحال پر مجھے ایک انٹرویو ٹیپ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

مدارس کی صورتحال اور ان سے متعلق اصلاحی تدابیر پر حضرت قاری صاحبؒ کی رائے گرامی انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور بیس سال کی مدت گزرنے کے باوجود اس انٹرویو کی تازگی، نافعیت اور شفاء بخشی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، بلکہ مدارس کی موجودہ فضا میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اس انٹرویو کو کیسٹ سے کاغذ پر منتقل کرتے وقت تحریری انداز اختیار کرنے کے بجائے کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان حضرتؒ کے الفاظ اور فقرے بعینہٖ نقل ہوں تاکہ ان کے مفہوم اور تاثر میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

اُمید ہے کہ متعلقہ حلقوں میں اسے پوری توجہ سے پڑھا جائے گا اور اساتذہ و تلامذہ اس کی روشنی میں اپنے لئے لائحہ عمل طے کر سکیں گے۔

واللہ الموفق

احقر محمود اشرف عثمانی

۵۔۵۔۱۴۱۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نصابِ تعلیم

س: کیا جناب مدارس کی موجودہ صورتحال سے مطمئن ہیں؟

ج: جہاں تک نصابِ تعلیم کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابلِ اطمینان ہے یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، جزوی ترمیم اور تغیر البتہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، البتہ اصول وہی ہیں جو نہیں بدل سکتے، جیسے صحاح ستہ، قرآن کی تعلیم، باقی جتنے فنونِ آلیہ ہیں، مبادی ہیں ان میں جزوی طور پر تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ نوعی طور پر نصاب وہی باقی رہا، اس لئے جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابلِ اطمینان ہے۔

طرزِ تعلیم

دوسری چیز ہے اصل میں طریقۂ تعلیم وہ تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ اور میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کا اثر

استعدادوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانہ کے حضرات اساتذہ ایجاز اور اختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشین ہو جاتی تھی، اور جب طالب علم نے کتاب دیکھی مطلب سامنے آ گیا، اب لوگ اس مسئلہ کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، لمبی لمبی تقریریں اس سے استعداد خراب ہوتی ہے۔ ایک تو یہ فرق پڑ رہا ہے جن سے استعدادیں کمزور ہو رہی ہیں۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سے یہ عوامیت کے نام پر جمہوریت چلی اس میں سارے عوام الناس آزاد ہو گئے۔ طلباء بھی بہر حال جوان ہیں، لڑکے ہیں ان پر بھی اثر پڑا، وہ جو عوام کا یا خوردوں (چھوٹوں) کا بزرگوں سے ربط تھا اس میں کمی ہو گئی۔ اس سے علمی قوت میں کمی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ خورد کا یا تلمیذ کا تعلق استاذ سے قوی ہو، اس میں ادب بھی ہو، تعظیم بھی ہو، اعتماد بھی ہو، اس میں جتنی کمی پڑے گی، استعداد میں اتنی ہی کمی پڑے گی۔

تو موجودہ حالات کی وجہ سے ایک اخلاقی کمی ہو رہی ہے اور ایک طرز تعلیم کے بدلنے سے نفس تعلیم (اصل تعلیم) میں کمی ہو رہی ہے تو اس کا استعدادوں پر خراب اثر پڑ رہا ہے، باقی جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ بحمد اللہ قابل اطمینان ہے، اور مدارس میں عامۃً جو بڑے مدارس ہیں ان میں اساتذہ بھی ذی استعداد ہیں اور چھوٹے مدارس میں تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔

معلم کا اثر

س: بعض حلقوں کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جانا چاہئے، اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اور ہم نے اس پر عملدرآمد بھی کر لیا ہے جدید قسم کے جو علوم و فنون جن سے عقائد کے اوپر اثر پڑ رہا ہے خواہ وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے پڑے مگر پڑ رہا ہے۔ جیسے مبادیاتِ سائنس ہیں، فلسفۂ جدید ہے، ہیئت جدیدہ ہے اس کو لوگ ذریعہ بناتے ہیں دینیات کی تردید کا، حالانکہ وہ ذریعہ ہیں تقویتِ دین کا، سائنس جتنی بڑھے گی میں سمجھتا ہوں اسلام کو اتنی تقویت ملے گی، اس لئے کہ اسلام نے عقائد و نظریات کے لحاظ سے جو دعوے کئے ہیں ان کے دلائل سائنس مہیا کر رہی ہے، تو دعویٰ ہم کرتے ہیں مگر دلائل وہ لوگ مہیا کرتے ہیں جو اس کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھ سے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ اس لئے سائنس "منافی تو کیا ہوئے" معین و مددگار ہے، خرابی در حقیقت ماحول کی ہے، کیونکہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں جو غلط نظریات اور غلط فکر لئے ہوئے ہے اس لئے ان فنون کا اثر برا پڑتا ہے۔ لیکن اگر صحیح پڑھانے والے ہوں، تو وہی ذریعہ بن جائیں تقویت دین کا--- آخر یہ قدیم فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی پڑھاتے ہیں اس کا برا اثر کیوں نہیں پڑا اور موجودہ فنون کا کیوں پڑا رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں کہ دین ان میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے اس لئے عقائد پر ذرا برابر برا اثر نہیں پڑتا اور موجودہ زمانے میں عموماً پڑھانے والے وہ ہیں کہ نہ ان کی اخلاقی حالت درست، نہ ماحول درست، اس کا اثر برا پڑتا ہے ورنہ اسلام میں تنگی نہیں،

اسلام نے تو ہر علم و فن کی تحقیق کی اجازت دی ہے سوائے مخصوص چند علوم کے کہ جن سے روکا ہے کیونکہ وہ علوم نافع نہیں ہیں۔ عام طور سے فرمایا گیا ہے:

کلمة الحکمة ضالة الحکیم حیث وجدها فھوا حق بھا — کہ حکمت کی بات دانا کی گمشدہ چیز ہے، جب وہ اسے پالے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔

ان جیسی روایتوں نے بتلایا کہ علم بہر حال جہل سے بہتر ہے۔ سوائے ان علوم کے کہ جو مضر ہیں کہ ان کا عام علم ہی رکھنا فضول ہے کیونکہ وہ فی الحقیقت ضائع ہیں۔

تو علم کسی بھی فن کا ہو وہ بُرا اثر نہیں رکھتا، وہ معلم کا اثر پڑتا ہے۔ معلم اگر صاحب قال، صاحب حال، صاحبِ اخلاق ہے تو اسی سے اخلاق پیدا کر دے گا اور اگر خود بد اخلاق ہے، بد فکر ہے تو وہ قرآن و حدیث سے بھی بد فکری ذہن میں ڈال دے گا، اس لئے نئے علوم میں سے اگر اس حد تک لئے جائیں کہ جس حد تک وہ معین بنتے ہوں دین کے حق میں، یا جو ذریعہ بنے ہوئے ہیں دین پر اعتراضات کا تو میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ، انہیں ضرور حاصل کرنا چاہئے۔

طلباء کی اخلاقی حالت

س: حضرت! ابھی آپ نے طلباء کی اخلاقی حالت کا ذکر فرمایا ہے تو ہم یہ بات اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ مدرسہ اور خانقاہ کوئی علیحدہ چیز نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک ہی چیز ہے، مدرسہ خانقاہ بھی ہوتا تھا، طلباء کو تعلیمی طور پر بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی درست کئے جاتے تھے، تو اب یہ صورتحال کیوں بدل گئی اور اس کی اصلاح کی کیا تدابیر ہیں؟

ج: یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا۔ نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھلا رہے ہیں یا طریقت سکھلا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرزِ عمل، ان کا کردار، کریکٹر وہ تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہو جاتے تھے تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے، اور کمی کی بناء پر جو کچھ بھی ہو، مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیہ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے۔

رابطہ کا فقدان

س: حضرت! کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلباء کے درمیان اب ربط نہیں رہا؟

ج: میں تو سمجھتا ہوں کہ فتن اس کی بنیاد ہیں' حالات اتنے بگڑ چکے ہیں اور مزاج اتنے فاسد ہو چکے ہیں کہ وہ جو ایک رجحان اور ایک عقیدت اور ایک محبت اساتذہ سے ہوتی تھی وہ نہیں ہے، کچھ تو حالات کا اثر ہے۔ اور مثل مشہور ہے "کچھ لوہا کھوٹا، کچھ لوہار کھوٹا" کمی تھوڑی بہت اساتذہ میں بھی آئی ہے، ان کو جس درجہ کا معیاری ہونا چاہئے نئے اساتذہ میں وہ چیز کم ہے تو طلباء پر اثر پڑنا لازمی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اساتذہ چند سالوں کے بعد پروانے بن کر کسی اونچے مقام پر پہنچ جائیں، لیکن ابتدائی حالت اساتذہ کی، نوجوان اساتذہ کی وہ نہیں ہے جو ان

کے اساتذہ کی تھی۔

اساتذۂ کرام کا معیار

ہم لوگوں نے تعلیم پائی، اس وقت اساتذہ علمی اعتبار سے بھی معیاری تھے اور تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے بھی معیاری تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا انور شاہ کشمیریؒ) پر اتباع سنت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کے طرز عمل کو دیکھ کر ہم مسئلہ معلوم کر لیتے تھے، اور وہی مسئلہ نکلتا تھا جو ان کا طرز عمل تھا، اس درجہ گویا وہ منہمک تھے اور ہمہ وقت انہیں فکر آخرت ضرور رہتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دوپہر کو چھوٹی مسجد میں آکے قیلولہ کرتے تھے تو عموماً گھٹنے پیٹ میں دے کر لیٹا کرتے تھے، یعنی سکڑ کے، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پیر پھیلا کے لیٹے ہوں، تو میرے خسر مولوی محمود صاحب رامپوری مرحوم، طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب کے ساتھ چھوٹی مسجد ہی میں رہتے تھے تو ابتداء میں وہ سمجھے کہ امر اتفاقی ہے لیکن جب دیکھا کہ عادت ہی یہ ہے کہ انہوں نے ایک دن پوچھا کہ آپ پیر پھیلا کے کبھی نہیں سوتے؟ فرمایا کہ "بھائی پیر پھیلا کے سونے کی جگہ قبر ہے، دنیا نہیں"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ہر وقت فکر آخرت سوار تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ ہی کا واقعہ ہے، جلالین شریف ہم نے ان کے یہاں پڑھی آیت یہ آئی کہ "لیس للانسان الا ما سعی" آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے سعی کہ ہے، یہ نہیں کہ کسی غیر کی سعی اس کے کام آجائے۔ ادھر تو یہ آیت اور ادھر روایت میں ایصالِ ثوب ثابت، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی سعی کام آگئی۔ اب آیت اور روایت میں ایک قسم کا تعارض، جب یہ آیت پہنچی تو حضرت مفتی صاحب نے کتاب میں مثبت پہلو میں مطلب سمجھا دیا اور بعد میں یہ فرمایا کہ میں اس میں الجھا ہوا ہوں اور ابھی رفع تعارض کی صورت سمجھ میں نہیں آئی کہ حدیث بتلاتی ہے کہ دوسرے کی سعی کار آمد ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ قطعاً کار آمد نہیں، تو فرماتے تھے کہ کتابیں دیکھیں رجوع کیا کتابوں کی طرف، مگر تشفی نہیں ہوئی، ایک دن گھر تشریف لائے، رات کا وقت، گرمی کا زمانہ، چارپائی پر لیٹے تو خیال یہ بندھ گیا کہ تجھے ایک آیت میں شک ہے، اگر اسی حالت میں موت آگئی تو آیت خداوندی میں شک لے کر جائے گا تو تیرا ایمان کہاں رہے گا، ؟ یہ تو "ریب" کی کیفیت ہے۔ بس یہ جذبہ آنا تھا کہ اسی وقت کھڑے ہوگئے اور پیدل سفر شروع کر دیا گنگوہ کا کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) کے پاس جا کر تحقیق کروں گا، پہلا جذبہ تو اس سے معلوم ہوا فکر آخرت کا کہ وہ (اس علم کو) محض ریسرچ یا تحقیق نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی آخرت سمجھتے تھے، جب آیت میں ایک قسم کا شک ہے تو وہ ریب ہوا، اور ایمان میں اگر ذرا سا بھی ریب ہو تو ایمان کی بقاء مشکل ہے۔ یہ جذبہ تھا اصل میں محض علمی تحقیقات نہیں تھیں۔

پیدل سفر کر لیا گنگوہ کا ساری رات چلتے رہے حالانکہ عادت نہیں تھی پیدل سفر کرنے کی، آخر شب میں گنگوہ پہنچے، صبح کی نماز کا وقت تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وضو فرما رہے تھے، انہوں نے سلام کیا، فرمایا کون؟

عرض کیا عزیز الرحمٰن، فرمایا کہ اس وقت! کیا رات آئے تھے؟ کہا کہ رات بھر سفر کیا بس ابھی پہنچا ہوں، فرمایا ایسی کیا ضرورت پیش آئی جو ساری رات سفر کیا؟ انہوں نے کھڑے کھڑے وہ اشکال پیش کر دیا کہ حضرت' یہ ایک اشکال ہے کہ آیت میں نفی ہے کہ کسی کی سعی کسی کے کام نہیں آئے گی اور احادیث میں اثبات ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آ جائے گا ایصالِ ثواب کی صورت میں۔ یہ تعارض رفع نہیں ہو رہا۔

حضرت گنگوہیؒ نے وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ لیس للانسان الا ما سعی میں سعی ایمانی مراد ہے۔ یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا یعنی نجات کا ذریعہ نہیں بنے گا، عمل کی نفی نہیں کی، تو حدیث ثابت کر رہی ہے عمل کا فائدہ پہنچے گا اور آیت نفی کر رہی ہے سعی ایمانی کی کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا، اس میں کوئی تعارض نہیں تو یہاں ایمان مراد ہے وہاں عمل مراد ہے۔ آیت میں جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے حدیث میں اس کا اثبات نہیں اور حدیث جسے ثابت کر رہی ہے قرآن میں اس کی نفی نہیں تو تعارض کہاں آ گیا؟

تو مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے یہ معلوم ہوا کہ جیسے علم کا ایک دریا میرے اندر سے پھوٹ گیا' تو یہ عزیر (وسیع) اور گہرا علم تھا ان اکابر کے ایک ایک لفظ میں۔

کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت، حدیث میں بدعت کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد.　　جو ہمارے دین میں احداث کرے اور دین کے ذوق کی چیز نہ ہو تو وہ چیز مردود ہے۔"

اس پہ کسی نے کہا کہ پھر یہ مدارس بھی مردود ہونے چاہئیں، یہ قرنِ اول میں کہاں تھے؟ اور یہ مدرسوں کے لئے گھنٹوں کا تعین اور گھنٹا بجانا یہ کہاں تھا؟ اور یہ جماعت بندی (کلاس بندی) یہ سارے بدعات و محدثات ہیں تو حدیث کی رو سے ممنوع ہونے چاہئیں۔

حضرت نے ایک مختصر سا جواب دیا، فرمایا کہ:

احداث فی الدین کی ممانعت ہے، احداث للدین کی ممانعت نہیں۔

ان دو لفظوں میں (مسئلہ) کھول دیا۔ یعنی یہ احداث جو ہے "لتقویة الدین لاعانة الدین لنصرة الدین" ہے۔ عین دین کے اندر اضافہ نہیں ہے۔ کسی مدرسہ میں صبح کے گھنٹے مقرر ہیں کسی میں شام کے، یہ نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ رہے ہیں کہ یہی چار گھنٹے ہونے چاہئیں، دوسرے نہ ہوں، ایک تدبیر ہے۔ ایک معالجہ ہے، تو احداث للدین اور فی الدین کے فرق سے حضرتؒ نے سارے اشکالات رفع فرما دیئے۔

اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے

اسی پر مجھے یاد آیا کہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے زمانے میں کوئی عرب ہندوستان پہنچ گئے۔ تو ہندوستان

میں عربوں کی آمد و رفت اس زمانہ میں نہ تھی، کوئی عرب آ گیا تو لوگ چیلوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑتے تھے کہ عرب صاحب، عرب صاحب! اور عقیدت و محبت سے ہر ممکن طرح مدارات کرتے تھے، ان عرب صاحب کا بھی خیر مقدم ہوا، شافعی تھے، اتفاق سے کسی مسجد میں جہاں سارے جاہل جمع تھے، انہوں نے نماز پڑھی اور رفع یدین کیا جیسا شوافع کرتے تھے وہاں سارے جاہل جمع تھے، وہ سمجھے کوئی بددین ہے اسے نماز پڑھنی نہیں آتی، تو نماز کے بعد تُو تُو میں میں شروع ہوئی، حتیٰ کہ ان عرب پر ہاتھ ڈالا اور انہیں پیٹ دیا۔ اب وہ مہمان تھے، مولانا شہیدؒ کو خبر ہوئی ہے، غصہ آیا، فرمایا کہ اول تو زدوکوب! پھر عرب سے آیا ہوا مہمان جو واجب التعظیم ہے، حکم دیا کہ آج سے ساری مسجدوں میں رفع یدین ہوا کرے گا، ترک رفع ختم، اب صاحب تمام مسجدوں میں رفع یدین شروع ہو گیا، کئی دن گذرے تو کہیں رفع یدین اور کہیں ترکِ رفع، ایک عجیب فتنہ بپا ہوا۔ (ہنس کر فرمایا) اور حقیقی معنی میں رفع یدین شروع ہو گیا، ہاتھا پائی، مار کٹائی میں بھی رفع یدین ہی ہوتا ہے۔

غرض بہت فتنہ ہوا تو لوگ گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس کہ حضرت! وہ آپ کے بھتیجے نے بڑا فتنہ برپا کر دیا اور حکم دے دیا کہ ہر مسجد میں رفع یدین ہو گا تو بڑی مصیبت ہو گئی اور فتنہ پھیل گیا آپ انہیں سمجھائیں۔

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی! اسمٰعیل کی ذہانت اور ذکاوت سے تم واقف ہو، وہ میرے سے زیر نہیں ہو سکے گا، وہ ذہین اور طباع ہے، میں ایک چیز بیان کروں گا وہ بیس احتمال نکال کر مجھے ہی بند کر دے گا، خود اس کی اصلاح کیا ہو گی، اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ خاندان میں شاہ عبدالقادرؒ صاحب کی سب عظمت کرتے ہیں، چھوٹے اور بڑے، حالانکہ وہ سب سے چھوٹے بھائی تھے، مگر بڑے بھائی بھی ان کے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ان کی عظمت کرتے تھے، چالیس برس اعتکاف کیا ہے، اکبری مسجد میں اور سوائے قرآن کے اور کوئی شغل نہیں تھا، اور جس دن ان کی وفات ہوئی تو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ پر منکشف ہوا کہ دِلّی کے سارے قبرستانوں سے آج عذاب قبر اٹھا لیا گیا ہے، ان کی آمد کے احترام میں، تو اس درجہ کے تھے شاہ عبدالقادر صاحبؒ۔

تو شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے سامنے لوگوں نے کہا کہ آپ کے بھتیجے نے فتنہ برپا کر دیا ہے، کہا بلاؤ اسمٰعیل کو۔ خیر مولانا اسمٰعیل شہید حاضر ہوئے، فرمایا: میاں اسمٰعیل! تم نے حکم دیا ہے کہ رفع یدین ہوا کرے؟ کہا جی حضرت! فرمایا کیوں؟ کہا حضرت یہ سنت اتنی مردہ ہو چکی تھی کہ اس کے عمل درآمد کرنے پر لوگ پیٹے جانے لگے اور حدیث میں ہے:

من احیا سنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید	جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

تو میں نے احیائے سنت کیا ہے، اس درجہ مردہ ہو گئی یہ سنت کہ عمل کرنے پر لوگ مارے پیٹے جانے لگے، اس لئے میں نے حکم دیا کہ یہ سنت زیر عمل آ جائے۔

فرمایا کہ میاں اسمٰعیل! ہم تو یہ سمجھے تھے کہ تم نے حدیث کچھ سمجھ کر پڑھی ہو گی، تمہیں تو مس بھی

نہیں فہم حدیث سے، کیا مطلب، ہے احیاء سنت کا؟...

فرمایا کہ احیاء سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت ختم ہو کر بدعت اس کی جگہ لے لے گا، وہ احیاء سنت ہے جو ماتہ شہید کے برابر ہے، اور یہاں تو سنت کے مقابلہ میں خود سنت موجود ہے، رفع یدین اگر سنت ہے تو ترک رفع بھی سنت ہے اگر ایک امام ادھر گیا ہوا ہے، ایک ادھر، احیاء سنت کا یہ موقعہ کون سا ہے؟ احیاء سنت وہاں ہے کہ سنت ختم ہو اور بدعت اس کی جگہ آجائے، یہاں کون سی بدعت ہے؟

کہا حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی، پھر ساری مسجدوں میں خود کہتے پھر رہے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، لوگ اسی طرح ترک رفع کے ساتھ نماز پڑھیں۔

تو یہ بات مجھے اس پر یاد آئی کہ ان اکابر کے یہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں ایک جملہ سے مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا اور یہ جب بھی ہو سکتا ہے کہ استعداد نہایت قوی اور استحضار ہو علم کا اب محنتیں تو ہیں نہیں قوی بھی ویسے نہیں، استحضار وہ نہیں ہے علوم کا، جو کچھ کتاب میں دیکھا وہ صبح کو بیان کر دیا، وہ نقل اور سرد روایت ہوتا ہے جو وہ قلبی کیفیت ہے وہ شامل نہیں ہوتی، اس لئے استعدادوں پر بُرا اثر پڑا ہے۔ تو نہ تو نصاب میں خرابی ہے اور نہ کسی اور چیز میں، بلکہ کچھ طرزِ تعلیم کی، اور کچھ اساتذہ کے ترقی نہ کرنے کی، کہ وہ پڑھ رہے ہیں کہ بس پڑھا دیں گے، پیشہ سا سمجھ لیا ہے یہ وجہ ہو رہی ہے استعدادوں کی کمی کی۔

طلبہ کی سیاسیات میں شرکت کے آثار

اور ادھر طلبہ، کہ ملک کے حالات جمہوریت کے نام پر ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ یکسوئی تھی وہ باطل ہو گئی۔ ہر طالبعلم کو فکر کہ تھوڑا سا سیاسیات میں شریک ہو اور تھوڑا سا اجتماعیات میں۔ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ:

"العلم لا يعطيك بعضه حتى تعطيه كلك" علم اپنا بعض اس وقت نہیں دے گا جب تک تم اپنا کل اسے نہ دے ڈالو۔

اب تم تو جز دو اور اس کا کل لینا چاہو تو یہ ہو گا کیسے تو طالب علم کہیں ادھر متوجہ، کہیں ادھر متوجہ، کہیں معاش اور کیا کیا، اسی میں ضمناً اس نے علم کی طرف بھی توجہ کر لی تو استعداد بنے گی کہاں سے؟

اس لئے میں نے عرض کیا کہ "کچھ لوہا کھوٹا کچھ لوہار کھوٹا" کچھ اساتذہ آگے نہیں بڑھنا چاہتے، کچھ طالب علموں میں محنت کی کمی، اب وہ قصور بتا دیتے ہیں نصاب کا...... حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب ہمارے استاذ بہت مختصر گو تھے، کسی نے ان سے ذکر کیا کہ حضرت! نصاب میں کچھ تغیر تبدل ہونا چاہئے، تو جیسے ان کی عادت تھی، ایک لمبی سی، "ہوں" کر کے فرمایا: دیکھو تعلیم کے سلسلہ میں تین چیزیں ہیں۔ (۱) ایک اساتذہ (۲) ایک تلامذہ (۳) ایک نصاب تعلیم۔ تو اساتذہ کی جماعت تو ہے بڑوں کی جماعت، چھڑی ہاتھ میں، کوئی بولے تو اسی وقت گردن زدنی قرار پائے اور طلباء اس زمانے کے، بھائی وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں، کوئی انہیں چھیڑے گا تو وہ آکے لپٹ جائیں گے، آدمی ڈرتا ہے، بس صاحب اب بے چارہ بے زبان نصاب رہ گیا، اسی میں کتر بیونت کرتے رہو، نصاب میں کمی ہے، یہ کمی ہے۔

کمی ہے استاد میں اور طالب علم میں، نصاب میں کمی نہیں ہے۔ مگر بے زبان چیز ہے، اس پر سب مشق آزمائی کرتے رہتے ہیں تو یہ ہے اصل میں بنیاد ...... بہر حال کچھ جدید معلومات کی ضرورت ہے کہ طلبا نابلد نہ رہیں۔

فکرِ معاش نے علمی ترقی روک دی

س: حضرت! تیسرا سوال یہ تھا کہ محسوس یہ کیا جارہا ہے کہ جو طلباء مدارس سے فارغ ہوتے ہیں ان میں کام کرنے کا وہ جذبہ نہیں جو پہلے موجود ہوتا تھا، باطل سے ٹکرانے، خود اعتمادی اور خود آگے بڑھ کر کام کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ اب نظر نہیں آتی، اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج: اول تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا:

الناس کابل ماۃ لاتکاد تجد فیھا راحلة — سو اونٹوں کی ایک جماعت ہے دانتوں ہیں سارے تو سواری کے قابل ایک ہی نکلتا ہے۔

تو ان پچاس ہزار طلبا میں یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی جوہر قابل نہ ہو، لیکن سو میں سے ایک آدھ نکلے گا تو وہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دے گا...... تو اب بھی ایسے نکلتے ہیں جو اپنی استعداد پر کام کرتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے چونکہ وہ ننانوے ہیں جو اپاہج بن کر پھوہڑ رہتے ہیں، تو ان کی قدر و منزلت بھی جاتی رہتی ہے۔ جو کام کرنے والے ہیں، مگر ہیں، اگر نہیں ہیں تو اس وقت (دین کا) یہ کام کیسے چل رہا ہے بحثیں بھی ہیں۔ مناظرے بھی ہیں، باطل پرستوں کا مقابلہ بھی ہے۔ لوگ کام کر رہے ہیں اور اس میں نوجوان بھی کرنے والے ہیں، مگر بہت کم ہیں، گنے چنے۔

زیادہ تو اس کی بناء یہ ہے کہ معاشی حالات ایسے کمزور ہو چکے ہیں کہ طالب علم کو پڑھنے کے زمانے میں فکر یہ ہے کہ جلدی سے پڑھوں تاکہ گھر کا بندوبست کر سکوں، باپ ضعیف ہو گیا، ماں کا انتقال ہو گیا، فلاں گزر گیا، چار پیسے کماؤں تو بچوں کو کھلاؤں، فکر تو یہ رہتی ہے تو وہ ترقی کہاں سے کرے؟ اکثر و بیشتر اسی میں مبتلا ہیں۔

پستِ فکر بھی علمی ترقی نہیں کر سکتا

اور دوسری وجہ ہے کہ ان مدارس میں آنے والے بلند فکر کم ہیں، زیادہ تر وہ ہیں جن کی فکر کی حالتیں پست ہیں، انہوں نے دیکھا کہ روٹیاں ادھر بھی ملتی ہیں، آٹھ نو برس یہاں کچھ مل جائے گا۔ وہ نصاب پر عبور تو کر لیتے ہیں مگر جبلی دماغ کی افتاد ہے، ساخت ہے اس سے باہر تو نہیں جا سکتے، وہ جوان کی پست فکری ہے وہ علم کو بھی پست بنا دیتی ہے......

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں بتلاؤں کہ اس علم کی ذلت کا کونسا وقت ہوگا؟ عرض کیا گیا، فرمایئے، فرمایا کہ جب اراذل ناس اس کو حاصل کرنے لگیں جو خود پست ہیں اور پست فکر ہیں، وہ جب عمل کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کی پستی علم میں نمایاں ہوں گی اور علم بھی پست نظر آئے گا، ورنہ بلند فکر اور اونچے طبقہ کے لوگ اگر علم حاصل کریں تو وہ آج بھی وہ کام کریں جو پچھلے کرتے تھے......

علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا کردیتا ہے

س: حضرت! جو بلند فکر ہیں اور اچھی سمجھ والے ہیں اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے بچوں کو ادھر نہیں بھیجتے، ان طلباء کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟

ج: بات یہ ہے کہ دنیا غالب آچکی ہے، پہلے فکر آخرت غالب تھی اب جو بلند فکر ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ حکومت میں کرسی ملے، عہدہ ملے، وہ سارے ادھر متوجہ ہیں، ادھر آتے ہیں کم، ادھر وہ لوگ آتے ہیں جو ادھر کی استعداد نہیں رکھتے انہوں نے سوچا کہ چلو دین ہی استعداد بناؤ، مدارس میں تو بھائی دین ہے جو آئے گا ہم سکھادیں گے، وہ جس درجہ کا بھی ہو، لیکن سلف کے زمانے میں پرکھتے تھے کہ اسے کس علم سے مناسبت ہے، جس فن سے مناسبت ہوتی تھی اسی میں ترقی دیتے تھے تو وہ طبعی رفتار ہوتی تھی اس لئے اس علم وفن کے اندر وہ ماہر ہو جاتے تھے۔

میں جب افغانستان گیا تو سردار نعیم وزیر معارف (تعلیم) تھے، انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ صاحب، ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا مگر ہماری تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، میں نے کہا صاحب! وہ کیا؟

انہوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی عالم دین کو وزیر خارجہ بنائیں۔ وزیر داخلہ بنائیں، وہ چلتا نہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب تو میں بعد میں دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی میں نے جواب میں دوسری لائن اختیار کی، ورنہ سیدھا جواب یہ تھا کہ بھائی آج کل کی سیاست تو مستقل فن ہے، جو اسے حاصل کریگا وہ چلے گا، مگر میں نے یہ جواب اختیار نہیں کیا، میں نے کہا آپ کی یہ تمنا میرے خیال میں کبھی پوری نہیں ہوگی۔ "کیوں"؟ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جو افغانستان سے طلباء بھیجتے ہیں وہ معلوم نہیں کون سے جنگل سے پکڑ کر بھیجتے ہیں، گھٹل دماغ کے، کہ دس برس چاہئیں ان کا ذہن بدلنے کے لئے پھر دس برس چاہئیں انہیں پڑھانے کے لئے، اگر آپ وزارت کے خاندان، شاہی خاندان اور شاہی کنبہ کے افراد بھیجتے تو ہم آپ کو دکھلاتے کہ علم کیا چیز ہے؟ اب آپ نے جنگل سے پکڑ کر بھیج دیئے جنگلی اور پہاڑی لوگ، ان پر علم کیا اثر کرے گا؟ صدر عالم کہنے لگے۔ جناب مولانا حق می فرمائید، حق می فرمائید۔

اس کے بعد میں نے کہا، میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کیسے ہیں آپ کی نظر میں؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر اور ہندوستان میں انہوں نے وہ وہ کام کیا، میں نے کہا کہ وہ دارالعلوم کے فاضل ہیں کسی یونیورسٹی سے گریجویٹ نہیں ..... میں نے کہا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کیسے ہیں؟ کہنے لگے سبحان اللہ بہت اونچا مقام ہے۔ میں نے کہا دارالعلوم کے طالب علم ہیں کسی یونیورسٹی کے فاضل نہیں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ جو پاکستان چلے گئے؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر ہیں میں نے کہا وہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں، میں نے دس بیس نام گنوادیئے تو میں نے کہا یہ لوگ بلند فکر تھے۔ تو علم نے ان کی فکر کو اور زیادہ بلند کردیا، تو علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا، جو پیدا شدہ چیز ہے انہیں اجاگر کردیتا ہے اب اگر کسی میں پستیاں ہی بھری ہوئی ہوں وہ اجاگر ہوجائیں گی، بلندیاں بھری ہوئی ہوں وہ اجاگر ہوجائیں گی، علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں

کریگا، تو صدر عالم نے کہا بالکل حق بات ہے۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ اب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شاہی گروپ اور وزارتی گروپ کے ہر سال گیارہ طلباء بھیجیں گے میں نے کہا پھر ہم آپ کو دکھلائیں گے کہ ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

مگر مجھے اب فکر یہ ہوئی کہ وہ جو بادشاہی خاندان کے آئیں گے ان کی خادمی کون کرے گا؟ ان کا تمدن، ان کی معاشرت علیحدہ اور یہاں غریب طلباء کی جگہ ہے تو ان کی مہمانداری کے لئے سینکڑوں روپیہ چاہئے، کوئی وزیر کا بیٹا ہوگا کوئی بادشاہ کا بیٹا ...... یہ فکر پڑی تو میں نے یہ فقرہ کہا کہ ہم ان کو اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے؟ کہنے لگے نہیں نہیں آپ کو خرچ اٹھانے کی ضرورت نہیں حکومت برداشت کرے گی میں نے دل میں کہا اور مجھے کیا چاہئے تھا میں نے اسی لئے کہا تھا...... اس کے بعد میں نے کہا نہایت مبارک خیال ہے، ہم ان کو تعلیم دیں گے۔ اب ہماری ایک اور درخواست ہے، گیارہ لڑکے ہم آپ کے یہاں بھیجیں گے، اس لئے کہ آپ کے یہاں مختلف زبانوں کے کالج ہیں، افغانستان میں بخات کالج خالص جرمنی زبان کا کالج ہے، استقلال کالج یہ خالص فرانسیسی زبان کا کالج ہے، کا کول پے طب یہ خالص ترکی زبان کا کالج ہے اور انگریزی زبان کا مستقل کالج ہے، تو میں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب مبلغ تیار ہوں تو غیر ممالک میں جاکر تبلیغ کریں مگر زبان سے عاجز ہیں آپ کے یہاں کالج ہیں تو گیارہ لڑکے آپ بھیجیں گے اور گیارہ لڑکے ہم بھیجیں گے آپ انہیں زبان سکھلائیں گے، کہنے لگے، ہم مستقل بندوبست کریں گے اور اپنے خرچ پر تعلیم دیں گیا اور نصاب بھی مختصر مقرر کریں گے۔ کہ زیادہ وقت بھی نہ لگے اور زبان میں مہارت پیدا ہو جائے، یہ ہمارا اور ان کا معاہدہ ہو گیا مگر وہ جنگ چھڑ گئی تو سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

طبعاً ہی فکری قوت کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں

تو بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ ذی استعداد تو پیدا ہوتے ہیں مگر استعداد ہی گھٹی ہوئی ہو تو اس کا کیا علاج، فکری طاقت ہی کمزور ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں تو زیادہ تر وہ آتے ہیں جو فکر کے پست ہیں، اور جو بلند فکر ہے وہ ہزار میں ایک دو آتا ہے مگر جو آجائے تو وہ بلند ہو کر چل پڑتا ہے

جیسے حدیث میں آپ نے فرمایا:

خیار کم فی الجاهلية خیار کم فی الاسلام — جو جاہلیت میں اونچا تھا وہ اسلام میں بھی آکر اونچا رہے گا۔

جو وہاں نیچا تھا وہ یہاں بھی پست رہے گا، دین سب میں آجائے گا، مگر بلند فکری وہ خلقی چیز ہے، یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے اب سوائے اس کے کہ لوگ محنت کریں وعظ اور ترغیب ترہیب سے ہوتا نہیں، آپ لاکھ وعظ کریں کہ بھائی تم آؤ، نہیں آئیں گے، ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ وہ مجبور ہو کر علم دین سیکھنے کیلئے آئیں اور ادھر جھکیں جیسے عالمگیرؒ نے کیا تھا۔

فضلاء کرام کی اپنی مادرِ علمی سے وابستگی کی ضرورت

عالمگیرؒ کے زمانے میں عام طور سے علماء بے چارے بے کس تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، لوگ دنیا

داری کی طرف، عہدوں کی طرف متوجہ ہو گئے تو علم دین کوئی حاصل نہیں کرتا تھا حکومت کے عہدے اور اقتدار نگاہوں میں تھے، رہ گئے بیچارے علماء، عالمگیرؒ چونکہ خود عالم تھے، انہیں احساس ہوا، انہوں نے نہ ایک فرمان جاری کیا نہ کوئی نصیحت نامہ لکھا، ایک دن حکم دیا کہ ہم وضوء کریں گے فلاں والی ملک ہمیں وضو کرائے، تو ان صاحب نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی، بادشاہ کو وضوء کرائیں گے، وہ آفتابہ لے کر پہنچے۔

عالمگیرؒ نے کہا وضو میں کتنی سنتیں ہیں؟ واجبات کتنے ہیں؟ اب انہوں نے کبھی وضو کیا ہو تو بتائیں، عالمگیر نے کہا:

"حیرت ہے، آپ ایک بڑے والی ملک ہیں ہزاروں پر حکمرانی کر رہے ہیں اور مسلمان ہیں، آپ کو یہ پتہ نہیں کہ وضو میں فرائض کتنے ہیں؟

بس صاحب اتنا ان سے کہہ دیا...... کہ اگلے دن کہا فلاں امیر ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں، وہ افطار میں شریک ہوئے تو اورنگ زیب نے کہا روزہ میں مفسدات کتنے ہیں؟ مکروہات کتنے ہیں؟ انہیں کچھ پتا نہیں، تو کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے والی اور تمہیں یہ پتہ نہیں؟

کسی سے کچھ اور پوچھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب مولویوں کی تلاش شروع ہو گئی کہ مسئلے معلوم کرو، اگر بادشاہ سلامت یونہی پوچھتے رہے تو بڑی تذلیل ہو جائے گی ہماری، صاحب مولوی کسی قیمت پر نہیں ملتے، مولویوں نے نخرے شروع کر دیئے کہ صاحب ہم پانچ سوسے کم تنخواہ نہیں لیں گے، ایک نے کہا کہ ہزار سے کم نہیں لیں گے، انہوں نے کہا کہ بھائی دو ہزار دیں گے مگر تم آؤ تو، سارے مولوی لگ گئے تو وعظ و تلقین سے کچھ نہ ہوتا، تدبیر تھی اربابِ اقتدار کی، تو اگر کوئی صورت ایسی بن جائے کہ حکومت ادھر توجہ کر کے ایسے قوانین بنا دیں کہ وہ مجبور ہو جائیں تب تو چلے گی یہ بات، محض وعظ و نصیحت سے نہیں چلے گی۔

حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں دین آسکتا ہے

س: حضرت جو طلباء دینی مدارس سے نکلتے ہیں وہ نکلنے کے بعد متفرق ہو جاتے ہیں، متفرق ہو کر اپنی اپنی جگہ کام میں لگتے ہیں، بعض دینی کام میں لگ جاتے ہیں، بعض دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو دینی کام کرتے ہیں وہ بھی متفرق طور پر کرتے ہیں کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہر مدرسہ سے جو طلباء نکلیں وہ ایک خاص نظم کے تحت اجتماعی طور پر کام کریں؟ اور مدرسہ کی طرف سے انہیں وقتاً فوقتاً ہدایات ملتی رہیں، جو مختلف مسائل ملک میں پیش آتے رہیں، ان کے بارے میں مدرسہ کی جانب سے، مدرسہ کے اکابر کی جانب سے ان کو ہدایات جاری ہوتی رہیں اس طرح وہ سارا کا سارا نظام لگا بندھا ہو گا، اور اس سے یہ فائدہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ طلباء اپنے مستقبل سے بھی مایوس نہ ہوں گے جب وہ ایک نظام کے تحت ہوں گے تو ان کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ انہیں مساجد و مدارس میں بھی کام میں لگایا جا سکتا ہے اور دوسرے کاموں میں بھی، اس تجویز کے بارے میں جناب کی رائے کیا ہے؟

ج: یہ صحیح ہے ایسا ہونا چاہئے مگر کس طرح سے ہو؟ تو دو ہی قوتیں ہیں جن سے کسی ایک مرکز پر جمع کیا

جا سکتا ہے، ایک تو قوتِ قہری کہ اقتدار ہاتھ میں ہو اور آپ ملک بھر میں کسی کو نمٹنے نہ دیں، حکمرانی کی قوت ہو تو یہ قہری قوت ہے۔

ایک قوتِ ارادت ہے کہ عقیدت مندی کسی شخصیت سے اتنی ہو کہ وہ اشارہ کرے تو سب اس کے اشارے پر چل پڑیں، اس وقت دونوں چیزوں کی کمی ہے، ایک کا تو فقدان ہے، قوتِ قہری تو ہے نہیں آپ کے ہاتھوں میں، اب رہ گئی قوتِ ارادت اور قوتِ عقیدت اس میں خال خال افراد ملتے ہیں۔ بعض تو وہ ہیں کہ مدارس سے تعلق نہیں، شخصی طور پر لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور مدارس میں بھی ہیں ایسے لوگ مگر خال خال ...... تو جب تک کہ کوئی قوت نہ ہو جو مرکز سے ہٹنے نہ دے، خواہ قوت معنوی ہو یا مادی، اس کے بغیر یہ کام نہیں چل سکتا۔

آپ کے یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کام شروع کیا گیا وفاق المدارس میں اس کی کیا صورت ہے؟

س: وہ تو تمام مدارس کا ایک، مجتمع نظام ہے، میری مراد یہ ہے کہ ہر مدرسہ اپنے طرز پر ایک نظام بنادے کہ اس کے مدرسہ سے جو طلبہ فارغ ہوں وہ لگے بندھے نظام کے تحت اپنے مدرسہ سے وابستہ ہوں۔

ج: یہ فی الجملہ آسان ہے ...... بہ نسبت اس کے سارے مدارس ایک نقطہ پر آئیں، وہ تو مشکل ہے مگر سوائے اس کے کہ تحریک کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دی جائے اور اس کے جو فوائد و منافع ہیں، انہیں قلم بند کر کے انہیں سامنے رکھا جائے، جو مضرتیں پہنچ رہی ہیں وہ دکھلائی جائیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی خیر خواہی کر رہے ہیں، اپنی غرض پیش نہیں کر رہے کہ اگر تم نے اس طرح طلباء کو مربوط کر لیا تو تمہارا وقار اس میں بلند ہوگا، تمہاری ہی قوت اس میں زیادہ ہوگی ...... یہ تجویز ٹھیک ہے، توجہ دلائی جائے اور ذمہ داروں کو متوجہ کیا جائے ...... اب آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ جو تجویز ہو پہلے عوام کو متوجہ کیا جائے، خواص جن کے ہاتھ میں عوام ہیں انہیں توجہ دلائی جائے، عوام خود بخود آجائیں گے، مدارس کے لوگ ہیں یا با اثر شخصیتیں ہیں ان کو جمع کر کے تحریک کی جائے۔

اکابر کے خواب کی تعبیر

س: حضرت! یہ تو مدارس سے متعلق چند سوالات تھے اب مسلمانوں سے متعلق ایک دو سوال، ایک تو یہ کہ سرزمین پاکستان میں قادیانیوں سے متعلق قرارداد (اسمبلی میں) پاس کی گئی ہے، اس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے اور جناب کا کیا تبصرہ ہے؟

ج: ہم اس بارے میں بیان جاری کر چکے ہیں اور اس میں بہت زیادہ سراہا گیا وہاں کے علماء کو بھی اور حکومت کو بھی۔ یہ بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے، جو حکومتِ پاکستان نے کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تو ہمارے بزرگوں ہی کا خواب تھا جس کی تعبیر ملی ہے، یہی جذبہ رکھتے تھے حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ کو کسی طرح سے یہ التباس ختم ہو کہ یہ مسلم نام سے کام کر رہے ہیں، یہ تلبیس ہے، مگر انگریزوں کا زمانہ تھا، انہیں غیر مسلم کیسے قرار دیا جائے، تو اللہ نے اب آکر یہ خواب

پورا کیا، ادھر تو مڈل ایسٹ کی ۱۳۲ انجمنوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ داخل ہی نہیں ہو سکتے اور ادھر پاکستان نے اس کے اوپر مہر کر دی، تو یہ عالمگیر مسئلہ بن گیا اور وہ جو ایک تلبیس اور التباس تھا وہ ختم ہو گیا۔

اب رہیں قادیانی دنیا میں ہزاروں باطل فرقے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر کام نہیں کر سکتے۔ تو میں نے پاکستانی اسمبلی کی قرارداد کی تائید میں بیان دیا۔ پھر کلکتہ اور متعدد جگہوں سے خطوط آئے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جگہوں میں لوگوں نے کہا کہ پھر یہ ہمارے قبرستانوں میں کیوں دفن ہوں، مسلم کو کافر سے کیا تعلق؟ تو مسلمانوں میں یہ چیز پیدا ہو رہی ہے کہ قادیانی ہمارے قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے...... مگر قبرستانوں کی تولیت ہے گورنمنٹ کے ہاتھ میں تو یہ روک نہیں سکتے، تو اب مسلمانوں میں یہ جذبہ ہے کہ ہم حکومت سے لڑیں گے، مطالبہ کریں گے اور فتاویٰ بھی دکھائیں گے کہ قبرستان میں حصے الگ الگ کر دو، ان کا خط الگ متعین کرو، ہم اپنے پاس دفن نہیں کریں گے اور بھی بہت سے مسائل سامنے آئے مثلاً پہلے قادیانی مسلمانوں کی مساجد میں آجاتے تھے، بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سو کے قریب قادیانی تائب ہو گئے...... مجھے وہاں کے لوگوں نے لکھا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک سوسائٹی قائم کریں جس کے ذریعہ ان قادیانیوں کے شکوک و شبہات رفع کریں جو اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ادھر آنا چاہتے ہیں۔ تو میں نے انہیں لکھا تھا کہ سوسائٹی ضرور قائم کرو لیکن جماعتی طور پر یا مجمعوں میں رفع شکوک کا کوئی سلسلہ ہرگز نہ قائم کیا جائے، اس میں تلبیس ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب مجمع ہوں گے شکوک پیش کئے جائیں گے تو رد و کد میں اور بحث و مناظرہ میں انہیں رستہ نکل آئے گا پیر رکھنے کا۔ ہاں انفرادی طور پر رفع شکوک کرو، لیکن مجالس عامہ منعقد ہوں رفع شکوک کرنے کے لئے یہ تو ہرگز نہ کیا جائے، اس بات کو انہوں نے مانا بہر حال اس کا (پاکستان اسمبلی کی قرارداد کا) بہت ہی اچھا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان پر۔ [۱]

بمقام مدینہ منورہ ۱۹۷۴ء

---

[۱] حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ سے یہ انٹرویو جناب محترم مولانا محمود اشرف عثمانی نے لیا، مرتب خطبات نے عنوانات کے اضافہ اور ان کے شکریہ کے ساتھ اسے خطبات کی زینت بنا دیا۔

(از مرتب غفرلہٗ)

صدیق حمیم و رفیق قدیم
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

"البلاغ" کا "مفتی اعظمؒ نمبر" ایک مدت تک حضرت حکیم الاسلام مد ظلہم کے مضمون کے انتظار میں رو کا رہا، خیال یہ تھا کہ آپ کی تحریر کے بغیر حضرت مفتی اعظمؒ کا تذکرہ نہایت تشنہ و ناتمام رہے گا۔ بالآخر جب حضرت حکیم الاسلام مد ظلہم کی غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر مضمون ملنے سے ناامیدی ہوئی تو حضرت کی سابقہ تحریروں سے ایک مضمون مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا گیا لیکن نمبر کی اشاعت کے بعد حضرت مد ظلہم کا یہ مضمون موصول ہوا جو ذیل میں بصد افتخار شائع کیا جا رہا ہے۔

معیت و رفاقت

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ل کا نام نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دم سامنے آ گئی جس میں اس احقر اور مفتی صاحب نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحب سے جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی ویسی کسی دوسرے ہم درس و ہم سبق کے ساتھ نہیں رہی۔ یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی، بلکہ حقیقی اور معنوی تھی جس کی قدر و قیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از پیش ترقی پذیر رہی جس کا تسلسل برس ہا برس قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب کے انتقال مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوئی حتی کہ اپنے مکان میں بیٹھ کر بہت دیر تک آنسوؤں سے روتا رہا۔ گھر والوں نے گھبرا کر پوچھا کہ آج کیا کوئی حادثہ اہم پیش آ گیا ہے جو خلافِ عادت اتنے گریہ و بکا کا سبب بن گیا ہے؟ تب مفتی صاحب کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

رفاقت تعلیم

ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس و رفیق رہے، آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فارسی کے مسلمہ اساذ و قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کے متوسلین میں سے تھے، ان کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیق درس تھے، تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ بھی مشترک ہی تھے، اساتذہ کی غیر معمولی عنایات و توجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ عالم ربانی حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحبؒ اور محدث وقت حضرت الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور استاذ المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب اور حضرت علامہ ابراہیم صاحبؒ جیسے اساطین علم خوش بختی سے ہمیں ملے، اس طرح آغازِ تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ تعلیمی اور تدریسی رفاقت مسلسل رہی۔

یاد نہیں پڑتا کہ اس رفاقت و معیت میں کبھی کوئی فکری و ذہنی انقطاع رونما ہوا ہو..... اگرچہ مفتی صاحب کی عملی مصروفیات اور مشاغل علم میں مسابقت، انکے کسی ہم درس و رفیق کے بس کی بات نہ تھی، وہ اس میدان

میں سب سے آگے تھے۔

رفاقتِ تدریس

تعلیمی دور ختم ہو جانے پر بھی یہ رفاقت اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقعہ ملا، احقر کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً انتظامی امور سے تعلق ہوا، اور مفتی صاحب کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً افتاء سے تعلق ہوا۔

رفاقتِ سلوک

پھر یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مسترشدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک و توافق سامنے آیا کہ ہم دونوں خانقاہ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوضِ اشرفیہ کے خوشہ چین بنے اور اس میں بھی معیت و رفاقت اس درجہ کی رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ کی عنایات و اضافات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہیں، مفتی صاحبؒ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر مقامات طے کرتے چلے گئے، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے سبب اس راہ سلوک میں اتنا تیز رو نہ بن سکا، گو حضرت مرشد تھانویؒ یہ فرما کر تسلی بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان مشاغل میں نیت مجاہدے کی کرلی جائے تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر شغل پر ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ، لیکن بہر حال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا، تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدت پر مشتمل ہے۔

رفاقتِ خدمت

جب احقر کو نیابت اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحبؒ بھی اپنے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کی بناء پر صدارتِ افتاء تک جا پہنچے جو دارالعلوم کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزازات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ممدوحؒ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء و تفقہ پر جتنا کام تن تنہا انہوں نے کیا در حقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا، حتیٰ کہ اپنی ان خدمات کی بدولت رائے عامہ نے آپ کو "مفتی اعظم پاکستان" کا لقب عطا کیا جو یقیناً ان کے شایانِ شان تھا۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو مفتی صاحبؒ ہمیشہ ملاقات میں پہل فرماتے۔ اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم شرانی میں لے جانا اور علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی، خود ان جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سنتے اور غیر معمولی طور پر محظوظ محسوس کرتے تھے۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھیں جو سینے میں محفوظ ہیں اور سینے سے سفینے پر قلم برداشتہ آگئیں، لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظر ثانی نہیں فرما سکتے تھے، ان کی وفات کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ان کے فتاویٰ پر نظر ثانی کے لئے حضرت مفتی

صاحب (مفتی محمد شفیع صاحبؒ) ہی کا انتخاب کیا تھا، اس سے ان کی دقتِ نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مفتی صاحبؒ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں انہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔

ان کی زندگی کا آخری شاہکار "تفسیر معارف القرآن" ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم و رفیع قرآنی خدمت ہے اگر مفتی صاحب صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت و رفعت اور عند اللہ مقبولیت کے لئے کافی تھا لیکن اس کے علاوہ ان کی ہر علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام و خواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے اور ہر اہل علم مفتی صاحب کی علمی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دار العلوم دیوبند کے مکمل ترجمان، علمائے حق کی سچی نشانی اور خانقاہِ تھانویؒ کے قابلِ فکر نمائندے تھے، ان کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے صفِ اول کے علماءِ دیوبند میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا بلکہ خود دار العلوم دیوبند کے لئے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جسے وہ بالخصوص ایسے موقعہ پر شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ وہ اپنے اجلاس صد سالہ اور تقریب دستار بندی کے اہتمام میں مصروف رہے جس میں مفتی صاحبؒ جیسی شخصیت کی شرکت مجالس کو چار چاند لگا دیتی، حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی اس اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق و جذبہ سے اس میں شرکت کیلئے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی جدائی کا تعلق تو یقیناً مرتے دم تک رہے گا، البتہ جو بات قابل، رشک اور لائق اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے لائق اخلاف چھوڑے ہیں۔ بلا شبہ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع عثمانی واخوانہم سلمہم اللہ مفتی صاحب کے زندہ کارنامے ہیں جو الولد سر لابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔ جنہیں مفتی صاحبؒ نے اپنی نسبی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجا طور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ ان شاء اللہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمات کا شجرِ طوبیٰ زیادہ سے زیادہ برگ و بار لائے گا اور اربابِ علم و فضل اس کی گھنی چھاؤں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

احقر اس وقت بیرونی سفر کے لئے پابرکاب ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت علم و فضل اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقعہ نہیں۔ دفعۃً ذہن پر جو یادوں کی پرچھائیں آئیں، وہ قلمبند کر دیں، ورنہ مفتی صاحبؒ کا تذکرہ۔

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کا مصداق ہوتا!

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

والسلام

(حضرت مولانا قاری) **محمد طیب** (صاحب مد ظلہم)

مہتمم دار العلوم دیوبند

(۲۷ رجب ۱۳۹۹ھ)

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

حضرت حکیم الاسلامؒ مصر سے حج بیت اللہ شریف کے لئے حجاز پہنچے' روضۂ مبارک پر حاضری کے لئے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے ایام میں جامعہ مدینہ منورہ کے سربراہوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ اور آپ کے رفقاء (مولانا منت اللہ صاحب رحمانی وغیرہ) کو جامعہ میں تشریف آوری کی دعوت دی۔ جامعہ کے ایک خاص اجتماع میں حضرت موصوف نے یہ تحریر پیش کی جس میں دارالعلوم دیوبند کے ضروری تعارف کے ساتھ جامعہ مدینہ منورہ کا خیر مقدم فرمایا گیا ہے۔ (ادارہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی
اَمَّا بَعْدُ

نعمت کبریٰ

یہ ساعت بڑی ہی مبارک ہے کہ میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا قلب جذبات تشکر و امتنان سے معمور ہے۔ کیونکہ آپ حضرات نے اپنی مخلصانہ دعوت کے ذریعہ مجھے اس عظیم الشان دینی ادارے میں شرف حاضری بخشا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میری مسرت وشادمانی دوبالا ہوگئی ہے۔ کیونکہ میں ایک عظیم اسلامی علوم کے مرکز سے چل کر قابل قدر دینی مرکز میں پہنچ گیا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی مچھلی پانی سے نکل کر دوبارہ پانی میں ڈال دی جائے تو اسے محض سرور ونشاط ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے جسم میں ایک نئی روح کار فرما ہو جاتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی قسم کی تازگی اور نشاط روحانی محسوس کر رہا ہوں جو فی الحقیقت ایک نعمت کبریٰ ہے جس کے لئے میں بارگاہ خداوندی میں شکر بجالاتا ہوں۔

مبارک احساس

میں براعظم ایشیا کے ایک ممتاز اور زبردست اسلامی ادارے سے حاضر ہوا ہوں جس کی تاسیس پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔

سن ۱۲۸۳ھ میں جبکہ انگریزی سامراج نے ہندوستان پر تسلط جمایا او مغربی تہذیب کا طوفان ہندوستان کی ہر سمت میں پھیلنے لگا تو اس وقت علماء امت نے اس خطرہ کو محسوس کرلیا جو اس تہذیب کے نتیجہ میں امت

مسلمہ کو گھیر چکا تھا چنانچہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مغربی تہذیب کے اس خوفناک طوفان سے بچانے اور دین سے آشنا اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا احساس کیا جو اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کے ذریعے صالح اور غیرت مند علماء کی ایسی جماعتیں تیار کرتا رہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر میدان میں مغربی تہذیب اور مذہب دشمن تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو کر امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس دور کے خدا رسیدہ بزرگ اور عالم فاضل شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔

حضرت نانوتوی کتاب و سنت کے زبردست عالم اور امام وقت تھے جو دار العلوم میں سب سے پہلے محدث ہوئے اور انہی کی سند پر دار العلوم میں سلسلہ روایت و درایت حدیث جاری ہوا۔

اس وقت آپ کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین تھے جن کے بعد اس مسند پر ہندوستان کی معروف شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ متمکن ہوئے جو حضرت نانوتوی کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے ذریعے دار العلوم میں درس حدیث نے نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا اور آپ ہی نے اس دینی ادارہ کو علوم ربانیہ کی تعلیم کے ذریعہ استحکام عطاء فرمایا اور کتاب و سنت کی تعلیم سے اس کے در و دیوار کو منور کیا۔

دار لعلوم کا امتیاز

اس دار العلوم کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کے تمام شیوخ و اساتذہ' مدرسین و طلبہ کتاب و سنت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور کتاب و سنت ہی پر عمل پیرا رہتے ہیں وہ ایسے احکام و امور کی تاویلات نہیں کرتے جو مخالف کتاب و سنت ہوں۔ اسی بناء پر اہل بدعت ہمیشہ اس ادارے اور اس کے شیوخ کے خلاف معاندانہ محاذ بنائے رہے لیکن ان کی اس مخاصمانہ روش کے باوجود اس ادارے کے شیوخ و علماء نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے علوم کی ترویج و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہمیشہ کتاب و سنت کی اشاعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شعار اور وظیفۂ حیات بنائے رکھا جس پر آج پورا برِاعظم ایشیا شاہد ہے۔

دار العلوم کا تعارف

اس وقت اس ادارے میں مختلف ممالک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ جو ہندوستان' افغانستان' پاکستان انڈونیشیا' برما' جنوبی افریقہ' روس' ترکستان اور چین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں زیر تعلیم ہیں۔

اس ادارے میں بنیادی علوم جن کی تعلیم دی جاتی ہے' تفسیر' حدیث' فقہ اور اصول فقہ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ساٹھ مدرسین تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں' جو سب اسی ادارے کے فیض یافتہ ہیں۔

دار العلوم کا انتظام و انصرام ۲۲ شعبوں پر منقسم ہے جن میں اہم شعبہ جات یہ ہیں: تعلیم' محاسبی او قاف' مطبخ' صفائی' بجلی' تعمیرات' نشر و اشاعت اور کتب خانہ۔ اس کے علاوہ دار العلوم میں فضلاء قدیم کا

بھی ایک شعبہ ہے جو ان کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور مختلف امور میں ان کی معاونت و راہنمائی کرتا ہے۔

دار العلوم اپنے حسن کارکردگی اور عظیم الشان علمی و دینی خدمات کی بدولت ایشیا میں مرکزی حیثیت حاصل کرچکا ہے حتیٰ کہ اسے ازہر الہند کہا جانے لگا۔ پوری ایک صدی میں اس دار العلوم سے بیس ہزار سے زائد علماء پیدا ہوچکے ہیں جن میں مفسر بھی ہوئے ہیں اور محدث بھی، مفتی و فقیہ بھی ہوئے اور واعظ و مرشد بھی جنہوں نے ہندو بیرون ہند میں ہر ہر جگہ کتاب و سنت کے چراغ روشن کئے اور لاکھوں انسانوں نے ان کے ذریعے اپنی رشد وہدایت کا سامان فراہم کیا۔

حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ

میں اس عظیم دینی ادارے کے ایک خادم کی حیثیت سے آپ کی جامعہ اسلامیہ میں حاضر ہو کر سرور وانبساط کی ایسی کیفیت محسوس کررہا ہوں جس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے نہ قلم سے کیونکہ الفاظ خواہ کتنے ہی معنی خیز و پر شوکت کیوں نہ ہوں وہ صحیح جذبات اور مسرت آفریں احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کرسکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کا مدینہ منورہ میں قیام ایک ایسا مبارک اقدام ہے جس کی خبر تمام علمی حلقوں بالخصوص حلقہ دار العلوم میں انتہائی فرحت و مسرت کے ساتھ سنی گئی کیونکہ اس مبارک سرزمین میں صدیوں کے بعد ایسے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا۔

بلاشبہ حکومت سعودیہ نے جہاں حجاج کی راحت و آرام کے لئے تمام ضروری سہولتیں مہیا کیں اور حج کی تمام راہیں آسان بنائیں اور سعودی مملکت کو اقتصادی اور تعمیری ہر اعتبار سے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا اسی کے ساتھ تاسیس جامعہ اسلامیہ بھی اس کا قابل قدر اور تاریخی کارنامہ ہے۔

حقیقتہً مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جو ان زریں کارناموں کی انجام دہی کے لئے مناسب ہو سکتا ہے اور یہی خطہ ارض وراثت نبوی کی اشاعت کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہیں سے علوم نبوت کے چشمے پھوٹے اور یہیں وہ علوم پروان چڑھے اور اس سرزمین سے خلافت راشدہ کی شعاعیں نکلیں، اسی لئے مسلمانان عالم کے لئے یہ مبارک شہر ہمیشہ پر کشش رہا اور اسی کے خزانہائے علوم شریعت سے وہ مالا مال ہوتے رہے، جس طرح مکہ کے پہاڑوں سے نداء ابراہیمی کی گونج چہار دانگ عالم میں پھیلی تو مسلمانوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے اور ان کے قافلے اس نداء کو لبیک کہتے ہوئے سرزمین پاک کی طرف ہر چہار سمت سے رواں دواں نظر آنے لگے۔ اسی طرح جب مدینہ منورہ کی وادیوں سے علوم نبوت اور تعلیمات الٰہی کی صدائیں بلند ہوں گی تو کون ہے جو اس طرف رواں دواں نظر نہ آئے گا اور اس صدائے علم کو لبیک نہ کہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے قیام کا ہندوستان کے تمام علمی اور دینی اداروں میں دلی خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے اپنے فرزندان علم کو اس جامعہ میں بھیج کر اپنے لئے سعادت محسوس کی اور بلاشبہ ان فرزندان علم کا جامعہ کے چشمہ ہائے علم سے فیض یاب ہونا ان کے لئے مرتبہ سعادت و خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔

مستحکم رابطہ

حضرات! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارس دینیہ بالخصوص دار العلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے۔ کیونکہ اگر کوئی تعلق دیرپا اور مستحکم ہو سکتا ہے تو وہ صرف

علمی تعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار و مستحکم ہو جو دونوں اداروں کے درمیان طلبہ اور اساتذہ کے تبادلے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اخیر میں میں آپ حضرات کے جذبۂ اخوت اور اخلاق کریمانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتری اور راست روی کی توفیق عطاء فرمائے۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مؤتمر اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کا بصیرت...

ذیل میں ہم وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے مؤتمر اسلامی قاہرہ میں پیش فرمایا۔ اصل مقالہ عربی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ہم پیش کررہے ہیں۔ اس مقالہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان دینی اور فقہی مسائل پر ابتدائی بحث فرمائی ہے جن پر علماء اسلام کو متحدہ غوروفکر کے بعد اپنا ایک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مقالہ ہندو پاکستان کے علماء اسلام کو بھی زمانۂ حال کے مسائل کی طرف متوجہ کرے گا اور یہ حضرات زمانۂ حال کی ان طبعی ضرورتوں پر شرعی رہنمائی فراہم کرسکیں گے۔

(ادارہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ـ

جامعہ ازہر کی خوش نصیبی

بزرگان محترم!

الحمدللہ کہ آج ہم علماء کرام کے ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کررہے ہیں جو صدر جمہوریہ ربیہ السید جمال عبدالناصر کے عہد میں جامعہ ازہر میں ادارۂ بحوث اسلامیہ کی دعوت پر مختلف ممالک سے ض اہم عصری مسائل پر غوروخوض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ عظیم الشان اجتماع جو درحقیقت زبردست اسلامی یکتائی کا نمونہ پیش کررہا ہے' ایسے وقت میں بکہ دشمنان اسلام ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن سعی کررہے ہیں جامعہ ازہر کی خوش نصیبی ور عظیم کامیابی ہے جو اسے السید جمال عبدالناصر کے عہد میں حاصل ہوئی ہے اس لئے ہم بارگاہ خداوندی ں شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے دشمنان اسلام کی تمام مساعی کو ناکام بنا کہ ہم خادمان دین کو جسمانی وروحانی یکتائی کے ساتھ ملت اسلامیہ کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے باہمی ملاقات کا یہ زریں موقع نایت فرمایا۔

مصر اسلام کا نشان قوت

بزرگان محترم! سرزمین مصر جہاں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہو رہا ہے محض سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ اسے زبردست دینی اہمیت بھی حاصل ہے جس کے باعث مسلمانان عالم کا ہمیشہ ایک قلبی رابطہ رہا ہے اور مصر کی اس دینی اہمیت کا اندازہ حدیث نبوی سے بھی کیا جا سکتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ

"اسلام نے حجاز مقدس کو دین کا مرکز، ملک شام کو اسلام کا نشان عظمت اور ملک مصر کو اسلام کا نشان قوت قرار دیا"۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کو عبادت کا مرکز بنایا اور شام کو اسلامی شان و شوکت کا مظہر اور مصر کو افواج اسلامیہ کا مستقر اور حلقہ بگوشان اسلام کی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

حجاز مقدس مرکز عبادت

چونکہ حرم مکہ مرکز عبادت تھا اس لئے اسے بلد مامون بنایا گیا تاکہ اس میں عبادت کرنے والے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ مصروف عبادت رہیں اور کسی قسم کا نزاع و فساد قتل و قتال اس کی فضاء عبادت کو مکدر نہ بنائے اس لئے اس بلد مامون میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"بیشک مجھ سے پہلے اس (حرم) میں کسی کو قتال کی اجازت نہیں ملی، صرف میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت میں قتال کی اجازت دی گئی تھی سو وہ اب بھی بدستور سابق خدا کا حرم ہی ہے۔ نہ اس کے درخت کاٹے جائیں اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے"۔ (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

شام ــــ عظمت اسلامی کا مظہر

اور شام چونکہ عظمت اسلامی کا مظہر تھا اس لئے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:

"اے شام! تو میری شمشیر غضب اور میرا درۂ عذاب ہے تو ہی منتشر کرنے والا اور تو ہی یکجا کرنے والا"۔ (کنز العمال)

اور شام ہی کے بارے میں دوسری حدیث ہے:

"میری امت میں ایک جماعت ایسی ہوگی جو دمشق، نواح دمشق اور بیت المقدس کے دروازوں پر برابر قتال کرتی رہے گی اسے کسی کی رسوا کن کوشش رسوا نہ کر سکیں گی"۔

دوسری روایت میں ہے:

"کسی کی مخالفت اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی وہ دشمنان خدا سے برابر قتال کرتی رہے گی، ایک لڑائی ختم تو دوسری شروع ہو جائے گی"۔

معلوم ہوا کہ ملک شام کفار کے لئے عذاب کا کوڑا اور عتاب کی تلوار بنا رہے گا جب تک کہ اہل شام اس کی امتیازی خصوصیت کو ختم نہ کریں۔

استحکام مصر عالم عرب کے امن کا ضامن ہے

اور مصر چونکہ فوجی مرکز ہے اس لئے اس کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ :

"جب خدا تم کو مصر پر فتح عطا فرمائے تو تم اس میں زیادہ سے زیادہ فوج بنانا کیونکہ وہ فوج روئے زمین کی افواج سے بہتر ہوگی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ وہ اور ان کے ازواج قیامت تک حفظ وامان میں رہیں گے"۔ (کنزل العمال)

معلوم ہوا کہ امن کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عظمت وشوکت قائم نہ ہو اور یہ عظمت وشوکت فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خطۂ عرب کا امن وامان مصر کے استحکام اور اس کی فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں اور وہی تنہا ملک ہے جو حجاز وشام کا دفاع کر سکتا ہے۔ اس لئے ان تینوں ملکوں حجاز، شام اور مصر کا اتحاد ہی فی الحقیقت اسلام اور مسلمانان عالم کی طاقت و قوت کا نشان بن سکتا ہے۔

اس بارے میں صدر متحدۂ عرب جمہوریہ السید جمال عبد الناصر جو مخلصانہ سعی کر رہے ہیں وہ یقیناً لائق استحسان اور قابل ستائش ہیں اور سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور لائق آفرین بات یہ ہے کہ وہ جہاں عربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سرگرم عمل ہیں اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماء اسلام کو ایک نقطہ پر جمع کرنے اور موجودہ دور کے مسائل دینیہ کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً باعث مسرت اور لائق امتنان ہے۔

جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ

بزرگان محترم! مؤتمر کے اجتماعات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے مسئلۂ اجتہاد اور مسئلۂ تلفیق اور بعض علمی وعملی ہیں جن پر ان کے اصحاب نگارش یقیناً قابل مبارکباد ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے مسائل ومباحث جو زمانۂ ماضی میں تنقیح و تحقیق کی مختلف راہوں سے گزر چکے ہیں وہ اپنی علمی اور تحقیقی اہمیت کے باوجود موجودہ ضروریات کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جو روز بروز دنیا کی مادی ترقیات کے باعث نت نئی شکلوں میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور جن کا حل کرنا ہمارے لئے اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح آج سے پہلے ہر دور میں علماء ومفکرین امت نے اپنے عمومی مسائل کو حل کیا اور جس طرح کہ فقہاء امت نے اپنے اپنے ملکوں میں پیش آمدہ واقعات کے تحت اپنے فتاویٰ اور فقہی مسائل کے ذریعے امت مسلمہ کی رہنمائی کی۔ بلا شبہ آج ضرورت ہے کہ ایسے فقہی اصول کلیہ پر غور وخوض کیا جائے جن کے ذریعے کتاب وسنت کی روشنی میں امت مسلمہ کو پیش آمدہ نئے مسائل کا حل کرنا آسان ہو اور

اصول و قواعد جن دلائل کے ذریعہ مرتب کئے جائیں وہ بھی قرآن وحدیث سے مستفاد ہوں تاکہ امت مسلمہ کے سامنے اسلامی شریعت کی راہ آسان ہو جائے اور کسی کے لئے عملی میدان میں عذر کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی یہ حجت "قرآن کریم جو ہر چیز کے لئے ایک واضح بیان ہے" بندوں کے لئے پوری ہو جائے۔

منصب نبوت کا بیان کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں سے وہ احکام بیان فرمادیں جو ان کے لئے نازل کئے گئے ہیں"۔

نیز بارگاہ خداوندی میں مقبول بندوں کے اتباع کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

"آپ ان لوگوں کے راستے پر چلیں جنہوں نے میری طرف رجوع کیا"۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ کے لوگوں پر اہل علم اور اہل فتویٰ کا اتباع لازم قرار دیا۔ پس ان تین بنیادی امور کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مسائل کا حل کرنے کے لئے اس میدان میں قدم اٹھائیں اور چونکہ ہمارے تیار کردہ حل اور مرتب کردہ اصول و قواعد کی بنیاد یہی تین مأخذ ہوں گے اس لئے لامحالہ ہر شخص ان پر عمل کرنے کا پابند ہوگا اور اس بحث کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے؟ اسی طرح اجتہاد کلی اور اجتہاد جزئی کی بحث بھی بند ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ مسائل و مشکلات حیات کو شریعت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر منطبق کرنے کی سعی کی جانی چاہیے۔

اسلامی تہذیب وثقافت اپنانے کی ضرورت

بزرگان محترم! ہمارے اسلاف کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی ملک یا شہر میں داخل ہوئے انہوں نے وہاں کی تہذیب 'تمدن' ادب' معاشرت اور زبان و علم پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ خود غالب ہوئے اور دوسرں کو مغلوب بنایا اس طرح انہوں نے دین کی روح اور اسلام کے جوہر کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا بلکہ ہر اس چیز کا استیصال کر ڈالا جو روح اسلام کے منافی نظر آئی۔ چنانچہ اس پر حضرت عمرو بن العاص کا وہ واقعہ شاہد ہے کہ جب انہیں دریائے نیل میں ایک نوجوان لڑکی کو بھینٹ چڑھانے کی جاہلانہ رسم کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے متاثر ہوئے بغیر اس بھینٹ کے جاہلانہ اور بے بنیاد عقیدہ کا استیصال کر کے اسلام کے صحیح عقیدے کا تحفظ فرمایا (کہ کسی دریا کا جاری ہونا یا نہ ہونا محض خدا کے ہاتھ میں ہے لڑکی کی بھینٹ کو دریا کی روانی کا مدار بنانا غیر اسلامی اور جاہلانہ عقیدہ ہے)۔

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گرا تو انہوں نے فوراً اٹھالیا' اس پر ان کے فارسی غلام نے اسے معیوب سمجھتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں یہ بات معیوب ہے اور نامناسب ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیب کی سنت ان احمقوں کی خاطر ترک کردوں؟ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف و اکابر کبھی بھی دوسروں کی معاشرت اور طور طریق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنی قوت عمل سے دوسروں کی معاشرت پر اپنی معاشرت کو غالب کیا' اس لئے اگر ہم اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ ثقافت و تہذیب کو دل سے اپنالیں اور دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے لگیں تو لوگ ہماری تقلید و اتباع پر مجبور ہوں گے اور اگر بالفرض ہم مذکورہ تمام اوصاف پ

عمل کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہی ہونا چاہئے کہ غیروں کی تہذیب وثقافت سے صرف وہی اصول اپنائیں جو تعلیمات اسلام' اس کی روح اور مزاج کے خلاف نہ ہوں اور ان کے ساتھ ہمارا تعامل انہی حدود میں ہو جو مخالف اسلام نہ ہوں نہ یہ کہ ہم ہر میدان اور ہر معاملہ میں انہی کے دوش بدوش اور انہی کے قدم بہ قدم چلتے رہیں۔

مقصد اجتہاد

اور اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل تلاش کرنے کا (غیر صحیح) اجتہاد کریں کہ جس کا مقصد اپنے افعال پر قواعد و اصول دین کو منطبق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا اجتہاد محض خدمت دین ہو نہ کہ دنیا کو دین سے منطبق ثابت کرنے کی کوشش۔ جو شخص اپنا دین تباہ کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتا ہے دین اس کے پاس نہیں رہتا اور نہ اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔

بزرگان محترم! اس میں کوئی شک نہیں کہ دین کا دامن نہ تنگ ہے اور نہ اس میں دنیا سے بالکلیہ بے تعلق بنانے والی رہبانیت ہے لیکن علمی اور عملی زندگی میں اس کی کچھ خصوصیات ہیں جن کا مقتضیٰ ہے کہ وہ ہمیشہ ہر میدان میں واضح اور نمایاں رہیں شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام فی الحقیقت ایسے تمام آداب و اصول اور تعلیمات کی جامع ہے کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے عہد نبوت میں بعض مشرکین نے کہا :

"کیا تمہارا نبی تم کو ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کی بھی؟"

اس طرح انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے واضح نہ کر دیا ہو اور ایسے اصول عطا فرمائے کہ جن کی روشنی میں تمام معاملات کے حسن وقبح کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ادارہ بحوث اسلامیہ نے حقیقۃً علماء اسلام کو عصری مسائل پر غور و خوض کرنے کی دعوت دے کر ایک عظیم الشان دینی و علمی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے ہم اس ادارہ اور جامعہ ازہر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے شکر گزار ہیں۔

اس سلسلہ میں میں چند اہم تجاویز ادارے کے سامنے پیش کرتا ہوں جو امید ہے کہ ادارے کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں گی۔

تجاویز

(۱) ضرورت ہے کہ ایسے مسائل کو مرتب کیا جائے جو ہماری سوسائٹی اور معاشرے کا ایک جزو بن چکے ہیں اور جن کے بغیر زندگی گزارنا آج کے دور میں مشکل نظر آتا ہے جیسے بینکوں کا سود' انشورنس اور بیمہ کے مسائل' مال کی درآمد و برآمد وغیرہ کے مسائل۔ یہ سب مسائل واقعاتی شکل و رنگ میں مرتب کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے فرضی احتمالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) اس قسم کے سوالات مختلف ممالک کی نمائندگی کرنے والے علماء کو تقسیم کئے جانے چاہئیں تاکہ وہ ان پر کتاب و سنت کی روشنی میں غور و خوض کرنے کے بعد جوابات اور تحقیقی مقالات پیش کریں پھر جب تمام علماء کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ مرتب ہو جائیں تو مجمع البحوث الاسلامیہ ان علماء

کے دستخطوں سے تمام ممالک میں امت مسلمہ کے افادہ کے لئے ان جوابات و مقالات کو شائع کرے۔ اس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک متفقہ اور قابل قبول حل سامنے آسکے گا۔

(۳) ہم دیکھتے ہیں اس وقت مادی وسائل حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلط جما کر انھیں ایک نقطہ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں اور تمام لوگ وحدت نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کریں کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلا امتیاز رنگ و نسل زمان و مکان کی حدود سے بالا ہو کر مساویانہ برتاؤ کرتا رہے۔ وہ جس طرح جمود و تقشف سے دور ہے ایسے ہی دونوں تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

اسلام کے تین مرکزی نقاط

حضرات! اسلام کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ اول قرآن کریم جو کتاب آسمانی ہے اور دوسرا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور تیسرا خانہ کعبہ جو قبلہ عبادت اور امت مسلمہ کا ذریعہ وحدت نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا :

ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۔

"سب جہانوں کے لئے ذریعہ نصیحت"۔

اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا :

رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "سب مخلوقات کے لئے باعث رحمت"

نَذِيْرًا لِّلْعٰلَمِيْنَ "سب مخلوقات کو انجام سے ڈرانے والا"

اور خانہ کعبہ کے بارے میں ارشاد فرمایا :

هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ

"سب جہانوں کے لئے ذریعۂ ہدایت"

اسی طرح گویا اسلام نے ایک عالمی بلکہ عالمین امت کو ان تین بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد اسے تمام انسانوں کے لئے ظاہر کیا اور اسی لئے اس وقت کے اجماع کو (دین میں) حجت قرار دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

"میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی"۔

پس جبکہ اس امت کی بنیاد ان مہتم بالشان امور پر ہے جو ہر قسم کے مادی، وطنی، قومی اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بلند و بالا ہے تو ضرورت ہے کہ عام لوگوں میں ان کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

امید ہے کہ اس ضرورت کے لئے مجمع البحوث الاسلامیہ اپنا دائرہ کار وسیع تر کریگا اور اس کے لئے مختلف ممالک میں عیسائی مبلغوں اور مشنریوں کی طرح وہ بھی اپنے دعوتی اور تبلیغی مشن اور وفود روانہ کرتا رہے گا۔

توقع ہے کہ ہر ملک کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ان تبلیغی وفود کا خیر مقدم کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اس دعوت و تبلیغ میں مخلصانہ تعاون بھی کریں گے اور اس دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی رسم و رواج مغربی تہذیب سے مس کئے بغیر رچ بس جائیں گے۔

ارشاد خداوندی ہے :

"تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں بہترین نمونۂ زندگی ہے"

اسلام کا اجتماعی دفاع

حضرات! ہماری دلی تمنا اور دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ کی سرگرمیاں اسلام کے دفاع اور اس کے تحفظ میں تیز ہوں اور وہ مستشرقین اور دشمنان اسلام کے اعتراضات وجوابات کے لئے سرگرم عمل ہو۔ نیز ہماری دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ اور ان حضرات مندوبین کے درمیان ایک دائمی اور مستحکم رابطہ قائم رہے اور اسلام پر مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے شبہات و اعتراضات ان تمام حضرات کے پاس بھی روانہ کئے جائیں تاکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جوابات تحریر کرکے ادارے کو روانہ کریں اور وہ ان کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس طرح اسلام کا یہ دفاع یقیناً اجتماعی اور مضبوط ترین ہوگا۔

مناسب ہوگا اگر تمام مندوبین حضرات میں سے بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی جائے جو اس قسم کے مسائل پر غور وخوض کرنے کی مکلف ہو اور پھر اس کمیٹی کی وساطت سے وہ سوالات ادارہ کو بھیجے جائیں تو اسلام کا یہ ایک شاندار عالمی نظام ہو جائے گا۔

ادائے فرض

بہرحال ہمیں توقع ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ ایسے مسائل کا ایک عمومی ادارہ ہوگا اور انشاء اللہ وہ اسلامی تہذیب وثقافت کے موضوع پر مفید تالیفات مختلف زبانوں میں شائع کرے گا۔

یہ چند خیالات مختصر الفاظ میں ذمہ داران ادارہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد میں سب سے پہلے صدر متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبد الناصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد رئیس اجتماعات مؤتمر اور جناب ڈاکٹر محمود حسب اللہ صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمر کی خدمت میں ہدیۂ تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کریں' یہ زیادہ موزوں ہو گا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کردیں تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول وعدم قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔۔۔۔۔۔ اَمَّا بَعْدُ ۔۔۔۔۔۔

احوال واقعی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۶ مارچ ۱۹۶۴ء کو سفر مصر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے حجاز مقدس ہوتے ہوئے بعد فراغت حج ۱۹ مئی ۱۹۶۴ء کو ورود فرمائے دیوبند ہوئے۔ اسٹیشن دیوبند پر بسلسلہ استقبال طلبہ' اساتذہ کارکنان دفاتر اور اہل شہر کا ہجوم تھا۔ طلبہ خوشی کے نعرے بلند کررہے تھے۔ ملاقات' مصافحہ اور دعاء کے لئے خاص نظم قائم کیا گیا تھا جو حضرات اساتذہ کی نگرانی میں عمل آیا۔ طلبائے دارالعلوم کی درخواست پر ایک عظیم الشان جلسہ میں جو دارالحدیث میں منعقد ہوا تھا اور حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا حضرت ممدوح نے خطاب فرمانا منظور کرلیا۔ جلسہ کی صدارت حضرت مولانا فخرالحسن صاحب استاذ دارالعلوم نے فرمائی۔ ابتداء میں طلباء اور بعض اہل شہر کی طرف سے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں جن میں شاعر انقلاب علامہ انور صابری کی نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا مجمع پر کافی اثر پڑا۔ آخر میں حضرت ممدوح نے نعروں کی گونج میں ایک بلیغ جامع تقریر شروع فرمائی جو تقریباً دو اڑھائی گھنٹہ جاری رہی آپ نے اس شاندار خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفر مصر و حجاز کے تاثرات اور عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ اور اجتماع مدینہ یونیورسٹی کے احوال وکوائف پر روشنی ڈالی۔

مؤتمر کے اغراض و مقاصد

آپ نے فرمایا کہ قاہرہ کی اس عالمی مؤتمر کے اغراض و مقاصد کی کوئی تفصیل اس دعوت نامہ میں نہ تھی اجمالی طور پر دعوت کا مقصد جدید تمدن سے پیدا شدہ مسائل کی شرعی تنقیح و تحقیق اور اس سلسلہ سے علماء عالم اسلامی کا ربط باہمی ظاہر کیا گیا جس سے اتحاد بین المسلمین کا جذبہ مفہوم ہوتا تھا نیز مصر کے مرکزی شہروں کی سیر' البتہ مؤتمر کے اجلاس اور رفتار عمل سے جو اغراض و مقاصد ہمارا ذہن اخذ کر سکا ان کا خلاصہ یہ تھا:

(۱) نئے تمدن اور جدید انکشافات سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اصولی طور پر جامعہ ازہر کا موقف علماء کے سامنے رکھ کر ان کے فکر سے اس میں استفادہ۔

(۲) بلاد مختلفہ کے علماء اور دینی حلقوں میں بین الاقوامی رابطہ کے ساتھ موتمر سے ان کی علمی وابستگی ہو تاکہ وہ پورے عالم اسلامی کے عوامی اتحاد کا ذریعہ ثابت ہو۔

(۳) جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کا سنگ بنیاد اور اس کی ہزار سالہ خدمت و عظمت کا تعارف

(۴) حکومت مصر کے بعض اہم دینی اقدامات کا اعلان و تبشیر۔

(۵) فلسطین کی ناجائز تقسیم کی مذمت اور مغصوبہ فلسطین کی عربوں کے حق میں بازیابی کے لئے ایک عالمی تجویز کی منظوری۔

(۶) مصر کی جدید ترقیات اور مصری قوم کے شعور بیداری کا مطالعہ۔

ان مقاصد کے ساتھ مؤتمر کا اجلاس مبنی محافظۃ القاہرہ کے فلک بوس قصر میں شروع ہوا جس میں ۳۸ ملکوں کے ستر نمائندہ علماء نے شرکت کی' مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی مجموعی طور پر سوا سو علمی نمائندے شریک جلسہ ہوئے۔ ہندوپاکستان کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیوبند تھے اجلاس کی کاروائی نہایت منضبط اور باقاعدہ تھی۔ پہلے ہی دن آرٹ پیپر کا ایک خوشنما کتابچہ برنامج (پروگرام) کے نام سے طبع شدہ مندوبین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا' جس میں پہلے ہی دن سے لے کر آخری دن کا نظام عمل بقید گھنٹہ و منٹ پیش کر دیا گیا تھا اس کے مطابق کانفرنس چلی اور چلتی رہی۔ ہر روز کی کاروائی اور خواندہ مقالات و مباحث طبع ہو کر اگلے روز مندوبین کے سامنے آجاتے تھے جس سے رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

مؤتمر کے زیر بحث مسائل

پہلے نمبر کے تحت موتمر میں جن مسائل بذیل برنامج اہمیت دی گئی اور ان پر خطباء نے خطاب کیا وہ یہ تھے:

(۱) اسلام میں مالیات کا نظام تقسیم۔

(۲) عرب اور اسلام کے عالمگیر نفوذ کے طبعی اسباب۔

(۳) اسلام میں اراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔

(۴) اغنیاء کے مال میں غریبوں کے حصہ کی نوعیت۔

(۵) اسلام میں حسبت (احتساب) یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام۔

(۶) اسلام میں اجتہاد کا ماضی و حال۔

(۷) اسلام میں دولتی علاقے۔

تقریباً ان سب ہی عنوانوں پر مقالے پڑھے گئے اور زبانی خطابات بھی ہوئے۔

مسئلۂ اجتہاد

لیکن نئے حوادث و مسائل پر غور فکر کے سلسلے میں چھٹے نمبر (مسئلہ اجتہاد) پر زیادہ زور دیا گیا جو باوجود چھٹا نمبر ہونے کے پہلے ہی دن سے سامنے آ گیا تھا اور اس کی بحث میں کانفرنس کی پوری مدت کا دو تہائی حصہ صرف ہوا۔

فکر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اس وقت تک وقت کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہو سکیں گے کیونکہ آج کی صورت حال جدید انکشافات کی وجہ سے بالکل نئی ہے۔ پچھلا نقش قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

اس موضوع پر اجتہاد کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے بطور تحریک الاستاذ علی عبدالرحمن ازہری وزیر سوڈان نے ایک پر مغز اور طویل مقالے سے اس کی ابتدا کی اور اس کے بعد اجتہاد و تقلید و تلفیق سے متعلق مقالے اور مناقشات سامنے آتے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنا وقت لیا کہ کانفرنس کا زیادہ وقت اسی مسئلہ میں لگ گیا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کانفرنس کا بنیادی موضوع یہی ایک مسئلہ ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ ناظم جامعہ اسلامیہ کراچی فاضل دارالعلوم ورئیس وفد پاکستان کا جوابی مقالہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو نہایت پر مغز اور محققانہ تھا۔

حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ دسویں دن (۱۶ مارچ ۶۴ء) کو ان کا نام پکارا گیا اور مقالہ پڑھنے کی خواہش کی گئی۔ یہ مقالہ تقریباً بیس منٹ میں پڑھا گیا۔ یہی وہ بیان تھا جو مؤتمر میں آپ نے ذمہ دارانہ طریق پر بطور نمائندہ دارالعلوم دیا اور مصری اخبارات نے اس کے اقتباسات خطاب رئیس الوفد الہندی کے عنوان سے شائع کئے۔

آپ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں میں نے امکانی حد تک تمام پیش شدہ مسائل کے بارے میں اجمالی اور اصولی طور پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس وقت مقالہ سنانے کا موقع نہیں ہے وہ اپنے موقع پر شائع ہو جائے گا مگر میں اس میں پیش شدہ امور کو آپ کے سامنے عرض کئے دیتا ہوں گو اختلاف لغت والفاظ سے عنوان اور اسلوب بیان کچھ مختلف ہو جائے گا اور اجمال و تفصیل کا بھی فرق پڑ جانا ممکن ہے لیکن روح مقالہ کی قائم رہے گی۔

مجتہد فیہ مسائل کا حل قوت فکر و عمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے

آپ نے اس مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس میں عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد و تقلید کی بحث میرے خیال میں موضوع سے متعلق نہیں ہے گو اس سلسلہ میں خواندہ مقالات نہایت قیمتی اور پر از معلومات ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت یہ بحث اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو یا کھلا ہوا ہو اور کھلے ہونے کی صورت میں یہ باب مفتوح اجتہاد مطلق کا ہو یا اجتہاد خاص کا، ضرورت اس کی ہے کہ آج جو مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں اور انہیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے ان کے ضمن میں ہر وہ شخص جو کوئی اجتہادی قوت رکھتا ہے اسے عملاً پیش کرے تاکہ ارباب فکر و نظر اس قوت کو پرکھ کر کوئی فیصلہ دے سکیں۔ کیونکہ اجتہاد مطلق ہو یا اجتہاد فی المذہب ہر ایک کی شرائط کتب فن میں محفوظ ہیں جو اجتہاد کی صحت و سقم کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر کوئی اجتہاد فی الواقع اپنی ساری شرائط کے ساتھ کسی شخص کے پاس موجود ہے اور وہ مسائل کے ضمن میں سامنے آ جائے گا جو مسائل کے اجتہادی حل میں اصول و تفقہ کے مطابق ہوگا تو کون جانتے بوجھتے اس سے انکار کر

سکے گا اور اگر شرائط ہی نہ پائی گئیں تو کون اس کے اعتراف و تسلیم پر مجبور کیا جا سکے گا؟

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا پورا زور صرف کریں یہ زیادہ موزوں ہو گا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ایسے مسائل کے تنقیحی سوالات واقعاتی سلسلوں سے مرتب کر کے کافی مدت پہلے سے مندوبین کے پاس بھیج دیئے جاتے یا اب بھیج دیئے جائیں اگر مسائل کا مجوزہ تصفیہ پیش نظر ہے تاکہ متعلقہ مواد فراہم کر کے ہر شخص علیٰ وجہ البصیرت بحث و تنقیح میں حصہ لے سکے اور مؤتمر کے بنیادی فیصلہ تک پہنچ جائے۔

ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل پیش کیا جاتا رہا

حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے خطاب کا یہ حصہ بھی پیش کیا جو مؤتمر میں پڑھا گیا نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے نئے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور نئے نظریات و افکار نئے واقعات و احوال کی وجہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہر دور میں اہل فکر علماء اور مبصر مفتی اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصول فقہ اور منضبط مسالک فقہیہ کی روشنی میں ان کے فیصلے دیتے رہے اور امت انہیں قبول کرتی رہی ہے چنانچہ ہر دور کے فتاویٰ کا ذخیرہ اس کا شاہد عدل ہے۔ آج بھی نئے حوادث و مسائل کی تنقیح و افتاء میں علماء امت نے کوتاہی نہیں کی' حوادث الفتاویٰ اور آلات جدیدہ کے شرعی احکام کے نام سے مستقل کتابیں بھی منضبط کر کے شائع کر دیں جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں نیز جزئی مسائل پر الگ الگ مقالات و رسائل بھی مرتب کر کے شائع کئے جو امت کے زیر عمل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

فکر و عمل کی یکسانی وحدت امت کا موجب ہے

البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی کہ اب ایسے احکام کی اشاعت اور تنقیح مزید عالمی پیمانے پر ہو اور بجائے مقامی ہونے کے بین الاقوامی انداز سے سامنے لائی جائے کیونکہ وسائل نقل و حمل کی آسانیوں کی وجہ سے پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کی مانند ہو گئی ہے۔ اس لئے آج کی ایک پورے ملک کی جماعتی بات بھی پوری دنیا کی نسبت سے شخصی اور انفرادی ہی بات کہلائی جا رہی ہے اور جب تک وہ بین الاقوامی نہ ہو جائے جماعتی نہیں بنتی اس لئے موزوں ہو گا کہ ان جدید فتاویٰ کا مؤقف خواہ وہ کسی بھی ملک کے ہوں پورے عالم اسلام کے سامنے آجائے اور عالمی فکر و نظر سے یہ احکام عالمی انداز سے امت سامنے پیش ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر اور کون انجام دے سکتا ہے۔ وہی اپنے عالمگیر اثرات سے ملک کے جدید فتاویٰ' مقالات اور کتب کے ذخیرے فراہم کر کے بذریعہ تراجم اعضاء موتمر کے سامنے رکھ سکتی ہے تاکہ فکر میں عالمیت اور یکسانی پیدا ہو کر امت کے عمل میں بھی یکسانی کی جھلک آجائے جو وحدت امت کے لئے ایک مؤثر ترین وسیلہ کا کام دے سکتی ہے اور یہی وہ عالم اسلامی کا مضبوط اتحاد ہو گا جو پائیدار ہو گا جو پائیدار بنیادوں پر قائم ہو کر پائیدار ثابت ہو سکے گا۔

انسانیت کو عالمی دین کی تلاش

آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ میں نے مقالہ میں یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ہی جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ نفس اسلام سے دنیا کو روشناس کرانا ہے جبکہ آج کی کائنات پسند دنیا ایک فطری اور جامع دین و دنیا مذہب کی تلاش میں خود بھی سرگرداں اور متلاشی ہے اور جبکہ وسائل نقل و حمل کی وسعت و سہولت کی وجہ سے پوری دنیا ایک خاندان کی مانند ہو گئی ہے جس کے تمام تمدنی امور میں یکسانی آتی جارہی ہے۔ ملکوں کی مقامی خصوصیات مٹتی جارہی ہیں اور اشتراک کی ایک وسیع فضا پیدا ہورہی ہے جس سے دنیا کا پلیٹ فارم بھی ایک ہوتا جارہا ہے اور جذبات کی رو ادھر آرہی ہے کہ تمدن و تہذیب سب کا ایک ہو، معاشرت ایک انداز کی ہو حتیٰ کہ سیاست بھی سب کی ایک رنگ کی ہو اور ایک ہی پلیٹ فارم سے چلے اور آگے بڑھے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہوتا جارہا ہے اور پوری دنیا ایک ہی عالمگیر تمدن اور ہمہ گیر معاشرت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اس اشتراک فکر کی وجہ سے طبعاً دنیا کے جذبات ادھر بھی آرہے ہیں کہ مذہب اور دین بھی سب کا ایک ہو، دینی پلیٹ فارم بھی سب کا ایک ہو اور اسے کوئی عالمگیر دین ہاتھ آجائے جس میں نہ وطنی حد بندیاں ہوں نہ قومی، نسلی اور وطنی تحدیدیں ہوں نہ لونی **تخصیصات**، بلکہ وہ نفس انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا نام لے کر پوری ہی دنیا کو آواز دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس نے یہی عالمگیر نعرہ اخوت و مساوات لگایا اور دنیا کو دین میں پیوست کردیا ہے اس لئے دنیا دوسرے لفظوں میں اسلام کو پکار رہی ہے اور اس کی خواہاں ہے۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہے کہ اصل اسلام کو ان عالمگیر وسائل سے پورے عالم کا دین بنانے کی ہمت لے کر اٹھیں۔

ظاہر ہے کہ اس اہم ترین مقصد کے لئے جس قوت اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ مجمع البحوث کے پاس موجود ہیں اور غیر موجود کو وہ با آسانی فراہم بھی کر سکتی ہے جس کے لئے سارا عالم اسلام اس کے ساتھ تعاون کرنا اپنا فرض منصبی سمجھے گا۔

اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالۂ شبہات

آپ نے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں جیسے اس مثبت پہلو پر کام کرنا ضروری ہے ایسے ہی منفی انداز میں یہ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام سے بے خبر یا باخبر معاندین خواہ وہ مستشرقین یورپ ہوں یا مستغربین ایشیا جو شکوک و شبہات یا اعتراضات اسلام کے بارے میں پھیلا کر قلوب کو تشویش و تذبذب اور منافرت کا شکار بناتے رہتے ہیں ان کو بھی عالمی پیمانہ پر ہی دفع کیا جائے جبکہ وہ شکوک کی رو بھی عالمی انداز میں بہا رہے ہیں۔ بلاشبہ علماء ازہر نے اس سلسلہ میں شاندار اور وقیع خدمات انجام دی ہیں لیکن وہ لسان اجنبیت کی وجہ سے سب کے سامنے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خدمت بھی بین الاقوامی ہی رنگ سے ہو جن میں پورے عالم اسلامی کے علماء کے فکریات شامل ہوں اور جس طرح مختلف ممالک کے مسیحی مبشرین ان شکوک کو عالمگیر انداز میں پھیلا رہے ہیں اسی طرح مختلف بلاد کے علماء کی طرف سے ان کے جوابات بھی عالمگیر ہی انداز میں سامنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت پورے عالم میں اسلام اور مسیحیت کی یہ نظریاتی اور فکری جنگ ہے اس لئے اس کا مقابلہ بھی برابر ہی ہتھیاروں سے ہونا چاہئے جب ہی وہ مؤثر اور کار آمد ثابت ہوگا اس لئے مجمع البحوث کے برنامج میں یہ نمبر بھی مقصدی حیثیت سے شامل رہنا چاہئے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے فکر و اجتہاد کا دائرہ صرف فقہیات و جزئیات مسائل تک محدود نہ رہنا چاہئے بلکہ

پوری دنیا کو سامنے رکھ کر پورے اسلام کی تعلیمات کی توسیع واشاعت کا فرض ادا کرنا چاہئے

دائرۂ اجتہاد میں اتباع اسلاف

حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اور مقالے کے شمولات کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ ہم میں اجتہادی کچھ نہ کچھ قوتیں ہماری بساط کے مطابق آج بھی موجود ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا اس لئے موجودہ اجتہاد کو استعمال کر کے اضافہ کا منتظر رہنا چاہئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہمیں اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہئے کہ ہم آج کے مغربی تمدن اور اس کی مصنوعی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کرلیں اور پھر قرآن وحدیث سے ان کے مؤیدات تلاش کر کے ان کو حدود جواز میں لانے کی فکر کریں جو آج ایک عالمگیر وباء کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ کتاب وسنت کا اتباع نہیں بلکہ کتاب وسنت سے اپنا اتباع کرانا ہے جو علاوہ بے ادبی کے ایک مہلک اور خطرناک حرکت بھی ہے۔ ہمارے لئے اس فکر ونظریا طریق استنباط میں جہاں اصول وقواعد فن کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی کے ساتھ ان کے ترکہ سے پہنچا ہوا وہی ذوق تھامے رہنا بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا اور بطور توریث ہم تک پہنچایا ورنہ اس کے بغیر دین کا وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو وَيُزَكِّيهِمْ کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بخشا۔ اس لئے طبعاً ہم اجتہاد کے دائرہ میں رہ کر بھی اتباع سلف کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے تاآنکہ ایک ایک سنت اور ایک ایک اسوۂ سلف ہمارے جہد واجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہئے۔

اس پر حضرت ممدوح نے مقالہ کی چند مثالیں بھی نقل فرمائیں جو مقالہ میں آپ پڑھ سکیں گے۔

عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا 'بلاد مختلفہ کے علماء کے جمع ہونے سے قدرتی طور پر ربط واتحاد کا ایک مظاہرہ ہوا جو خوش آئندہ تھا اور ساتھ ہی مؤتمر کے مقاصد میں بھی داخل تھا۔ آپ نے اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے زیادہ زور عرب اتحاد اور اس میں بھی خصوصیت سے مصروشام اور حجاز کے اتحاد پر اہمیت کے ساتھ زور دیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے شرعی اشارات سے مصروشام اور حجاز کی خصوصیات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم ان تین مرکزی ملکوں کو محض سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے اہمیت نہیں دیتے بلکہ دینی اور مذہبی حیثیت سے اہم اور مقدس جانتے ہیں۔ شریعت نے حجاز کو مرکز عبادت بتایا ہے 'شام کو مرکز شوکت کہا ہے اور مصر کو مرکز عسکریت فرمایا ہے۔ حجاز مرکز امن اس لئے رکھا گیا کہ عبادت بغیر امن کے نہیں ہوسکتی' شام کو مرکز جنگ ودفاع اس لئے رکھا گیا کہ شوکت بغیر مدافعت وہجوم کے قائم نہیں ہوسکتی اور مصر کو مرکز عسکریت اس لئے رکھا گیا کہ مشرق میں مغرب کے سیاسی اقدامات کی روک تھام بغیر عسکری قوت کے نہیں ہوسکتی اس لئے یہ تین ملک تین قسم کی مخصوص مرکزیتوں کے حامل ثابت ہوئے۔ اس صورت میں ان کے باہمی ربط کی صورت حال خود بخود کھل جاتی اور وہ یہ کہ امن عبادت کے لئے شوکت ضروری ہے اور شوکت کی بقاء کے لئے عسکریت ضروری ہے تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حجاز کا تحفظ بلاد شام کی شوکت کے بغیر ممکن نہیں اور شام کی شوکت کی برقراری مصر کی عسکری قوت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے جب تک مصر کی فوجی طاقت مضبوط نہ ہو اور شام وحجاز سے اس کا اتحاد نہ ہو نہ شام وحجاز کا تحفظ ہوسکتا نہ خود مصر کا اور جب کہ یہ تمام نقاط خود احادیث میں دکھائے گئے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نقاط بحث محض سیاسی یا جغرافیائی نہیں بلکہ دینی

ہیں اس لئے ہم مصروشام اور حجاز کا باہمی اتحاد دینی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اندریں صورت اگر عالم اسلام کا اتحاد چاہتے ہیں تو اس کے لئے عرب اتحاد پہلا زینہ ہے اور عرب اتحاد کا پہلا قدم مصروشام اور حجاز کا اتحاد ہے آج جبکہ صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ السید جمال عبدالناصر نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگایا ہے اور بالفاظ دیگر اسلامی اتحاد کا پرواز ڈالا تو ہمیں ان کے اس نعرے کی قدر کرنی چاہیے اور اس کے لئے یہ مؤتمر بلاشبہ ایک مبارک قدم ہے۔

مصر کی صنعتی ترقی

آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ موتمر کے ان جلسوں کے دوران ہی میں دو تین دن کے بعد مصر کے مختلف مرکزی شہروں کے سفروں کا پروگرام رکھا گیا تھا موٹر کاروں سے اور کہیں ہوائی جہاز سے۔

سب سے پہلا سفر المحلۃ الکبریٰ کا ہوا جو مصر کا صنعتی مرکز ہے۔ جس میں پارچہ بافی اور قالین بافی وغیرہ کے مل اور فیکٹریاں ہیں۔ دوسرا سفر طنطا کا ہوا جو مصر کا ایک بڑا صنعتی شہر ہے۔ تیسرا سفر نہر سوئیز اور فلسطین کا ہوا جو مصر کی فوجی قوت کا مرکز ہے۔ اس سفر میں اولاً عریش آیا جو نہر سوئیز کے کنارے ایک پر فضا شہر ہے اور اس سے ایک میل آگے بڑھ کر نہر سوئیز ہے جس کے کناروں پر چلتی پھرتی گودیوں کا انتظام ہے۔ نہر سوئیز مصر کی ایک عالمگیر شوکت کا قدرتی نشان ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اس سمندری نہر سے یورپ وایشیا اور افریقہ وامریکہ کے جہاز گزرتے رہتے ہیں جن کا کسٹم لیا جاتا ہے اور تلاشی لینے کے بعد ڈیوٹی بھی وصول کی جاتی ہے۔

نہر سوئیز سے گزر کر صحرائے سینا آیا جس سے گزرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ اسلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے گزرنے کا تصور بندھا رہا' اس مقدس وادی کی برکات سے قلب و روح متاثر ہوتے رہے۔ اس کے بعد غزہ آیا جو فلسطین کا آخری سرحدی شہر اور فوجی حیثیت سے ایک اہم مقام ہے۔ یہی شہر امام شافعی رحمۃ اللہ کا مولد و منشا بھی ہے۔ چنانچہ ہمیں وہ بلڈنگ دکھلائی گئی جو آج حضرت الامام کے مکان ولادت پر بنی کھڑی ہے۔

غزوہؔ میں فلسطینی عربوں نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ شب میں ہم پہنچے تو غزوہ کے ایک پر تکلف اور وسیع ہوٹل میں طعام و قیام کا انتظام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک مختصر سا استقبالیہ جلسہ اسی ہوٹل میں ہوا۔ صبح کو ہم نے کئی لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی جھونپڑیاں دیکھیں جس میں فلسطین کے تباہ حال عرب عسرت و تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر فلسطینی عربوں کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ان عالمی علماء کو مرحبا کہا گیا' خیر مقدمی نعرے لگائے گئے' تقریریں ہوئیں اور آخر میں تقسیم فلسطین کے خلاف ایک عالمی تجویز پاس ہوئی۔

واپسی پر مؤتمر کے دو تین اجلاسوں کے بعد پھر ہوائی جہاز سے اسوان کا سفر ہوا جہاں دریائے نیل پر بند باندھا جارہا ہے اور جدید اسوان شہر کی تعمیر کی جارہی ہے۔ جس سے مصر کی ٹیکنیکل ترقی کا پروگرام سامنے آیا اور ہم نے دیکھا پندرہ بیس میل کی حدود میں لوہا اور سیمنٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے وسیع پیمانے پر تعمیر ہورہے ہیں۔ اس سفر سے واپسی کے بعد مدیریۃ التحریر کا سفر ہوا جو مصر کی زراعتی ترقیات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں فوجی دستہ نے مہمانوں کو خیر مقدمی سلامی دی۔ بچوں نے فوجی کرتب دکھلائے اور ورزشی کھیلوں کا مظاہرہ کیا۔ مہمانوں کو عطر کی شیشیاں پیش کیں اور یہ اجتماع پانچ' چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ شام تک

واپسی ہوئی اور صبح سے پھر بدستور مؤتمر کے اجلاس جاری رہے۔

دار القرآن کا سنگ بنیاد

اعضاء مؤتمر کے اس مبارک اجتماع کے موقع پر قاہرہ میں دو اہم اور عظیم الشان عوامی جلسے بھی منعقد کئے گئے: ایک دار القرآن کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے جو جامعہ ازہر سے متعلق ہے اور اسے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے تاکہ قرآن کریم کی تعلیم ذیلی ضمنی نہ رہے بلکہ ایک مستقل نصب العین کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس کی صدارت نائب صدر جمہوریہ السید حسین شافعی نے فرمائی۔ تلاوت و تقریرات اور تاسیس کے بعد اس جلسہ میں تمام مہمانوں کو مصر کے مطبوعہ قرآن شریف بطور ہدیہ پیش کئے گئے۔

مدنیۃ الازہر

دوسرا عظیم الشان جلسہ جامعہ ازہر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے مدنیۃ النصر میں منعقد ہوا، جس کا پنڈال غیر معمولی طور پر وسیع اور پرشوکت بنایا گیا تھا اس میں تقریباً بیں پچیس ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ یہ پنڈال جھنڈیوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر مندوب علماء کی کرسیاں تھیں اسٹیج کے نیچے ایک جانب مصری زعماء و علماء بٹھلائے گئے تھے اور دوسری جانب سفراء دول کی نشستیں تھیں۔ صدارت کے لئے اعلان صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ السید جمال عبد الناصر کا تھا لیکن وہ بعض ہنگامی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے تو ان کے امر سے سید حسین شافعی نائب صدر جمہوریہ نے ان کی نیابت کی اور جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ایک پورا شہر کا شہر مدنیۃ الازہر کے نام سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔ جس میں جامعہ ازہر کے تمام کالج، مدارس، دار الاقامے اور دفاتر یکجائی ہوں گے جو اب منتشر ہیں۔ جامعہ ازہر نے سولہ کروڑ روپیہ کا تخمینہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔

ہزار سالہ علمی عظمت

اس اجتماع میں اجمالاً جامعہ ازہر کی ہزار سالہ علمی عظمت پر روشنی ڈالی گئی جس کا سب نے اعتراف کیا کہ اس ہزار سالہ جامعہ نے بلاشبہ بڑے بڑے ائمہ علوم وفنون پیدا کئے۔

ظاہر ہے کہ جب اس کے فضلاء فارغین میں جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے ائمہ علم وہدایت ہوں تو اس کی زرین خدمات سے کون انکار کر سکتا تھا۔

صدر ناصر ___ خدمات اور کردار

اسی دوران میں ملک میں الیکشن کا ہنگامہ بھی برپا ہوا، نئی پارلیمنٹ چنی گئی اور اس میں السید جمال عبد الناصر صدر مملکت چنے گئے۔

نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس نئے صدر منتخب (السید جمال عبد الناصر) کی صدارت میں ہوا جس میں صدر مملکت نے تقریباً تین گھنٹے تقریر کی جس میں مصر کے جدید دور کی جو شاہیت کے خاتمہ کے بعد کا ہے ترقیات کا مفصل تذکرہ کیا اور قوم نے بے پناہ چیرز اور تالیوں کی گونج میں صدر کا خطاب سنا اور اس سے متاثر ہوئی۔

مصری قوم اپنے موجودہ صدر سے کافی محبت رکھتی ہے۔

اولاً صدر کی خدمات کی وجہ سے جن میں سے عظیم ترین خدمت اتحاد ثلاثی (اسرائیل، برطانیہ، فرانس) کے حملہ سے مصر کو بچانا ہے اور اندرونی طور پر مصر کو مہلک قسم کی سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نجات دلانا، نیز پوری قوم کو یکسانی کے ساتھ ہر ممکنہ ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور مصر کو صنعتی، زراعی، علمی ترقیات کے راستہ پر ڈال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے صدر کے ذاتی کردار کی پختگی اور اس سادگی کا مصر والوں پر خاص اثر ہے کہ جمال عبد الناصر نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے آج تک کوئی سرکاری عمارت استعمال نہیں کی اور جاہ وجلال کی رسمی نمائش سے الگ رہے بلکہ ابھی تک بھی وہ اپنے ہی قدیم ذاتی مکان میں رہائش رکھتے ہیں جو شہر میں اور مکانوں کے ساتھ ایک عام مکان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی اولاد اور بچوں کے لئے اسکول وغیرہ جانے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح یہ بچے بھی سائیکلوں پر اسکول جاتے آتے ہیں۔ اسکولوں کا عام قانون ان پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح قوم کے دوسرے بچوں پر۔

صدر مملکت خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مسجدوں میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں نہ کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے۔ جہاں جگہ ملتی ہے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں پنج وقتہ نمازوں کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

مصر کی عمومی مذہبی حالت

اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عامۃً نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں، قاہرہ، طنطا، اسکندریہ، غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آئی، مساجد کے نقشے نہایت پر شوکت اور تعمیریں معیاری ہیں۔ ساتھ ہی ان مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ ائمہ ومؤذنین حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں۔ ہر وقت کی نماز میں نمازی جوق درجوق آتے ہیں اور مساجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر وبیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد ائمہ مساجد آدھ پون گھنٹے وعظ بھی کہتے ہیں۔

مصری قوم میں ملنساری اور محبت کا مضمون کافی ہے۔ جب تک زبان وغیرہ کی اجنبیت رہتی ہے بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے لیکن جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ضمائر سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

اکرام ضیف

اکرام ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا مزاج ہی ہے، جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں، مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خو طبیعت ثانیہ ہے اعضاء مؤتمر کی مدارات وضیافت میں مصر نے کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ وزراء، امراء اور انجمنوں کی طرف سے دعوتیں عموماً ہوٹلوں میں دی جاتی تھیں، اندازہ یہ ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں ہوٹلوں کا انتخاب اور ترتیب خاص سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ہر اگلے دن کا ہوٹل پچھلے ہوٹل سے زیادہ عظیم اور عالی شان ہوتا تھا۔ ہر پہلا ہوٹل دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ اس سے بہتر ہوٹل دوسرا نہ ہوگا لیکن اگلے دن دوسرا ہوٹل نگاہوں میں پہلے کو گرد بنا دیتا تھا۔ شخصی طور پر بھی متعدد علماء وفضلاء کے لئے

دعوتیں ہوئیں مگر سلیقہ مندی ہر حرکت سے محسوس ہوتی تھی۔ کاموں میں مستعدی اور اداء فرائض میں چستی نمایاں نظر آتی تھی، قوم کا علمی شعور عام طور پر بیدار ہے۔

مصر کا سرکاری مذہب

سیاسی سوجھ بوجھ انفرادی حد تک بلکہ اجتماعی اور قومی ہے۔ قومی الیکشن کے سلسلہ میں جن امور کی خاص طور پر مؤتمر کے اجلاس میں مندوبین کو بشارت دی گئی وہ یہ کہ دستور مملکت میں مستقل دفعہ رکھدی گئی ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے او سرکاری زبان عربی ہوگی۔

اشتراکیت کا پروپیگنڈہ

یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کرلی گئی ہے اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کے بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا کمیونزم کا نہیں ہوگا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت وعمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے کمیونزم نہیں کہلائی جاسکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کے ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کردیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصہ جسے مصر جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے وہ کم وبیش صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشنلائز کردیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہر حال شخصی املاک کی افراط کو جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بڑا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو ختم کر کے حدود اعتدال میں لے آنا قابل ملامات نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابل ستائش کہا جاسکتا ہے۔ بہر حال مؤتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔

مصری قوم کی قرآن کریم سے والہانہ محبت

یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآن کریم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوت قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائیگا۔ چنانچہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جاچکا تھا قاری محمد حسری نے (جو مصر کے مشہور مجود ہیں) یہ تلاوت شروع بھی کردی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف

ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں۔ جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں یہ لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور مجود جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے' وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل' جامعہ شافعیہ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینب میں دوسرے ایک مشہور مجود اس عمل کے پابند ہیں اسی طرح اور تمام جوامع کا یہی دستور ہے۔ سماع قرآن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآن کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ایک سپاہی جو سڑک کے چوراہے پر پہرہ دے رہا ہے اسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسسٹر نکال کر قرأت سننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جامعہ ازہر میں ہر مدرس کے انتخاب میں حافظ قرآن ہونے کی شرط رکھی گئی ہے۔ دار القرآن کا سنگ بنیاد ہی مستقلاً حفظ کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی ہے دوسرے عربی ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

حفاظت قرآن کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری کارنامہ

پھر نہ صرف تلاوت قرآن بلکہ حفاظت قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ یہود بے بہبود نے اپنی روایتی تلبیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلا دیا جس میں سے کئی سورتیں خارج کر دیں' کتنی ہی آیتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے تاکہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رو رک جائے اور جو مسلمان ہوں وہ غلط اور مخالف اسلام عقائد واعمال کے حامل اور داعی ہوں تاکہ اسلام کی تعلیمات کو سن کر قومیں ہنسیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآن کریم چھپوایا اور اس کے سرورق پر یہود کی اس شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف یہی بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کی بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریا برد کر کے یہ صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچا دیا جس سے عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظت خداوندی کھل کر نمایاں ہو گئی۔

مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میرا یقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کو اس قرآنی شغف ہی نے تیرا رکھا ہے جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود تھمی ہوئی ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال مؤتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے' حکومت کی زبان لسان قرآن ہے' حکومت کا نصب العین اشاعت قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظت قرآن ہے جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زائد مصر کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

مغربیت سے مرعوبیت

مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کے لئے ان ساری مسرتوں کے ہجوم میں کوفت اور سوہان روح کا سبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہو جانا ہے جب تک ان کے ضمائر اور مافی الضمیر کا اندازہ نہ ہو ظاہری طور پر قاہرہ و پیرس اور لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔ جہاں مساجد نمازیوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دیگا۔ نمازیں بھی پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر، آداب شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے۔ اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے۔ عورت مرد کا اختلاط عام ہے۔ جلسوں ٗبازاروں اور دفتروں حتیٰ کی مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔

جامع ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا حلقہ مستقل تھا جس میں وہ کھلے منہ شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظر عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ ملی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن گو بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے مگر اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے۔ اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے سے یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔

تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جاتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جارہی ہے کیونکہ قدیم فقہ یقیناً بہت سی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کرتا اور توسعات میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا ہے۔ اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صاف بات مغربیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔

ممکن الزوال خرابیاں

اب فکری اور عملی بے راہ رویوں کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔ یہ توسعات درحقیقت فکر کی آزادی سے چلتے ہیں ؎

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روادارد
زنند لشکر یا نش ہزار مرغ بہ سیخ

کا معاملہ سامنے آیا ہوا ہے اس لئے جائزات کی تلاش بلکہ جائزات سازی کی کثرت ہے اور عوام کی حد تک کوئی ممنوع و مکروہ ناجائز کی حدود میں نظر نہیں آتا۔

گو اس میں امید کی کرن یہ ضرور نظر آتی ہے کہ اوپر کی ذکر کردہ خوبیاں اصلی ہیں اور یہ خرابیاں یورپ اور یورپینوں سے ہمہ وقتی قرب اور غلط ماحول کا نتیجہ اور اس کا رسوخ تنبیہہ و اصلاح کی کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ سمجھانے پر قلوب متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور رفتار کے بدل جانے کی بھی توقع ہم لوگوں کے اپنے مقالات و خطابات میں ان امور پر شائستہ انداز میں نکیر و ملامت کی جس پر کسی بیزاری کے بجائے ہمیں شرمساری محسوس ہوئی۔ اس لئے اصلاح اور مصلح کے لئے یقیناً گنجائشیں ہیں مگر مصلح کی کامیابی صرف صحیح عمل کی

نشاندہی سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ استدلالی قوت سے صحیح فکر کی نشاندہی نہ کی جائے اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کوئی علمی رنگ کا اقدام نہ کیا جائے اور وہ بھی مسلسل جب تک کچھ اہل دل خواص ان کے پیچھے نہ لگ لیں اور استدلال و نظر کے ساتھ اپنے عمل و تقویٰ کا نمونہ ان کے سامنے نہ رکھتے رہیں' اصلاح و تعدیل مشکل ہے۔

بہر حال جیسے دنیا کی ہر قوم میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں اسی طرح مصری قوم میں بھی کچھ خوبیاں ہیں جو کافی حد تک ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں مگر ممکن الزوال بشرطیکہ مؤتمر کے عالمی رابطہ کو اس میں استعمال کیا جائے۔

بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت

حضرت محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بہر حال میں نے مصر پہنچ کر اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کر کے جو کچھ اندازہ لگایا' میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے' پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصرہی کے ساتھ مخصوص نہیں اس غلبہ سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر و مغلوب ہو چکا ہے' کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ بے پردہ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو وہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کے ساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو وہاں کی قدرتی آب و ہوا کا نتیجہ ہے دونوں کی مضبوطی نے انہیں استحکام اور قیادت کے رستہ پر ڈال دیا ہے اور وہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ کے مصداق ہو کر اَحَقُّ بِالْمُلْكِ کے حقدار بن گئے ہیں اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا اثر و رسوخ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا چلا جائے گا اور بالخصوص مڈلیسٹ کے ممالک کو ان اٹھائی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔

ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلاشبہ ان کے حسن تدبر کی قابل ستائش مثال ہے۔

حضرت ممدوح نے اس تقریر میں مصر کے احوال و مشاہدات پر تفصیلی روشنی ڈالی' اس بارے میں چونکہ حضرت موصوف کے مشاہدات مصر و حجاز سے آئے ہوئے خطوط میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس لئے مشاہدات سے بجائے اس تحریر میں تاثرات اور مقالات کو جمع کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے جن میں بنیادی چیز آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے مؤتمر میں پڑھ کر سنایا۔

اس تقریر میں آپ نے اپنے اس مقالہ کے بنیادی نکات کی ضروری حد تک نشاندہی اور مزید تفصیل فرمادی مگر پھر بھی مقالہ میں جو تعمیری تجویزیں اور ضروری نکات مؤتمر کے سامنے رکھے گئے تھے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت ممدوح ہی کے اصل عربی الفاظ میں مع ترجمہ کے پیش کر دیا جائے تاکہ اس متن کے ساتھ زبانی بیان کردہ حالات و مشاہدات اس کی شرح کی حیثیت سے سامنے آجائیں۔

اس عربی بیان کا سلیس ترجمہ ہمارے دار العلوم کے صف عربی کے استاذ مولانا وحید الزمان صاحب نے کیا ہے جس میں اصل مقالہ کی روح کو پوری طرح باقی رکھا گیا ہے (مقالہ رسالہ دار العلوم کے اسی شمارے میں شامل ہے)۔

اس سلسلہ میں فلسطین اور غزہ کے سفر میں آپ نے تقسیم فلسطین کے خلاف بھی اپنی رائے بذیل تحریر

منضبط فرمائی تھی لیکن جبکہ فلسطین سے متعلق تجویز کے سلسلے میں وہ سب امور موجود تھے جو اس مقالہ میں درج کئے گئے تھے اور اس تجویز پر حضرت ممدوح کے دستخط بھی ہوئے اس لئے مقالہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اس بارے میں حضرت موصوف کا زاویہ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ مقالہ بھی مع ترجمہ کے ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے (جسے خطبات کے صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)۔

سفر حجاز

یکم اپریل ۶۴ء کو حضرت موصوف قاہرہ سے بقصد حج بیت اللہ حجاز مقدس روانہ ہوئے اور اس تاریخ میں براہ جدہ ہوائی جہاز سے اولاً مدینہ طیبہ پہنچے اور وہاں چودہ دن قیام کر کے ۱۶ر اپریل کو مکہ مکرمہ پہنچے اور ۲۱ر اپریل کو ادائیگی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اس تقریر میں آپ نے مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ کے اجتماعات کا بھی ذکر فرمایا جن کا اجمالی خلاصہ علمی دنیا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران اس دفعہ خصوصیت سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے متعدد اساتذہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے اور وسعت اخلاق کے ساتھ ملے۔

دوسرے روز مدینہ یونیورسٹی کے رجسٹرار الاستاذ الشیخ عبود بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بعنایت کرم وعنایت پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں انہوں نے یونیوسٹی کی طرف سے دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ خیر مقدم کے طور پر یونیوسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہوں اور آپ کچھ خطاب بھی کریں۔ حضرت ممدوح نے یہ کہہ کر کہ میں تو خود ہی جامعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اس دعوت کو بصد شکریہ قبول فرمالیا۔

مقررہ وقت پر کاریں آگئیں اور آپ اپنے رفقاء سفر خصوصیت سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت صوبۂ بہار، صاحبزادۂ محترم مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالحق صاحب پیش کار اہتمام دارالعلوم کو ساتھ لے کر یونیورسٹی روانہ ہوگئے۔

یونیورسٹی کے وسیع صحن اور چمن میں الاستاذ عبود اور دوسرے حضرات نے خوش آمدید کہا اور یونیورسٹی کے نائب الرئیس الشیخ بن باز کے دفتر میں پہنچایا جو ایک متبحر عالم اور قادر الکلام خطیب ہیں۔

شیخ بکمال شفقت وعنایت پیش آئے۔ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھیڑا حضرت مہتمم صاحب حالات بیان کرتے رہے جس سے شیخ متاثر ہوئے۔ شیخ بن باز نے متعدد قیمتی کتابوں کے ہدایا حضرت ممدوح اور ان کے تمام رفقاء کو عنایت فرمائے۔

پھر شیخ عبود نے یونیوسٹی کا معائنہ کرایا اور آخر میں یونیورسٹی ہال میں لے گئے جہاں تمام طلبہ، اساتذہ اور الشیخ بن باز پہلے پہنچ چکے تھے اولاً شیخ بن باز نے تقریباً نصف گھنٹہ تقریر فرمائی اور فرمایا کہ میرا ارادہ تھا کہ میں اس خطاب میں مناسک حج پر روشنی ڈالوں لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ رئیس دارالعلوم دیوبند ہم میں موجود ہیں۔ ہم بہ صد طوع ورغبت ان کے افکار وخیالات سننے کے آرزومند ہیں۔

اس تقریر کے بعد صدر جلسہ نے حضرت مہتمم صاحب کا تعارف کرایا اور تقریر کے لئے ایماء کیا۔

مدینہ یونیورسٹی میں خطاب

حضرت ممدوح نے اسٹیج پر پہنچ کر اپنا مقالہ پڑھا جسمیں شکریہ ارباب جامعہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کے

حالات، تعلیمات، مسلک اور دینی رخ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور آخر میں جامعہ مدینہ منورہ کے بارے میں ستائش کے وہ کلمات فرمائے جو اس مقدس یونیورسٹی کے شایان شان تھے۔

دارالعلوم کے حالات، معاملات اور مسلک کی تفاصیل کے جملوں پر اکثر اسٹیج اور طلبہ کی طرف ماشاء اللہ اور الحمدللہ کے کلمات بلند ہوتے رہے۔

یہ مقالہ بھی دارالعلوم کے اسی شمارہ میں شامل کیا جارہا ہے (جسے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

بے اصل بات

اس مقالہ کے اختتام پر صدر جلسہ حضرت ممدوح کے شکریہ اور کلمات خطاب کی تحسین کے لئے اٹھے مگر خطاب شروع کرنے سے پیشتر اسٹیج پر اتر کر حضرت مہتمم صاحب کی کرسی کے پاس آئے جو شیخ بن باز کے پاس بچھی ہوئی تھی اور جھک کر اور اپنی ایک کچی یادداشت کو سامنے رکھ کر استفساری لہجہ میں فرمایا،

> "کیا یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اہل حدیث طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے اور کوئی داخل ہوتا ہے تو اسے خارج کردیا جاتا ہے چنانچہ ایک سال اس کا کھلا مظاہرہ بھی ہوا کہ آٹھ دس طلبۂ اہل حدیث دارالعلوم سے خارج کردیئے گئے۔ یہاں یہ پروپیگنڈہ عام ہے کیا اس کی کوئی اصلیت ہے"؟

حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے فرمایا :

> "یہ بے اصل بات ہے جو جناب کے کانوں میں ڈالی گئی ہے مسلک کے اختلاف کی بنا پر نہ کبھی اہل حدیث طلبہ کا داخلہ دارالعلوم میں روکا گیا ہے اور نہ کسی مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔
>
> جس واقعہ کی طرف جناب اشارہ فرمارہے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ اہل حدیث اور حنفی طلبہ میں **مسلکی** تنازعہ ہوا۔ نوبت ایک دوسرے کے بزرگوں کے حق میں سخت کلامی بلکہ بدکلامی کی آئی اور اس نزاع کا اثر دارالعلوم کے عام ڈسپلن پر پڑنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ یہ معاملہ عام ہنگامہ کی صورت اختیار کرے تو نظم برقرار رکھنے کے لئے ان جھگڑالو طلبہ کو جھگڑے کی بنا پر خارج کیا گیا جن میں اہل حدیث بھی تھے اور حنفی بھی۔ اگر مسلک کے تفاوت کی بنا پر یہ اخراج ہوتا تو حنفی کیوں خارج کئے جاتے اور اگر مسلک کے اختلاف کی بنا پر اہل حدیث خارج کئے جاتے تو انہیں داخل ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پھر خارج کرنے کا بار سر لیا جاتا اور اگر یہ سب کچھ مسلک کے اختلاف کی بناء پر ہوتا تو جو اہل حدیث اس نزاع میں شریک نہیں تھے انہیں بدستور دارالعلوم میں کیوں داخل رکھا جاتا؟ اس لئے یہ واقعہ سرتاپا غلط ہے کہ ان طلبہ کے اخراج کی وجہ تفاوت مسلک ہے"۔

اس سے صدر جلسہ بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر اولاً حضرت مہتمم صاحب کے مقالہ کے بارے میں بھرپور تحسین کے کلمات فرمائے پھر دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آخر میں اس واقعہ کا ذکر کرکے فرمایا کہ :

"دارالعلوم دیوبند کے بارے میں جو یہ شہرت دی گئی اور بارہا کان میں پڑا کہ وہاں اہل حدیث کا داخلہ ممنوع ہے یا وہ اس بنا پر خارج کئے جاتے ہیں غلط ہے۔ ہم نے اسی وقت رئیس دارالعلوم سے اس کی تحقیق کی تو یہ شہرت بے اصل ثابت ہوئی۔ ایسی افواہوں کا پھیلانا نامناسب ہے"۔

حضرت مہتمم صاحب نے جب یہ تفصیل اپنے اس خطاب میں ارشاد فرمائی تو مجمع میں اس سے خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور افسوس اس کا ہوا کہ لوگ غیر ممالک اور بالخصوص حجاز مقدس پہنچ کر بھی اس قسم کے غلط پروپیگنڈوں سے احتراز نہیں کرتے لیکن حق تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان غلط شہرتوں اور تشہیروں کا پردہ خود ذمہ دار دارالعلوم کی زبانی ذمہ داران مدینہ یونیورسٹی کے مواجہہ میں خود مدینہ کی فضاء میں چاک کر دیا اور اصل حقیقت کھل گئی۔

حضرت ممدوح کا وہ جامع مقالہ جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھا گیا وہ بھی اسی شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الرابطۃ الاسلامیہ کے اجلاس میں شرکت

پھر آپ نے مکہ مکرمہ کے اس بین الاقوامی اجتماع کا ذکر فرمایا جو قصر الملک میں الرابطۃ الاسلامیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا کہ اس میں شرکت کی اور رابطہ کے ذمہ داروں کے مقالات اور خطابات سنے گئے جن میں خصوصیت سے قابل ذکر خطاب السید امین الحسینی مفتی فلسطین اور الاستاذ سعید رمضان کا ہے نیز خصوصیت سے قابل ذکر عراق کے ایک بلیغ شاعر کا تاریخی قصیدہ ہے جس میں انہوں نے وقت کے حالات سنا کر عالم عرب کو بیداری کا پیغام دیا جس سے پورا مجمع متاثر ہوا۔

اجتماع کے بعد جدہ الرابطہ کے سیکریٹری صاحب سے ایک دعوت میں جو سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سیکریٹری سفارت خانۂ ہند کی طرف سے دی گئی تھی ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے الرابطہ کے اغراض ومقاصد کے ضروری کاغذات اور اس کا دستور نامہ ایک ریشمی رومال میں رکھ کر عنایت فرمایا۔

دارالعلوم کا بین الاقوامی تعارف

بہر حال مجموعی حیثیت سے حضرت ممدوح کا یہ سفر شاندار اور کامیاب رہا اور اس مبارک سفر میں بین الاقوامی طور پر جو اہم کردار آپ نے ادا کیا وہ دارالعلوم دیوبند کا بین الاقوامی تعارف تھا جو مڈ ایسٹ اور یورپین ممالک کے سربر آوردہ زعماء اور علماء کو کرایا گیا۔ آپ کے ساتھ دارالعلوم کی عمارتوں کے البم کے نسخے بھی تھے جو ممتاز اور مشاہیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

صومالی لینڈ، کنیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز اکابر اس البم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے جس سے بہت سے خطوں میں دارالعلوم جانا پہنچانا ہو گیا۔

دارالحدیث دیوبند کے اس جلسہ میں طلبہ اور شہر کے لوگوں نے حضرت ممدوح کے ان اقدامات پر نظم ونثر میں مبارکباد دی۔ اس لئے یہ جلسہ حج کی مبارک باد سے زیادہ غیر ممالک کے ان قلوب کو ہموار کرنے کی حج اکبر کی مبارک باد پر مشتمل تھا جو اس سفر میں دارالعلوم کے لئے ہموار ہوئے۔

جلسہ خیر وخوبی کے ساتھ تقریباً شب کے ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔

والحمد لله الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات

تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہندوستان...

حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ کی ایک تحریر

ذیل کی تجویز و تحریر حضرت حکیم الاسلامؒ نے غزہ (مصر) میں پیش فرمائی جس میں فلسطین کی ناجائز تقسیم اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانان ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار اور اسرائیل کے جارحانہ حملوں کے سلسلہ میں مصر اور دوسری اسلامی ریاستوں سے مسلمانان ہند کی دلی ہمدردی اور اپنے سرگرم تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔ وحدت اسلامی کا تقاضا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ ان کے جسم چاہے کروڑوں' اربوں سے متجاوز ہوں مگر روح ایک ہی ہو۔ امید ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ کی یہ تحریر وحدت اور اخوت اسلامی کی دعوت کو بھی زندہ کر سکے گی۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزرگان محترم! مسلمانان عالم بالخصوص ممالک اسلامیہ کے لئے وہ حادثہ بڑا ہی المناک تھا جب کہ حکومت برطانیہ نے یہود کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے فلسطین کے حصے بخرے کر دیئے اور یہود کے لئے یہودی وطن کا خواب پورا کر دیا۔ برطانیہ کی اس حرکت کے خلاف ہر ملک کے مسلمانوں نے صداء احتجاج بلند کی۔ حتیٰ کے ان ممالک کے مسلمانوں نے بھی جو برطانیہ کے زیر تسلط تھے۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور کانفرنس منعقد کیں اور برطانیہ کی ناگواریوں کے باوجود احتجاجی ریزولیشن پاس کئے۔ چنانچہ اسی ذیل میں بمبئی میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔

مین نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ مسلمان تقسیم فلسطین اور کو کسی صورت بھی منظور نہیں کر سکتے نہ دینی حیثیت سے نہ جغرافیائی اور نہ تاریخی اعتبار سے بھی۔ اب یہ بات اسی طرح درست ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ تاریخ نے دوسری بار اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ ایک طاقت اور ایک ملت ہیں جس کی وحدت کو وطن اور انسان کا اختلاف ختم نہیں کر سکتا اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ فلسطین صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی مسئلہ ہے۔ جس کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ پر جو سہ طاقتی جارحانہ حملہ ہوا وہ درحقیقت دشمنان اسلام کے مخفی ارادوں کا انکشاف اور ''کفر ملت واحدہ ہے'' کا اظہار تھا۔

اس حملہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ عرب ممالک پر دوبارہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ وہ عربی اور اسلامی ممالک کو نو آبادیات بنانے کی اور اسرائیل کے لئے راستہ صاف کرنے کی ایک نئی سامراجی چال تھی لیکن خداوندی نصرت و تائید نے السید جمال عبدالناصر کو اس سہ طاقتی حملہ کے مقابلہ میں بے مثال عظیم

الشان کامیابی عطاء فرمائی اور دشمنان اسلام کو ایسی رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

اس حادثہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے امت مسلمہ عربیہ کو اس کی غفلت سے چونکا دیا اور اس نے بخوبی سمجھ لیا کہ فلسطین اور ایسے ہی دیگر اسلامی معاملات کا دفاع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سب مسلمان اس سلسلہ میں متحد و متفق نہ ہوں۔

میں ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کی حیثیت سے اور میرے رفقاء مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار ہم تینوں مسلمانان ہند کی جانب سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب مسئلہ فلسطین کی جدو جہد میں اخلاقی، مادی اور روحانی ہر قسم کی ممکنہ معاونت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

عمید دارالعلوم دیوبند

(نزیل فلسطین غزہ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اِمتیازِ دار العلوم

عدمِ اعتناءِ دین کے اس دور میں جبکہ علومِ دینیہ سے شدید بُعد پیدا ہو چکا ہے' اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا' یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال میں چندہ نسبتاً زیادہ ہی آیا۔ اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی ــــــ یہ واقعہ ہے کہ اس دورِ فتن میں دار العلوم کا قائم رہنا' اسباب کے درجہ میں نہیں ہے' بلکہ غیبی امداد و اعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ـ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ہ
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

ایک بڑی کمی

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز طلبہ! پروگرام میں عربی تقریروں اور نظموں کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نمبر تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں ورنہ ارشاداتِ گرامی سے مستفیض فرماتے۔ اگر حضرت موجود ہوتے تو ہم سب کے لئے کار آمد اور مفید ہوتا۔ میں نے حضرت مولاناؒ سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ جلسۂ انعام[1] کی تاریخوں میں شرکت نہ فرماسکیں تو جلسہ کو مؤخر کیا جائے۔ مگر حضرت نے پسند نہ فرمایا اور وعدہ کیا کہ حتی الامکان شرکت کی سعی فرمائیں گے۔ اس وقت ہمیں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ جلسہ کی غرض و غایت تقسیم انعام اور طلباء کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور جس شعبہ کے طلبہ

[1] جلسۂ انعام منعقدہ ۲ رجب المرجب ۱۳۶۶ھ، ۱۵ رجون ۱۹۴۷ء سے خطاب۔

کو یہ انعام دیا جاتا ہے اس شعبہ کے صدر حضرت مولاناؒ ہیں۔

مہمانوں کا شکریہ

جلسہ کے واجبات کے متعلّق چند ضروری باتیں بھی مجھے عرض کرنا ہیں۔ دار العلوم کی جانب سے باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کا شکر گزار ہوں کہ اس سخت اور تکلیف دہ گرمی کے موسم میں انہوں نے شرکت کے لئے زحمت گوارہ فرمائی۔ بالخصوص دہلی سے آنیوالے حضرات کاروباری لوگ ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر ہماری طلب پر تشریف لائے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات ہمارے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ ان حضرات کا یہاں آنا کسی مالی غرض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ در حقیقت اس کا سبب وہ محبت ہے جو انہیں دار العلوم سے ہے۔

اِمسال جلسہ کے انعقاد میں کچھ موانع تھے اور خیال تھا کہ جلسہ نہ ہو سکے گا مگر ابھی چند دن ہوئے کہ یہ ارادہ ہوا۔ اس لئے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے دعوت مختصر دی جائے۔ مجھے آپ حضرات سے دار العلوم کا تعارف کرانا نہیں ہے اور نہ آج دار العلوم کسی تعارف کا محتاج ہے۔

تأسیسِ دار العلوم کا اِمتیاز

مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ دار العلوم کی تأسیس دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہے۔ جو ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ چند اہلُ الرّائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ سے سوچ کر ایک چیز طے کرتے ہیں ___ مگر دار العلوم کی تأسیس اس سے مختلف ہے۔ دار العلوم اِلہام غیب اور اھلُ اللہ کے قلوب پر اِنکشاف واردات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ سنا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر اہلُ اللہ اور بزرگ تھے ان سب کے قلوب پر یہ منکشف ہوا۔ غرض یہ کہ اس طور پر ان حضرات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے اِنکشاف اور منجانب اللہ اِلہام کا اظہار فرمایا۔ اس طرح پر یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ دار العلوم کی بنا اِلہامی طور پر ہے رسمی اور حسّی طور پر نہیں ہے۔ دار العلوم کے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدّین صاحبؒ تھے جو اگرچہ اُمّی محض تھے مگر نہایت باکمال اور صاحبِ حال بزرگ تھے۔ دار العلوم کے لئے جب بنیادیں کھودی گئیں تو وہ احاطہ جو اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا بہت مختصر تھا۔ رات کو حضرت مولانا خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرّف ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اُٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ بلا کسی مشورہ کے ان ہی نشانات پر بنیاد کھُدوا کر تعمیر کا کام شروع کرادیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کی بنیاد اِلہامات پر قائم ہو اس کی کیفیت یقیناً دوسرے اداروں سے مختلف ہو گی۔

طلباءِ کرام کا اِمتیاز

یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر جاتے ہیں ان کا تعیّن بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو طلباء یہاں پڑھتے ہیں وہ بھی منجانب اللہ منتخب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدّین صاحبؒ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم

مطبخ سے کھانا لے کر آیا اور شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے اوندھا کر کے کہنے لگا کہ "یہ شوربا کھانے کے لئے ہے یا وضو کے لئے؟" اس طرح تند و تیز باتیں کر کے چلا گیا۔

مولاناؒ نے دریافت فرمایا یہ کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں طالب علم ہے۔ مولاناؒ نے وُثوق کے لہجے میں فرمایا کہ یہ طالب علم نہیں ہے اور نہ یہ طالب علم ہو سکتا ہے چنانچہ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے فرضی طالب علم ظاہر کر کے دھوکہ سے کسی طرح مطبخ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوا لیا ہے اور فی الحقیقت طالب علم نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے مولاناؒ سے دریافت کیا کہ آپ نے وُثوق کے ساتھ کس طرح پر اس کے طالب علم ہونے سے انکار کیا تھا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ یہاں جس قدر طالب علم پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سب کی شکلیں مجھے دکھلا دی گئی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے اس شخص کو بغور دیکھا تو دکھلائی ہوئی شکلوں میں اس صورت کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرگز طالب علم نہیں ہے۔

حصولِ علم کا امتیاز

اِحاطہ مولسری میں جو کنواں ہے اس کے متعلق مولاناؒ نے خواب میں دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے برتن ہیں۔ ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جاتا ہے۔

مولانا نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعبیر یہ فرمائی کہ اس ہر شخص کا ظرفِ علم مراد ہے۔ جس شخص کا جس قدر ظرف ہے اسی مقدار میں علم اسی کے نصیب و حصہ میں آئے گا۔

دار العلوم کے اِنتظام و اِنصرام کا اِمتیاز

اس ادارہ کے اُصول و فرُوع بھی اِلہامی طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے ۲۵-۲۶ سال کے زمانہ اہتمام کا تجربہ ہے۔ اس دوران میں یہ چیز نہایت شدّت سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارہ کو چلا رہی ہے اور اس کا دار و مدار ظاہری جدّوجہد سے بالاتر کوئی باطنی قوّت ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے' ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے ورنہ آج کے دَور میں عُلوم دِینیہ کا ذوق رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانہ میں ملامیہ فرقہ تھا۔ اسی طرح آج جس کو ملامت سننی ہو وہ مولوی ہو جائے۔ عدمِ اِعتناءِ دین کے اس دَور میں جب کہ علوُم دینیہ سے شدید بُعد پیدا ہو چکا ہے۔ اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال نسبتاً زیادہ آیا اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اُٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دورِ پُرفِتن میں دار العلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد و اعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

غالباً سن ۴۹ ہجری کا واقعہ ہے اور یہ پہلا سال ہے میرے اہتمام کا' مولوی گل محمد خان صاحب جو خزانہ کے تحویلدار اور تقسیم تنخواہ کے ذمّہ دار تھے۔ رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی نہیں ہے اور کل پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کی صورت میں تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا ____ ان کو رخصت کر کے حضراتِ مدرّسین کو میں نے کوٹھی پر بُلا کر دریافت کیا کہ آپ دار العلوم میں کیوں پڑے ہوئے ہیں اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے

یا تنخواہ حاصل کرنا۔

مُدرّسین کرام کا امتیاز

سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس مقدس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے۔ حاشا و کلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ فاقہ کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ مطمئن رہیں۔ دار العلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہیں بھی ملتی رہیں گی۔ خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے۔ دعا کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے میں اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔ سب نے مل کر خشوع خضوع کے ساتھ دعا کی جس کا اگلے دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کا وقت نہ آیا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دو ہزار روپئے کلکتہ کے ایک تاجر کی طرف سے تھے اور پانچ سو میرٹھ کے مشہور رئیس خان صاحب شیخ رشید خان صاحب آرمی کنٹرکٹر اتفاقیہ دہرہ دون جاتے ہوئے دیوبند تشریف لائے اور پانچ سو کا عطیہ دے گئے۔ غرض یہ کہ دار العلوم کی بنا بھی غیبی اُمور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی منجانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز دار العلوم آگے بڑھ رہا ہے۔

عرصہ سے یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جلسۂ انعام عظیم الشان پیمانہ پر کیا جائے اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو دعوت دی جائے اور قدیم طلبہ کو بھی بلایا جائے۔ مگر ملک کے ہنگامی موانع نے ہمیں باز رہنے پر مجبور رکھا۔ بہت ممکن ہے کہ سال آئندہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

روحِ دار العلوم

تعلیمی اداروں کی اصل قابلِ اعتناء چیز روح ہے۔ عمارات نہیں ہیں۔ یہاں کی اصل روح تعلیم ہے۔ اگر دار العلوم تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہے تو اس نے اپنے مقصد کو پورا کر دیا اور اس روپیہ کو ٹھکانے لگا دیا جو قوم نے اس کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ امتحانات کے نتائج سے ہو سکے گا جو ابھی آپ کے سامنے بیان کئے جانے والے ہیں۔

اس سال دار العلوم میں تین مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے۔

ایک شعبہ صنائع کا ہے جو طلبہ کو صنائع سکھلائے گا۔ عام طور پر علماء کا نفقہ قوم پر ہے۔ جو لوگ فی سبیلِ اللہ کارِ خیر میں محبوس ہیں قوم کا فرض ہے کہ وہ ان کی امداد کرے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کو ان کی معاش سے مطمئن کر دیا جائے۔ اس شعبہ میں ۷ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا جز فنِ کتابت ہے۔ اس کی بنیاد سن ۶۴ ہجری میں ڈالدی گئی تھی۔ اس شعبہ میں اس وقت ۴ آدمی کتابت کا فن سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ ورزش کا ہے رُوحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا کے لئے شعبہ ورزش کھولا گیا اس شعبہ میں دو استاد کام کر رہے ہیں۔ آج صبح اس شعبہ کے معائنہ میں دہلی کے حاجی محمد یوسف صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے تیس روپے بطورِ انعام کے طلبہ کو دیئے ہیں۔

تیسرا شعبہ جمعیت الطلبہ کے ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت قدیم ہے مگر اس سال اُس کو باضابطہ بنا دیا گیا ہے۔ سال آئندہ اس کی کارگذاری تفصیل کے ساتھ معائنہ کرائی جا سکے گی۔ اس کے چار شعبے ہیں۔ ۱۔ عربی تحریر، ۲۔ اُردو تحریر، ۳۔ عربی تقریر، ۴۔ اُردو تقریر۔

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے اب انعام تقسیم کیا جائے گا۔ تاکہ کامیاب طلبہ میں شوق اور ترغیب پیدا ہو اور جو لوگ ناکام ہیں وہ شرمندہ اور خجل ہو کر آئندہ محنت سے تعلیمی اُمور میں منہمک ہوں۔ اگرچہ یہ سلسلہ نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر اصل میں یہی تعلیم کے نتائج کا نچوڑ اور معیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری توجّہ سے اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

الہامی ادارہ اوراس کے فضلاء کی تنظیم

دین کا بقاء علم دین کے بقاء سے ہوتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت وشوکت باقی ہو تو قابل اعتناء نہیں تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا ادارہ ضروری ہے ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ علیہ' حضرت مولانا گنگوھی رحمہ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہیے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو ___ تو ایک رسمی صورت نہ تھی بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی' الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چنانچہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ـــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــ

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیام دار العلوم' اسباب ومحرکات

زرگان محترم!

دار العلوم دیوبند جس کا نام آپ کل سے بار بار سن رہے ہیں اور یہ تمام اکابر جو اس وقت یہاں دار العلوم حقانیہ کے سالانہ اجلاس میں) آپ حضرات کے سامنے جمع ہیں۔ اسی دار العلوم دیوبند کے اجزاء اعضاء ہیں۔ دار العلوم کے ارکان ہیں۔ ان ہی حضرات کے اجتماع کا نام دار العلوم دیوبند ہے' خواہ وہ ارالعلوم دیوبند کے اندر رہوں یا باہر ہوں۔

دار العلوم دیوبند کا قیام رسمی طور سے عمل میں نہیں آیا کہ چند آدمی شہر کے ذمہ دار حضرات جمع ہوئے

۲۳ جون ۱۹۶۳ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) میں یہ تقریر ارشاد فرمائی۔

اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت نہ تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ انگریزوں کا تسلط واقتدار ہندوستان میں آیا۔ دین کی کسمپرسی کا حال سب کے سامنے ہوا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اسلام شاید اب باقی رہے یا نہ رہے۔ تو اس وقت جتنے اولیاء اور اکابر تھے۔ یک دم ان کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا کوئی ادارہ ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعہ سے دین اور علم دین باقی رہے۔ دین کی حفاظت کی جاسکے۔ اگر یہ باقی رہے تو تمام چیزیں اسلام اور مسلمان کی باقی رہ سکتی ہیں اور اگر دین وعلم دین باقی نہ رہے تو خدانخواستہ مسلمان مسلمان نہ رہ سکیں گے۔

دین کا بقاء علم دین کے بقاء سے ہو سکتا ہے اور اگر یہ باقی نہ رہے اور مسلمانوں کی قوت وشوکت باقی بھی ہو تو قابل اعتناء نہیں۔ تو وقت کے تمام اہل اللہ کے قلوب میں وارد ہوا کہ ایسا ادارہ ضروری ہے۔ ایک مجلس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ علیہ، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر جمع ہوئے تھے۔ دین کے بارے میں فکر دامن گیر تھی۔ تو کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ غرض تمام اولیاء اللہ کا اجماع منعقد ہوا کہ ادارہ قائم ہو۔ تو ایک رسمی صورت نہ تھی۔ بلکہ غیبی اور باطنی صورت تھی، الہامی اور کشفی صورت تھی۔ چنانچہ الہام خداوندی کے تحت اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا یاسین صاحب دیوان جی حضرت قاسم العلومؒ کے خادم خاص اور معتمد علیہ تھے۔ جب حج کو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں جانا ہوا جو پورے مشائخ کے شیخ اور مرشد طریقت تھے۔ تو رخصت کے وقت عرض کیا کہ ہمارے مدرسہ کے لئے بھی دعا کریں۔ حضرت حاجی صاحب نے یہ بن کر تعجب سے جواب میں فرمایا۔ چہ خوب پیشانیاں تو برسوں ہم نے رگڑیں، راتوں بھر سجدے ہم نے کئے۔ دعائیں ہم نے مانگیں۔ اب جب مدرسہ قائم ہوا تو مدرسہ آپ کا ہو گیا اور پھر فرمایا کہ ہمارا خیال مدرسے کا تھانہ بھون یا نانوتہ میں قائم کرنے کا تھا ہمیں کیا خبر تھی کہ دیوبند والے یہ غنیمت لے اڑیں گے۔ تو مدرسہ دیوبند کا قیام ہنگامی حالات اور مشورہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ اکابر کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سجدے کئے جارہے تھے۔ راتوں کو دعائیں مانگی جارہی تھیں۔ حق تعالیٰ نے قبول فرمایا معلوم ہوا کہ الہام غیبی سے مدرسہ قائم ہوا۔

خشت اول

اس ادارہ کی عمارت کی سب سے پہلی اینٹ حضرت لانا اصغر حسین صاحب دارالعلوم کے جلیل القدر استاذ کے نانا میاں جی منے شاہ نے رکھی۔ ان کا نام محمد حسین رحمہ اللہ علیہ تھا۔ میاں جی مرحوم کے بارے میں حضرت مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ میں آج پہلی اینٹ ایک ایسے شخص سے رکھواؤں گا کہ جسے کبھی بھی عمر بھر صغیرہ کے درجہ میں بھی گناہ کا تصور نہیں ہوا۔ استغراق اور ربودگی کی یہ کیفیت طاری تھی کہ اپنی اولاد تک کو نہ پہچانتے۔ ان کے داماد تھے، اللہ بندہ نام تھا۔ جب ان کی خدمت میں آتے تو پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے۔ اللہ بندہ۔ پھر پوچھتے کون؟ تو جواب دیتے آپ کا داماد ہوں۔ دس منٹ بعد پھر وہی استغراق۔ یہ کیفیت استغراق کی جاری رہتی نہایت ہی پاک طینت بزرگ تھے۔ جب انتقال ہوا اور غسل کے لئے تختے پر لٹائے گئے۔ تو چشم دید واقعہ مولانا محمد لیسین صاحب نے سنایا، جو میرے فارسی کے استاذ تھے اور آپ کے پاکستان کے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے والد ماجد تھے۔ انہوں نے خود سنایا کہ تختے پر لٹاتے ہی میاں صاحب ایک دم کھل کھلا کر ہنسے

لگے۔ شور مچ گیا تو لوگ دوڑ پڑے۔ جب مجمع زیادہ ہوا تو ہنسا بند ہوا تو اس قماش کے لوگ تھے۔ جنہوں نے دار العلوم کی پہلی اینٹ رکھی۔ پھر حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ اور دوسرے اکابر نے بعد میں اینٹ رکھی۔ ظاہر ہے کہ اینٹ رکھنے والے ایسے اولیاء اللہ اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ایسے لوگ ہوں تو اس مدرسہ کی بنیادیں کتنی مضبوط ہوں گی۔ آج بحمد اللہ اس پر سو برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے۔ ہزاروں مصائب آ آکر ختم ہوئے اور وہ مدرسہ ترقی کرتا گیا۔ برابر بڑھتا جارہا ہے اور آج تک اسی آب و تاب سے قائم ہے۔ یہ ایک رسمی بات ہے کہ فلاں شخص وہاں کا مہتمم ہے، عہدیدار ہے یا مدرس ہے اور اسے ترقی دیتا ہے یہ غلط اور محض ایک تہمت ہے۔ ترقی دینے والی غیبی طاقت ہے، سب کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کرتا ہے۔

مرکز روحانیت

میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے سنا فرماتے تھے کہ دار العلوم آدمیوں کو بناتا ہے۔ آدمیوں نے دار العلوم کو نہیں بنایا۔

یہ ایک کسوٹی ہے، پرکھ ہے۔ یہاں دار العلوم کے ہزاروں فضلاء ہیں اور مدارس قائم کئے ہوئے ہیں۔ میں برما گیا تو دار العلوم کے فیض یافتہ موجود ___ افغانستان گیا تو سینکڑوں علماء موجود اور قصبہ قصبہ آباد ہے۔ مدارس قائم کر چکے ہیں۔ بہاؤ کثرت سے فضلاء سرگرمی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں ان سب کا رجوع دار العلوم کی طرف ہے۔ یہ اس ماحول کے آثار ہیں۔ وہاں کی غیبی طاقت ہے کہ سب کا تعلق اور رجوع اس مرکز کی طرف ہے۔ وہاں کے فضلاء کہتے ہیں کہ جب ہم دار العلوم سے جدا ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ماں کی گود سے جدا ہونے کی حالت ہے گویا ایک جاذبیت ہے، روحانیت ہے اور دار العلوم مرکز روحانیت بن گیا ہے۔

دار العلوم کی شان تجدید

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے :

ان اللّٰہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔

(الحدیث)

ہر ایک صدی میں کوئی نہ کوئی مجدد آئے گا۔ جو دین کو نکھارے گا۔ عقائد و اعمال اور کلیات دین میں لوگ جو فرق و خرابی ڈالیں گے۔ مجدد ہر صدی میں آکر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردے گا۔ تو فرمایا کہ مجدد کے لئے فرد واحد ہونا شرط نہیں۔ جماعت بھی مجدد بن سکتی ہے اور فرمایا کہ دار العلوم کے بانی حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ ان سب کی حیثیت مجدد کی سی ہے اور ان حضرات کا مظہر اتم دار العلوم ہے۔ گویا دار العلوم کی حیثیت مجدد کی سی ہے۔ جس نے بدعت و سنت کو الگ الگ کیا۔ دین کو خلط ملط، غل و غش سے پاک صاف کردیا۔ مسائل میں جو خلط لوگوں نے کیا تھا، اسے نکھار، نکھار کر پاک صاف رکھ دیا۔ یہ ایک کیفیت ہے دار العلوم کی۔

مرکزِ اتحاد

مادی چیزوں میں تغیر اور انتشار ہوتا ہے۔ روحانیت میں قدرتی طور پر اجتماع ہوتا ہے اور دارالعلوم کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ مادہ کا خاصہ ہی تغیر ہوتا ہے اور روحانیت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک شیخ کے مرید' ایک استاذ کے شاگرد قدرتی طور پر مجتمع رہتے ہیں۔ آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم کے فضلاء کے قلوب ایک مرکز سے وابستہ ہیں اور حقیقی طور سے وابستہ ہیں۔

جو اتحاد کا مرکز ہے تو قدرتی طور پر ان کا آپس میں اتحاد قائم ہے۔ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ جب تک حیات تھے' ان کی سرپرستی دارالعلوم کو حاصل تھی۔ تو کیفیت یہ تھی اور ہماری حالت یہ تھی کہ لوگ اختلاف کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے دلوں میں افتراق کا خیال بھی نہیں آتا تھا اور جب ان کی وفات ہوئی اور حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی آئی تو اگر کچھ اختلافات اٹھتے بھی۔ مگر حضرت گنگوہیؒ کی روحانیت کی وجہ سے ختم ہو جاتے۔ ان کی روحانی طاقت انہیں دبادیتی اور قوت مجتمع رہتی۔

تنظیم کی ضرورت

پھر خلفاء کے زمانے میں مراکز الگ الگ ہوئے۔ مرکز خلفاء بن گئے۔ مگر قوت مجتمع تھی۔ مریدین آپس میں مجتمع تھے۔ اس وقت سوال پیدا ہوا کہ مراکز کے اختلافات کی وجہ سے رسمی طور سے تنظیم ہونی چاہئے۔ تاکہ رسمی طور پر بھی ایک اتفاق پیدا ہو جائے۔ ایک نظام اور تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مرکز پر سب متحد رہیں۔ ورنہ مشائخ کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے صورت اختلاف تشتت وظاہری پراگندگی کی نمایاں ہو جاتی ہے۔ گو وہ درحقیقت مذموم نہ ہو۔

اس وقت بزرگوں کے دلوں میں وارد ہوا کہ تنظیم ابنائے دارالعلوم دیوبند ہونی چاہئے۔ یہ تنظیم ابنائے قدیم آج کی نہیں۔ ہاں زیادہ قوت اس تنظیم میں ابھی چند سال ہوئے کہ پیدا ہوئیں ورنہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم کے زمانہ میں جب کہ دارالعلوم ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی ضرورت محسوس کی۔ زیادہ قوت سے اس کی ضرورت اب محسوس کی گئی۔ یہ تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں نہ سیاسی مقاصد اس کے ساتھ متعلق ہیں۔

مقصد تنظیم

بلکہ اس تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ فضلاء دینی علمی قابلیتوں سے عظیم کام انجام دے رہے تھے۔ ان کو منظم کیا جائے تاکہ زیادہ مؤثر ثابت ہوسکیں۔ آج ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم کے فضلاء ہیں' فیض یافتہ ہیں جو دین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک میں اس کے فضلاء پھیلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے کوئی قصبہ ایسا نہیں جو ان سے خالی ہو۔ ان سو برس میں جتنی خدمت اس ادارے نے کی کوئی نظیر اس کی نہیں۔ جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے۔ ہزار ہا ہزار تصانیف اس جماعت کی مختلف مسائل پر موجود ہیں۔ ایک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا جائے تو ایک ہزار تصانیف اپنے ترکے میں چھوڑ گئے۔ ہر زبان میں تصانیف' ہر علم میں' ہر فن میں تصنیفات موجود ہیں۔ نظم میں موجود ہیں' نثر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہزار کے قریب مواعظ الگ چھوڑ گئے۔ کچھ چھپ گئے ہیں' کچھ باقی ہیں۔ گویا

ایک ایک فرد نے ایک ایک امت کے برابر کام کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے مرید و متوسل ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اسی طرح حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے ہزارہا شاگرد، مریدین اور متوسلین ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے مریدین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں الگ پھیلے ہوئے ہیں۔ سب اپنے رنگ میں دین کا کام کر رہے ہیں۔ حدیث، فقہ فتویٰ، تفسیر، عمل جہاد ہر میدان میں اس جماعت کے لوگ نمایاں نظر آئیں گے غرض یہ کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے ایمان کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ کام سب سے بڑھ کر خدمت کے میدان میں تمام جماعتوں سے آگے اور زیادہ۔ ہر دیہات میں کوئی نہ کوئی فاضل موجود ہے۔ شہرت نہیں، اخباروں اور رسالوں میں نام نہیں۔ مگر ہزاروں کے ایمان کو سنبھالے اور خود بھی سنبھلے ہوئے ہیں۔ اب آپ کے اکوڑہ خٹک میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب سلمہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہی شخصیت نے دارالعلوم قائم کیا۔ یہ ہزاروں لوگ علماء و مشائخ جو اس وقت یہاں (دارالعلوم حقانیہ میں) نظر آ رہے ہیں۔ یہ ان کی نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کی خدمت ہے۔ ایک شخص کے ساتھ ہزاروں لوگوں کا دین وابستہ ہے۔ مگر رسمی طور پر اگر کسی نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے فارغین کیا کیا کام کر رہے ہیں۔ تو چونکہ انتشار ہے۔ منظم نہیں ہیں۔ تو صحیح خدمات آپ نہیں بتلا سکتے۔ اگرچہ خدمتیں بے شمار ہیں۔ آپ اجمالاً بیس ہزار کی تعداد کہہ سکیں گے۔ مگر یہ معلوم نہ ہو گا کہ ان بیس ہزار علماء و فضلاء نے کام کر دکھایا۔ مؤرخ بھی اجمالاً ذکر کر دے گا۔ مگر تفصیلی طور سے اسے کچھ معلوم نہ ہو گا۔ دنیا کو اجمالاً بھی پتہ نہ چل سکے گا۔

تنظیم خدمات

لہٰذا اسی مقصد کے لئے شعبۂ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تاکہ دارالعلوم کی روحانی ذریت کے کارنامے منضبط ہو سکیں۔ مقصد خدمات کی تنظیم ہے۔ افراد کی تنظیم نہیں۔ اس کے لئے ایک فارم تیار کیا گیا جس کی سرخیاں میں نے خود لکھیں کہ ہر فاضل اس کی خانہ پری کر کے بھیج دے اس کی مدت فراغت اور کہاں اقامت ہے۔ تصنیف و تالیف کے کیا اور کون سے کام کئے۔ جائے سکونت اور بیعت و ارشاد کے بارے میں سوالات لکھے گئے۔ الحمدللہ کہ ڈھائی تین ہزار فارم پر ہو کر آ گئے اور یہ خدمات اور کارنامے اگر کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ ان حضرات نے دنیا کو دین و ایمان سے بھر دیا ہے اور پھر ان حضرات کے وعظ و ارشاد، تعلیم و تبلیغ سے اور ہزاروں متکلم، خطیب، شیخ طریقت، واعظ مبلغ تیار ہوئے۔ اب اسی مقصد کے لئے یہ ادارہ قائم کیا جا رہا ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کے چار صفحات اسی غرض کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں کہ ان میں دارالعلوم کے فضلاء کا ذکر ہو۔ سن وار ان کے حالات اور کارنامے بیان کر دیئے جائیں۔ یہ دین اور علم دین اور علماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہو گی۔

وسعت دارالعلوم

دارالعلوم اس چار دیواری کا نام نہیں۔ اس تمام نظام مسلک تحریک اور خدمات کا نام ہے۔ جو ہند و بیرون ہند میں قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ذکر کیا کہ بریلی میں ایک مدرس ہیں۔ جو دارالعلوم کے نمایاں فاضل ہیں۔ انہیں دارالعلوم میں بلا لیں مولانا خاموش رہے، چپ ہو گئے۔ تین دفعہ عرض کیا گیا، پھر عرض کیا کہ آپ کیوں رکاوٹ کرتے ہیں فرمایا! ان کو بلانا غلط ہے۔ اس لئے

کہ جو فاضل جہاں بیٹھا ہے وہاں دارالعلوم دیوبند قائم ہے اسی طرح گویا ہر شہر و قصبہ میں دارالعلوم قائم ہے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کی وسعت ہے' آپ فاضل کو بلا کر دارالعلوم کے دائرے کو سمیٹ کر محدود کر رہے ہیں اور میں سمیٹنا نہیں چاہتا یہ ساری روحانی اولاد اسی دارالعلوم کی ذریت ہے۔ کسی کا ایک بچہ رہ جاتا ہے کسی کے دو کسی کے تین۔ دارالعلوم کے لاکھوں بیٹے ہیں۔ لاتعداد اولاد ہے اور جائز اولاد ہے۔ ترکے اور میراث کے وارث ہیں۔ اور یہ ترکہ اخلاق ہیں' اعمال ہیں' علوم ہیں' معارف ہیں جو انبیاء کا ترکہ ہوتا ہے۔ اور اس ترکہ میں ہر ایک کو بقدر ظرف حصہ ملا ہے۔

معیار اہتمام

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب جو دارالعلوم کے مہتمم اور امی محض تھے' منقطع عن الخلائق' صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ حضرت نانوتوی نے بلا کر مجبور کیا۔ دارالعلوم کے اہتمام کے لئے فرمایا! میں تو محض امی ہوں نہ لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا۔ فرمایا اس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں بلکہ قلب سے اس چیز کا تعلق ہے۔ چنانچہ مولانا اہتمام کے لئے بیٹھ جاتے اور جو کچھ لکھواتے لکھ دیا جاتا اور اس پر مولانا کی مہر لگالی جاتی تھی۔ بہر حال حضرت نانوتویؒ سے فرمایا کہ ادارہ بڑا ہے میں اس ذمہ داری کو کس طرح سنبھال سکوں گا اور اتنا تحمل کس طرح کر سکوں گا۔

معیار طلباء

اس واقعہ سے پہلے ان کا ایک اور واقعہ سنئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے اہتمام کے زمانے میں دارالعلوم میں پچاس ساٹھ طالب علم تھے۔ چوبیں پچیس طلبہ مطبخ سے کھانا لیتے تھے۔ یہ کل کائنات تھی۔ حضرت مولانا دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں کھڑے تھے۔ ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ لایا' اور غصہ سے مولانا کے سامنے پٹخ دیا اور کہا کہ یہ سالن ہے یا پانی ہے۔ یہ کھانا مطبخ سے کھلاتے ہو؟ بے ادبی کے الفاظ بھی استعمال کئے۔ کہا کہ یہ ہے آپ کا اہتمام؟ مولانا نے تین مرتبہ سر سے پاؤں تک اس طالب علم کو دیکھا اور فرمایا یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ لوگوں نے کہا مدرسہ کا طالب علم ہے' یہاں مقیم ہے' مطبخ سے کھانا لیتا ہے فرمایا کچھ بھی ہو مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ طلبہ چپ رہے دو تین دن کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں تھا۔ اس نام سے دھوکہ دے کر مدرسہ سے کھانا لینے کے لئے داخل ہوا تھا' اہل مدرسہ نے آپ سے پوچھا۔ حضرت آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ فرمایا کہ جب مدرسہ کا اہتمام میرے سپرد ہوا پریشانی ہوئی کہ کس طرح یہ کام سنبھالوں گا۔ اس عالم میں رات کو خواب دیکھا۔ صاحب دل اور عارف ربانی تھے اور صاحب دل کا خواب' آدھا خواب اور آدھا کشف ہوتا ہے۔

تو فرمایا کہ میں نے مولسری کے کنویں کو دیکھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی من پر بیٹھ کر دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ کسی کو لوٹا بھر کر دے رہے ہیں' کسی کو دیگ میں کسی کو بالٹی میں مل رہا ہے اور کوئی پیالہ بھر رہا ہے اور جس کے ساتھ برتن نہیں تو چلو میں ہی پی کے چلا گیا' اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ دودھ بھر کے لے جا رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد ہے آنکھ کھل گئی تو میں نے مراقبہ کیا تعبیر کے لئے منکشف ہوا کہ یہ کنواں صورت مثالی ہے علم کی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صورت مثالی ہیں قاسم العلم کی جو تقسیم کر رہے ہیں علم کی اور یہ لے جانے والے طلبہ ہیں جو بقدر ظرف لیتے

جارہے ہیں۔ اب اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب شوال کا داخلہ ہوتا ہے تو میں فوراً طلبہ کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ طلبہ کے اس مجمع میں موجود تھا۔ اب جب یہ طالب علم آیا تو میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں نہیں تھا۔

الہامی طریقے سے اس کا علم ہوا۔ معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے طلبہ کا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے جہاں بھی کام کرتے ہیں غالب آتے ہیں۔ غلبہ پر ایک واقعہ یاد آیا۔ مولانا تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں چودہ طالب علم دورہ حدیث میں تھے۔ دستار بندی کی تجویز ہوئی۔ یہ دارالعلوم کا دوسرا جلسہ تھا۔ ہمیں بھی پگڑی باندھنے کا ارادہ کیا گیا تو ان چودہ طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جلسہ کو رکوانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ ہم امیوں کو پگڑی بندھوائی جائے گی اور ہم اہل نہیں۔ جس سے مدرسہ کی بدنامی ہوگی۔ غرض ان چودہ طالب علموں نے مولانا تھانوی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ جاکر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب دارالعلوم کے اول صدر مدرس تھے، حضرت تھانوی جب ان کی خدمت میں پہنچے تو مولانا محمد یعقوب صاحب مطالعہ فرمارہے تھے کتابوں کا۔ حضرت تھانوی نے ہیئت بھی اس وقت کی بتلادی کہ میں جب حجرہ میں گیا تو ڈیسک پر کتاب رکھی ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور بہت گہرے طریقے سے مطالعہ کررہے تھے کتابوں کا۔ نگاہ اٹھائی ان کا رعب اتنا تھا کہ ہر ایک برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ پوچھا خیر تو ہے کیسے آنا ہوا؟ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں نے درخواست پیش کی کہ دیوبند میں جلسہ دستار بندی ہورہا ہے اگر یہ حکم ہو تو تعمیل سے انکار نہیں اور اگر کہنے کا موقع ہو تو ہماری درخواست ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں، نالائق ہیں پورا مدرسہ اور ہمارے اکابر واساتذہ بدنام ہوجائیں گے۔ جلسہ روک دیا جائے اور ہماری نالائقیوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عیوب پر پردہ ڈالا جائے یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو جوش رحمت آیا فرمایا یہ تمہاری نالائقی کا احساس تمہاری سعادت مندی کی علامت ہے۔

جب آدمی میں اپنی نالائقی کا احساس آجائے تو یہ اس کے کمال وفضیلت اور سعادت مندی کی دلیل ہے اور ہم جو یہ جلسہ کریں گے تو وہاں اعلان کریں گے کہ **فیما بیننا وبین اللہ** ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے نزدیک اہل ہیں قابل ہیں اور جس کی مرضی ہو ان کا کسی فن میں بھی امتحان لے لے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ ہم لوگ اور بھی ڈر گئے کہ آئے تھے جلسہ رکوانے کے لئے اور یہاں امتحان دینے کا الگ کہا گیا۔ بہرحال ہم وہاں سے چلے گئے۔ جاتے وقت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک جملہ فرمایا کہ دنیا گدھوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بھی تم جاؤ گے وہاں تم ہی تم ہوگے تمہارا ہی غلبہ ہوگا۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ ہم نے تجربہ کیا کہ جہاں گئے ہم ہی ہم نظر آئے جہاں گئے غالب ہی غالب رہے کیونکہ حق ہی کو غلبہ ہے۔ **الحق یعلوا ولا یعلی** غالبیت کے لئے حق ہے اور مغلوبیت کے لئے باطل ہے۔ بہرحال یہ ہے فضلاء دیوبند کی تنظیم جو دراصل خدمات کی تنظیم ہے۔

تنظیم کے فوائد

دوسرا فائدہ اس میں یہ ہے کہ کچھ خدمات مرکز کی ہیں، کچھ فضلاء کی۔ دونوں کے سامنے خدمات ہیں۔ اس واسطے بھی تنظیم ہونی چاہئے کہ مرکز کو فضلاء کی خدمات کا پتہ لگے اور فضلاء کے سامنے مرکز کی خدمات آتی رہیں۔ اگر فضلاء کو کسی مدد کی ضرورت وحاجت ہو تو ادھر مرکز کو پتہ لگے اور اس کے لئے سوچے اور مرکز کی ضرورتوں کا علم فضلاء کو ہو۔ غرض جانبین سے ایک رابطہ قائم رہے گا۔ ہندستان میں دیکھا گیا کہ فتنے اٹھتے

ہیں، علمی فتنے، عملی فتنے اور ہر قسم کے فتنے اٹھتے ہیں۔ فضلاء دیوبند نے مقامی طور پر ان فتنوں کا مقابلہ کیا اور ان فتنوں کو مغلوب کیا۔ مرکز کو پتہ نہیں کہ فضلاء نے کیا خدمات انجام دیں اور فضلاء کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہم بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ لیکن مرکز ہماری خبر نہیں لیتا، ہماری تحسین نہیں کرتا۔ تو اس غرض سے تنظیم کا سلسلہ قائم کیا گیا کہ اگر ضرورت پڑے گی تو آپس میں اجتماعی آواز ہوگی، ان کی حمایت میں آواز اٹھے گی یا مرکز کوئی شخص ان کی امداد کے لئے بھیج سکے گا۔ جماعتی آواز کا اثر اور طاقت ہوگی، دین کا فائدہ ہوگا، قوم کو فائدہ ہوگا تو یہ تنظیم خدمات کی ہے افراد کی نہیں۔ اس صورت میں خدمات زندہ جاوید رہیں گی۔ منظم ہونا قوم کو ہر حیثیت سے مفید رہے گا۔ باہمی تعاون جاری رہے گا۔ خدمات کا انضباط کیا جا سکے گا کہ کہاں کہاں اور کیا کیا خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آئی کہ مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے دعوے بڑے کئے اور کام بہت تھوڑا کیا یا بالکل نہیں کیا معمولی خدمات مگر نمائش زیادہ۔ ہمارے ہاں کام ہوتا ہے۔ مگر نہ اخبارات نہ اشتہارات اور دعویٰ یہ لوگ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو ہم نے سنبھالا ہے ہمارے اکابر کے ہاں کام ہے نام نہیں، پروپیگنڈہ نہیں لوگ چھوٹی چھوٹی خدمات اخبارات میں دیتے ہیں، میں سوچا کرتا ہوں کہ دارالعلوم میں روزانہ جلسے ہوتے ہیں لیکن کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ جتنے لوگ اشتہارات منصوبوں اور پروگرام کے بعد کسی جلسے میں جمع ہوتے ہیں۔ وہاں بلا کسی منصوبہ آئے دن اتنے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں مگر پروپیگنڈہ بہت ہے، کام کے درجہ میں صفر ہوتے ہیں۔ کئی لوگ دارالعلوم کو جاننے والے نہیں کہ کیا خدمات انجام دیں۔ اس تنظیم میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مرکز میں بھی انبساط ہوگا اور فضلاء کا دل الگ بڑھے گا۔ خدمتیں نمایاں ہو کر سامنے آئیں گی اور بھی کئی قسم کے فوائد ہیں۔ یہ صورت پیش آئی کہ تنظیم ہونی چاہئے اس کے لئے کئی قواعد وضوابط منضبط کئے گئے۔ تنظیم کو صوبہ وار پھر ضلع وار رکھا گیا کہ فضلاء دارالعلوم علاقہ وار جمع ہو کر ایک کو ذمہ دار مقرر کریں، صدر بنائیں۔ سیکرٹری منتخب کریں۔ یہ خیال زیادہ اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اکابر نے ارادہ کیا۔

اجلاس صد سالہ

ایک جلسہ دستار بندی کا بھی ہو جائے تقریباً پچاس برس سے جلسہ دستار بندی نہیں ہوا۔ ۱۳۲۸ھ سے لے کر اب تک درج رجسٹر فضلاء کی تعداد چھ ہزار تک ہے۔ ان چھ ہزار علماء کی دستار بندی کرائی جائے۔ اس واسطے اشتہارات جاری کئے گئے۔ ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا کہ اس تنظیم کے نظم ونسق کو سوچیں۔ ترتیب دیں۔ اس کے اعلانات جاری کئے گئے تو ملک میں اس کا شہرہ ہوا۔ ملک میں اس کا شدید انتظار ہے۔ بیرون ملک کے لوگ بھی منتظر ہیں۔ کیونکہ ان میں حجازی بھی ہیں، ایشیا، سماٹرا، ملایا، چینی، ترکستانی، ایسٹ افریقہ، افغانستان کے فضلاء ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ تو ہزاروں کی تعداد میں جب جلسہ ہوگا۔ تو ایسی صورت میں گورنمنٹ کے سامنے ویزوں کے لئے درخواست دینی ہوگی۔ متعلقہ حکومتوں سے اجازت لینی ہوگی، اس کے ساتھ مصارف کا تخمینہ اور ساتھ ہی ساتھ آمدنی کا اندازہ وغیرہ اہم امور ہیں۔ کیونکہ حاضرین کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ سے کم نہ ہوگا، پورے ملک میں انتظار ہوگا۔ ہم لوگ اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ دیوبند کی آبادی تیس ہزار ہے، اور اگر دو لاکھ آدمی آجائیں تو اس مختصر آبادی میں کس طرح سما سکیں گے۔ کہاں بسیں گے۔ ہر ایک فاضل کو پگڑی باندھنی ہوگی اور اگر دس روپے فی پگڑی ہو تب بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے صرف پگڑیوں کے مصارف ہوں گے اور اگر یہ بھی آسان ہو جائے تو اس کے باندھنے کا مسئلہ ہے۔ کل یہاں (دارالعلوم حقانیہ

میں) ۳۰ ‘ ۳۵ طلبہ کو پگڑی بندھوانی تھی۔ تو بڈھے بزرگ تھک گئے‘ ہاتھ تھک گئے۔ مگر ختم نہیں ہو رہے تھے۔ تو یہ تقریباً پانچ ہزار پگڑیاں باندھنا آسان کام نہیں۔ کل دستار بندی کے وقت ہمارے مولانا عبدالحنان صاحب (ہزاروی) نے خوب جملہ چسپاں کیا کہ یہ پگڑیاں ہیں۔ یا سوٹہ بازی ہے۔ میں نے کہا کہ پگڑیاں بھی کلف دار ہیں اور باندھنے والے بھی مکلف ہیں اور پگڑیاں بھی ذرا مکلف ہونی چاہئیں۔ کلف لگا ہوا ہو۔ یہ بھی صورت ہے کہ اس وقت پیچ وخم نہ ہو۔ بلکہ پہلے سے باندھ کر رکھ دی جائیں۔ (یہ جملے حضرت نے مزاحاً فرمائے) خیر ان حالات کی وجہ سے یہ جلسہ ذرا مؤخر کیا گیا۔ مجلس شوریٰ میں یہ بھی بحث میں آیا کہ دارالعلوم کے سو سال پورا کرنے میں ایک سال باقی ہے تو پورا ہونے پر سو سالہ جشن منایا جائے۔ بہرحال منصوبہ ہے‘ تجویز ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد پر منحصر ہے۔ وسائل جمع کرنے کے لئے سوچ رہے ہیں کہ ہند وبیرون ہند کے دو ڈھائی لاکھ افراد جمع ہو سکیں اور انعقاد کیا جا سکے۔ یہ تنظیم کی غرض وغایت ہے۔

یہ چند باتیں تنظیم کے بارے میں ذکر کی گئیں۔ یہاں آج اس مجلس میں اس صوبہ کے فضلاء اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ مقاصد پر غور کیا جائے۔ میں تو دیکھ کر خوش ہونے والوں میں ہوں گا۔ اب کام کرنا ان حضرات کو ہو گا۔ کام آپ حضرات ہی کا ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اکابرِ دیوبند اور آزادئ ہند

اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریکِ آزادی اس وقت جاری رکھی، جب انگریز کی مخالفت کا تصوّر بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا بلکہ نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدّد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آ گئے۔ اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر رُوس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر پاشا کے قول کے مطابق :

"شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جُثّے میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔

حضرت حکیم الاسلام قدّس اللہ سرّہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــــ

شیریں ثمر کے حصولؒ پر تبریک

بزرگانِ ملّت! علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم!

آج کا مبارک دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ایک عظیمُ الشّان سلطنت جس کے متعلق مسلّم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبّر نمائندہ گلید سلون نے اپنے ایامِ زندگی میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذرّوں کے اُڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوان اور بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانی

لہ ہندوستان کی آزادی کے موقع پر ۱۵، ۱۶؍ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں نمازِ تراویح کے بعد علماء وطلباء دارالعلوم اور اہلِ شہر سے خطاب

اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

اکابرِ ملّت اور جہادِ آزادی

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر ہم ان اکابرِ ملّت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب کہ آزادی کے تصوّر سے بھی اس ملک کے دل و دماغ خالی تھے اور وہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہے تھے۔ آخر میں ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی اِقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصوّر کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اسی تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔

۱۸۵۷ء میں بانئ دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرّہٗ بقول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس تصوّر کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرّہ کی قیادت میں تلوار اُٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اُترے۔ لیکن وقتِ مقرّرہ نہیں آپہنچا تھا اس لئے فتح کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا۔ ملک آزاد نہ ہوا ____ لیکن یہ جماعت اپنے تصوّر سے الگ نہ ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دنیا وفاداری کے جذبہ سے سرشار تھی۔ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن سے آیاتِ جہاد کو خارج کردینے کے مشورے اور منصوبے قائم کئے جا رہے تھے۔ دیوبند کے لمبے کرتے والے مولویوں کا باغی نام رکھ کر مطعون کیا جا رہا تھا لیکن یہ جماعت اپنی دُھن میں تھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس دنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرّہٗ نے جو ان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے۔ اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریکِ آزادی اس وقت جاری رکھی جب کہ انگریز کی مخالفت کا تصوّر بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا۔ نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدّد ریاستیں 'اسلامی ممالک' متعدّد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آگئے اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق :

> "شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جُثّے میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔

بہرحال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ و منصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ایک جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حق بحقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے۔

شیخُ الحدیث دارالعلوم کی پیشین گوئی

ان بزرگوں کا ہر وقت یہی ذکر تھا اور یہی فکر اسی کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی

کے بارے میں عام نظم اور انتظام۔ چھتہ کی مسجد میں یہ سب بزرگ جمع تھے اور انگریزوں کے تسلّط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں نے گھرے پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرّس اور شیخُ الحدیث تھے۔ فرمایا :

> ”حاجی صاحب آپ کس خیال میں ہیں؟ وہ وقت دُور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالتِ امن وسکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا اور انقلاب ہو جائے گا۔ رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں!“۔

لیکن آج دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پندرہ اگست کی رات لوگ حسبِ معمول دس گیارہ بجے سوئے تو انگریزوں کی عملداری میں تھے۔ اور جب پندرہ اگست کی تاریخ شروع ہوئی تو ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر دوسری عملداری تھی۔ سوئے ایک عملداری میں اور جاگے دوسری عملداری میں۔

آزادیٔ ہند کی جدّوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے کی

میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج کی آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے۔ جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں بابانگِ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدّوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتوٰی دیا کہ ”ہندوستان کو دارُالحرب قرار دیا“۔ حضرت حاجی امدادُ اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخہ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا۔ شیخ الہندؒ نے اسی نسخہ کو معجونِ مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کردیا کہ ہر کس وناکس اسے استعمال کرسکے۔ چنانچہ وہ استعمال عام شروع ہو کر عام ہوگیا۔ تحریکِ خلافت میں بھی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہرحال استعمال عام شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گزر کر ابناء وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہوگئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرہ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، جن کی تخم ریزی اور تردد سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات

ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ ملک کی آزادی کی یہ پہلی قسط ہے۔ اس کی دوسری قسط جون اڑتالیس میں سامنے آنے والی ہے۔ لیکن ان اکابر مرحومین کا مقصد اس سے بھی آگے ہے۔ ہمیں آزادی کی دوسری قسط اور پاک نصبُ العین کی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے اور اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی کمر کھولنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہماری مبارک

باد کی مستحق ہندوستان وپاکستان دونوں سلطنتیں ہیں۔

"ہم پاکستان کو مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارکباد دیتے ہیں"۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

میں اس تصوّر کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمان اب ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات

وہیں اس فکر کا موقعہ بھی ہے کہ ان کی حیاتِ اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہوگی؟ اس کے لئے انہیں ابھی سے قدم اٹھانا چاہئے۔ شریعتِ مقدّسہ کی روشنی میں صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدیّن امیر کا انتخاب کر کے ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہو جائیں اور اسلام کے کلمہ پر ایک ہوں ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں۔ صرف ظاہری طور پر ایک نہ ہوں بلکہ حقیقی طور پر ایک ہوں۔ اسی ایک جملہ میں ان کی حیاتِ اجتماعی کی لمبی چوڑی داستان پنہاں ہے۔ ان کے لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کر دیئے جائیں طعن وطنز کا سلسلہ ترک کر دیا جائے ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ رکھیں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ انہیں متحد ہو جانے کے لئے اخوّت ومساوات کی کتنی تدابیر ہو سکتی ہیں جو وہ آج عمل میں لا سکتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں وحدتِ جماعت کی ضرورت

میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب وقت ہے کہ ہم متّحد ہوں پہلے سے زیادہ اب امکانات ہیں کہ ہم متّحد ہو سکیں۔ وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں۔ اس انقلاب سے منقلب ہو چکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں۔ اس لئے اب بجائے اس کے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدتِ جماعت کا سنگ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں۔

میں آخر میں مکرّر مبارک باد پر جو مسلمانوں کے لئے اور پورے ایشیاء کے لئے ہے اس تقریر کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پسِ منظر

حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ کی تحریک اور نائب مفتی احمد علی صاحب سعید کی تائید سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدرِ جلسہ قرار پائے۔

قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی قرأت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔

حافظ اخلاق احمد صاحب محرّرِ دار الافتاء نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی جانب سے فارسی کا قصیدۂ خیر مقدم پڑھ کر سُنایا۔ محمد حبیب دیوبندی طالب علم نے اُردو نعت اور فضل الرحمٰن ابن قاری حفظ الرحمٰن نے عربی قصیدہ سنایا۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تُو
تو کُجا بہرِ تماشا مے روی

نہایت خوشی کا مقام ہے، جس جگہ ہم سب جمع ہیں یہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ تذکرۃُ الرّشید میں ہے کہ حضرت نانوتوی قدّس سرّہٗ نے خواب میں دیکھا تھا کہ :

"میں خانۂ کعبہ کے دَر پر کھڑا ہوں اور میرے پیروں کے نیچے سے نہریں نکل کر تمام عالم میں پھیل رہی ہیں"۔

اس خواب کا مِصداق دار العلوم اور اس کی شاخوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت مولانا رفیع الدّین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے خلیفہ اعظم تھے۔ شاہ عبدالغنی صاحبؒ تلامیذ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ پر اور خلفاء میں حضرت مولانا رفیع الدّین صاحبؒ پر فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ تصوّف میں مولانا رفیع الدّین صاحبؒ کا بڑا درجہ تھا۔

انہوں نے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ علم کی کُنجیاں میرے ہاتھ میں دی گئیں وہ تعجب کرتے تھے کہ میرا علم میں کوئی بڑا درجہ نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہوا؟ مگر جب وہ دار العلوم کے مہتمم بنائے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعہ سے علم دنیا میں پھیلا۔

ایک دوسرا خواب انہوں نے ہی یہ دیکھا تھا کہ :

"مدرسہ کے چمن میں خانۂ کعبہ ہے اور لوگ اس کا طواف کر رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی معنوی حیثیت اسلام میں وہ شان رکھتی ہے جو عالم میں خانۂ کعبہ کے انوار و برکات لئے ہوئے ہے"۔

ہماری عملی حالت گو بہت گری ہوئی ہے مگر خدا کا یہ عظیم الشّان احسان ہے کہ اس نے ہم سے اس مرکز کی خدمت لی۔ حضرت مجدّدِ الف ثانی قدّس اللہ سرّہٗ کے ان مکاتیب میں جو ابھی چھپے نہیں ہیں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب جہانگیر نے ان کو قید کر کے دہلی بُلایا تو ان کا دیوبند سے گزر ہوا تو فرمایا کہ :

"اس جگہ سے علمِ نبوت کی بو آتی ہے"۔

---

[1] کارروائی جلسۂ خیر مقدم حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ بواپسی پاکستان منعقدہ یکم ربیع الاوّل ۱۳۷۰ھ، ۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء مقام دار الحدیث فوقانی، (آغاز ۱۰ بج کر ۳۰ منٹ)

چنانچہ اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے علمِ شریعت و علمِ نبوّت کا مظہر قرار دیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ سے جب ہمارے مہتمم صاحب کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرمائیں تو بگڑ کر فرمایا کہ :

"کیا خوب! تمہارے مدرسہ کے لئے؟ نہ معلوم ہماری کتنی راتیں اس دعا کی نذر ہوئی ہیں۔ اور اب مدرسہ آپ کا ہو گیا ___ فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا خیال تھا کہ علم شریعت کا کوئی مرکز بننا چاہئے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دیوبند کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے"۔

بہرحال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم سب سے یہ خدمت لی۔ دارالعلوم کو جو فضیلت ان بزرگوں کے ذریعہ سے حاصل ہے وہ کسی دوسری جگہ کو نصیب نہیں ہے۔

علم کے اللہ نے بڑے بڑے مرکز مقرر فرمائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عراق، شام، مصر، خراسان، بخارا اور سمرقند وغیرہ۔ پھر دیوبند کے حصہ میں یہ دولت آئی۔ دینی علوم کی ترقی جس قدر آپ کو یہاں ملے گی وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۝

یہاں کے دیہات میں علم کا جو اثر ہے وہ دوسری جگہ کے شہروں تک میں نہیں ہے۔

ہمارے محترم بزرگ حضرت مہتمم صاحب گو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ان کو خاندانی جو نسبت حاصل ہے اور ان کا جو منصب ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ ہمارے سب کے سردار ہیں۔ ہمارے لئے افسوس کا موقع تھا کہ وہ دوسری جگہ پاکستان رہ جاتے۔ اگرچہ جانا عارضی تھا مگر یہ افواہیں سُن سُن کر اب واپسی نہیں ہوگی ہم کو تکلیف ہوتی تھی مگر ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور

الحمدللہ! ہمارے صدر مہتمم صاحب حضرت نانوتوی کی آنکھوں کے تارے تشریف لے آئے ہیں۔ ہم جس قدر بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے۔ ان کا قیام اگر پاکستان میں ہوتا تو بھی فیض سے خالی نہ ہوتا مگر ہمارے لئے قلق کا باعث ہوتا۔ آپ کے لئے سرچشمۂ فیض خانۂ کعبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے سفر کے تأثرات سے بھی مستفیض فرمائیں گے تاکہ وہ مستقبل میں ہمارے کام آئیں۔

حضرت مولانا کی تقریر کے بعد مولوی غلام حیدر اور مولوی عبدالاحد صاحبان کی دستار بندی ہوئی۔

اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خطبۂ مسنونہ کے بعد ذیل کا شعر پڑھ کر اپنے تأثرات بیان فرمائے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حدیثِ پاکستان

جب عام دنیا اس وقت اِصلاح طلب ہے۔ اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاجِ اصلاح ہے۔ جو علماء حقانی ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آگئی ہے۔ اور اصلاح کے راستے کچھ بند ہو گئے ہیں طلباء کا اِدھر آنا منقطع ہو گیا ہے ___ اور دار العلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔
دار العلوم کی سعی پر حکومتِ ھند نے راستہ کھول دیا ہے۔ اور اب حکومتِ پاکستان کے سامنے بھی دار العلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلباء علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے۔ امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

عظیم الشان نفع

بزرگانِ محترم!

ع کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گُل
نسیم صبح تیری مہربانی

میں حیران ہوں کہ بیانِ تأثرات کے اس بوجھ کو کس طرح اُٹھاؤں مجمع اکابر کا ہے۔ اساتذہ کا اجتماع ہے۔ بزرگوں کے اجتماع میں قوّتِ گویائی یارا نہیں دیتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ ارشاد ہے کہ اپنے ان تأثرات کا اظہار کروں جو ہر شخص کچھ نہ کچھ سفر سے لے کر آتا ہے۔

اوّل تو پاکستان جانے میں جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا وہ دعائیں ہیں جو بزرگوں نے فرمائیں۔ اگر میں پاکستان نہ جاتا تو یہ دعائیں حاصل نہ ہوتیں۔ پھر بزرگوں کے حوصلہ افزا کلمات میسّر نہ ہوتے۔ حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب نے اپنی نظم میں جس تأثر کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ اور حضرت شیخ

مدظلہٗ العالی کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں وہ تو ہم سب کے لئے اِنشاء اللہ وسیلۂ نجات ہیں۔ حضرت نے اس ناکارہ کے بارے میں جو کلمات فرمائے ہیں :

"میری درخواست یہ ہے کہ وہ انہیں یاد رکھیں اور قیامت میں انہی الفاظ میں گواہی دے دیں تاکہ میرے لئے وہاں نجات کا باعث ہوں کہ یہ کلمات ہی میرے لئے دستاویز نجات ہیں"۔

(اس موقع پر پُرنور جذبات سے حضرت مہتمم صاحب پر رِقت وگریہ طاری تھا۔ ممدوح کی اس حالت کا مجمع پر بھی زبردست اثر پڑا اور لوگوں کے بے ساختہ آنسو نکل آئے) چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرمایا :

پاکستان جانے کا مقصد

میں یہاں سے پاکستان تین مقصد لے کر گیا تھا۔ ایک عزیزوں اور اقرباء سے ملاقات تھی، جن کا عرصے سے تقاضا تھا، وہاں کے مدارس سے بھی طلب تھی اور جلسوں میں شرکت کے لئے خطوط بھی برابر آرہے تھے۔ اس مرتبہ کوشش کی کہ ہو آؤں۔ چنانچہ سفر کا یہ مقصد میں نے حکومت کے سامنے بھی ظاہر کردیا تھا۔

دوسری غرض دار العلوم کا مفاد تھا۔ دار العلوم ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہاں سفر بھی کئے اور بساط کے موافق جتنی کوشش ہو سکتی تھی کہ اس کے اثرات اور منافع بھی بحمد اللہ ظاہر ہوئے۔

تیسرے تبلیغ واصلاح کا سلسلہ جو ہر شخص کا فرض ہے اور قدرتی طور پر میرے دل میں بھی ہے۔ ایک اہم مقصد سفر تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور اصلاح دینی کی سعی کی گئی۔ میں نہ سیاسی آدمی تھا، نہ ہوں۔ اس لئے زیادہ تر اجتماعات، اخلاقی مواعظ وپند پر مشتمل ہوتے تھے۔

دُنیا کا عمومی دینی اِنحطاط

دینی حالت پاکستان وہندوستان کیا، ساری دنیا کی یکساں ہے۔ آج حقیقی طمانیت تمام دنیا سے مفقود ہے۔ دنیا اس وقت ایک بے اوڈھک کُرّہ کی طرح اِضطراب اور حرکت میں ہے۔ ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے۔ آج جہاں سے بھی خبریں آتی ہیں وہ عام بدامنی، عام طور سے بے چینی، بے سکونی، لڑائیوں اور فسادات کی تو آتی ہیں۔ صلاح ورُشد کی اطلاعات کہیں سے نہیں آتیں۔ حجاز سب سے بڑا مرکزِ دین ہے۔ خود وہاں کی حالت بھی دینی اور اخلاقی حیثیت سے بلند پایہ نہیں۔

تیسرے سال جب مجھے وہاں حاضری کا موقع ہوا تو میں نے دیکھا کہ عصر کے بعد ہزاروں آدمی جبکہ طوافِ بیت اللہ اور ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ مکّہ کے چند نوجوان جو لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔ حرمِ محترم میں انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ جس میں عُریاں تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کی خوبیاں بیان کرنے اور یورپ ولندن کے تمدّنی مسائل کی بحث میں مشغول تھے۔ گویا وہ ان طواف وذکر کرنے والوں کو اَحمق سمجھ رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک یہ عُریاں تصاویر کی دید بیتُ اللہ کی دید کے مقابلہ میں زیادہ باَقعت تھی ___ مجھے بڑی ضیق ہوئی۔ حرمِ محترم میں بیٹھ کر بیتُ اللہ کے سامنے قبولیت کے اوقات میں تصاویر پر بحث کرنا بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں چپ رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی اور لوگ نماز میں مشغول ہوگئے۔ نماز کے بعد دیکھا تو انہوں نے پھر یہ مصوّر اخبار سنبھالے اور پھر وہی بحث چھیڑی۔ تنگ ہو کر

میں نے عرض کیا کہ :

”عزیزو! مشرق و مغرب کے لوگ جو آپ کی تقلید کرنے یہاں آتے ہیں جب آپ عمل کا یہ نمونہ پیش کریں گے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ آپ کو اپنا مقام خود سمجھنا چاہیے۔ آنے والے آپ سے اسلام کا نمونہ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں“۔

حاصل یہ ہے کہ اخلاقی حالت آج ہر جگہ یہ ہے تو ہندوستان اور پاکستان تو پھر بعد کی چیز ہے۔ بہر حال ہر ملک کی طرح پاکستان بھی دین کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاجِ اصلاح ہے۔

اِصلاح کی ذمہ داری

اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہے؟ حقیقت میں مسلمانوں پر۔ مسلم کو خیر الاُمم کہا گیا ہے۔ جس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِمامُ الانبیاء ہیں۔ اسی طرح آپ کی اُمّت بھی امام الاُمم ہے۔ اگر امام کی وضو ٹوٹ جائے تو مقتدیوں کی تو نماز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ پھر مسلمانوں میں سب سے زیادہ اِصلاح خلق اللہ کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری بھلادی ہے۔ اگر وہ خود خلیق ہوں تب دوسرے بااَخلاق بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں سر اُٹھانے والے فتنے

وہاں اس وقت دینی حیثیت سے تین فتنے مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔

ایک قادیانی فتنہ

دوسرا شیعیت کا فتنہ

اور تیسرا مغربیت کا فتنہ

قادیانیوں نے اپنا مرکز کوئٹہ بلوچستان کو بنالیا ہے۔ مرزا بشیر الدین نے اعلان کردیا ہے کہ قادیانی بلوچستان کو سنبھالیں۔ چنانچہ انہوں نے کوئٹہ میں اپنا مرکزی دفتر کھول دیا ہے۔ جو ایران، مصر اور دوسرے ممالکِ اسلامیہ کا دہانہ ہے۔ انہوں نے ملتان میں ایک عظیم جلسہ کا اعلان کیا ہے۔ جس میں ان کے نزدیک پچاس ہزار قادیانیوں کے جمع ہونے کا اِمکان ہے۔ جلسہ کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا میں پھیل کر قادیانی مسلک کی اشاعت کی جائے۔

انہوں نے اپنے چند افراد مصر وغیرہ بھیج کر انہیں عربی بول چال کا ماہر بنالیا ہے۔ اور بطورِ شو کے ان کی عربی تقریریں پبلک کے سامنے کراتے ہیں۔ تبلیغ کا نظم سامنے لاتے ہیں اور اپنی مساعی کی رُوداد پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سے اہلِ حق اس باطل کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ادھر ان عربی دانوں کے ذریعہ ممالکِ اسلامیہ میں اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دوسری طرف شیعوں نے دخلِ ملک میں مختلف اندازوں سے شیعیت کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔ جس سے سادہ لوح عوام شیعیت کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ فتنہ بھی فروغ پارہا ہے۔

تیسرا فتنہ مغربیت یا آزادی اور بے قیدی کا ہے۔ جس کے راستہ سے بے دینی اور بے حیائی کی تخمریزی ہورہی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک سرے سے مذہب ہی کی اہمیت نہیں۔ مغربیت کے اس فتنہ سے الحاد اور

بے دینی بڑھ رہی ہے۔ گویہ فتنہ اس وقت پوری دُنیا پر مسلط ہے۔ تاہم ہمیں اور جگہ سے بحث نہیں۔

فتنوں کا سدِّباب

ایک زمانہ میں ان فتنوں کا دارالعلوم نے سدِّباب کیا تھا اور آج بھی دارالعلوم ہی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ذیل میں کمیونزم اور کیپٹل اِزم وغیرہ کے سیاسی فتنے بھی سر اُبھار رہے ہیں۔ جن کا سدِّباب علمائے حق کا کام ہے۔

میں نے تو وہاں کے علماء کو توجہ دلائی کہ اگر مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست ہوجائے تو دوسری اقوام کی حالت درست ہوجائے گی بلکہ اخلاق درست کرلئے جائیں تو پاکستان وہندوستان دونوں کے درمیانی معاملات کی حالت بھی درست ہوسکتی ہے۔

ایک حدیثِ قدسی میں یہ فرمایا گیا ہے:

> ”حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی قوم کی بدعملی پر ناخوش ہوتا ہوں تو دوسری اقوام کے دل میں اس بدعمل قوم کی طرف سے بغض وعداوت بٹھادیتا ہوں اور وہ جلاد بن کر مجرم قوم پر مسلط ہوجاتی ہیں۔ اور قتل وغارت کے ذریعہ اسے سزا دیتی ہیں۔ پس اگر تمہیں یہ سزا اور بے کسی اور مغلوبیت ناگوار ہے تو تم کسی قوم کو بُرا مت کہو۔ میرے ساتھ معاملہ درست کرو، میں اقوام کے قلوب میں پھر تمہاری محبت ڈال دوں گا“۔

اس لئے میں تو دوسری اقوام کی بدحالی کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد کرتا ہوں۔ اگر یہ قوم درست ہوجائے تو سب اقوام درست ہوجائیں۔

اصلاحی کاموں پر تقسیمِ ہند کے اثرات

بہرحال جیسے عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاجِ اصلاح ہے۔ جو علمائے حقانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آگئی ہے اور اصلاح کے راستے کچھ بند سے ہوگئے ہیں۔ طلباء کا اُدھر سے آنا منقطع ہوگیا ہے اور دارالعلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہوگیا ہے۔ دارالعلوم کی سعی پر حکومتِ ہند نے طلباء کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔

اور اب حکومتِ پاکستان کے سامنے بھی دارالعلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلبائے علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہوجائے گی۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ نہ صرف وہاں سے طلبہ کی آمد پر ہی سے پابندی ہٹالینے کی ضرورت ہے بلکہ یہاں سے وہاں مبلغین کی آمدورفت کو بھی آزاد کردیا جائے تو یہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے خیرسگالی کے وفود سے زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوگا۔ کیونکہ مبلغین ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کریں گے اور اخلاق جس حد تک درست ہوں گے اور کردار جس حد تک کسی ملک کا اُونچا ہوگا۔ اسی حد تک دوسرے ممالک اس سے مطمئن ہوکر اس کا اعتماد حاصل کرلیں گے۔

بڑی امید افزاء خوبی

آج کل اخلاقی حالات کے بگڑ جانے سے ہی عموماً بگاڑ آیا ہوا ہے۔ ہاں! مگر جہاں عام دُنیا کی حالت ہے وہاں دینی حیثیت سے یہ خرابیاں ہیں وہیں ایک بڑی امید افزاء خوبی بھی ہے جو اور جگہ کم پائی جاتی ہے اور وہ ہے طلبِ اصلاح او حسنِ قبول یعنی وہاں پر ہر بڑے چھوٹے میں اصلاح کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے لئے ہر قسم کے علماء کی ضرورت ہے۔ ایک خالی الذہن کے لئے خطابیات سے سمجھادینا کافی ہوگا۔ ایک عقلیت پسند کے لئے حکمت واستدلال کی ضرورت ہوگی اور ایک کٹ حجت کے لئے الزامی جوابات اور خود اس کے مسلّمات سے اس پر حجت قائم کرنا ضروری ہوگا۔

قرآن نے ان ہی تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا کہ :

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

پس جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی زبان میں انہیں سمجھانا ہوگا۔ اس لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔

اعلانِ استغناء

ہاں! پھر اسی کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کو قلبی استغناء کی بھی حاجت ہے۔ اصلاح میں جس قدر بھی رکاوٹ یا تاثیر میں جتنی بھی روک ہوتی ہے وہ مصلح کی طمع سے ہوتی ہے۔ مخاطب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مصلح غرض مند تو نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی غرض مندی کا شبہ ہوجاتا ہے تو پھر وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا' اس لئے جہاں قلبی استغناء درکار ہے وہیں اعلانِ استغناء بھی ضروری ہے تاکہ اصلاح محض توجہ اللہ ہونے سے قلوب پر اثر انداز ہو گویا تبلیغ کی تاثیر کے لئے استغنا بالخاصہ ضروری ہے۔ اس لئے قرآنِ حکیم نے بتلایا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام موعظت واصلاح کے وقت خصوصیت سے اعلانِ استغناء فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ **وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** اگر اس طرف سے طلباء آنے لگیں اور اس طرف سے مبلّغین جانے لگیں تو دونوں حکومتوں کے کردار پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے جیسا کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

دیانتِ عمل کی تاثیر

تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ جمعیّت علماء صوبہ سندھ کے جلسہ کی صدارت کے لئے میرا حیدر آباد سندھ جانا ہوا تھا' جلسہ کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کرنا چاہا جس کو مان لیا گیا۔ عصر کے بعد موٹریں آئیں۔ شہر سے باہر اُن کی کوٹھی پر پہنچے۔ مغرب کا وقت ہوچکا تھا اس لئے طبیعت نماز کے لئے بے چین ہوئی۔ جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور کہا کہ غالبًا آپ لوگ نماز کی وجہ سے مضطرب ہیں تو مسجد یہاں سے ڈیڑھ میل دُور ہے۔ مسجد تک جاتے جاتے نماز کا وقت جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو نماز ہمارے مکان ہی میں پڑھ لیجئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساری زمین ہمارے لئے مسجد ہے۔

اس قرارداد کے بعد کا منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ وہ لوگ پانی وغیرہ لارہے تھے سفید تولئے لارہے تھے' چادریں بچھارہے تھے۔ قبلہ کی سمت بھی انہوں نے تشخیص کرکے بتلائی۔ ہم نے اَذان دی اور نماز ادا کی۔ اور وہ سب مرد' بچے' بڑے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔

جب ہم لوگ نماز اور معمولات سے فارغ ہوچکے تو وہ آگے آئے اور کہا کہ :

”ہماری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ہمارے گھر پر بھگوان کا نام لیا جائے“۔

مجھے ان کے ان الفاظ کی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ یہ آپ کی نیکی کی بات ہے مگر عام طور سے تو لوگ نماز کے بارے میں اور مسجدوں کے معاملہ میں تعصّب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مسجد اور باجہ وغیرہ کا جھگڑا روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا، جیسے آدمی ہوتے ہیں ویسا ہی ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے چڑانے کو نماز پڑھیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے۔ بہرحال اگر مسلمان دیانت عمل کا مجسمہ بن جائیں تو خود بخود لوگوں کے دل میں کشش پیدا ہو جائے۔ غلط نمونہ پیش کر کے خود ہم نے لوگوں کو دین سے دُور کر دیا ہے۔ گویا ہم مبلّغ بننے کے بجائے تبلیغِ دین کے حق میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا نمونہ عمل دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کے یہی معنٰی ہیں تو ہمارا اسلام کو سلام ہے۔

بہرحال دار العلوم اپنی بنیادوں کے لحاظ سے مصلح ہے اور لوگ اس کی اصلاحی مساعی سے اثر لیتے ہیں۔ اس وقت اسے اخلاقی اور دینی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قدرِ دار العلوم

ہم کو دار العلوم کی قدر یہاں بیٹھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ دار العلوم سے باہر جا کر قدر ہوتی ہے کہ وہ کیا نعمت ہے؟ جب مجھے واپسی کی راہ کچھ مسدُود سی نظر آئی تو اس وقت دار العلوم کی فضا ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے لگی کیونکہ یہ ماحول ہر جگہ میسّر نہیں۔

مجھے عیدُ الاضحیٰ کراچی ہی میں پڑھنے کی نوبت آئی اور ظاہر ہے کہ چودہ لاکھ کے شہر میں عید کے اجتماع کا منظر کتنا اعلیٰ ہوتا ہوگا۔ لاکھوں کے مجمع میں ایک ایک جگہ عید پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تلاش طلباء وعلماء کے ماحول کی رہی۔ اور میں اس عید کا متلاشی تھا جس میں دار العلوم جیسا ماحول ہو۔ میں نے مولانا محمد صادق صاحب کے مدرسہ کے مجمع کے ساتھ نماز عید پڑھی کہ وہاں کا ماحول کچھ طلباء اور علماء کا تھا مگر پھر بھی کمال تسکین واطمینان حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مدارات میں کمی نہیں کی۔ قدم قدم پر وسائل راحت تھے۔ پبلک نے مجھے دار العلوم قائم کرنے کو کہا اور تین لاکھ کا فنڈ بھی پیش کیا۔ لوگ وہاں کے قیام کے لئے مضبوط دلائل بھی بیان کرتے تھے مگر اس کے باوجود قلبی رُجحان اور وجدانِ دار العلوم کے ماحول کا متلاشی تھا۔

حضرت مدنیؒ کا تصرّف

میرے اصرارِ واپسی کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قلب میں قیام سے توحّش کی بنا درحقیقت حضرت شیخ مدنیؒ کا تصرّف ہے جو وہاں بیٹھ کر وہ کر رہے ہیں اور اس لئے آپ یہاں سے اُکھڑ رہے ہیں۔ بہرحال میرا قلبی رُخ کسی بھی وجہ سے ہو یہی تھا کہ میں حاضر ہوں۔ الحمدللہ کہ حاضری ہو گئی۔ اور آپ بزرگوں اور دوستوں کی زیارت کا حق تعالیٰ نے موقع میسّر فرما دیا۔ پھر بھی وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی محبّانہ مہمان نوازی اور غرباء پروری کے نقوش دل میں نقش رہیں گے۔

باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کی حاضری حضرت شیخ کی ظاہری وباطنی توجّہ بلکہ تصرّف سے ہوئی اور دار العلوم کی خدمت کا دوبارہ موقع ملا۔

قمیصِ عثمانی

میرے محترم بھائی مولانا عبدالرّشید محمود صاحب گنگوہی نبیرۂ حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ نے اس خدمتِ دارالعلوم کو قمیصِ عثمانی سے تشبیہ دیتے ہوئے مجھے وہاں لکھا تھا کہ آپ کو اپنے ارادہ واختیار سے اس قمیصِ عثمانی کو نہ اُتارنا چاہئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قمیصِ عثمانی اُتارا نہیں ہے بلکہ تھوڑے وقفے کے لئے۔ جیسے غسل کے لئے کپڑے اُتارے جاتے ہیں اور پھر پہن لئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے برائے تطہیر کچھ وقفہ کے لئے یہ لباس اُتار کر رکھا ہے۔ عنقریب پہن لیا جائے گا۔

جذباتِ تشکّر

آخر میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ آپ حضرات نے کل سے اب تک جن پُرخلوص جذباتِ محبت کو ظاہر فرمایا اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور اس کو اپنے لئے وسیلۂ نجات تصور کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

خطبۂ استقبالیہ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد ومدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔
اسی طرز فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہر تصدیق ثبت کی ہے ___ اور آج بحمد اللہ تعالیٰ ایشیاء' افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتب فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علماء دیوبند علمی' تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظ دین اور اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر مسلمانوں کو چلانے اور قائم رکھنے کی کوئی اور صورت نہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ استقبالیہ

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

صدر محترم! حضرات گرامی' علمائے کرام' مہمانان عظام و معزز حاضرین!!
ہم اس ایمانی اور تاریخی اجتماع کے موقع پر جو برصغیر کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی بین الاقوامی تعلیم گاہ "جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیوبند" میں بین الاوطانی انداز سے منعقد ہو رہا ہے جس میں تقریباً تمام اسلامی منطقوں کے فضلاء اور ارباب دانش جمع ہیں' سب سے پہلے حق جل مجدہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس چھوٹی سی بستی میں ایسی بڑی بڑی ہستیوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کی زیارت و ملاقات' ربط باہمی اور اسلامی اخوت و مودّت کو تازہ بتازہ کرنے کا موقعہ عطا فرمادیا۔ ہم اس موقع پر اس غیر معمولی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آج یہ کبرائے ملت' ہم غرباء امّت کے کندھوں سے کندھا ملائے بیٹھے ہوئے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دلوں سے دل ملا کر اسلامی اخوت' مساوات اور مودّت باہمی کا عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں' جو محض فضل خداوندی اور انعام ربانی ہے۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ

عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔

اس پر جتنا بھی؟ شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

ہم بصمیم قلب دعاء گو ہیں کہ اہل علم کی ہمت افزائی اور ملت اسلامیہ کی عزت افزائی کے لئے آپ حضرات اس سرزمین علم پر بار بار قدم رنجہ فرمائیں! آمین

شکر و سپاس

اس کے بعد میرا سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ خوشگوار فریضہ یہ ہے کہ میں بحیثیت خادم جامعہ اپنی مجلس شوریٰ، اپنے ادارہ کے اساتذہ، شیوخ، طلبائے عزیز، فضلاء گرامی، مسلمانان ہند، جمیع کارکنان ادارہ اور بالخصوص اجلاس صد سالہ کے مخلص کارکنوں کی طرف سے آنے والے مہمانان کرام کا شکریہ ادا کروں، جنہوں نے مشرق و مغرب کے دور دراز سفروں کی صعوبتیں جھیل کر محض اللہ کے لئے اس بین الملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔

بلاشبہ یہ اسلام ہی کی جامعیت اور اجتماعیت کا کرشمہ ہے کہ ہم جیسے غرباء ان کبرائے قوم اور عظمائے ممالک کو اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں اور ان کے پر از مودت و اخوت چہروں کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بڑھا رہے ہیں، جس میں علماء و عرفاء بھی ہیں اور اصحاب حدیث و تفسیر بھی، ارباب فقہ و اصول بھی ہیں اور دانایان فلسفہ و کلام بھی، علوم شریعت کے شیوخ بھی ہیں اور علوم جدیدہ کے دانشور بھی، عمائد ملک و ملت بھی اور زعماء ممالک و اقوام بھی، جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی مؤقر خدمت سے انسانیت کے لئے رہنما تسلیم کیا گیا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ کس زبان سے اور کن الفاظ میں ان جلیل القدر ہستیوں کا شکریہ ادا کریں۔ جب کہ الفاظ تو جذبہ امتنان و منت پزیری سے اوپر چڑھنا چاہتے ہیں، لیکن ان ہستیوں کی بلند مکانی تک صد ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ پاتے ؎

داماں نگاہ تنگ گل حسن تو بسیار

ہم زبان و بیان بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والے اور ایمانی تقاضوں اور روح اسلامی سے مملو پر خلوص جذبات تشکر کو دعائیہ تعبیر میں آپ حضرات کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں کہ!

"جز اکم اللّٰہ فی الدارین خیرا" وابقاکم لی عزعلی اللدوام
(اٰمین!)

دیوبند ایک تاریخی اور مرکزی بستی

حضرات محترم!

یہ بستی "دیوبند" جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، بہت پرانی اور قدیم الایام بستی ہے، تاریخوں نے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال تک اس کی آبادی کا پتہ چلتا ہے، قدیم زمانے سے یہ بستی برادران وطن کی ایک زبردست تیرتھ گاہ ہونے کی وجہ سے (جو "دیوی کنڈ" کے نام سے معروف ہے۔ اور اس پر آج بھی سالانہ میلہ لگتا ہے) مرکزیت

کی حامل ہے' اس دیوی کنڈ ہی کے نام پر اس بستی کا قدیم نام "ڈیبی بن" تھا جو کثرت استعمال سے "دیوبند" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اس چھوٹی سی بستی میں جس میں مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے' سو سے اوپر مسجدیں ہیں جن میں متعدد مساجد شاہی زمانوں کی یادگاریں ہیں' آدینی مسجد "یعنی قدیم جامع مسجد" پانچ سو سال اور ایک روایت کے مطابق آٹھ سو سال پرانی ہے جس کے سنگین کتبے پر بہلول شاہ ثبت ہے۔

مسجد خانقاہ عہد اکبری کی یادگار ہے' مسجد سرائے پیرزادگان عہد جہانگیری کے آثار میں سے ہے۔

یہ بستی شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۵۳ دقیقہ طول البلد دہلی سے ۹۲ میل شمالی جانب صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ شیر شاہی شاہراہ اعظم' جو پشاور سے کلکتہ تک چلی گئی ہے اس بستی سے ہو کر گزرتی ہے' اس بستی میں قدامت کے ساتھ مرکزیت کی شان بھی پہلے ہی سے موجود تھی' لیکن قدرت کو اس رسمی مرکزیت سے شرعی مرکزیت کا کام لینا تھا اور اس جگہ سے علم کا ایک ایسا ہمہ گیر چشمہ جاری کرنا تھا جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی علوم نبوت سے سیراب کرے۔

روشن ضمیر اہل دل اس کی پیشین گوئیاں پہلے سے کرتے آرہے تھے "جس کی تفصیل تاریخ دار العلوم" میں دی گئی ہے ان پیشین گوئیوں کے مطابق یہ بستی عالموں' فاضلوں' قادر الکلام ادیبوں' آزادی کے جانبازوں اور دینی میدان کے سرفروشوں کی بستی بننے والی تھی' یا باسباب ظاہرہ یہاں کی قدیم مساجد کی اذانوں اور تکبیروں' ذکر و تلاوت کی محفلوں اور نمازیوں کی جمگھٹوں کی برکات کا ظہور دینی رنگ میں ہونے والا تھا۔

قیام دار العلوم کا پس منظر اور اسباب تاسیس

وقت آیا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رست و خیز کے بعد اس بستی کا نیا دور شروع ہوا اور یہاں علمی و عرفانی زندگی کا ستارہ طلوع ہوا جبکہ ہندوستان کی باگ انگریز کے ہاتھ میں جاچکی تھی' اسلامی شوکت کے چراغ میں صرف دھواں اٹھتا ہوا رہ گیا تھا' جو چراغ کے بجھ جانے کا اعلان تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بزوال تھے' دینی تعلیم گاہیں اور علمی خانوادے اجڑ چکے تھے دینی شعور رخصت ہو رہا تھا' جہالت و ضلالت کی گھٹائیں افق ہند پر چھا چکی تھیں' سنن انبیاء کی جگہ جاہلانہ رسوم و رواجات' مشرکانہ بدعات و خرافات اور ہوا پرستی زور پکڑتی جارہی تھی جس سے دہریت و الحاد فطرت پرستی' آزاد فکری' بے قیدیٔ نفس اور نوضویت کی وباء پھوٹ پڑی تھی چمن اسلام میں خوش آواز پرندوں کے زمزموں کی جگہ زاغ و زغن نے مکروہ آوازوں نے لے لی تھی' مسلمان مضطرب و بے چین اور مایوسی کا شکار تھے' علماء کے لئے پھانسیوں کے پھندے تھے یا جلاوطنی کے مصائب اس وقت چند نفوس قدسیہ نے اپنے منور قلوب میں یہ خلش اور کسک محسوس کی کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے ملی وجود کے تحفظ اور علوم نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان میں دینی شعور اور ایمان دارانہ سیاسی فکر کو حیات نو کس طرح بخشی جائے؟ تو یہ صلحائے امت کمر ہمت باندھ کر میدان میں آئے جو رسمی قسم کے لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے جو غیبی اشارے کے تحت کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے جن کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) تھے جنہوں نے اس غیبی اشارے کو سمجھ کر اسے اس تجویز کی صورت دی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی تعلیم و تربیت اور علم عمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمان کو سہارا دے کر دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ہجری مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ کو تعلیمی رنگ میں عالمگیر احیاء دین کی تحریک کا یہ پودا چھتہ کی مسجد میں (جو آپ حضرات کی نگاہ میں آچکی ہے) ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں کے ذریعہ نصب کیا گیا' دونوں کا نام محمود تھا ــــ ایک محمود معلم تھا اور ایک محمود متعلم ــــ جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام سے معروف زمانہ ہوا۔ اس وقت نہ اس گمنام مدرسہ کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ مکان بنانے کا سرمایہ' نہ پروپیگنڈہ تھا نہ اشتہار و اعلان کا تخیل' صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ جس کی تلقین اور تاکید خود بانی اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے ہشتگانہ اساسی اصول میں باربار بشدومد کی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور احیائے دین کی عالمگیر تحریک

غور کرنے کی بات ہے کہ جس طرح ہندوستان سے اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا حادثہ محض مقامی یا محض ملکی قسم کا نہ تھا بلکہ عالمی رنگ کا تھا جس کے دوررس اثرات دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی پڑے' چنانچہ تھوڑی ہی مدت کے بعد ہندوستان کی غلامی کتنے ہی ملکوں اور ریاستوں کی غلامی پر منتج ہوئی' اسی طرح ایمانی اور علمی رنگ میں احیاء دین تحریک جو "محمود دین" سے شروع ہوئی' ابتداً محض ایک ضعیف کونپل کی صورت میں نمودار ہوئی' مگر اہل نظر میں اس کونپل بلکہ اس کے تخم ہی میں ایک تناور شجرہ طیبہ لپٹا ہوا محسوس ہو چکا تھا جس کے شیریں ثمرات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی بہرہ مند ہونے والے تھے اور وہ دین کی نشاۃ ثانیہ کا مصدر و منشاء بننے والا تھا۔

اس لئے جہاں غلامی کے رنگ میں اس ملک کی تخریب عالمی تھی وہیں تعلیمی رنگ میں یہ تعمیری تحریک بھی بانیٔ اعظم کے فکر پر علمی رنگ سے اٹھی جو نہ صرف علم دین کے لحاظ سے ہی عالمگیر ہوتی چلی گئی بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ثابت ہوئی تا آنکہ اسی تحریک کے پروردوں نے جہاں سو برس بعد ہندوستان کو آزاد کرایا وہیں اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر جو ممالک اور ریاستیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ آزادی کا سانس لینے لگے' تخریب اگر عالمی انداز کی تھی تو اس کے رد عمل کے طور پر یہ تعمیر بھی عالمی ہی انداز سے ابھری۔ جس کا علمی و عملی فیضان چند ہی سال میں ایشیاء سے آگے بڑھ کر افریقہ تک پھیل گیا اور آج یورپ وامریکہ تک اس کی شعاعیں پہنچ چکی ہیں' ان ساری آزادیوں کا خاموش رہنما بھی جامعہ دارالعلوم دیوبند تھا' جس کے فضلاء نے درس و تدریس کے ساتھ مختلف قومی و سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اتر کر تحریکات کے ذریعہ اس ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور ۱۸۵۷ھ ہی سے پھونکنی شروع کر دی تھی جب کہ ملک کے دوسرے حلقے سراسیمہ اور خاموش تھے یا خوشامد میں لگے ہوتے تھے' ان بزرگوں نے غاصب انگریز کا مقابلہ ابتداءً آہنی تلوار سے کیا پھر امن اور علم کی ناقابل شکست طاقت سے نبرد آزما ہوئے اور علمی رنگ سے یہ جذبات دوررس ثابت ہوئے اور آزادی کی لہریں دور دور تک پھیلیں جس سے اس جامعہ کے مؤسسین' فضلاء اور روشن ضمیر حلقوں کی سنہری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم کا بنیادی اور ہمہ گیر مقصد

اس مرکزی جامعہ کی تعلیم کا اساسی مقصد کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج' اس کے عملی تمرین اور عمومی اشاعت اور تبلیغ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعصب آمیز منافرتوں کا استیصال کر کے

مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے تاریخ اس پر شاہد ہے کہ بحیثیت مکتب فکر اس درسگاہ نے ہر اسلامی طبقہ کی طرف مؤانست و محبت کا ہاتھ بڑھایا اور بحیثیت جامعہ اس نے اپنا تعلیمی نصاب ایسا جامع رکھا کہ کوئی بھی اسلامی طبقہ اس سے باہر نہ رہنے پائے' نصاب میں حفظ قرآن سے لے کر تفسیر' اصول تفسیر' حدیث' اصول حدیث' فقہ اصول فقہ کلام بلاغت وبیان' حقائق واسرار اور ان منقولات کے ساتھ علوم معقولہ' منطق فلسفہ ریاضی' ہیئت' عروض و قافیہ مناظرہ اور اختیاری فنون' مبادی سائنس' معلومات عامہ' علم طب' صنعت و حرفت اور خوشخطی وغیرہ نصاب درس میں شامل کیں تاکہ کوئی بھی علمی' عملی' اخلاقی اور صنعتی طبقہ اس اجنبیت کو محسوس نہ کرے اور نہ صرف یہی بلکہ دین کے ہر بنیادی شعبے کو اس جامعہ میں ایک مستقل مدرسہ وکلیہ کی حیثیت وصورت دی گئی ہے۔ جیسے مدرسہ القرآن' مدرسہ التجوید' مدرسہ فارسی وریاضی' کلیۃ الطب' کلیۃ الصنائع' کلیۃ اللغۃ العربیہ اور کلیۃ الفقہ والافتاء وغیرہ' اس طرح اس درسگاہ نے ایک مذہبی یونیورسٹی اور جامعہ کی صورت اختیار کرلی اور الحمد اللہ ہر ہر فن کے متخصص تاحال اس سے ۱۶ ہزار تیار ہو چکے ہیں اور جامعہ سال بسال مائل بہ ترقی ہے۔ ان ۱۶ ہزار فضلاء کی تعداد میں مدرسین بھی ہیں اور مبلغین بھی' خطباء بھی ہیں اور مقررین بھی' زعماء بھی ہیں اور مفکرین بھی' مصنفین بھی ہیں اور مورخین بھی' اطباء جسمانی بھی ہیں اور مصلحان روحانی بھی۔ فضلاء دار العلوم کی مذکورہ ۱۶ ہزار تعداد بلاواسطہ ہے اور بالوسائط ان فضلاء کو بھی شمار کیا جائے جو فضلائے دیوبند کے تیار کردہ ہیں تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس علمی گہوارہ کے لاکھوں لاکھ مستفیدین نہ صرف برصغیر میں بلکہ ایشیاء' افریقہ' یورپ اور امریکہ تک میں بیش بہا دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت بانی دار العلوم اور جملہ بزرگان دیوبند کی سب سے بڑی سیاست ہی یہ تھی کہ دینی تعلیم گاہیں قائم کر کے مسلمانوں کو سنبھالا جائے' چنانچہ حضرت الامام بانیٔ دار العلوم رحمہ اللہ علیہ نے دیوبند کے علاوہ جگہ جگہ بنفس نفیس پہنچ کر دینی درسگاہیں قائم کیں اور اپنے متوسلین کو خطوط بھیج بھیج کر بڑی تعداد میں مدارس قائم کرائے۔

دار العلوم دیوبند کے منہاج پر اور قاسمی فکر سے وابستہ معاہد و مدارس دینیہ ہی برصغیر میں درحقیقت دین کی بقاء و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اس طرز فکر کی کامیابی پر گزشتہ صدی کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات نے مہر تصدیق ثبت کی ہے اور آج بحمد اللہ ایشیاء' افریقہ اور یورپ میں دیوبندی مکتب فکر کے ہزاروں مدارس موجود ہیں۔ جن میں یہی علمائے دیوبند علمی تبلیغی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہ تعلیم و تربیت کے بغیر تحفظ دین اور اتباع سنت نبوی کے راستے پر مسلمان کو قائم رکھنے کی اور کوئی صورت نہیں' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیت اخلاق ہی ظاہر فرمایا ہے۔

انما بعثت معلماً ـــــ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

یعنی احکام کا تعلق تعلیم سے ہے۔ جو حدیث اول کا مفاد ہے اور احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا تعلق تربیت اور تزکیۂ اخلاق سے ہے جو دوسری حدیث کا مفاد ہے۔ اس لئے علمائے دار العلوم نے دونوں چیزوں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ٹھہرایا اور کامیابی کے ساتھ یہ منازل طے کیں!

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا ماتمسکتم بهما کتاب اللّٰه وسنت رسوله۔

(ابن ماجہ)

دار العلوم کی تصنیفی خدمات

اس مکتب فکر کا دوسرا سلسلہ تصنیف و تالیف کا ہے تو اس سلسلے میں علماء دیوبند کے قلم نے حقیقت رقم پانچ ہزار سے زائد تصانیف کا عظیم الشان ذخیرہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں جمع کیا جو برصغیر کے ہر اسلامی مکتب فکر سے بدرجہا زائد اور وقیع ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ آغاز دار العلوم ہی سے شروع ہو گیا تھا خود حجۃ الاسلام حضرت بانی اعظم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصانیف ۲۵ سے زائد ہیں، جن میں علم کلام، عقائد اور قطعیات وغیرہ کو عقلی اور حسی دلائل سے مبرہن کیا ہے اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو نہر سے بحر بنا دیا، دار العلوم کے مشہور مصنفین جنہوں نے فنون دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، احسان، اجتماعیات، سیاسیات، تاریخ اور سیرت وغیرہ میں تصنیفی خزانہ جمع کیا ہے ان میں سرفہرست نام مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا آتا ہے جن کی تصانیف کا عدد ایک ہزار تک پہنچا ہوا ہے، جو موصوف نے ہر علم و فن میں نثر و نظم میں عربی، فارسی اور اردو میں مدوّن فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا عبد العزیز صاحب گوجرانوالہ پاکستان، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب سابق مدرس دار العلوم دیوبند و محدث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دار العلوم دیوبند پھر ان کے تلامذہ میں "حضرت شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی" "صاحب فتح الملہم"۔ حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ محدث مدرسہ امینیہ دہلی و صدر جمعیت علماء ہند حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مدیر رسالہ "القاسم" و "الرشید" دیوبند، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الادب والفقہ دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ محدث دار العلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی محدث دار العلوم دیوبند، پھر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں۔

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ علیہ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم المدنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی اعظم پاکستان، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدیر برہان دہلی، مولانا منظور احمد نعمانی صاحب مدیر "الفرقان" لکھنؤی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامع اشرفیہ لاہور، نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیر ترین تلامذہ میں یہ احقر راقم السطور بھی شامل ہے جس کی تصنیفات سو ۱۰۰ سے اوپر ہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں مولانا عبد الحق صاحب بانی دار العلوم اکوڑہ خٹک پاکستان، مولانا سید محمد میاں صاحب محدث مدرسہ امینیہ دہلی مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سربراہ مدرسہ رحمانیہ مونگیر، مولانا حامدی الانصاری غازی صاحب وغیرہ اور ہزاروں وہ فضلاء ہیں جن کے قلم سے ہزارہا تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح تصنیف کے سلسلے میں بھی یہ مکتب فکر برصغیر کے تمام مکاتب فکر سے آگے اور ممتاز ہے۔ جس نے دین کے ہر ہر گوشے کو اجاگر کیا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو علمی رنگ میں دنیا کے سامنے رکھا۔

ساتھ ہی دار العلوم محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک عملی تربیت گاہ بھی ہے جہاں علم کے ساتھ عمل

صالح' اخلاق فاضلہ اور کثرت ذکر کی روح بھی طلبہ میں پھونکی اور پیوست کی جاتی ہے۔ اس ادارہ میں حسن سلوک واحسان کے تحت شخصی تربیت کے علاوہ اصولی اور علمی طور پر بھی فن کے مسائل کو کتاب وسنت سے واشگاف کر کے اس مصنوعی تصوف پر کاری ضرب لگائی ہے جوکہ زمانہ بنام تصوف چند بندھی جڑی رسوم و بدعات ومحدثات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا ہے' اس لئے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں علم کے ساتھ عزت نفس' وقار' استغناء اور خودداری کے ساتھ خاکساری تواضع' زہد و تقویٰ اور صلاح و رشد کی روشنی بھی راسخ ہوتی ہے جو اس کے فروعی مدارس میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔

دار العلوم دیوبند برصغیر کے مدارس وجامعات میں ام الجامعات ہے اس لئے اسے ازہر الہند بھی کہا جاتا ہے جس کے فیضان سے ہزارہا مدارس ومعاہد چل رہے ہیں اور لاکھوں کے قلوب میں ایمانوں کی حفاظت ہو رہی ہے اور بیشمار افراد طریق سنت پر لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح اس دور کی عقلیت پسندی اور خوگری محسوسات چونکہ منقلیات دین کے ماننے میں حارج ہوتی تھی۔ اس لئے انہی فضلائے دار العلوم دیوبند نے قاسمی رنگ سے متکلمانہ انداز کی بھی سینکڑوں تصنیفیں سطح پر لا رکھیں جس سے نام نہاد عقلی شکوک وشبہات' تمدنی تاویلات اور معاشی تحریکات کا پردہ چاک ہو گیا۔

ان فضلائے گرامی کو اگرچہ دستار وسند تو آج دی جا رہی ہے لیکن بہت پہلے سے اپنی خدمات وتعلیمات سے خود سند ومستند ثابت ہو چکے ہیں۔

جامعہ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی امتیاز

اس دار العلوم میں خصوصیت سے تدریس حدیث پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے جو قرآن حکیم کی اولین تفسیر اور فقہ اسلامی کا اولین سرچشمہ ہے اس لئے کہ فن حدیث کی تکمیل سے قرآن مبین اور فقہ فی الدین کے سمجھنے کی صحیح استعداد پیدا ہو جاتی ہے' اس کے نصاب کا اساسی حصہ تفسیر' حدیث' فقہ' اصول فقہ' علم کلام وبلاغت ومعانی' ادب عربی اور صرف ونحو ہے بقیہ فنون بطور مبادی واسباب یا بطور آثار ونتائج پڑھائے جاتے ہیں۔

دار العلوم کا سلسلہ سند

اس دار العلوم کا سلسلہ سند اساتذہ دار العلوم سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ تک' اور ان سے سند متصل کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ دار العلوم کی جماعت خالصۃً اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت اور فقہ پر قائم ہے۔ اس کے ذوق پر تمام مسائل میں اولین درجہ نقل وروایت اور آثار سلف کو حاصل ہے۔ اس لئے فضلائے ادارہ کتاب وسنت کی مرادات اقوال سلف سے' ان کے متوارث تعامل وذوق کی معرفت کے ساتھ اساتذہ وشیوخ کی تربیت وصحبت اور معیت وملازمت سے حاصل کرتے ہیں' مگر اس کے ساتھ ہی مکتب فکر عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین کو بھی فہم کتاب وسنت کا ایک اہم ترین رکن قرار دیتا ہے۔

جامعہ دار العلوم کا انتظامی طریقہ کار

انتظامی حیثیت سے اس دار العلوم کی تعلیمات وانتظامات کی نگران اعلیٰ ایک موقر مجلس شوریٰ ہے جس میں ملک کے مقتدر علماء اور ارباب فکر ونظر فضلا شامل ہیں جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

ادارۂ اہتمام کے تحت چوبیس انتظامی شعبے ہیں۔ ساٹھ اساتذہ اور دو سو سے اوپر شعبہ جاتی عملہ ہے جو تقسیم کار کے اصول پر کام کرتا ہے۔ ان تمام شعبوں کا حقیقی مقصد اساتذہ اور طلبہ کی ضرورت کی تکمیل اور نظام کی استواری ہے جس پر سالانہ ۳۰ لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے جس کی تکمیل کا شعبۂ محاسبی ذمہ دار ہے۔ اس کے ذریعہ ہر سال میزانیہ تیار ہو کر مجلس شوریٰ سے منظور کرایا جاتا ہے اور اسے باضابطہ آڈٹ بھی کرایا جاتا ہے۔

ملّی اور اجتماعی دائروں میں جامعہ دارالعلوم کی تاریخی خدمات

اسی کے ساتھ دارالعلوم کی سرگرمیاں محض درس وتدریس تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس نے قومی ملکی اور سیاسی معاملات میں بھی اندرون حدود شرعیہ بڑھ چڑھ کر قائدانہ حصہ لیا اور لے رہا ہے اور اس کے اکابر کے کارنامے بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ حضرت سید احمد شہید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جو نقش اپنے پاکیزہ لہو سے کھینچا تھا وہ ہر وقت علماء دیوبند کے سامنے ہے۔

۱۸۵۷ء میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم اور حضرت قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سرپرست اعظم دارالعلوم نے شاملی کے میدان میں تلوار اٹھائی اور انگریزوں سے جنگ کی، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ مجاہدین کے قائد تھے، پھر ان کے تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند اسی قیادت کو لے کر اٹھے اور آزادئ ہند کے لئے وہی ۱۹۱۵ء کی ریشمی خط کی انقلابی تحریک کے قائد تھے، جس کا مرکز افغانستان اور کثیر التعداد سینٹر مختلف ملکوں میں قائم تھے، مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور احمد انصاری، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے سرفروش مجاہد ان کے دست راست تھے، اس راہ میں ہزاروں غازی بنے، خود حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ پانچ سال تک فرنگی قید میں مالٹا رہے، اور رہا ہونے کے بعد ہندوستان پہنچ کر اسی جوش جہاد سے جمعیت علماء ہند کی سرپرستی فرمائی اور آپ کے بعد یہ جماعت فضلاء دارالعلوم ہی کے تحت مصروف خدمت رہی۔

۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں کتنے ہی علماء نے قائدانہ حصہ لیا، یہ اسی موروثی جذبہ اور عمل کا اثر تھا کہ جب ملک معظم عبدالعزیز آل سعود نے جزیرہ عرب میں اسلامی حکومت کا پرداز ڈالا تو علماء دیوبند نے سب سے پہلے اس کی حمایت کی اور دیوبند سے متعدد علماء اس کی تائید کے لئے سفر کر کے حجاز پہنچے اسی طرح ماضی قریب میں جب بیت المقدس اور فلسطین کی آزادی کی تحریک اٹھی تو صیہونی اور برطانوی سامراج کے خلاف علمائے دیوبند ہی کا فتویٰ سب سے پہلے صادر ہوا اور ان مسائل میں دارالعلوم ہی نے تمام مسلمانوں کو اختلاف سے بالاتر ہو کر ایک محاذ پر جمع کیا اور اجتماعی احتجاج عمل میں آیا۔

اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں پر مظالم اور انہیں پسماندہ و متفرق کرنے کے لئے جب بھی نزاعی مسائل کھڑے کئے گئے تو ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے بھی فضلائے دیوبند آگے بڑھے۔ چنانچہ مسلمانوں میں تنظیمی اور طبقاتی اتحاد پیدا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قائم کی گئی، جس کی سربراہی مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فاضل دیوبند رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم کررہے ہیں، اس لئے اگر دارالعلوم کی یہ خواہش ہو کہ عالم اسلام کے رہنما، تعلیمی، علمی، تمدنی اور اجتماعی میدان میں علمائے دیوبند اور مسلمانان ہند سے تعاون کریں، تو اس کی ہمہ جہت روشن تاریخ کی روشنی میں یہ خواہش یقیناً بجا اور برمحل ہوگی۔ حاصل یہ کہ جب بھی کوئی سیاسی فتنہ اٹھا جس سے مسلمانوں کے اجتماعی یا

مذہبی معاملات مجروح ہونے کا اندیشہ ہوا تو علماء دیوبند نے بیرون ملک بھی اس کے سدباب میں وہی پامردی دکھلائی جو اندرون ملک ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

جامعہ دار العلوم اور باطل تحریکات کا مقابلہ

انگریزی حکومت کے ایماء سے اس ملک میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں جن کے ذریعہ یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہ راست سے ڈگمگانے کی کوششیں کی گئیں مگر دار العلوم اور اس کے فضلاء نے پامردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور بحمد اللہ ان کی کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکومت کی دسیسہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے۔ بعض باطل پسندانہ تحریکات حضرت بانی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں بڑے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئیں اور ان کی جانب سے اسلامی احکام و مسائل پر جاہلانہ اور غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کی گئی لیکن حضرت بانی دار العلوم اور پھر ان کے تلامذہ نے مناظروں اور تصانیف کے ذریعہ ان کے برخلاف ایک مضبوط بند باندھ کر انہیں ختم کر دیا۔

انکار حدیث کا فتنہ ابھرا تو انہی فضلائے دیوبند نے جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ اور راقم الحروف نے نہایت مدلل کتابیں تالیف کر کے اس کا سدباب کیا۔ اسی طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دار العلوم دیوبند نے پچاس سے زیادہ فضلاء اس کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتار کر ان کی مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا۔ فقہیات اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اٹھا تو دار العلوم ہی نے قضاء شرعی قائم کرنے کی تحریک اٹھائی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مہتمم خامس دار العلوم نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمہ قضاء شرعی کا مطالبہ پیش کر دیا، جس سے یہ باطل تحریک مضمحل ہو گئی۔

ابھی ماضی قریب میں دوبارہ اس تحریک نے ترمیم فقہ کا روپ اختیار کیا اور عائلی قوانین اور فقہ میں ترمیم کرنے کی آوازیں بلند ہوئیں تو دار العلوم ہی تحریک پر بمبئی میں تمام مسلم فرقوں کا کنونشن بلایا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا جس کی صدارت بالاتفاق مہتمم حال دار العلوم دیوبند کے سپرد کی اور بورڈ کی متحدہ احتجاجی آواز پر حکومت نے اعلان کیا کہ وہ خود مسلم پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی۔

غرض برصغیر میں جامعہ دیوبند کے ان علماء ربانیین اور فضلاء صالحین نے درس و تدریس کے مشاغل کے ساتھ مذہبی اور دینی فضاء کو کبھی مکدر اور زہر آلود نہیں ہونے دیا، بلکہ قلوب اور دماغوں کو جلا بخشنے کے لئے مدلل تحریر و کتاب اور تقریر و خطاب کے ذریعہ ایک زبردست پشتہ بنا کر ان سیلابوں پر بند باندھ دیا۔ اس طرح برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں اس نے دین توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم و برقرار رکھا ہے۔

اور آج یہ جامعہ اس بین الاوطانی اجتماع میں خدمات پر ایک بڑی حسی دلیل کے طور پر اپنے ہزاروں فضلاء کو پیش کرنے میں شکر آمیز فخر محسوس کر رہا ہے کہ جن کی خدمات سے اطراف عالم میں دین پھیلا اور پھیل رہا ہے۔

عصری بین الاقوامیت کے تقاضے

یہ علمی اور عملی ثمرات اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا پھیلی ہوئی تھی اور ہر ملک کا دائرہ عمل اپنی ہی حدود تک محدود رہتا تھا لیکن آج وسائل نقل و حمل اور ذرائع علم و خبر کے وسیع تر ہو جانے کے سبب یہ پوری دنیا

سمٹ کر ایک عائلہ اور قبیلہ بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک محض اپنی داخلی سیاست سے اپنا کام نہیں چلا سکتا جب تک کہ اس کے روابط دوسرے تمام ممالک سے مستحکم نہ ہوں، اسی لحاظ سے آج دنیا کے سارے ممالک ملک واحد بن چکے ہیں اور پوری دنیا ایک نقطہ پر آگئی ہے اس لئے سیاسی امور ہوں یا انتظامی، سب بین اقوامی رنگ ہی سے نمایاں ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں بھی مقامیت سے آگے بڑھ کر بین الاقوامیت کے دائرہ میں قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، گو دارالعلوم کا مزاج ابتداء ہی سے بین الاقوامی ہے اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات واجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا، مؤتمر عالم اسلامی مصر، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، مؤتمر السیرت والسنۃ "دوحہ وقطر" مؤتمر الجغرافی ریاض میں اس کے نمائندگان نے شرکت کی اور اب عرب اور امارات متحدہ بھیجا نیز رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش پر یہاں سے تربیت الاطفال کے سلسلے میں متعدد اہل قلم نے مقالات ارسال کئے۔ اور آج دارالعلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم کو آشکارا کیا جائے، نیز اسلام پر وارد کئے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔

بلاشبہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ بین الاوطانی اشترک کے ساتھ اسلامی منطقوں کے رجال علم وفضل کو تکلیف دی جائے اور دارالعلوم کی خدمات پیش کر کے ان کی آراء گرامی سے استفادہ کیا جائے، ان خدمات کے پیش کرنے کا منشا ہرگز ہرگز اس جامعہ کا کوئی تفوق جتانا یا جماعتی خود ستائی کرنا نہیں حاشا وکلا بلکہ یہ ہے کہ ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے آپ حضرات کے مشورہ وتعاون سے ان تبلیغی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعلیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کارفرما ہو، جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آسکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی عملی اثر ڈال سکیں اور وہ ایمانی اخوت، باہمی تعاون، علمی اشتراک اور فکری یکسانی ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم وخدمات کو بروئے کار لا سکیں اور ان میں دینی دعوت کا وہ جذبہ ابھر آئے جو قرن اول کا نصب العین تھا کہ اس کے بغیر ان کی وہ پست ہمتی دور نہیں ہو سکتی، جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے۔

اگر اسلام کا مقصد واقعی اقوام دنیا کی اصلاح اور انہیں خدا پرستی پر لانا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کا یہ مقصد نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد آج اجتماعی آواز، اجتماعی شعور، اجتماعی فکر اور اجتماعی تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ حقیقت آج کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ آج کوئی آواز بھی اس وقت تک وقیع نہیں بنتی جب تک کہ اس میں ہمہ گیری اور عالمیت نہ ہو اس لئے کہ آج کی سیاست ہے تو بین الاقوامی، تمدن ومعاشرت ہے تو بین الاقوامی، تجارت وصنعت ہے تو بین الاقوامی، صلح وجنگ ہے تو بین الاقوامی، حتیٰ کے کھیل کود بھی ہیں تو بین الاقوامی۔

اس لئے قدرتی طور پر طبائع میں یہ جذبہ آنا ہی چاہئے کہ دین کی دعوت اور اصلاحی آواز ہو تو وہ بھی بین الاقوامی ہی ہو، بالخصوص جبکہ اسلام خود ہی اپنی ذات سے بین الاقوامی بن کر دنیا میں آیا ہے جو ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے بلکہ اس نے دنیا میں بین الاقوامیت کا پرداز ڈالا ہے۔ اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں۔ "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آچکا ہے اور وہ یہی وقت ہے کہ جس میں فطرت اسلام پکار رہی ہے کہ یہ بین الاقوامی دین اور اس کے انسانی فلاح کے ضامن بین الاقوامی مقاصد اور اس کی ہمہ گیر ثقافت بھی علمی رنگ سے دنیا کے سامنے آئے۔

توحید سنت کی حامل جماعت تیار کرنے کے بعد حالات وقت کے پیش نظر جامعہ دارالعلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امت مسلمہ اسلام کے علمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور

جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے اسے اجتماعی بنائیں تاکہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔

عالمی دعوت کے لئے تعلیمی جامعات میں ارتباط کی ضرورت

ہمارے نزدیک قابل غور ضروری مسائل میں سب زیادہ اہم مسئلہ عالمی دعوت اسلام کے بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کن کن راستوں سے بگاڑ آرہا ہے اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے، عموماً بے پڑھے لوگوں کا بگاڑ رسوم و رواجات اور کورانہ تقلید سے نشونما پا رہا ہے، جس کا انسداد تبلیغی ذریعہ سے ممکن ہے۔ اور برسر اقتدار طبقوں کا بگاڑ جاہ پسندی اور ہواء نفسانی سے ابھرا ہوا ہے جس کا حل ان سے ہمدردانہ رابطہ قائم کرکے انہیں راہ پر لگانا ہے اس لئے ان سب کے لئے نفسیات شناس ایسے مخلص فکری مصلحتوں کی ضرورت ہے جو ہر ملک کے برسر اقتدار طبقہ کو اس کے اقتدار کی برقراری کا یقین دلا کر ان کی شخصی اصلاح کے ساتھ ان عمومی مقاصد دعوت کے لئے انہیں آمادہ بھی کرسکیں اور ان سے کام بھی لے سکیں۔

بہرحال تقسیم عمل کے اصول پر ہر طبقہ میں اسی مناسب حال اصلاحی افراد کی تشخیص عمل میں لانے کا مسئلہ آپ کے غور و فکر کا محتاج ہے، ساتھ ہی ان مسائل کے متعلق مالیاتی مصارف اور ایک بین الملّی مشترک فنڈ کا وجود بھی اپنی طبعی اہمیت کے ساتھ محتاج اعتناء ہے اس عظیم دینی و ملی مقصد و خدمت کے لئے یہ مرکزی جامعہ اپنی تمام تر علمی اور عملی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہے، ہم اس کے آرزومند ہیں کہ ارباب علم و فضل ہمیں اس باب میں بھی اپنے موقر مشوروں سے نوازیں کہ اس مرکزی جامعہ کا علم اسلام کے تعلیمی جامعات و معاہد سے ممکن حد تک تعلیم یکسانی کے ساتھ اس طرح قریبی رابطہ قائم ہو کہ جس سے طلبہ کے بین الجامعاتی تبادلے اور سندات کے معادلے کے مسائل سہل ہوجائیں اور عالمگیر سطح پر دینی خدمات کی راہیں ہموار ہوجائیں، غور کیا جائے تو فی زمانہ اداری قوت ایک بڑی قوت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے تعلیمی، تہذیبی اور تبلیغی معیار سے جوڑ سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ادارے جہاں ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر رہنے کے ذرائع مہیا کریں وہیں معاندین اسلام کی لٹریچری راہوں سے آنے والی دسیسہ کاریوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے اور بروقت اس کا سدباب کرنے کے لئے اپنے ذرائع ابلاغ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔

اس ناچیز نے دار العلوم کی ماضی کی خدمات کے اجمالی تذکرہ اور مستقبل کے منصوبوں کی پیش کش کے ساتھ چند مشورہ طلب نقاط بھی پیش کردینے ضروری سمجھے، تاکہ اس بامقصد اجلاس کے اثرات آئندہ نسلوں کے لئے دیرپا اور خوش آئندہ ثابت ہوں۔

اس کے بعد میں اس سمع خراشی پر معذرت خواہی کے ساتھ صدر معظم اور مہمانان کرام اور معزز حاضرین کے تہہ دل سے مکرر شکریہ تشریف آوری پر ان افتتاحی اور خیر مقدمی کلمات کو ختم کرتا ہوں۔

والحمد للہ کثیرا اولاً و آخراً

دعاجو و دعاگو

محمد طیب

رئیس جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیوبند

۲۵ر ربیع الاول ۱۴۰۰ھ ۱۳ فروری ۱۹۸۰ء

آزادیٔ ہند کا خاموش راہنما

اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دارالعلوم کی تحریک کا مرکّب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا' بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی' غلامی شکنی' اسلامی اتحاد' وطنی اتحاد' قومی خود مختاری' حقِ خود ارادیت' معاشی استغناء و سائلِ قوّت کی فراہمی' رابطۂ عوام' تالیفِ خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کار فرما تھے ــــــ اور دارالعلوم کی تاسیس ایک "خاص مکتبِ فکر" کی تاسیس تھی۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرّہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

آزادی کی خوشی کی تکمیل

آج ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے' اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی۔ اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی' بلکہ کتنے ہی صبر آزماؤں' مہینوں اور سالوں' کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں ــــ اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹھروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل ہمیں بیک دم اور پُرامن طریق پر اچانک شب کے بارہ بجے موصول ہو گیا لیکن وہ کتنے تاریک سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا' کتنے طوفانوں میں سے نکالا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اوّلین علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی ہی ممکن ہو سکتی ہے ــــ اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی

کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دار و رسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی ــــــ اس لئے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روشوں کے تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

آزادی کا ہیرو

ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے موقعہ پر سرفروشی کے جوہر دکھلائے اور ایثار و قربانی سے گو اپنے کو ختم کرلیا۔

مگر آنے والی نسلوں کے لئے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کر گئے' ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرپور ہے۔

میں اس موقعہ پر ایک ایسی نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اُصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالارِ فوج کی حیثیت سے شاملی کے میدانِ جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ جنگ کی فتح و شکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اُصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتوں کی جماعتیں آزادی کے میدانوں میں مارچ کرتی ہوئی نظر آنے لگیں' بلکہ دلوں اور دماغوں کی تربیت ہی آزادیٔ ضمیر' آزدیٔ زبان و قلم اور آزادیٔ ملک و ملت کے جذبات کی اساس پر ہوتے رہنے کی راہ پڑ گئی اور جو فتح شاملی کا میدانِ کارزار تیغ و سناں سے نہیں پا سکا تھا وہ ان اصول کے ہتھیاروں سے قلم و زبان کے میدان میں نظر آ گئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہو گئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نورّ اللہ مرقدہٗ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی ذاتِ گرامی ہے جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ سرّہٗ کے دل و دماغ کے اور علماً و عملاً امدادِ الٰہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامۂ رُست و خیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم کی رونمائیوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی

گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دو رُخ تھے فرق تیغ و سناں اور قلم و زبان کا تھا وہاں تشدّد کے ساتھ آزادیٔ ملک و ملت اور آزادیٔ مذہب و دین کا نصبُ العین سامنے تھا اور یہاں عدمِ تشدّد کے ساتھ علمی' اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصبُ العین کے لئے افراد استعمال کئے جا رہے تھے اور یہاں اس کے افراد بنائے جاتے لگے وہاں نام میدانِ جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسۂ مکتب امن و صلح کا تھا۔ وہاں قلب و دماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کر رہے تھے اور یہاں براہِ راست دل و دماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔

غرض حضرت والا نے میدانِ شاملی کے نتائج پیشِ نظر رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اُصول اور نظامِ کار کو ایسے انداز پر اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا تھا وہ اب ہو جائے۔

سیاسی محکومیت کے اِزالہ کی واحد تدبیر

حضرت والا نے دار العلوم دیوبند بلکہ ۵۷ کے بعد تمام دینی مدارس کے لئے آٹھ اُصول کا ایک دستور اساسی مرتّب فرمایا جو دار العلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے۔ جو ایک طرف اگر علاقہ خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطۂ عوام تھی' ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔

حضرت والا ان اُصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراءِ عصر سے بے نیاز کرکے حق خودارادیت اور حق خوداختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر جیتی ہے اور وہ جینا زندگی نہیں۔ موت بصورتِ حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک وسیاست کے ساتھ علم واخلاق اور ذہن وفکر میں بھی حق خودارادیت باقی نہ رہا تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار بن کر نہ اُبھر سکے گی۔ اس لئے حضرت والا کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعہ یہی تھی کہ قوم کو علم ودین کے راستے سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے۔

اور یہ سب ہی ممکن تھا کہ تعلیم وتربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کے بجائے جماعتی اُصول پر قائم کیا جائے تاکہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظم تعلیم کے پروردوں میں دینی حدُود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والا دل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو اُبھارنے والا ہے۔ حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اگر یہ صورت حال خودرو طریق پر ہوئی تو اس عوامیت میں لادینی کے جراثیم کار فرما ہو جائیں گے جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔

اس لئے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی اور نظامِ تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اُصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے تاکہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خود اختیاری قوت پیدا ہو جائے کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَانِ (ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جُدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شاملی کے رُخ کی تبدیلی

حضرت والا کے ان اُصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت وشکست کا منظر آپ کے سامنے ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت متسلط شکست خوردہ قوم کے حقوقِ آزادی کو کچل رہی ہے اور اس کے بنیادی تشخص اور حق خودارادیت کو اور ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی جن کا سلسلہ ۵۷ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

حضرت والا نے ۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے تلوار کے مقابلہ کا وقت نہیں ہے تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدان مقابلہ میں آجاتے

ہیں۔ گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رُخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔

اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی جبکہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لئے اس جدید اقدام میں تعلیم وتربیت کے راستہ سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے آثرات زائل کرنے تھے۔ احساسِ کمتری کو دلوں سے دُور رکھنا تھا تاکہ حوصلوں میں فرق نہ آجائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ

دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت' پاکیزگی نفس اور جذبات حُب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تاکہ آزادی ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہوجائے۔

تیسرا قدم علم وعمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریتِ نفس اور آزادیٔ ملک وملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر وبصیرت کے ساتھ اخلاص وایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اُصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت وضع فرمائے جبکہ نئے تسلّط واقتدار کے زیر اثر سربر آوردگان ملک عوام کے جذبات سے الگ ہوکر طاقتِ مسلّطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے "حریت کاری" کے بجائے "وفاداری" کا خمار خود سروں کے سروں میں بھر چکا تھا اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جارہے تھے حضرت نے اس وقت ان آٹھ اصول کے راستہ سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو اُبھارنے اور مضبوط بنانے کا پرواز ڈالا۔ اور ملک کے اونچے طبقہ سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اُصول کے راستہ سے کرلیا۔

ان اُصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم اور اخلاق اور قال اللہ وقال الرّسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟

اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی لائنوں میں ان اُصول نے کیا اثر دکھلایا اور اس دارالعلوم سے علمی تنظیم کی صورت سے اجتماعی رجحانات اور ان کے علمی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہنمائی کے آٹھ اُصول

سوان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لئے پہلے ان اُصولِ ہشت گانہ کا متن پڑھیے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھئے!

اُصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے:

وہ اُصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں

اس عنوان کے نیچے حسبِ ذیل آٹھ اُصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

(۱) اصلِ اوّل یہ ہے کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیرِ چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲) اِبقاءِ طعام طلبہ بل کر افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی تر رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اُسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کی پس وپیش میں اُسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامّل نہ ہوں اور سامعین بہ نیّت نیک اس کو سُنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم اُمورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں۔ یا کوئی وارد صادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیراندیش ہو اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ کو کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرّسینِ مدرسہ باہم متفقُ المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررّہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اوّل تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ اِنشاء اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ' تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع اِلی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور اُمرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امیدِ ناموری نہ ہو بالجملہ حسنِ نیّت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ

ان اُصولِ ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے :

(۱) سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تاکہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کے بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی جس کا سلسلہ واسطہ بلاواسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستغنی نہ ہو اور عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیرِ

چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تاکہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اُصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلسِ شوریٰ کو (جو اس کے نظم و نسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہلِ چندہ اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ عوام صرف چندہ بلکہ بواسطہ مجلسِ شوریٰ اس کے مالی مصارف کے نگران اور مجوّز بھی ہیں اور اوّل سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل داخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اُصول کیا اس سے مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دَور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطہ عوام کے سوا اور کیا ہے؟

اور اس رابطہ کی صورت آخر اس کے سوا کیا باقی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کرکے ان کی قوت سے کام لیا جائے اور انہی کے حصۂ رَسَد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رُکنیت کی فیس رکھ دی کانگریس کمیٹی رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۴ کی ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں اُبھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رُکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے اِنقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطۂ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کرکے عوام کو فیس رُکنیت کے عنوان کے بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔

کیا اسی طریق کار کو بعد کے مبصروں نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے نہیں اپنایا؟ فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی اور اس ادارہ کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادیٔ وطن کے ساتھ آزادیٔ مذہب و ملّت کی روح بھی قائم کردی۔

بہر حال اس اوّلین اُصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدّوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا تھا۔ تاکہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ جب کہ ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں اور اسی لئے ہر اجتماعی کام کا مدار رائے عامّہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اصول مذکور کی رو سے عوام یا رائے عامّہ کو پشت پر لے کر در حقیقت آزادی ملک و ملّت کی ایک بنیادی قسط حاصل کرلی گئی اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری اِمداد کا بدل

(۲) اسی کے ساتھ دوسرے اُصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش و تکثیر ضروری قرار دی تاکہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطہ سے قوم اور ملک کی اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اُصول اگر رابطۂ عوام کا رکھا گیا جو پچاس برس بعد کے انقلابات اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا تو دوسرے اُصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقع دیا۔ تاکہ

اس دو طرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف اس عوامی چندہ کی تحصیل و وصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھیک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لئے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دارالعلوم ہی تھا جو ۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۶۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن حضرت والا اپنے نورِ فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور اس سرکاری امداد کا بدل بجز قومی چندہ کے دوسرا نہیں اس لئے ان مطاعن کی پرواہ کئے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرغم ادارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطہ عوام کی ضرورت و اہمیت سمجھادی اور بھیک مانگنے اور بھیک منگے بنانے کا سسٹم بالآخر ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس بارہ میں دارالعلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اُصول عملی طور دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیفِ خواص

(۳) رابطہ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقۂ خواص بھی ناگزیر تھا۔ تو حضرت والا نے تیسرا اُصول تالیفِ خواص کا رکھا جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کے بجائے شورائی قرار دیا تاکہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں۔ کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اُٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اُٹھتے رہنے کے باوجود بقا پذیر رہتا ہے۔

ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے ردو قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لئے ہوئے ہوں اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں۔ بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آوٹ کا جذبہ اُبھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں کہ اپنی رائے کے اظہار میں بھی حق نظر آئے تو گردن جھکادیں۔

پس آزادیٔ ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجک محسوس نہ کریں اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آجانے کے بعد مان لینے میں تأمل تک نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس آزادیٔ ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد ہی فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہوگی تو آزاد اور نظم و نسق بھی ہو گا تو آزاد اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔

پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہو گئی۔

پھر اس تالیفِ خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر وارد و صادر، ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لئے کُھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقۂ خواص میں رابطہ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا۔ تاکہ ادارہ چند مخصوص اہلُ الرّائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضُعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالآخر نظم میں محدودیت و استبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصّب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں جو آزادی کے حق میں

سنگِ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹادیا گیا جو اصول آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اتحادِ مشرب

(۴) مرکز میں مربیّوں اور کارکنوں کا اتحادِ مشرب لازمی قرار دیا تاکہ اتحادِ خیال سے جماعتی نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ درصورت اختلافِ مشرب تقابل باہمی پھراس سے خود بینی وخود ستائی اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم اُبھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہ وبالا کردیتے ہیں۔ انتظامات میں پارٹی فیلنگ شروع ہوجاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو اور زیادہ مستحکم کردیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور حریت طلب جماعت کے لئے سم قاتل ہے۔

اس لئے حضرت والا نے اس غلامی شکن اُصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرمادیا یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کرلی جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہوجاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی اِستعداد

(۵) تجویز نصاب، مقدارِ خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اُصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامۃ الناس کے عامیانہ آراء وقیاسیات کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیاتِ وقت سے معرّیٰ ہو۔ بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہلِ علم اور اہلِ تجربہ کی رائیوں پر مبنی رکھا جو مثل علما روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے آزار نہ ہوں تاکہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامۃ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظِ نظر رہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات ومقتضیاتِ تعلیم سے دل ودماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہوسکتے تھے اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جاسکتی تھی جو ملک کی ساری قوموں کے لئے قابلِ قبول اور اپنے اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو۔ جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا، نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کردی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لے آئی گئی۔

یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانسٹی ٹیوشن بناکر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے۔ اور متعصب آمیز کورس سے دل ودماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے۔ انقلاب وتعمیر میں تعصب وتنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرست تھا تو فرقہ پرستی کے ___ اس لئے حضرت والا نے نصاب کو کوری آزادی وبے باکی اور خالص بستگی وغلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیانی رکھا جو دل ودماغ میں ہر طبقہ کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کرسکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہوسکتا تھا۔

روحانیت واخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل

(۶) عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں اُمراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے۔ تاکہ مرعوبیت اور اسیریٔ دل ودماغ کے جراثیم پرورش نہ پاسکیں اور ادارہ خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے۔ جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کی دعوؤں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں یہی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج ہوتی ہے۔ حضرت والاؒ نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔

حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست اور اپنے مذہب کے اُصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ 'ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے۔ اس لئے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جسے وہ اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے' سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کردیا تاکہ اِدھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ رہے اور اُدھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے' کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کردینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی موہوم اور فساد یقینی تھا اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن واصلاح کے ساتھ۔ نیز پہلی صورت میں شور وشر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کاربرآری زیادہ ہے اور دعوؤں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کردینا ہے

حضرت والاؒ نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن وسلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اُتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کرسکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند درحقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے۔ جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی' ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہوگئی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہوگئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لئے حضرت والاؒ نے ادارہ کی آمدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سروسامانی' توکل اور استغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تاکہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آجائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات

نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔

پس حضرت والاؒ نے اس اصول کے ذریعہ حصولِ آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت و اخلاق کے راستہ سے۔

سرکاری امداد سے اِحتراز کی حکمت

(۷) ادارہ کے لئے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالآخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے اسلئے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترکِ موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بسلسلہ تحریک آزادی وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیشی کپڑے سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں تاکہ خود اپنے ملک کی تجارت وصنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج وغلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں۔ ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی تاکہ یہ قومی ادارہ اپنی ضروریات میں خود کفیل رہے اور قومی ہے تو قومی ہی سرمایہ سے چلے۔ اسے غیر قومی رنگ کے سرمایہ کا دستِ نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہے۔ بہر حال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مخفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔

اس لئے حضرت والاؒ کی دوربین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضَرب کاری

(۸) اس آٹھویں اُصول میں کارکنانِ ادارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے جیسے کہ چھٹے اُصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفع کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے اور انہی کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لئے یہی پائیداری اور پختگی کا سامان ہے۔

گویا اس دفع کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برادری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلا انداز تقابل ورقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت ہی میں رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بُعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کئے رہتے ہیں۔ اس کا ثمرہ یہ

نکل سکتا ہے کہ جب اکثریت اپنے کمالِ قناعت وتوکّل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہو جائے تو قدرتاً سرمایہ دار اس کے محتاج ہو جائیں گے اور وہ بشوق ورغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر لا کر نثار کرنے کے آرزو مند ہو جائیں گے جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بخود باہر آجائے اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔

اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سرپر ایک کاری ضرب ہے مگر موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کا روڑا بنے۔ اس لئے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہو جاتا ہے۔

تنظیمِ مدارس آزادی کی خشتِ اوّل

(۹) یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اُصول کی تشریح تھی لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اُصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیمِ مدارس کا اصول ہے کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ کے نیچے جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے جو رابطہ مدارس کی ایک معقول اور مؤثر صورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے اس لئے اس اُصول میں تنظیمِ مدارس کے راستہ سے علمی فضلا اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کردی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لئے خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والاؒ نے صرف نظری ہی طور پر یہ اُصول نہیں بتلادیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصولِ ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔

گویا ۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کئے جائیں اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کئے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اُٹھے کہ :

> ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل ودماغ اور طرزِ فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ :

> ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل ودماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں''۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لئے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا، سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔

غرض جہاں جہاں حضرت والاؒ خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خُدّام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطے سے بتاکید تمام آزاد مدرسے قائم فرمائے۔ جس سے اطراف میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقشِ قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں۔ جس سے آپ صرف بانیؒ دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیتِ خاص کے لحاظ سے بانیؒ مدارس ثابت ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جن کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی

تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر ابھرے۔

جمعیّت علماء کا پس منظر

چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی طور پر بھی منظم ہو گئیں اور انہوں نے جمعیّت العلماء کے نام سے جنگِ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

جمعیّت العلماء کے افراد پر شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے ___ لیکن اس کے اصول ومقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس تنظیمِ مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق جوق آوازہ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادۃً مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لئے مذہبی آواز ہی میں جذب وکشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش بر آواز نہیں ہوتا۔ اسی لئے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی صورت میں اس وقت منظم تھے جب عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصوّرات سے خالی تھے۔

ملّت کا وقار بازیافت کرنے کے اُصول

یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والاؒ ہی کے ان اصولِ ہشت گانہ اور طرزِ عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے اور جوں ہی اس مدارسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیّتی پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے وہیں عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش وخروش کے حیرت ناک منظر سامنے آ گئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادیٔ وطن دے سکتی ہے۔

بہر حال حضرت والاؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدانِ شاملی میں مسلمانوں کی ہر جتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہو سکتا تھا جو بناءِ مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔

سوانح مخطوطہ عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متأثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتیٰ کہ مخالفین تک بھی اس وقت تک جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملّت کے گئے ہوئے وقار کی بازیاب کے لئے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہو سکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کی مرکزی جہت کے تباہ ہو جانے سے پورے ملک کے حال اور مال کی تباہی عیاں تھی۔ صاحب سوانح مخطوطہ نظام مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اور جو فوائد معاش ومعاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم

ے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لئے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور مجرّب نسخہ کوئی نہیں"۔

گویا اس دَور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی' ان اصول کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کیا جاچکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے اعتراف کیا جارہا تھا۔

آج کی اجتماعی مساعی کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اس نے بدیشی غلامی سے نجات پائی۔ وہ سرموان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والاؒ تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجراءِ مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے۔ اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد وطبقات اپنی زندگی حکومت مسلطہ کے رحم وکرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت ووفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراجِ کمال سمجھے ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوّت کا پرواز

پھر حضرت والاؒ نے ان اُصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جبکہ ملک کے بارُسوخ طبقات بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشاءِ حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراکِ عمل کے اُصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہد و سربکف علماء و مفکرین کے ساتھ تحقیرو تمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جارہا تھا۔

گویا "اینٹی مُلّاازم" کا پرواز بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جارہا تھا' لیکن حضرت والاؒ کے نتائج مخفی تھے وہیں ان میں اس تحقیرو تمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوّت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطۂ حکومت نہ تھا بلکہ رابطۂ عوام کا استحکام تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلّط اقتدار کے خلاف مشینی قوت کے بجائے عوامی قوّت ہی مؤثر ثابت ہو سکتی جسے حضرت والاؒ نے پرکھ لیا تھا جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوّت براہ راست انہی علماء کے ہاتھ میں تھی اور ہے۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوّت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جُھکتا جو اس عوامی قوّت پر قابض اور جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ جن علماء کو نکمّا اور بیکار یا قوم پر ناحق بار باور کرایا جارہا تھا جونہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوّت سے حکومت متسلّط کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو وہی "اینٹی مُلّاازم" والے طبقات مُلّاؤں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور انہیں پر وہی تمسخرو نفرت اظہار عقیدت ونیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی مُلّا جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اُصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے وہ بالا خر انہیں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چارو ناچار ان کے کار آمد ہونے کو تسلیم کرلیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر وبیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

عدمِ تشدد کے راستہ سے اِنقلاب کا ذہنی خاکہ

ان اُصول کے زیرِ اثر تربیت پانے والے علماءِ آخر آزادیٔ ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے اور جو کام شاملی کے میدان میں تلواروں سے پورا نہ ہو سکا تھا وہ امن کی زبان و قلم سے پورا ہو گیا۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر مدرسِ اوّل دار العلوم دیوبند نے جو مسجد چھتہ کے عناصرِ اربعہ میں سے ایک عُنصر تھے، حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ "اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا"۔

ارشاد فرمایا :

"حاجی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں"۔

یعنی تشدد اور تلوار کے راستہ سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدمِ تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے عدمِ تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکہ کو ان اصولِ ہشتگانہ کی دفعات میں تعلیمی رنگ سے بھر دیا جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے اور بقول صاحبِ سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور مؤثر تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتویؒ کے اُصول کی قدر و قیمت

اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کے ساتھ مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ناظم جمعیت علماءِ ہند نے اپنی مشہور تصنیف "علماءِ ہند کا شاندار ماضی" میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہلِ قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدینِ شاملی نے بنایا اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے پیشرو حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے اُبھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصولِ ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا۔ جو اس اقامتی تربیت گاہ "دار العلوم دیوبند" کے لئے آپ نے وضع فرمائے۔

دار العلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیرِ سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہندیہ کا ابال چھلکا تو چولہے کے گرد و پیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبید اللہؒ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلا واسطہ سنا کہ :

"میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی، بالخصوص یورپ

وایشیا کے متعدّد انقلاب کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پاسکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کردوں گا''۔

رئیسُ الاَحرارؒ کا غایت تاثّر

رئیسُ الاَحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۴ء میں جب بسلسلہ تحریک خلافت دیوبند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دارالعلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے۔ اور غایتِ تأثر سے بیساختہ فرمایا کہ :

''یہ اصول تو اِلہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا عقلِ محض سے کیا واسطہ''؟

چنانچہ ان اُصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوقِ اِخفاء کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل نکل گئے ہیں کہ ''یوں معلوم ہوتا ہے'' اور ''یوں نظر آتا ہے'' اور ''ایسا ہوجائیگا'' وغیرہ جو ان اُصول کے اِلہامی ہونے کی گویا خود صاحبِ اُصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

اِنقلاب ۷۴ء کے اوّلین ہیرو

بہر حال ان اُصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اوّلین ہیرو قدرتاً وہی سمجھے جاسکتے ہیں جو ۱۹۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے۔ جس پر آزادی خواہ' طبقے بعد میں آئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول و عمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر رہے۔

بہر حال حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے یہ دارالعلوم قائم کیا تھا جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوچکا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدّت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقدار کو پامال کرچکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ ضُعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھایا۔ صف کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگے قومی حکومت میں اسی طرح ۱۸۵۷ کی ناکامی کی تلافی ہوگئی۔ گو متسلّط طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑدینے کے کافی سامان فراہم کردیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اُصول کی صداقت نے اصل نصبُ العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اُصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی تلافی والا نصبُ العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لئے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جہاد کی قوّت قائم ہے۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا ہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا۔ مدرسہ حربیہ ہوگیا تو حضرت والاؒ نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالتِ شرعیہ کا قیام

دوسری طرف قومی محکمہ قضا قائم فرمایا تاکہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقۂ اثر میں عدل وقسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ اُبھارا ہے چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہلِ دیوبند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ:

"کوئی مقدمہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسمؒ صاحب تھے"۔

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برسہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں اُلجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ صدر مدرس دار العلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ جب اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیوبند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہوگئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلط قوت کا اثر ورسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دار العلوم میں صنعت وحرفت کے شعبہ کا مقصد

اسی کے ساتھ حضرت والاؒ نے دار العلوم میں صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوط میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاکہ ادارہ کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔

بظاہر یہ مقابلہ تھا اس رو کا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطہ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکاری جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں۔ اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا ردّ عمل صحیح معنیٰ میں یہی ہو سکتا تھا کہ لوگ اس غلامی آموز تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء واستغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت وحرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دار العلوم کے ذریعے "ہندو مسلم" کا پرداز

ایک طرف دار العلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہو سکیں۔ چنانچہ دار العلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔

حضرت والاؒ کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلا تفریق مذہب وملّت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم کو عنایت کریں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع نول کشور لکھنؤ تھے جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دار العلوم میں بھیجا۔ جس پر دار العلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ ودعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے دار العلوم کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کرکے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس ادارہ کو عوامی نہیں بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے

تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پرواز بھی ڈال دیا گیا۔

دار العلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر

بلکہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس دار العلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لئے حاصل ہوں بلکہ اسے عالمگیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس علمی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ترکی کی خلافت جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی سے انتہائی شدومد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبد الحمید خان والی ترکی کی جنگ روس سے ہوئی تو حضرت والاؒ نے ترکی کے لئے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ' اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز' کپڑا' زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لئے قربان کر دیا۔

تنظیمِ ملت کا نیا خاکہ

اس سے اندازہ کرلیا جائے کہ اس دار العلوم کی تحریک کا مرکّب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی' غلامی شکنی' اسلامی اتحاد' وطنی اتحاد' قومی خود مختاری' حقِ خود ارادیّت' معاشی استغناء' وسائلِ قوت کی فراہمی' رابطۂ عوام' تالیفِ خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کار فرما تھے۔ اور دار العلوم کی تاسیس ایک خاص مکتبِ فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والاؒ کے اصولِ ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہوسکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیر داروں پر تکیہ کر کے ان کے فخورانہ عطیّات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ حکومت وقت کے علی الرّغم رابطۂ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیمِ ملّت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم و تعلّم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فنِ سپہ گری کے شعبہ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی جسے حضرت والاؒ نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والاؒ صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والاؒ شرعی محکمہ قضا قائم فرما کر اعضاء مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کئے جانے کا کوئی تصور سامنے آنا چاہئے تھا۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بلا تخصیص مذہب و ملت چندے قبول کئے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا و شکریہ سے ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض محض کتابی درس و تدریس تھی تو حضرت والاؒ اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد

ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ترکی سے رشتۂ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتہ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتہ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتبِ درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرت اسے ایک ملی جُلی تحریک کے مرکزی حیثیت سے قائم فرمارہے تھے جن کے نظام کار میں علم و عمل ' معاش و معاد ' قوم و وطن اور دین و مذہب کی حمایت و نصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے جو حضرت والاؒ کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلاء متوسلین میں حسبِ استعداد و قابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیامِ دارالعلوم کا بنیادی محرّک!

بہر حال دارالعلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کا اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کر رہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لے کر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لئے بقول حضرت شیخ الہندؒ یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ ' حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی اور حاجی صاحبؒ کے لوگوں میں بالآخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کے قلب و دماغ کا جوہر بن گئی جنہیں حاجی صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقاء و ترویج اور اظہار و اعلان کی توقع ہو سکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول و نظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصولِ آزادی کی امین شخصیت

بہر حال ان اصولِ ہشت گانہ کے مرکب نصبُ العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دارالعلوم دیوبند ہے اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی موعودت تلافی کر دکھائی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر دنیا اس کے نصبُ العین پر آکر رہی اور آزادی ملک و ملت کے لئے جو خاموش راہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں ' پوسٹروں ' رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپگنڈوں کے شور محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لئے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منارہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جارہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو کر ملک کا ذہن آزادی پسندی اور حریت طلب بناتے رہے تا آنکہ آزادی سامنے آکھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقعہ ملا۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ
مدیر دارالعلوم دیوبند
۱۸ اگست ۱۹۵۷ء

حضرت مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ شخصیّت و کردار

میری سعادت

حضرت الاستاذ علّامہ شبیر احمد صاحبؒ نوّر اللہ مرقدہٗ کی سوانح کے سلسلہ میں محترم عاشق عمر صاحب عبّاسی کا امر ہے کہ میں بھی سوانح نگاروں کی فہرست میں نام درج کرالوں، تعمیل امر سعادت ہے۔ لیکن حضرت علّامہ کے مناقب کی فہرست اتنی طولانی ہے کہ ہم جیسے ناقصُ المعلومات کی چند سطریں اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کر سکتیں۔ تاہم یہ کیا کم سعادت ہے کہ ان کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام ہی آجائے۔ گو چند ناتمام سطریں ہی لکھ کر ہو جن میں کوئی خاص ترتیب یا مضمون نگارانہ تشکیل نہیں۔ قلم برداشتہ ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا، اسے سپرد کاغذ کردیا ہے۔ پس یہ سوانح یا سوانح کا عرفی نہیں۔ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تسلّی اور تنشیط مقصود ہے۔ (وباللہ التّوفیق)

ذوقِ علم کا رنگ

حضرت علّامہ میرے استاذ تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مولانا اپنی جامعیّتِ علوم کے ساتھ خصوصیت سے علومِ عقلیہ سے طبعی دلچسپی رکھتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی تصانیف نہ دیکھ لیتا تو نہ معلوم اعتزال کے کس گڑھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ لیکن حضرت نانوتویؒ کے علوم نے مجھے سنبھالا، علومِ عقلیہ سے پہلے سے دلچسپی تھی، حکمتِ قاسمیہ کے مطالعہ نے معقولات ایمانی کا راستہ دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا میں متکلّمانہ رنگ کا غلبہ ہوگیا۔ اسی لئے اسلام کے اصول وکلیات سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر ان کا کلام نہایت بسیط اور محققانہ ہوتا تھا۔ ابتداء میں معقولات کی کتابیں، حمد اللہ، وغیرہ زیادہ پڑھاتے تھے۔ مگر آخر میں یہ تمام مشاغل ترک ہوگئے تھے اور صرف کتاب وسنت اور فنونِ دینیہ کا شغل باقی رہ گیا تھا ___ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بالآخر مولانا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمت کی طرف متوجّہ ہوگئے۔ قرآن شریف کے تفسیری فوائد، لطیف وشیریں زبان اور شگفتہ طرز ادا کے ساتھ ان کی قلمی کاوشوں کا شاہکار اور صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی علمی محنتوں کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر وحدیث کی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے اہم مسائل کا سہل عنوانات کے ساتھ حل فرماگئے ہیں۔ جس سے حضرت ممدوح کے علم کا اندازہ ہوتا ہے۔

تقریر وبیان کا رنگ

تقریر وبیان آپ کا خاص حصہ تھا۔ قوّتِ استدلال نہایت مضبوط اور مستحکم تھی معمولی سی بات کو اس

خوبصورتی اور قوت سے ادا کرتے تھے کہ وہ ایک اہم مگر حل شدہ مسئلہ نظر آنے لگتی تھی اور اس کے تمام پہلو متانت کے ساتھ صاف ہو جاتے تھے۔ تحریر کا ایک خاص رنگ تھا جس میں نہ زمانہ حال کی بے قید شوخی تھی نہ قدیم طرز کی کہنگی' حال کی فصاحت اور ماضی کی متانت سے ملا جلا رنگ تھا' جو آپ کی تحریر کا نمایاں پہلو تھا۔ بلاغتِ کلام' کلام پر برستی تھی جو ہر طبقہ کے جذبات کو اپیل کرتی تھی۔

طرزِ تدریس

درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصاء کے ساتھ ادا کرتے تھے' کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل۔ ایک مسئلہ کو اس کے تمام شقوق وجوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی۔ اسی لئے درس میں کمیت پر نہیں کیفیت پر نظر رہتی تھی سبق خواہ تھوڑا ہو مگر تمام ہو اسی لئے درس و تدریس کے سلسلے میں وقت کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے' تنقیح مسئلہ اور اس میں تدبّر و تفکّر پر وقت زیادہ صَرف ہوتا تھا مگر اسباق کا یہ تخلل اس لئے گراں نہ ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے درس میں کیفی طور پر کئی دنوں کے درس کا مواد فراہم ہو جاتا تھا اور کسر نکل جاتی تھی۔

میری ابتدائی تعلیم کے دوران حضرت والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے خود ہی فرمائش کی کہ اسے معقولات میں پڑھاؤں گا اور مجھے فرمایا کہ منطق تجھے میں پڑھاؤں گا چنانچہ خصوصیت سے صغریٰ کبریٰ شروع کرائی اور مرقات تک پہنچے' گو یہ کتابیں بیچ میں رہ گئیں۔ لیکن جس قدر پڑھایا اتنے ہی سے فن سے کافی مناسبت پیدا ہو گئی کیونکہ ان کی ابحاث کا نقطۂ نظر کتاب نہیں ہوتی تھی بلکہ فن ہوتا تھا اور طلبہ کو حسب استعداد فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

احقر جب کہ متوسط کتابیں ہدایہ' جلالین وغیرہ پڑھتا تھا تو میں نے خود فرمائش کی کہ ترجمہ قرآن شریف پڑھا دیجئے۔ دوسرے طلبہ بھی بکثرت شائق اور ملتجی ہیں۔ فرمایا کہ اوّل اوّل تو طلبہ شوق میں نام لکھا دیتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے آخر کار جماعت صفر کے درجہ میں رہ جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کم از کم مجھ پر تو اطمینان فرمایئے۔ نہ میں ناغہ کروں گا نہ بدشوقی دکھلاؤں گا' مگر آپ بھی پابندی فرمادیں' وعدہ فرمالیا اور بڑی شفقت سے قرآن کا درس شروع کرا دیا۔ ابتداء میں سو' سوا سو طلبہ کا جمگھٹا جمع ہو گیا' مگر آخر کار وہی ہوا کہ طلبہ گھٹنے شروع ہوئے اور آخر میں میں تنہا رہ گیا' قدرتی طور پر مولانا کی تدریسی اُمنگ بھی کم ہو گئی اور ناغے بکثرت ہونے لگے۔ مگر میں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ اس گھنٹہ میں مولانا جہاں بھی ہوتے وہیں پہنچ جاتا' خواہ مکان پر یا دفتر میں یا کتب خانہ مدرسہ میں اور وہ گھنٹہ میں ان کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے گزار دیتا تھا' کبھی پڑھا دیتے کبھی عذر فرمادیتے' مگر میں یہ وقت ان کے پاس پورا ہی کر دیتا۔ آخر کار ایک دن فرمایا کہ بھائی میں ہار گیا اور تو جیت گیا' تو نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔

کمالِ اخلاق

اخلاقی طور پر ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر و باطن میں یکسانی تھی۔ وہ اپنے قلبی جذبات کے چھپانے یا ان کے خلافِ اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر و باطن خوش اور اگر ناخوش ہیں تو اعلانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ بشرہ سے ہو جاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے' دارالعلوم کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ

علیہ مہتمم دار العلوم (جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے) کچھ رنجش ہو جاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے انہیں منانے اور راضی کرنے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ خفا ہو کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا ___ ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا' حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نے طے فرمایا کہ تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔

میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے اور دار العلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آجاتی تھی تو اسی لمحہ گرانی رفع ہو کر حقیقۃً بشاشت چہرہ پر نمودار ہو جاتی اور ایسے خوش اور منفرح ہو جاتے کہ گویا کوئی گرانی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور بہ تکلف نہیں بلکہ بلا تصنع و بناوٹ اس کی قلبی رفتار ہی یہ ہو۔

حق تعالیٰ نے علم و فضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی بارہا دیکھا کہ ان کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجہ سے کوئی بات کہی تو اُف بھی نہ کرتے تھے' اگر بات ان کے نزدیک قابلِ تسلیم بھی نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت فرماتے۔

حق پسندی

قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے خواہ وہ اپنی ہی کوئی کمزوری ہو ___ ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں حسبِ معمول منانے کے لئے گیا تو غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ بھائی نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے' جو اس طرح سے مجھ سے قطع نظر کر لی تو سن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دل میں دو قسم کے جذبے پیدا ہوئے ایک جذبہ لِلّٰہیت سے اور ایک نفسانیت سے۔ نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو میں انہیں اپنی زندگی باور کراؤں؟ اور اس کا یہ اور یہ طریقہ ہو تا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا۔ دوسرا جذبہ لِلّٰہیت سے پیدا ہوا اور وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانی پڑے گی۔

میں نے عرض کیا کہ حضرات ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے؟ فرمایا لِلّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا کہ الحمد للہ مگر میں نے کہا کہ حضرت آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر بھی تو دھیان فرمایئے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہو گا جب کہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے اس میں پیش آجاتی ہیں یہی فیصلے کر لیں کہ ہمیں کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمایئے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا؟ اور اسے کون سنبھالے گا؟ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا' بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آگئی اور فرمایا ہاں یہ تو نے صحیح کہا' بس! میں نے اب یہ دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دار العلوم پہنچ کر کام کروں گا' چنانچہ علی الصبح حسب وعدہ تشریف لائے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔

یہ در حقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانی، قلب کی صفائی اور حقیقت پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

اندازِ تحریر

بہرحال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھا دی تھی، قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا۔ کام کے سلسلہ میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا خود بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ کیا کام کروں میں تو کتابوں کا کیڑا بن کر رہ گیا ہوں۔ پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ تفسیری فوائد اور شرح مسلم جیسے دو اہم اور عظیم الشّان کام یادگار زمانہ چھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اعلیٰ ترین تصانیف "العقل والنقل" "الاسلام"۔ "الشہاب الثاقب" "صدائے ایمان" "اعجاز القرآن"۔ اور دوسرے مفید ترین رسائل و مسائل پر قلم زنی فرمائی اور حق یہ ہے کہ بیان مسائل کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت علامہ الاستاذ الکشمیری نور اللہ مرقدہٗ انہیں اس لحاظ سے لسان الغیب فرمایا کرتے تھے۔

ذکاوت و ذہانت طبعی تھی، فہم تیز اور طبیعت سادھا تھی۔ علم کی بنیاد فہم ہی ہے جب اسے کتاب و سنت میں استعمال کیا گیا تو علم کا دوچند ہو جانا قدرتی امر تھا۔ تحریر کی شگفتگی مسلم تھی، ایک ہی مضمون کئی آدمی لکھتے اور اسی کو وہ قلم بند فرماتے تو سب پر ان کی تحریر کی شگفتگی نمایاں رہتی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے واپسی پر مالٹا کے بعد ترک موالات کا استفتاء کیا گیا۔ حضرت نے اپنے تین ارشد تلامذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سپرد کیا کہ فتویٰ یہ حضرات مرتب کریں اور غایت احتیاط و تدیّن سے فرمایا کہ انگریزوں کے بارے میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مجھ پر ان کے بغض و عداوت کا غلبہ ہے ہو سکتا ہے کہ فتویٰ میں جذبات کا رنگ آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔

"تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے کام نہ لو، انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے"۔

اس لئے اس استفتاء کا جواب آپ تینوں حضرات لکھیں۔ چنانچہ تینوں حضرات نے قلم بند فرمایا اور حضرت نے تینوں کے جوابات ملاحظہ فرما کر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے جواب کے بارے میں فرمایا کہ جواب تو ماشاء اللہ سب ہی بہتر اور جامع ہیں۔ لیکن بھائی میں اگر لکھتا تو وہ اس کے قریب ہوتا جو شبیر نے لکھا ہے۔

بہرحال ان کی تحریر کی جامعیّت شگفتگی اور بلاغت کو خود ان کے اکابر بھی مانتے تھے اور اس کی کافی داد دیتے تھے۔

نظم و شعر

مولانا نظم اور شعر و شاعری سے بھی عاری نہ تھے گو اس کا ذوق نہ تھا، چند مواقع ایسے بھی پیش آئے کہ

جذبات دلی کی ترجمانی آپ نے نظم میں فرمائی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر "نالۂ دل" کے نام پر ایک نظم لکھی جو بہت پسند کی گئی اور ایک بار میرے متعلق ایک نظم قلم بند فرمائی جس کا واقعہ یہ ہوا کہ میرا رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری کے یہاں ہو چکا تھا، نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ یہ میری اہلیہ جے پور اپنے تایا کے پاس گئی ہوئی تھی اور شدید علیل ہوئی، حالت نازک دیکھ کر غلطی، یا غلط فہمی سے وہاں سے انتقال کا تار دے دیا جس سے یہاں دیوبند میں صف ماتم بچھ گئی، تیسرے دن تار پہنچا کہ وہ انتقال کا تار غلط تھا۔

اس پر بساطِ شادی بچھ گئی اور تہنیتی جلسے گھروں میں اور مدرسہ میں ہونے شروع ہو گئے ___ تقریباً پندرہ بیس دن تک جلسہ ہائے شیرینی و تہنیت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان مجالس میں مختلف حضرات کی طرف سے مبارک بادی نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے بھی ایک جلسہ میں نہایت بلیغ نظم لکھی اور سنائی، جس کا واقعاتی شعر یہ تھا ۔

غلط ایک تار برقی پہنچی تھی جے پور سے، جس نے
جلایا خرمن مقصود کو برق تپاں ہو کر

اس طرح کبھی کبھی کسی خاص محرک کے ماتحت نظم بھی کہہ لیتے تھے، مگر یہ چیز ذوق کے درجہ میں نہ تھی صرف ضرورت کے درجہ میں تھی اور طبیعت اس سے عاری اور عاجز نہ تھی ___ بہرحال حضرت علامہ کی ہستی تقریر، تحریر، نظم و نثر اور علم و فضل کی ایک مجسّم تصویر تھی، جس کے اُٹھ جانے کے بعد یہ مخصوص کمالات بھی گویا اٹھ گئے۔ یوں حق تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہے اور وہ شخصیتیں پیدا فرماتا رہے گا جو اس کے دین اور اس کے نبی کے علم کو سنبھالتے اور تازہ بہ تازہ کرتے رہیں گے لیکن جن کے سامنے علم و فضل کی ہستیاں اُٹھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تو اندھیر ہو جاتا ہے اور وہ جس قسم کے فضل و کمال سے مانوس اور مألوف ہوتے ہیں اس کے اُٹھنے سے یہ پسماندہ بالیقین یتیم رہ جاتے ہیں۔

سیاسی خدمات

آخر میں سیاسی لائنوں پر ان سے جو مہم کام انجام پائے یہ بھی فی الحقیقت ان کی زندگی کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بات تو الگ ہے کہ ان کی رائے سے بہت سے اکابر کو اختلاف تھا۔ اختلافِ رائے اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ہر شخص اپنی حجّت سے مجبور ہے لیکن عزم و عمل کی جو طاقتیں مولانا ممدوح سے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد ظاہر ہوئیں دوسرے انہیں خلاف توقع سمجھتے تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ حصہ ان کے لئے مقدر کر دیا تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے کے بعد دین اور علماء دین کو کافی سنبھالا۔ قدرت نے تنہا انہیں وہاں کی مرکزی شخصیت بنا دیا اور اس سے وہ کام لیا جو مرکزی شخصیتوں سے لیا جاتا رہا ہے، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو وہاں کے کاموں کی نوعیت اور ہوتی۔ یہاں کے لوگ ان کی رائے سے تو اختلاف رکھتے مگر ان کے جذبات اور صدق و خلوص کی قدر بھی کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اختلاف رائے کے حیلہ سے حضرت ممدوح وہاں نہ پہنچتے تو دین کا جو کام ہوا بظاہر اسباب وہ نہ ہو سکتا۔

خراجِ تحسین

غرض مجموعی حیثیت سے حضرت علّامہ کی شخصیت ایک ممتاز ترین شخصیت تھی جس کے علم و فضل کا سکّہ ملک بھر نے مانا ہوا تھا۔ اور بیرونی ممالک میں بھی اس کا شُہرہ پہنچا ہوا تھا جس کے سامنے اہل علم و فضل سر جھکانا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

ان کے تفسیری فوائد کا حکومتِ افغانستان کی طرف سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا جانا اور ان فوائد کا انتخاب عمل میں آنا در حقیقت ان کے فضل و کمال کے سامنے جُھک جانا تھا' فتح الملہم کو علامہ زاہد کوثری مشہور فاضل مصر کا خراج تحسین ادا کرنا ہی ان کے فضل و کمال کا اعتراف تھا۔ بہرحال جہاں جہاں بھی ان کے فضل و کمال کا کوئی اثر پہنچا وہیں اعتراف و تسلیم کا شیوہ بھی اختیار کیا گیا۔ اس طرح حضرت مولانا کی شخصیت صرف ہندوستان ہی کے لئے مایہ نازنہ تھی بلکہ دنیائے اسلام کے لئے سرمایہ نازش تھی۔

تعمیلِ حکم

اگر اس طرح سے قلم چلاتا ہوا چلا جاؤں جس طرح سے وہ بے ساختہ چل رہا ہے اور اس مجلس میں چند سُطور سپردِ قلم ہو گئیں تو ممکن ہے کہ قلم چلتا ہی رہے اور بات پر بات یاد آتی چلی جائے مگر سوئے اتفاق سے وقت ختم کیا۔ میں بہار کے سفر کے لئے پابرکاب ہوں' ریل کا وقت آگیا اس لئے قلم کو روک دینا پڑا' اگر قلم چلتا ہی رہتا تب بھی مناقب کی طولانی فہرست پوری نہ ہو سکتی اور اسے رُک جانا پڑتا۔ اس لئے اگر رُک بھی گیا تو مضائقہ نہیں' تکمیلِ فہرست جب ہوتی نہ اب اس لئے یہ سُطور بے ساختگی کے ساتھ حافظہ سے باہر آگئیں اور محترم عاشق صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور میں بھی اس حیلہ سے مولانا کے سوانح نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گیا' جو میرے فخر کے لئے کافی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔

"اے ربّ ہمارے' مَت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے"۔

آمین

A. BASEER ... QUADRY

آل انڈیا اَحناف کانفرنس سے خطاب

جس امام کی جو ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصولِ استنباط سے چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلِّد بظاہر تو جزئیاتِ فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظرِ حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا ہے جن سے وہ فقیہ بنتا ہے اور اسے راہِ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیاتِ فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔ پس اگر دو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کردے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہو مگر درحقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں۔ ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلِّد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے رُوحانی مزاج میں فساد پیدا ہو اور وہ متضاد آثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے۔ (از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِمَعْرِفَۃِ سُبُلِ الْاِجْتِھَادِ وَتَقْلِیْدِہٖ وَاَرْشَدَنَا اِلٰی طَرِیْقِ اِتِّبَاعِ الْاَئِمَّۃِ وَ تَاْئِیْدِہٖ فَنَوَّرَ قُلُوْبَنَا بِشُمُوْعِ اَعْلَامِ السُّنَنِ وَجَنَّبَنَا بِھَا عَنْ فِتَنِ الضَّلَالَۃِ وَالْغَوَایَۃِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ۔ وَاخْتَارَ لَنَا بِحُسْنِ تَوْفِیْقِہٖ سُنَّۃَ الْاِتِّبَاعِ وَیَسَّرَ لَنَا التَّجَنُّبَ عَنْ وَرْطَۃِ الْبِدَعِ وَالْاِخْتِرَاعِ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ حَبَّبَ اِلَیْنَا اِقْتِدَاءَ الْمُنِیْبِیْنَ بَعْدَ اِتِّبَاعِہٖ وَرَضِیَ لَنَا الْاِھْتِدَاءَ بِھُدَی الرَّاسِخِیْنَ بَعْدَ الْوُقُوْفِ عَلَیْہِ وَاِطِّلَاعِہٖ۔ فَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ شَھَادَۃً تُنْجِیْنَا عَنِ الْفُسُوْقِ بَعْدَ الْاِیْمَانِ۔ وَتَکُوْنُ عُدَّۃً لِلتَّقْلِیْدِ بِطُرُقِ اَھْلِ الْفِقْہِ وَالْعِرْفَانِ ــــ اَمَّا بَعْدُ!

شکریہ و تمہید

مُحترم حضرات!

میں اس تصور سے بھی خجل اور شرمسار ہوں کہ صدارت[1] کے نام سے مجھ جیسے نااہل کو ایک ایسی جگہ پر لابٹھایا گیا ہے جو کسی اہل ترین فرد کے لئے سزاوار ہوسکتی تھی اور اسی لئے مجھے اس منصب کے قبول کرنے میں حد درجہ تأمل اور تردّد تھا جس کا میں نے اعتذار کے لہجہ میں اظہار بھی کردیا تھا لیکن وہ خود پذیرائی نہیں ہوا۔ آخر کار اس جماعتی ارشاد سے رُوگردانی کو بے اَدبی خیال کرتے ہوئے میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور ہوگیا اور آج اپنی بے بضاعتی کے ساتھ آپ کے سامنے ہوں۔ مجھے ان بے نفس بزرگوں کے اخلاص اور ایثار کی برکت سے جو اپنی صدارت کی دولت کو بے دریغ لُٹا کر ہم جیسے نااہلوں کو مسندِ صدارت پر بٹھا سکتے ہیں۔ امید ہے وہ قادر و توانا جو رُسومِ حسنہ میں حقیقتِ حسنہ ڈالتا ہے اور جو اچھی صورتوں کے سانچہ میں اچھی سیرتیں اِلقاء فرمادیتا ہے۔ اس رسمی اعزاز کو حقیقت کا پیش خیمہ بنادے اور اس مبارک ہیئت کو جو بزرگانِ کانفرنس کی عزّت افزائی سے بصورتِ موجودہ نظر آرہی ہے عینِ حقیقت کردے۔

وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

بنا بریں میرا عقلی اور شرعی فریضہ ہے کہ میں ان تمام بزرگوں کا مخلصانہ شکریہ ادا کروں، جنہوں نے مجھے بایں بے بضاعتی قبول فرمایا ہے:

فجزاهم الله عنی خيرالجزاء واحسن اليهم احسن الصلة - آمین

حضرات! اس مختصر تحریر سے میری غرض حنفیہ ___ یا فقہ حنفی کی دعوت و تبلیغ یا دعایت و اشاعت نہیں یا اس کے منکرین یا غیر حنفی مسالک پر کوئی رد و انکار نہیں ہے کیونکہ یہ فقہی مسالک کچھ شرائع مستقلّہ نہیں ہیں کہ ان کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ چھیڑ کر ایک سے دوسرے مسلک پر رد و طعن یا ایک سے دوسرے کا اِبطال کیا جائے' یہ اجتہادی مسالک محض عملی راستے ہیں جو چلنے کے لئے صاف کئے گئے ہیں نہ کہ جنگ کے میدان ہیں جو لڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور نہ موجودہ نازک زمانہ جب کہ مسلمانوں میں ہزاروں مابہ النّزاع موجود ہیں اس کے لئے موزوں ہی ہوسکتا ہے کہ ایک اور نزاع کو ہوا دی جائے ___

تحریرِ خطبہ کی غرض وغایت

اس مختصر نوشتہ سے غرض اصولی طور پر اجتہاد و تقلید کے بارہ میں نقلِ صحیح اور عقلِ سلیم کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی معتبر اور مستند یعنی شرعی اجتہاد کی تقلید کوئی بدعتِ سیّئہ نہیں ہے کہ اسے قابلِ ملامت اور اس کے مرتکب کو مستوجبِ نکیر تصور کیا جائے بلکہ وہ ایک ایسا مسلوک راستہ ہے جو سلف سے لے کر آج کے خلف تک اجماعی طور پر دینی راہ گزر بنا رہا ہے اور اُمت نے اس کے سوا اپنے دین کے تحفظ کی کوئی اور صورت نہیں سمجھی۔

یہ غرض نہیں کہ تقلیدی مسلک سے انکار رکھنے والے کیسے ہیں اور کس حکم کے مستحق ہیں؟ میں اس سلسلہ میں ابتدا چند تمہید جملے اور بعد میں اصل مقصد کی چند باتیں عرض کروں گا۔ جس کے خطاء و صواب کا فیصلہ حضرات علماء کے ہاتھ ہے۔

---

[1] خطبۂ صدارت آل انڈیا احناف کانفرنس منعقدہ ۱۵ تا ۱۷ شوال المکرم ۱۳۶۳ھ مئو ائمہ ضلع الٰہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا۔

فانْ یّک صواباً فمن اللّٰہ وانْ یّک خطاءً فمن نفسی والمرجو المسامحۃ والاصلاح وباللّٰہ التوفیق۔

اللہ کا کام اور اُس کا کلام

حضرات! اس عالَم کی زندگی اور آبادی و رونق صرف دو چیزوں سے ہے بلکہ عالَم میں آبادی ہی صرف دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا کام اور ایک اس کا کلام۔

خدا کے کاموں سے کائناتِ عالم میں حسّی نظام بنا ہے جسے عالمِ خلق کہتے ہیں اور اس کے کلاموں سے اقوامِ عالَم کا یہ شرعی نظام اُستوار ہوا ہے جسے عالمِ اَمر کہتے ہیں۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ

پس عالَمِ خلق ہو یا عالَمِ اَمر دونوں میں اسی کی ذات و صفات اور کمالات عِلم و عمل کی جلوہ گری ہے اور تکوین و تشریع کے ان گوناگوں مظاہر میں اسی باطنِ مطلق کے محاسنِ اقوال و افعال ظہور کر رہے ہیں ؎

ہر چہ دیدم در جہاں غیرِ تو نیست
یاتوئی یا خوئے تو یا بوئے تو

تکوین و تشریع کا مبداء و معاد واحد ہے

یہی وجہ ہے کہ تکوینی نظام بھی اسی سے چل کر اسی پر ختم ہوتا ہے اور تشریعی انتظام بھی اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی تکوین و تشریع اور امر کا مبداء اور معاد وہی اور صرف وہی ہے۔ عالمِ خلق کے بارہ میں مبداء ہونے کو اپنے کلام پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا:

وَھُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُ الْخَلْقَ

"وہی ہے جو آغاز فرماتا ہے خِلقت کا"

پھر اسی آیت سے ملحق اپنے معادِ خلق ہونے کی یوں تصریح فرمائی کہ:

ثُمَّ یُعِیْدُہٗ وَھُوَ اَھْوَنُ عَلَیْہِ

"پھر وہی ہے جو خِلقت کو (اپنی طرف) لوٹا لیتا ہے اور وہ اس پر بالکل سہل ہے"

جس سے واضح ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہا صرف اسی سے ہے کوئی غیر اس میں دَخیل نہیں۔ اسی طرح عالَمِ اَمر کے بارہ میں اپنا مبداء ہونا یوں ظاہر فرمایا:

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ

"اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں اور انہیں کی مانند زمینوں کو بنایا، اُترتا رہتا ہے اَمر اُن کے درمیان"

اور دوسری آیت میں اپنے مرجعُ الاُمور اور معادِ اَمر ہونے کو یوں تعبیر فرمایا کہ:

وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ

"اور اللہ ہی کی طرف تمام اُمور لوٹ جاویں گے"

جس سے نمایاں ہے کہ اَوامر اور شرائع کا نازل کرنا اور آخر کار اپنی طرف اُٹھالینا صرف اسی کا کام ہے اس میں کوئی مخلوق یا کوئی بشر شریک نہیں۔ پس نہ تخلیق و تکوین میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک ہے اور نہ تشریع

و تعمیر میں کوئی اس کا سہیم وندیم اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

تکوین و تشریع کے اُصول بھی ایک ہیں

یہاں سے خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے کہ تکوین اور تشریع کو بروئے کار لانے والے ایک ہی اصولِ فطرت ہوسکتے ہیں جو فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی فطرت سے ناشی ہیں کہ وہی ان دونوں کا مبداء اور انتہا ہے انہی اصول کو جب تخلیق میں استعمال کیا گیا و عالمِ مخلوقات مکمل ہو کر سامنے آگیا اور انہی کو جب تشریع میں بکار لایا گیا تو عالمِ مشروعات تیار ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

چنانچہ حق تعالیٰ کی صفت تانیٔ و تدریج یا صفت رُبوبیّت کا اصول جس کے معنیٰ آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی شئے کو اس کی حدِ کمال تک پہنچانے کے ہیں جب تکوین کے ساتھ ہم کنار ہوا تو بتدریج مخلوقات کا نظام مکمل ہو کر اس ہیئتِ کذائی پر آگیا جو آج زمین و آسمان، شجر و حجر، حیوان و انسان اور پوری منظم کائنات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور وہی تدریج کا اصول جب تشریع سے ہم آغوش ہوا تو بتدریج ہی شرائع کا نظام بھی کامل و تام بن کر اس ہیئتِ کذائی پر سامنے آگیا۔ جو اسلام کی صورت میں ہمارے آگے ہے۔

مخلوقاتی نظام کی اس تدریجی ساخت اور تمہیلی مدّت کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی کہ:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔

"بلاشبہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں، پھر چھا گیا عرش پر کہ اَمر کی تدبیر فرمائے"۔

اس کی تفصیلات دوسری آیات اور احادیث میں موجود ہیں کہ کتنے دن اور کون سے دن میں کیا چیز بنی اور اس نے اپنی تکمیل میں کتنی مدت لی۔ آیت سے بالاِجمال یہ واضح ہے کہ یہ مجموعہ کائنات چھ ۶ دن میں تیار ہوا، اس کے ساتھ جب یہ آیت بھی ملالی جائے کہ۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

"اور ایک دن آپ کے پروردگار کا مثل ہزار برس کی مدت کے ہے، جو تم شمار کرتے ہو"۔

تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائناتِ خلق کی تکمیل رفتہ رفتہ چھ ہزار برس میں ہوئی۔ ادھر شرعیّاتی نظام کی تدریجی ترقی و تکمیل کی طرف بھی قرآن نے اشارہ فرماتے ہوئے تعلیماتِ الٰہیہ کا اوّلین مورد اور خلافتِ ربّانی کا پہلا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بتلایا ان کی علمی خلافت کے بارہ میں جو عالمِ امر کی ابتدا ہے :

قرآنِ عزیز کا ارشاد ہے :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ ۔

اور خلافتِ نبوّۃ کے بارہ میں جو عالمِ امر کی آخری کڑی ہے۔ حدیث ابوذر غفاریؓ میں جسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے آدم علیہ السلام کو اوّلُ الانبیاء اور نبیٔ مکلّم فرمایا گیا جن پر آسمانی صُحف نازل ہوئے (مشکوٰۃ باب بدء الخلق) غرض قصرِ نبوّت کی تعمیر آدمؑ سے شروع ہوئی اور وہ نبوّت اور علمِ نبوّت کے پہلے مرکز تھے جن سے عالمِ امر کا آغاز ہوا۔ پھر اس قصرِ نبوّت کی آخری خشت جس سے یہ قصر مکمل ہو۔ حدیث ابی ہریرہؓ میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ :

خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ (وفی روایۃ) فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ۔

"مجھ سے قصرِ نبوّت مکمّل کردیا گیا اور رسول ختم کردیئے گئے (اور ایک روایت میں ہے) پس میں وہ خشت ہوں جس سے یہ قصر مکمّل ہوا اور میں خاتم النبیین ہوں"

پس حضور اس علمِ نبوّت اور ختمِ نبوّت کے آخری مرکز تھے جن پر عالمِ امر کا اختتام کرکے اس کی تکمیل کردی گئی۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے حضورؐ کے آخری اور وداعی حج کے دن دین کی اس تدریجی تکمیل کے آخری نتیجہ کا اعلان ان الفاظ میں کردیا کہ :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمّل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور میں تم سے دین کے بارے اسلام سے راضی ہو گیا"۔

اگر مؤرّخین کا یہ قول اختیار کیا جائے کہ آدم علیہ السلام سے چھ ہزار سال بعد دورۂ محمدیؐ شروع ہوتا ہے اور آپ ساتویں الف کے آغاز میں مولود اور مبعوث ہوئے ہیں (جس پر بعض آثارِ صحابہؓ اور احادیث بھی شاہد ہیں جن کو ابن جریرِ طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے) تو واضح ہوگا کہ تکوینیّات کی طرح تشریعیّات کی تکمیل بھی چھ ہزار سال میں ہوئی ہے اور جس طرح تکوین و تشریع میں تدریج و تأنّی کا اصول مشترک تھا اسی طرح اس کی مدّت بھی مشترک اور یکساں ثابت رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے چھ چھ دن یا دنیا کے چھ چھ ہزار سال کی مدّت میں مخلوقات اور مشروعات کا نظام مکمّل ہوکر اس درجہ پر پہنچادیا گیا کہ اب اس میں نہ کمی کی گنجائش رہی نہ زیادتی کی نہ ترمیم کی نہ تنسیخ کی کہ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ یعنی جس طرح کائناتِ عالم کے کلّی مواد آب و خاک و باد و آتش پھر مواد کے کلّی موالیدِ جمادات، نباتات، حیوانات۔ پھر ان کے علویّات اور سفلیات

پھر موادِ علوی و سفلی کی جامع انواع و اجناس، انسان، شیر، بکری، شجر، حجر اور بحر و بر، جن، ملک، سیارات و ثوابت، ارض و سماء وغیرہ کی یہ مجموعی ہیئت جسے عالم کہتے ہیں اب کوئی کمی بیشی قبول نہیں کرسکتے۔

اسی طرح دین کے اصول و کلیّات اساسی قواعد و ضوابط اور تمام منصوص عقائد و احکام کی اس مجموعی ہیئتِ کذائی میں جسے اسلام کہتے ہیں کوئی کمی بیشی اور ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا

ایجاد اور اجتہاد

مگر ہاں جس طرح تکوین کے ان مرتّب مواد اور علوی و سفلی ذخائر سے بواسطہ فکر و تدبّر نئے نئے عجائبات کا اِنکشاف کیا جاسکتا ہے اور ان کی چھپی ہوئی طاقتوں کا سُراغ لگا کر تمدّن کے نئے نئے کارنامے دنیا کو دکھائے جاسکتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کہ لَا تَنْقَضِیْ غَرَائِبُہٗ

اسی طرح تشریع کے منظّم احکام و مسائل اور قواعد و کلیّات کے مخفی علوم و اسرار کا پتہ لگا کر اُن سے تدین کے نئے نئے فروعی مسائل لطائف و ظرائف اور حقائق و معارف پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ قرآن کی شان بھی لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ وارد ہوئی ہے۔ اس تکوینی انکشاف کا نام ایجاد ہے اور تشریعی استخراج کا نام اجتہاد ہے۔ نہ ایجاد کی کوئی حد ہے اور نہ اجتہاد کی۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ایجادات ہر زمانہ کی ذہنیت اور ضرورت کے

مطابق ہوتی ہیں اور فطرۃً موجدین کی طبائع ان ہی ایجادات کی طرف چلتی ہیں جن کی زمانہ کو ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے، تو طبائع کی یہ دوڑ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آگے صرف ان ایجادات سے فائدہ اٹھانا رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی اجتہاد کا رنگ بھی ہر دور کی علمی ذہنیت اور وقت کے مقتضیات کے مطابق ہوتا ہے۔ مجتہدین کے قلوب فطرۃً چلتے ہی اس استخراج کی طرف ہیں جس کی اس قرن کو ضرورت ہوتی ہے۔ پس تکمیل ضرورت کے بعد اجتہاد کا وہ دور نہیں لوٹتا جو آچکتا ہے کہ زمانہ اس کی ضرورت سے فارغ ہو چکتا ہے اب صرف اس سے نفع اٹھانے کا موقع باقی رہ جاتا ہے

اجتہاد کی انواع

مثلاً اگر عین دین میں اجتہاد کر کے استخراج عِلَل و کلیات اور تدوین اصول کی ضرورت ہوگی تو مجتہد دماغ قدرۃً ادھر ہی چلیں گے اور اگر ان کلیات میں سے اجتہاد کے ذریعہ استخراجِ مسائل اور تدوینِ قانون کی ضرورت ہوگی تو مجتہدِ دماغ ادھر ہی متوجہ ہوں گے۔

اور پھر اگر ان متخرج مسائل کو واقعات پر منطبق کر کے ترجیح و انتخاب فتاویٰ کی ضرورت پڑے گی تو اجتہادات ادھر ہی بڑھیں گے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جو درجہ بھی اجتہاد کے ذریعہ پردۂ ظہور پر آجائے گا اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ پھر طبعی طور پر اس کے اعادہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے قدرۃً بعد کے مجتہدِ دماغ اس کی طرف چل ہی نہ سکیں گے کہ ان کے لئے ان حاصل شدہ اجتہادات میں اجتہاد کرنے کی طرف کوئی کشش ہی نہ ہوگی کہ تحصیل حاصل سے فطرت ہمیشہ گریز کرتی رہی ہے کیونکہ حاصل شدہ شئے سے صرف انتفاع کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے نہ کہ اسے حاصل کرنے کی۔

مجتہد کا کام حقیقت رسی ہے

اس سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے ہوں گے کہ موجد اور مجتہد کا کام محض سطحی اُمور کا دیکھ لینا نہیں بلکہ ان کی گہرائیوں میں گھس کر ان کی بنیادوں کا پتہ لگانا ہے۔ موجد کائنات کی اشیاء کی صورت سے گزر کر ان کی مخفی خاصیات کا پتہ چلائے گا تاکہ اس کی باطنی کلیات اور اندرونی وُسعت سے اپنا علم وسیع کر کے کوئی ایجادی قدم اٹھا سکے اور مجتہد مسائل شرعیہ اور نصُوص کے ظواہر سے گزر کر ان کے باطن میں گھسے گا تاکہ عِللِ کلیہ اور اسرارِ جامعہ کا سُراغ لگا کر ان جزوی مسائل کو ہمہ گیر بنا سکے۔ خلاصہ یہ کہ جزئیات سے کلیات تک پہنچنا اور کلیات سے پھر نئے جزئیات نکالنا ان دونوں طبقات کا کام ہوگا نہ کہ سامنے آئی ہوئی جزئیات کا یاد کر لینا کہ یہ درحقیقت حفظ ہوگا علم نہ ہوگا یا علم ادنیٰ ہوگا علم اعلیٰ نہ ہوگا۔

مثلاً تکوین کے سلسلہ میں دنیا کی بے شمار جزئیات و افراد زید، عمر، بکر، شجر، حجر اور بحر و بر کا دیکھ لینا یا سُن کر معلوم کر لینا کوئی قابلِ ذکر علم نہیں کہ یہ ہر عامی سے عامی انسان کو میسّر آسکتا ہے بلکہ یہ علم ہی نہیں حس ہے۔ خواہ آنکھ سے محسوس کرے یا کان سے ہاں یہ جان لینا کہ زید کن کلیات کے ماتحت زید ہے۔ اس کی حقیقت کی تشکیل کن کن کلیات سے ہو رہی ہے اور اس کی ماہیت میں کون کون سے کلیات حصہ دار ہیں۔ پھر زید جزئی کا اس کی ماہیاتی کلیات سے کیا رابطہ ہے حقیقۃً علم ہے جو حس کے مقام سے بالاتر ہے۔

آپ خود ہی غور کریں کہ زید اور زید کی طرح عالم جزئیات منتشر اور بے جوڑ نہیں بلکہ ہر جزئیت میں بیسیوں کلیات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ سب جزئیات اور افراد سمٹ کر کسی نہ کسی نوع کے تحت میں

آئے ہوئے ہیں۔ پھر ساری انواع سمٹ کر کسی نہ کسی جنس کے نیچے ہیں ___ پھر اجناس جمع ہو کر کسی جنسِ عالی اور جنسُ الاجناس کے تحت میں آجاتی ہیں اور کائنات کی اس فطری ترتیب و تنظیم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عالم کی تمام جزئی کثرتیں سمٹ کر کلیات کی طرف اور کلی وحدتیں پھیل کر جزئیات کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ زید جزئی بظاہر تو ایک جزوی شخص ہے لیکن بہ نگاہِ غائر وہ ایک مستقل جہاں ہے جس میں ترتیب وار یہ سینکڑوں کلیات اور عمومات سمائی ہوئی ہیں اور اسی زیدیت کی تشکیل و تکمیل کر رہی ہیں۔

اس جزئی زید کے اوپر انسان کلی ہے۔ جس میں زید کی طرح لاکھوں افرادِ انسانی لپٹے ہوئے پڑے ہیں۔ پھر انسان کلی کی حقیقت میں یا اس کے اوپر حیوان ہے جس میں حیوان کی طرح لاکھوں نمودار نباتی انواع چھپی ہوئی ہیں۔ پھر نامی کی اصل جسم ہے۔ جس میں نامی کے ساتھ لاکھوں غیر نامی اور بے نمو جمادات شریک ہوگئے ہیں۔ پھر اس جسمِ مطلق سے اوپر جوہر ہے۔ جس میں اجسام کے ساتھ ان گنت غیر جسمانی مجرّدات بھی آجاتے ہیں۔ پھر جوہر سے اوپر وجود ہے جو کلی الکلیات اور جنسُ الاجناس ہے۔ جس کے نیچے جوہر کے ساتھ لاکھوں اعراض بھی آجاتے ہیں، پس ساری کائنات کے یہ مختلفُ الماہیات اور شاخ در شاخ اجزاء ان درمیانی کلیات سے گزرتے ہوئے وجود میں جمع ہو جاتے ہیں جو ان سب کی اصلِ اصول ہے اور اس طرح ایک زید کے بنانے میں کس قدر کلیات نے اپنا کام کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وجود نے جوہر کا لباس پہنا، جوہر نے جسم کی قبا اوڑھی، جسم نے نمو کی رداء پہنی۔ نامی نے حیوانیت میں قدم رکھا۔ حیوان نے انسانیت میں ظہور کیا اور انسان نے ان سارے تشخصات کے ساتھ زید کو دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ پس زید مجموعۂ اصول و کلیات نکلا جس کی جزئیت میں کتنی ہی کلیات سمائی ہوئی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ سے خود متمثل ہو کر نمایاں ہو رہی ہیں۔

پس ایک عامی تو صرف زید کو دیکھ لے گا، لیکن ایک مفکر زید کے دیکھ لینے ہی پر قناعت نہیں کرے گا۔ اس کی گہری نظر ان مخفی کلیات و اسرار تک پہنچ کر رہے گی جن سے زید کا قوام بنا اور وہ بایں ہیئت کذائی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوا۔ اس لئے عامی کو جس میں صرف پیشانی کی آنکھ تھی مُبصِر کہیں گے لیکن اس باطن بین دانا کو جس کی مخفی آنکھ نے زید کے ان تمام مخفیات کو بھی دیکھ لیا مُبصِر ہی نہیں مُبصّر بھی کہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ زید کے جثہ کا دیکھ لینا علم نہیں بلکہ زید کی کلی حقیقت کو پالینا اور پھر اس جزئی زید کا اس کلیات سے ارتباط معلوم کر لینا علم ہے جو ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

شریعت حد درجہ مرتّب اور منظّم ہے

بالکل یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ تشریع کے یہ لاکھوں مسائل اور شریعت کی یہ ہیئتِ کذائی محض سطحی اور نمائشی نہیں بلکہ پوری شریعت اپنے ظاہری مسائل اور باطنی دلائل نیز اپنے تمام فروع اور اصول کے لحاظ سے اس درجہ مرتّب اور منظّم ہے کہ وہ مثل ایک سیدھی زنجیر کے ہے۔ جس میں یہ سارے اصول و فروع اور جزئیات و کلیات درجہ بدرجہ ترتیب وار پروئے ہوئے ہیں۔

شریعت کا کوئی جزئیہ نہیں جو کسی نہ کسی کلیہ کے ماتحت نہ ہو۔ ہر ہر فرع کسی نہ کسی اصل کے ماتحت ہے ___ پھر ہر ہر اصول کسی نہ کسی اصلِ اصول سے مربوط ہے اور سارے اصول و کلیات سمٹ کر کسی ایک اصلِ اصیل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس سے پوری شریعت ایک محیّر العقول نظام کے ماتحت اور ایک ایسے شجرۂ واحد کی صورت دکھائی دیتی ہے جس کی تمام شاخیں اور شاخ در شاخ ٹہنیاں مع اپنے ثمرات کے ایک اصلِ واحد سے ناشی ہو رہی ہیں اور ہر آن اپنے مستفیدین کو اپنے پھلوں سے بہرہ مند کر رہی ہیں۔

مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ ۢبِاِذْنِ رَبِّهَا۔

"مثال کلمۂ طیبہ کی اس پاک درخت کی مانند ہے جس کی جڑ تو تہہ میں گھسی ہوئی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ پھل دے رہا ہو ہر آن اپنے پروردگار کی جانب سے"۔

پس آیات و احادیث میں جس قدر بھی جزئی احکام مذکور ہوتے ہیں جو زید عمرؔ بکر کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان کی تشکیل وہ اصول و کلیات و عِلَل و اَسرار کرتے ہیں جو ان جزئیات میں مستور ہوتے ہیں کہ ہر جزئی میں ایک علمِ کلّی ہوتا ہے اور ہر علمِ کلّی میں کوئی حکمت و مصلحتِ کلیہ پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہر مصلحت کا تعلق کسی نہ کسی شانِ کمال سے ہوتا ہے۔ پھر ہر شانِ کمال کسی نہ کسی صفتِ الٰہی سے مربوط ہوتی ہے جس سے نفسِ انسانی کی صفاتِ نقص اس جزئیہ شریعت کی تکمیل کے ذریعہ کمال کا اثر قبول کرتی ہیں اور پھر یہ صفاتِ کمال ذاتِ بابرکات سے مربوط ہیں کہ کمالات کا منبع ہی وجود ہے جیسے شرور کا منبع عدم ہے۔

حرف حرفش راست اندر معنے
معنے در معنے در معنے

اسی طرح ساری شریعت بالآخر ان درمیانی اصول و کلیات اور شئون و صفات سے گزرتی ہوئی اپنے وجود سے جاکر جُڑ جاتی ہے یعنی شریعت کے تمام اوامر و نواہی جو بمنزلہ افراد کے ہیں اپنی اپنی علل کے نیچے ہیں جو بمنزلہ انواع کے ہیں۔ پھر یہ تمام انواع سمٹ کر دو جنسوں کے نیچے آجاتی ہیں۔ معروف اور منکر۔ پس سارے ماموراتکا سرچشمہ معروف ہے اور سارے منہیات کا سرِ منشاء منکر ہے۔ اسی کو قرآنِ عزیز نے یوں واضح کیا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

"وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول کی جو نبیٔ اُمّی ہے' پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات و انجیل میں' جو انھیں معروف کا امر کرتا ہے اور منکر سے روکتا ہے"۔

پس اصل میں مامور بہ معروف اور منہی عنہٗ منکر ہے اب جس چیز میں معروفیت ہوگی وہ مامور بہ بن جائے گا اور جس میں منکریت ہوگی وہ منہی عنہٗ ہو جائے گا۔ اس لئے بالذات مامور ذہنی معروف و منکر ہے کہ وہی حسن بالذّات اور قبیح بالذّات ہوتے ہیں اور بالعرض وہ چیزیں مامور ذہنی بنتی ہیں جن میں وصفِ معروفیت اور وصفِ منکریّت موجود ہو کہ ان کا حسن و قبح ذاتی نہیں ہوتا لغیرہٖ ہوتا ہے۔ پس یہ معروف و منکر کی دونوں اجناس اللہ کی صفتِ عدل کے نیچے آئی ہوئی ہیں۔ عدلِ الٰہی کا تقاضی ہے کہ معروفات برسرِکار آئیں اور منکرات زیرِ ترک رہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔اور۔يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔

"اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل اور احسان کا اور روکتا ہے فحشاء و منکر سے"۔

پس دین کے حق میں یہ صفت بمنزلہ جنسِ عالی کے ہے اور ظاہر ہے کہ عدل حصہ ہے اس کے وجود کا یعنی وجودی کمال ہے اس لئے گویا سارے اوامر اور نواہی وجودِ الٰہی سے مربوط ہوگئے اور اس طرح پوری شریعت

ذاتِ بابرکات سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے ذیل کی اَمثلہ پر غور کیجئے۔

تنظیم شریعت کی چند اَمثلہ

① **وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى** (زنا کے پاس بھی مت پھٹکو) اور ساتھ ہی اس کی علّت نقل فرمائی کہ **اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً** (کیونکہ زنا فحش ہے) پس بظاہر تو **لَا تَقْرَبُوا** کا حکم زنا پر لگ رہا ہے مگر حقیقۃً فحش پر لگا ہوا ہے کہ فحش ہی کی وجہ زنیٰ حرام ہوا ہے۔ اگر اس میں فحش کی شان نہ ہوتی تو وہ ہرگز حرام نہ ہوتا۔ چنانچہ دوسری جگہ کتابِ مبین میں اس کی تصریح بھی ہے کہ :

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ

''اور اللہ روکتا ہے فحش سے اور منکر سے''

پس حکم کی شکل یوں ہو گئی کہ :

الزّنٰی فحش والفحش حرام فالزّنٰی حرام

''زنا فحش ہے اور فحش حرام ہے لہٰذا زنا حرام ہے''

پس اصل میں فحش کی جنس حرام نکلی اس کی وجہ سے زنٰی کا جزئیہ حرام بن گیا۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ فحش کی علّتِ کلیہ جن جن افعال میں پائی جاتی رہے گی اور وہ حرام ہوتے جائیں گے لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں جزئیہ میں فحش کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ہر ایک کا کام نہیں یہاں سے مجتہد کے کام کا دائرہ شروع ہوتا ہے کہ فحش کی شان کسی فعل میں ثابت کر کے اس پر حُرمت کا حکم لگا دے یہ ایسے ہی مجتہد دماغوں کا کام ہے جنہیں تشریع سے فطرۃً اور ذوقاً مناسبت ہو اور اللہ نے وہ ملکہ ان میں قدرۃً ودیعت فرمایا ہو۔

پھر فحش کے حرام ہونے کی بھی ایک علّت ہے جس کی وجہ فحش میں حرمت آئی اور وہ اللہ کی صفتِ حیاء ہے۔ **اِنَّ اللّٰهَ حَيِىٌّ سَتِيْرٌ** ۔

صفتِ حیاء کا فطری تقاضہ ہے کہ اس کے بندوں میں فحش نمایاں نہ ہو۔ پس حکم جُزئی یعنی حرمتِ زنٰی حرمتِ فحش سے ناشی ہے اور حرمتِ فحش اللہ کی صفتِ حیاء سے نکلی ہے۔ اس لئے زنٰی کے ساتھ اور بھی تمام فواحش کی حرمت کی علّت کلی خدا کی ایک صفتِ کمال نکلی جو اس کے وجود لا محدود کا ایک حصہ ہے۔ پس جس شخص میں حیاء درجہ حال کو پہنچ چکی ہو اور وہ ظاہراً و باطناً فیما بینہٗ وبین اللہ اور فیما بینہٗ وبین **الخلق** حیاءِ کامل کے لئے مضطر ہو چکا ہو۔ ادھر قلب میں ذوقِ اجتہاد رکھتا ہو اور دماغ میں کمالِ عقل۔ تو بلا شبہ وہی اس حیاء اور اس کے تقاضٰی سے حرمتِ فحش اور اس کے تقاضٰی سے حرمتِ زنٰی اور پھر حرمتِ زنٰی کے تقاضٰی سے عموماً دواعی زنٰی کو جو ہر زمانہ میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتے ہیں، پہچان کر حرمت کا حکم لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس اجتہاد سے تشریع کا یہ دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا اور ایک حکمِ زنٰی سے کس قدر احکام پیدا ہو جائیں گے جو مجتہد کی دیانت و امانت اور فقہ و اجتہاد کا ثمرہ ہوں گے۔ پس ایسے احکام میں جہاں یہ عِلَلِ کلیّہ ظاہر نص میں موجود ہوں۔ مجتہد کا کام قیاس ہے کہ علّت کے اشتراک سے اس جزئیہ پر دوسرے جزئیات کو قیاس کر کے ان پر حرمت کا حکم لگادے اور احکام کا دائرہ وسیع تر کردے۔

② اور کبھی نص میں صرف حکم ہی مذکور ہوتا ہے اور اس کی علّت حکم میں مستور و مخفی بھی ہوتی ہے لیکن جن چیزوں پر یہ منصوص حکم لگایا جاتا ہے ان میں خلقی طور پر کچھ اوصاف ہوتے ہیں جو حکم میں مؤثر ہوتے ہیں۔ گویا علّت حکم ان اوصاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس کو مجتہد کی گہری نظر ان اوصاف میں سے نکھار کر

نکال لیتی ہے اور علّتِ حکم کھل جانے پر یہ حکم جزئی بمنزلہ کلیہ کے ہو کر دوسری جزئیات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک مجتہد کے نور اجتہاد سے یہ جزئی حکم ایک وسیع دائرہ پیدا کر لیتا ہے جس سے شریعت کی تفصیلات اور ترتیبات نمایاں ہوتی ہیں۔

مثلاً احادیث ربٰوا میں اشیاءِ ستہ ۱۔ گندم ' ۲۔ جَو ' ۳۔ چھوارہ ' ۴۔ نمک ' ۵۔ سونا ' ۶۔ چاندی ' میں سُود لینا حرام فرمایا گیا۔ لیکن حرمت کی لِمّ اور علّت کسی حدیث میں مذکور نہیں اس لئے مجتہدین متوجّہ ہوئے کہ حکم کی حکمت یا وجہ حرمت نیز اشیاءِ مذکورہ کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟ انہی اشیاءِ مذکورہ کی وجہِ تخصیص کیا ہے؟ یعنی شارع نے آخر حُرمتِ ربٰوا کے لئے انہی اشیاء کو کیوں خاص فرمایا؟ تو سوائے اصحابِ ظواہر کے جو قیاس کے منکر ہیں۔ ہر ایک نے ان اشیاء کے اوصاف میں قوتِ اجتہادی سے غور کر کے کچھ ایسے جامع اوصاف نکالے جو علّتِ حکم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ وہ وصفِ جامع قدر مع الجنس ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ وہ طعمیت اور ثمنیت ہے۔

امام مالکؒ نے فرمایا کہ وہ اقتیات و اذخار ہے۔

امام احمدؒ نے وہی فرمایا جو امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

بہر حال ایک نے ایک علّتِ حکم برآمد کی جس پر حرمت ربٰوا کا حکم دائر ہے۔ اب جہاں جہاں جس کی نکالی ہوئی علت پائی گئی وہاں وہاں اس نے سُود کی حرمت کا حکم لگا دیا۔ ایسے مواقع پر مجتہد کا کام پہلے استنباطِ علت ہے اور پھر قیاسِ حکم۔

(۳) کبھی نص میں حکم کے سوا نہ علّت منصوص ہوتی ہے نہ محکوم نہ اس میں کوئی وصف ہی ایسا ہوتا جس سے علتِ حکم کا استنباط کیا جا سکے۔ ایسی صورت میں مجتہد محض اپنے ذوق اجتہاد سے آگے بڑھتا ہے اور عام قواعدِ شرعیہ اور وضع تشریع کی مدد سے جن کے استحضار سے اسے تشریع سے مناسبت اور اس کی اجتہادی قوت کی تشکیل ہوتی ہے۔ علت کا استخراج کرتا ہے اور حکمِ جزئی کو اس سے مربوط سمجھ کر پھر اس علت سے مختلف ابواب کے احکام قیاس کی مدد سے ظاہر کر دیتا ہے مثلاً حق تعالیٰ نے فرمایا :

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا۔

''گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو''۔

اجتہادی ذوق سے اس کا کلیہ جس سے یہ حکم ناشی ہے یہ ہے کہ :

اِفْعَلُوا الْأُمُورَ عَلَىٰ مَنْوَالِهَا۔ أَوْضَعُوا الْأَشْيَاءَ فِي مَحَالِهَا۔

''کاموں کو ڈھنگ سے کرو' بے ڈھنگے پن سے مت کرو یا ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو''۔

ظاہر ہے کہ دروازہ ہوتے ہوئے گھروں میں دیواریں پھلانگ کر گھسنا حد درجہ بے ڈھنگا پن' بد سلیقگی' ناشائستگی اور بے محل کام کرنا ہے۔ پس اصل میں ممانعت ہوئی ناشائستگی اور بے ڈھنگے پن کی۔ چونکہ یہ بے ڈھنگا پن دیواریں توڑ کر یا پھلانگ کر داخلِ خانہ ہونے میں پایا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ فعل ممنوع ہوا کہ اس کی علت ممنوع تھی اور علت اس لئے ممنوع ہوئی کہ اللہ کی صفتِ جمال اور صفتِ عدل کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جمال کے معنیٰ حقیقی موزونیت اور کامل توازن کے ہیں اور عدل کے معنیٰ وَضْعُ الشَّيْءِ فِي مَحَلِّهٖ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ بے ڈھنگا پن اور بد سلیقگی اس کے خلاف ہے۔ اس لئے ناپسندیدۂ حق ہوئی کہ اِنَّ اللّٰہَ جمیل یحب الجمال پس جس کے دماغی قُویٰ میں توازنِ حقیقی حدِ کمال پر پہنچا ہوا ہو۔ گویا وہ اللہ کی اس صفتِ جمال سے مستنیر اور اس کے اس خلق سے متخلّق ہے ادھر قلب میں وہ وَہبی ملکۂ اجتہاد بھی رکھتا

ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس کلیہ کے انکشاف کے بعد صرف اسی جزئی حکم پر قناعت نہیں کرے گا جو آیت میں مذکور ہے بلکہ ہر باب کے ہر اس فعل کو ممنوع و مکروہ قرار دے گا جس میں یہ بے ڈھنگے پن کی علت پائی جائے گی۔ البتہ یہ معلوم کرنا کہ آیا اس میں یہ علت غیر موزونیت ہے بھی یا نہیں؟ نہ ہر ایک کا کام ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اس میں معتبر ہے۔

بہرحال علت کے انکشاف پر حکم جزئی کی توسیع موقوف ہے۔ پس اگر یہ علت کلی ہوگی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مجتہد پر ایک کلیہ منکشف ہوگا جس سے بہت سی غیر معلوم جزئیات معلوم ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مجتہد کے لئے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوگی کہ اس نے کلیات کیوں بنالئے کیونکہ وہ کلیات بناتا نہیں بلکہ بتاتا ہے۔ بنے ہوئے تو وہ خود ہی موجود ہیں کیونکہ علم میں جتنا خفاء بڑھتا جائے گا اتنی ہی کلیت آتی جائے گی۔ پس مجتہد کا کمال یہ ہوگا کہ وہ ان خفیات کو نکال لے نہ یہ کہ کلیات کا پیش کرنا اس کے حق میں کوئی عیب اور نقص سمجھا جائے۔

انکشافِ علوم میں نبی اور اُمتی کا فرق

ہاں! اس موقع پر یہ فرق سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر تو بذریعۂ وحی اول علل و کلیات منکشف ہوتے ہیں اور پھر ان سے متعلقہ احکام کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی ان کے مصفی اذہان میں مقاصد و کلیات پہلے آتے ہیں اور ذرائع بعد میں کیونکہ ان کا تعلق ابتداءً ہی جاذبۂ حق کے ماتحت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ذات سے صفات کی طرف اور صفات سے افعال و احکام کی طرف آتے ہیں۔ لیکن مجتہدین اور امت کے محدثین کے روشن ضمیروں میں اوّل بذریعۂ درس و تدریس اور روایات کے احکامِ جزئیہ جمع ہوتے ہیں اور پھر علم و عمل کی مزاولت۔ تزکیۂ نفوس اور تصفیۂ قلوب کی برکت اور ہمہ وقت کے ذکر و فکر اور استمرارِ تفکر و تدبر سے عِلل کلیات کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ان کے لئے استنباط و قیاس اور اجتہاد کا دروازہ کھلتا ہے کیونکہ امتی کا تعلق ابتداءً ذاتِ حق سے نہیں ہوتا بلکہ نبیٔ وقت اور ان کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے احکام سامنے آتے ہیں ان پر پھر عمل کی برکت سے علوم و اسرار کا انکشاف ہوتا ہے **بفحوائے** حدیث:

من عمل بما علم ورّثہ اللہ علم مالم یعلم۔

”جس نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ اسے ایک ایسے علم کا وارث بناتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہ تھا“۔

اور اس علمِ وہبی سے بواسطۂ اسرار و کلیات صفاتِ حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تب کہیں ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ امت میں دین بحیثیت مجموعی پہلے تو مجتہدین اور راسخین فی العلم کے اذہان میں مرتب ہوتا ہے اور پھر وہ پوری ترتیب و تنظیم سے اس کی تشکیل کر کے اُمت کے سامنے رکھ دیتے ہیں جس سے دنیا کو دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور شریعت کا وہ یُسر واضح ہوتا ہے جس کے جگہ جگہ قرآن و حدیث میں دعاوی موجود ہیں۔

بہرحال کسی جزئیہ کے واسطے سے اس کلیہ کا سراغ لگانا اور پھر اس کلیہ کے نیچے دوسری جزئیات لانا اور اس مرتب سلسلہ کی درمیانی ترتیب اور رابطہ کا پہچان لینا فقیہ کا کام ہے۔ گویا فقیہ کبھی شاہد سے غائب کی طرف جاتا ہے جبکہ واضح جزئیہ سے اس کی مستور علت نکالتا ہے اور کبھی غائب سے شاہد کی طرف آتا ہے جبکہ

کلیات سے جزئیات کی طرف لوٹتا ہے اور یہ ایاب و ذہاب عوام اور علماء کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس لئے فقیہ مجتہد ان کی نگاہوں میں شریعت ذاتی رائے سے متصرّف دکھائی دیتا ہے۔ کوئی ناسمجھ اسے ازراہِ طعن قیاس کہتا ہے اور کوئی صاحبُ الرّائے وغیرہ حالانکہ اس کی یہ رائے اور قیاس عقلی محض نہیں ہوتا اور نہ محض قوّتِ فکریہ کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اسے تصرّفِ ذاتی کہا جائے بلکہ اس ذوقی قوت کا ثمرہ ہوتا ہے جو شریعت ہی کے علم و عمل کی مزاولت سے بطورِ جذبہ صادق اس کے قلب میں مِن اللہ تعالیٰ القاء کی جاتی ہے۔

پس وہ تصرّف خود شریعت ہی کا عینِ شریعت میں ہوتا ہے نہ کہ اس کا۔ مگر ہاں اس کا ظہور اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے تمام شرائع سماویہ کا ظہور محض مِن اللہ ہے۔ مگر ہوتا ہے نبی ہی کے لسان و قلب پر اور نہ یہ طعن کی چیز ہے نہ حیرت و تعجّب کی۔ انبیاءؑ کے بعد اُمّت میں محدّث بھی ہوتے ہیں جن کی خبر دی گئی انبیاء کو لسانِ شریعت میں متکلّم فرمایا گیا ہے ___ اور غیر انبیاء کو جو ان کشوفِ الٰہی اور علومِ تشریعی تک الہام کے ذریعہ پہنچائے جائیں اصطلاحِ شریعت میں محدِّث کہا گیا ہے۔ بہرحال ان محدّثین کے ذریعہ حکمِ شریعت اور اللہ کے درمیان تمام کلیاتی سلاسل منکشف ہوتے ہیں جس سے پوری شریعت کا رابطہ کلیات اور کلّی الکلیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کائناتِ خلق کی طرح عالمِ امر کا یہ پھیلاؤ بھی بے جوڑ نہیں بلکہ شریعت کا ہر ہر جزئیہ اپنے نوعی اصول و عِلل پھر بالائی جنس معروف و منکر پھر فوقانی جنس کی صفتِ الٰہی اور پھر جنسُ الاجناس عدل اور اس میں بھی بالائی محیط علم محیط اور اس سے اوپر لامحدود وجود یا جود سے سے ہوتا ہوا ذاتِ بابرکات سے مربوط ہو جاتا ہے گویا جیسے تکوین کی جزئیات زید، عمرو، بکر وغیرہ کا آخری مَرجع جسم و جوہر سے گزرتا ہوا وجود حق نکلا تھا۔ ایسے ہی تشریع کے تمام مسائل کا سرِمنشا بھی ان درمیانی انواع سے ہوتا ہوا وہی نکل آتا ہے اور تکوین و تشریع کا مبداء و معاد ذاتِ حق ٹھہر جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ابتدا میں ہم نے نقل کیا ہے نیز واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات آئینۂ جمالِ حق ہے جس میں اس کا فعلی ظہور ہے اسی طرح پوری شریعت آئینۂ کمالِ حق ہے جس میں اس کا قولی اور علمی ظہور ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

نصوصِ کتاب و سنّت کا ظہر و بطن

پس امر و نہی کے اس طویل سلسلہ میں سے امر و نہی یا حکمِ منصوص کا جان لینا کمالِ علم نہیں بلکہ اس سلسلہ میں سے اس جزئیہ کی فوقانی عِلل و کلیات اور پھر ان کی فوقانی شئون و صفات سے اس کا ربط اور کیفیتِ ارتباط کا پتہ چلا لینا اور اس حکم کی نِسبت اور کیفیتِ نسبت کا انکشاف کر لینا اس کی معروفیت و منکریّت کا درجہ معلوم کر کے صفت و نوعیت وجوب، فرضیت، سُنیت اور استحباب وغیرہ کی تعیین کرنا کمالِ علم ہے۔ جو صرف راسخین فی العلم اور دائرۂ علم کے اولُوالامر اصحاب کے حصہ میں آیا ہے۔

نصوص کے اسی سلسلہ حکم و حکمت یا معانیٔ جلیلہ اور مدلولاتِ خفیہ کو جس طرح عرض کردہ آیتِ شجرہ نے کلمۂ شریعت کو شجرہ سے تشبیہ دے کر پیش کیا تھا کہ جیسے شجرہ میں فروع و اصول ہوتے ہیں فروع نمایاں اور اصول مستور و مبطن اور فروع میں اصول ہی کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ گویا فروع درحقیقت مظاہرِ اصول ہوتے

ہیں جن کی صُور میں اصول کی قوی ظہور کرتی ہیں۔ اسی طرح ذیل کی احادیث ظہرو بطن سے تعبیر کررہی ہیں۔ قرآنی نصوص کے بارہ میں ارشادِ نبوی ہے :

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انزل القراٰن علیٰ سبعۃ احرف لکل اٰیۃ منہا ظہر وبطن ولکل حد مطلع۔

''ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ہر آیت کا ایک باطن اور ہر حد کے لئے طریقۂ اطلاع جداگانہ ہے۔ (یعنی مدلولِ ظاہری کے لئے علومِ عربیہ اور مدلولِ خفیہ کے لئے قوتِ فہمیہ)''۔

حدیث بالا میں ظہرِ آیت اور بطنِ آیت دونوں کے لئے ایک ایک مطلع کی خبر دی گئی ہے مطلع جھرو کے اور جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ جیسے جھروکوں اور جھانکنے کی جگہوں سے وہ تمام چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ان کے مقابل ہوتی اور ان کے وسیلہ سے معلوم ہوجاتی ہیں۔ ایسے ہی آیات کے ظواہر یعنی مدلولاتِ لفظی معلوم ہونے کے لئے جھروکہ عربیت ہے کہ کلامِ عرب کی اصناف اور اسالیب کلام پر عبُور ___ محاورات اور محاسنِ کلام سے واقفیت ہو۔ قواعدِ فصاحت وبلاغت زیرِ نظر ہوں۔ صیغ اداء اور ان کی تعریفات پر اطلاع ہو تو ان کی مدد سے آیتِ قرآنی کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے بشرطیکہ ذوقِ سلیم بھی سازگار ہو۔

لیکن بواطنِ آیت یعنی مدلولاتِ خفیہ اور احکام سرّیہ جو بطون در بطون کے پردوں میں مخفی ہیں۔ ان کے لئے مطلع اور جھروکہ بھی عِلل احکام ہیں جن پر مجتہد اپنے نورِ فہم اور ذوقِ اجتہاد سے وقوف حاصل کرتا ہے ان عِلل کے جھروکوں کے ذریعہ تمام وہ احکامِ خفیہ منکشف ہوجاتے ہیں جو ان عِلل کے بالمقابل ہوئے یعنی ان عِلل کے بالمقابل ہوئے ہیں یعنی ان عِلل کے معلولات ہوتے ہیں خواہ یہ عِلل قریبہ ہوں یا علل بعیدہ یعنی بطنِ آیت قریبی ہوں جیسے علتِ حکم یا بعید ہو جیسے کلیاتِ عامّہ یا اَبعد ہو جیسے صفاتِ حق جو عِللِ اصلی ہیں کیونکہ ثبوت حقوق اللہ یا حقوق العباد کی اصلی مقتضی یہ صفاتِ اِلٰہیہ ہی ہیں۔ جیسے خدا کی صفتِ ربوبیت وعظمت عبادت اور تعظیم کی خواستگار ہے۔ خدا کا بصیر ہونا بندہ سے حیاء اور ترکِ فحشاء کا مقتضی ہے اور خدا کا جمیل ہونا بندہ سے عشق ومحبت کا متقاضی ہے اور خدا کا مالک وملک ہونا بندہ سے انفاقِ مالی اور صدقات کا مطالب ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جو شخص بھی ان عِلل بعیدہ وقریبہ پر مطلع ہوگا وہی عالم اور حکیم کے لقب کا مستحق ہوگا اور اسی کو **وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا** کا حقیقی مصداق کہا جائے گا۔ بہرحال اس حدیث بالا میں علم کے اس مخفی مرتبہ کو بطنِ آیت سے اور اس آیت میں حکمت سے اور آیتِ شجرہ میں اقتضاء اصل (جز) سے تعبیر کیا گیا ہے پھر جس طرح علم کا یہ عمیق مرتبہ آیاتِ قرآنی میں پایا جاتا ہے' اسی طرح کلامِ نبوت میں بھی موجود ہے اور حدیث کا بھی ایک ظہر ہے اور ایک بطن کہ وہ بھی افصح البشر کا کلام ہے چنانچہ حدیث کے بارے میں خود صاحبِ حدیث ارشاد فرماتے ہیں :

عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نضّر اللہ عبداً سمع مقالتی فوعاھا واداھا فرُبّ حامل فقہ غیر فقیہ ورُبّ حامل فقہ الیٰ من ھو افقہ منہ۔

''ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : تر وتازہ فرماویں اللہ تعالیٰ اس بندے کو جو میری بات سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور

دوسرے کو پہنچادے کیونکہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں"۔

اس حدیث میں بعض شاگردوں کا استاذ سے افضل ہونا بیان فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ حرف ظاہری معنیٰ کے اعتبار سے شاگرد کے استاذ سے افضل واَفقہ ہونے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں اس لئے افضلیت کا معیار وہی بطن حدیث یعنی مدلولاتِ خفیہ اور اسرار وعلل نکل آتے ہیں جن کو فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس علمِ شریعت کے دو درجات ظاہر وباطن اس حدیث سے بھی واضح ہوئے۔ عبداللہ بن مسعودؓ صحابہؓ کی افضلیت تمام اُمت پر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کانوا افضل هٰذه الامّة ابرّها قلوباً واعمقها علماً واقلّها تکلّفاً۔

"صحابہؓ تمام امّت سے افضل تھے، سب سے زیادہ ان کے قلوب پاک تھے، سب سے زیادہ ان علم عمیق تھا اور سب سے کم ان کا تکلّف تھا"۔

اس سے واضح ہے کہ علم کا ایک درجہ عمیق اور گہرا بھی ہے جو علماء کے لئے معیارِ فضیلت ہے۔ چنانچہ اسی معیار سے صحابہؓ کو افضل فرمایا گیا اور یہ درجہ ہی بطن نص کا ہے جسے مدلولاتِ خفیہ اور اسرار وعلل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی علم کی بدولت علماء دقیقہ شناس اور نکتہ وَر بنتے ہیں اور اسی سے ان میں فضیلت کے مراتب قائم ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کو قرآنِ حکیم نے لفظ حکم سے تعبیر فرمایا ہے۔ گویا ایک حکمت ہے اور ایک اس کی اندرونی حکمت ہے۔

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔

"اور جسے حکمت دی گئی اسے خیرِ کثیر دی گئی"۔

پھر حدیثِ نبوی میں خیرِ کثیر کو جو یہاں حکمت کا ثمرہ ظاہر کی گئی ہے تفقہ کا ثمرہ کہا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

ومن یرد اللّٰہ بہٖ خیراً یفقہ فی الدّین۔

"جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا فقہ عطاء فرماتا ہے"۔

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکمت اور فقہ ایک ہی چیز ہے کہ ثمرہ دونوں کا ایک ہے۔ پس ایک فقیہ حکیمِ دین ہوتا ہے اور ایک حکیم اسلام فقیہ دین۔ بہرحال اس آیتِ کریمہ سے بھی علم کا یہ مستور اور خفی درجہ ثابت ہو گیا جو حکماء اسلام، فقہاء دین اور مجتہدین شرعِ متین کے ساتھ خاص ہے۔

علماء شریعت کے دو طبقات اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن

ظاہر ہے کہ جب علمُ النّص کے دو مراتب نکلے ایک ظاہر اور ایک باطن یا ایک مدلولِ جلی اور ایک مدلولِ خفی تو لامحالہ علماء نصوص کے بھی دو طبقات ہونے قدرتی تھے۔ ایک عالمِ جزئیات اور ایک عالمِ کلیات یا ایک عالم ظہر اور ایک عالمِ بطن یا ایک عالمِ حکم اور ایک عالمِ حکمت۔ یعنی ایک وہ کہ جس کی نگاہیں نص کے مدلول ظاہری تک رہ جائیں اور ایک وہ کہ جن کی عمیق نگاہیں اس ظاہری جزئیہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ چلالیں جس کے وسیع سلسلہ میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے منسلک ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی نظر علمِ کلی تک پہنچ گئی تو اس کا علم اسی ایک منصوصِ جزئیہ تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس علتِ جامعہ کے سبب ہزارہا وہ جزئیات بھی اس پر کُھل جانی ممکن ہوں گی جو اس منصوص جزئیہ کی طرح اس امرِ کلی کے عموم میں لپٹی ہوئی

بڑی تھیں۔ اس لئے یہ عالمِ جزئیات اگرچہ ہزار ہا جزئیات کا حامل ہو پھر بھی انصافاً عالم نہیں حافظ کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔ عالم اسے مجازاً ہی کہیں گے۔ ہاں جو شخص کلیات و جزئیات پر حاوی ہو، پھر ان کی باہمی نسبت اور کیفیتِ نسبت کا مدرک اور **مکتشف** اور پھر اس نسبت سے سیکڑوں نامعلوم جزئیات کا مستخرج ہوگا وہی حقیقی معنیٰ میں عالم کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

پس حافظِ آیات و نصوص محض راوی اور محدّث ہوتا ہے اور مدرکِ **مخفیات** و سرائر مجتہد اور محدّث ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کو ذیل کی حدیث میں یوں واضح فرمایا گیا ہے:۔

عن ابی موسٰی قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم مثلی ومثل ما بعثنی اللّٰہ بہ من الھدٰی والعلم کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضاً فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء وانبتت الکلاء والعشب الکثیر وکانت منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللّٰہ بھا النّاس فشربوا وسقوا وزرعوا واصاب منھا طائفۃ اخرٰی انّما ھی قیعان لا تمسک ماءً ولا تنبت کلاءً فذٰلک مثل من فقہ فی دین اللّٰہ ونفعہ بما بعثنی اللّٰہ بہ فعلم وعلّم ومثل من لم یرفع بذٰلک ولم یقبل ھدی اللّٰہ الّذی ارسلت بہ۔

”ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال اور میرے لائے ہوئے علم وہدایت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک موسلا دھار بارش زمین پر برسی تو زمین کا ایک حصہ تو نہایت عمدہ تھا جس نے پانی کو جذب کیا اور طرح طرح کے پھول پتے اور خشک و تر اُگایا اور ایک حصہ سخت تھا جس نے پانی تو جمع کر لیا (مگر گھاس وغیرہ اُگا نہیں سکا) تو اللہ نے اس زمین سے لوگوں کو پانی ہی کا نفع پہنچایا کہ انہوں نے پانی پیا بھی اور سیراب بھی ہوئے اور ان سے کھیتوں میں آبپاشی بھی کی اور ایک حصہ اور تھا جو بالکل چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو روکتا ہی تھا اور نہ گھاس پھونس اُگاتا ہی تھا۔ بس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور انہیں اس علم نے نفع دیا جسے لے کر میں مبعوث ہوا ہوں اور مثال ہے ان کی جو سرے ہی سے اس انتفاع کے درجہ کو نہ پہنچ سکے اور انہوں نے خدا کی وہ ہدایت ہی قبول نہیں کی جسے لے کر میں آیا تھا“۔

اس حدیث میں علم کو بارش سے اور قلوب بنی آدم کو زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لوگوں کی دو اقسام فرمائی گئیں ہیں۔ ایک دین سے منتفع اور ایک غیر منتفع۔ پھر منتفع کی دو اقسام ارشاد فرمائی گئیں۔ مُنبت اور غیر مُنبت یعنی ایک وہ کہ جنہوں نے علمِ وحی حاصل کر کے اسے اپنے قلوب میں بھرا، نفع کیا اور اس سے استنباط واجتہاد کے ذریعہ طرح طرح کے علوم ومعارف اور علل وحکم نکالے اور نکات واسرار بیان کئے پھر ان باطنی علوم کے ذریعہ سیکڑوں نامعلوم مسائل اُمت کے سامنے لا رکھے جس دین منقح اور مدوّن ہو کر ایک قانون کی صورت میں آگیا اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے علمِ وحی حاصل کر کے اپنے سینوں میں جمع کیا اور پوری امانت داری سے بلاکم وکاست دوسروں تک پہنچا دیا تاکہ ان میں جو بالغ نظر ہو وہ اس سے پھل پھول نکال سکے۔ پہلا طبقہ فقہاء مجتہدین اور علماء **راسخین** کا ہوا اور دوسرا محدّثین اور حفّاظ کا ہوا۔ محدّث اور حافظ کا کام حفظ وامانت اور بلاکم وکاست روایت ہے اور فقیہ مجتہد کا کام فہم اور تفقہ اور محققانہ درایت ہے کہ تخمِ علم کی

آبیاری کر کے دریا کو بصورتِ باغ وبہار دکھلا دے۔ اسی حدیث میں فکانت طیبۃ کے کلمہ سے مجتہد اور فقیہ محقق کی فضیلت بھی غیر مجتہد حافظ پر ظاہر فرمادی گئی جس کی وجہ بجز اس علمِ باطن کے اور کچھ نہیں۔

ان روایات سے علماء کے دو طبقات بھی واضح ہوئے۔ مجتہد اور غیر مجتہد اور ساتھ ہی فقیہ مجتہد کی غیر فقیہ و مجتہد پر یا راوی محض پر صاحبِ درایت وتفقّہ کی افضلیت بھی نمایاں ہوگئی جس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقیہ کلامِ الٰہی اور کلام نبوی ؐ کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتا ہے جو کتاب کے متعلق تبیاناً لکلّ شیئ سے اور حدیث کے متعلق اوتیت جوامع الکلم سے واشگاف فرمائی گئی ہے۔ گویا ایک فقیہ کے ذریعہ کلام وحی کی وجوہ اعجاز نمایاں اور فراہم ہوتی ہیں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور مقام ختم نبوت کی حقیقت اور رفعتِ شان کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

پس علمِ اولیٰ حفظ وروایت ہے اور علم حقیقی فقہ ودرایت اور اس لئے طبقاتِ علماء کے سلسلہ میں حافظِ حدیث یا اہلِ حدیث یا محدّث مبتدی ہے جو وحی کا مواد جمع کر کے ذخیرہ فراہم کرتا ہے اور فقیہ و مجتہد منتہی ہے جو اس ذخیرہ کی تہہ کی چیزیں نکال کر جسے فقہ کہتے ہیں ہمہ گیر جزئیات سے امّت کی تربیت کرتا ہے اور اس مواد سے مختلف صور کے دینی سامان بنا کر دین کو سجاتا اور امت کے حق میں اسے قابلِ استعمال بناتا ہے۔

صحابہ ؓ میں اہلِ علم کے دو طبقات

یہ دونوں طبقات حضراتِ صحابہ ؓ میں بھی موجود تھے۔ کوئی حافظ حدیث تھا' جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور کوئی فقیہ و مجتہد تھا جیسے عبادلہ ؓ اربعہ اور حضرات شیخین ؓ وغیرہ پھر فقہاء صحابہ ؓ میں بھی فرقِ مراتب تھا کہ بعض کی رسائی بہت گہری تھی اور بعض کی اس سے کم' چنانچہ صحاح کی مشہور روایت ہے:

عن عروۃ بن الزبیر قال سالت عائشۃ عن قولہ تعالی اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا قلتُ فواللّٰہ ما علیٰ احدٍ جناح ان لا یطوف بالصّفا والمروۃ فقالت بئس ما قلتَ یا ابن اختی ان ھذہ لو کانت علی ما اولتَھا کانت لا جناح علیہ ان لا یطوف بھما وفی الحدیث قال الزھری فاخبرتُ ابا بکر بن عبدالرّحمٰن فقال ان ھذا العلم ما کنتُ سمعتُہٗ۔

''عُروۃ ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارہ میں دریافت کیا ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ الخ'' اور میں نے کہا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ کا طواف نہ کرے تو اس کو گناہ نہ ہوگا (جیسا کہ ظاہر ترجمہ سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ گناہ نہیں ہے جو طواف کرے تو اس سے متبادر یہی ہے کہ طواف مباح ہے اگر نہ کرے تو بھی جائز ہے) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے بھانجے! تو نے بڑی غلط بات کہی اگر یہ آیت اس معنی کو مفید ہوتی جو تم سمجھے ہو تو عبارت یوں ہوتی لا جناح علیہ ان لا یطوف بھما یعنی طواف نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ زہری کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن عبدالرحمن کو اس کی خبر دی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ علم میں نہ سنا تھا''۔

اس سے واضح ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں فہم متفاوت ہوتے ہیں کوئی ظہر نص تک رہ جاتا ہے۔ کوئی

بطنِ نص تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں جو دقیقہ تھا باوجود یہ کہ وہ زیادہ خفی نہ تھا مگر حضرت عروہؓ اسے نہ سمجھ سکے اور حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں۔ بات چونکہ لطیف تھی اس لئے ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ نے سُن کر اس پر مسرّت ظاہر کی اور اسے علم کہا۔ اسی تفاوتِ فہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ :

رُبَّ حاملِ فقهٍ غیرُ فقیهٍ وربَّ حاملِ فقهٍ الی مَن هو افقهُ منهُ۔

"بعضے پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں"۔

مگر ساتھ ہی یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہئے کہ اس تفاوتِ افہام کے سلسلہ میں زیاہ فہم کا ہر درجہ معتبر نہیں یعنی ہر فہیم مجتہد یا فقیہ نہیں کہلایا جائے گا بلکہ اس بارہ میں فہم کا صرف وہی درجہ معتبر ہو گا جو معتدبہ ہو اور محض موہبتِ ربّانی ہو جو بطور علم لدُنّی قلب مجتہد میں القاء کیا گیا ہو یعنی جس طرح کائناتِ خلق کے سلسلے میں نہ ہر چھوٹے بڑے فہم کا آدمی موجد ہو سکتا ہے۔ نہ ہر دور میں موجدین کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ حق تعالیٰ کی حکمت جب کبھی تمدّن کے کسی خاص پہلو میں ترقی دیکھنا پسند کرتی ہے تو قرون ودُہور میں چند مخصوص دماغ منتخب کر کے ان سے ایجاد کا کام لیتی ہے اور وہ تمدّن کے ان گوشوں کو آراستہ کر دیتے ہیں جن کی زیبائش کی ضرورت تھی۔

اسی طرح کائناتِ امر کے سلسلہ میں نہ ہر فہیم وذہین مجتہد ہو سکتا ہے نہ ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے ہیں بلکہ حکمتِ ربّانی جب کبھی دین کے کسی مخفی گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتی ہے تو خاص خاص ذہنیت کے افراد پیدا کر کے ان کے قلوب میں ذوق اجتہاد ڈالتی ہے اور وہ اپنے اس خاص وہبی ذوق سے تدین کے ان پہلوؤں کو واضح اور صاف کر کے اور گویا بال کی کھال نکال کرامت کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ جن کے اظہار کی ضرورت تھی۔ فہم خاص یا ذوقِ اجتہاد کے اسی وہبی درجہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ارشاد فرماتے ہیں :

عن ابی حجیفه قال قلتُ لعلیٍ یا امیر المؤمنین هل عندکم من سوداء فی بیضاء لیس فی کتاب اللّٰه عزّوجل قال لا والّذی فلق الحبة وبرأ النسمة ما علمنا الأفهماً یعطیه اللّٰه رجلاً فی القرآن ۔ (رواہ البخاری والترمذی والنسائی)

"ابی حجیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس کچھ ایسے مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شگاف دیا اور جان کو پیدا کیا۔ ہمارے پاس کوئی علم ایسا نہیں۔ لیکن فہم خاص ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو قرآن میں عطاء فرمادیں"۔

ملکۂ اجتہاد وہبی ہے کسبی نہیں اور بعض اس کے اہل ہیں اور بعض نہیں

اس سے جہاں کتاب اللہ میں دقیق معانی کا ثبوت ہوتا ہے جنہیں غیر معمولی ہی فہم کا آدمی سمجھ سکتا ہے وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ فہم کوئی اکتسابی چیز یا فن نہیں ہے جسے محنت سے حاصل کر لیا جائے بلکہ ایک عطاء الٰہی ہے جو خاص خاص افرادِ امّت کو عطاء ہوتا ہے۔ بعینہٖ اس طرح جیسے رسالت ونبوّت کوئی فن نہیں کہ جس کا جی چاہے محنت کر کے نبی بن جائے۔ چنانچہ قرآن نے رسالت کے بارہ میں تو یہ ارشاد فرمایا کہ :

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھتا ہے"۔

اور اس قسم کے صاحبِ فہم یا صاحبِ علم اسرار و حقائق کے بارہ میں حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا:

وَعَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔

"اور ہم انہیں (خضر کو) اپنے پاس سے مخصوص علم دیا"۔

غرض دونوں امور کو یعنی علم نبوت اور علم حقیقت کو اپنی طرف منسوب فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ علم کا یہ مرتبہ اکتسابی نہیں بلکہ محض عطاءِ الٰہی اور موہبتِ ربانی ہے جس کے من اللہ ہی افراد کا انتخاب فرمایا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ علوی میں "یُعْطِیَہُ اللّٰہُ" اور "رَجُلًا" سے اسی طرف اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرنِ اوّل میں جب اجتہاد و قیاس اور استنباط کا دروازہ کھلا اور حضرات صحابہؓ نے نصوص نہ ہونے کی صورت میں اپنی رائے و قیاس پر عمل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں ہر ایک کی رائے کی تصویب و توثیق نہیں فرمائی۔ بعض کے اجتہاد کو قبول فرمایا اور بعض کے اجتہاد کو رد فرمادیا۔

گویا انہیں اجتہاد کا اہل اور مجتہد نہیں سمجھا کہ وہ اس فہم خاص کا وہ وہبی درجہ نہیں رکھتے تھے جس کی رو سے شرعیات میں صحیح حقیقت کو سمجھ کر استدلال کر سکیں۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خیر القرون میں ایک زخم زدہ شخص کو احتلام ہوگیا۔ ساتھیوں نے اسے غسل کرادیا وہ غسل کرتے ہی مرگیا۔ علم ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی رائے پر ناگواری کے اظہار کے ساتھ فرمایا کہ خدا انہیں قتل کرے اسے قتل کر ڈالا اور اس کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ تیمم کرلیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر مسح کرلیتا اور باقی بدن دھولیتا۔ ان لوگوں نے بظاہر غسلِ جنابت کی آیت وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا کو تو معذور اور غیر معذور کے حق میں عام سمجھا اور آیت تیمم مریض وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰی کو حدثِ اصغر کے ساتھ مخصوص سمجھ کر یہ فتویٰ دے دیا کہ اس جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں اور اس لئے اسے غسل کرنے پر مجبور کیا۔

یا مثلاً عدیؓ بن حاتم کے واقعہ میں جسے بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے قرآنی الفاظ خیطِ ابیض خیطِ اسود سے سفید و سیاہ ڈورے سمجھ کر تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور جب تک ان کی سفیدی و سیاہی ممتاز نہ ہو جاتی سحر کا کھانا کھاتے رہتے حالانکہ ان ڈوروں سے مراد رات اور دن تھے۔ پس باوجود اہلِ زبان ہونے کے چونکہ قوتِ اجتہادیہ نہ تھی اس لئے نفسِ مرادِ قرآنی تک کے سمجھنے میں غلطی کی چہ جائے کہ حقائق تک پہنچتے۔

تو ان کی رائے اور قیاس دین میں کس طرح سند ہو سکتا ہے تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برنگ مزاح انّ وسادتک لعریض (تمہارا تکیہ بڑا ہی لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے ابیض اور اسود یعنی رات اور دن آگئے) کے جملہ سے ان کے فہم پر رد فرمادیا۔ نیز پہلے عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کے بعض حاملِ فقہ خود غیر فقیہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر فقیہ کی رائے بھی دین میں معتبر نہیں ہو سکتی۔ پس حضورؐ کا بعض کے رائے و قیاس کو رد فرمادینا اس کی واضح دلیل ہے کہ نہ ہر ایک مجتہد ہوتا ہے اور نہ ہر ایک کی رائے اور قیاس پایۂ اعتبار کو پہنچ سکتا ہے جب تک کہ وہبی طور پر فہم و ذوق کا وہ خاص درجہ نہ پیدا ہو جائے جو شارع کی نظر میں متعین ہے۔ جب صحابہؓ میں یہ تقسیم ہو سکتی تھی تو آج کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کا فہم معتبر اور حدِ اجتہاد تک پہنچا ہوا تسلیم کیا جائے۔ آج بھی یہ تقسیم

لازمی ہوگی۔ پس اسی ذوقی نور اور علم خفیات وسرائر کی رسائی اور تصرف کو شرعی الفاظ میں کہیں بطن سے جیسے حدیث "لکل اٰیۃ ظھر و بطن" میں ہے کہیں فہم سے جیسے حدیث "الا فھماً یعطیہ اللہ" میں ہے۔ کہیں روایت ورائے سے جیسے حدیث "رایت فی ذلک الذی رای عمر" میں ہے۔ کہیں تفقہ سے جیسے حدیث "من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین" میں ہے

کہیں حکمت سے جیسے آیت "ومن یؤت الحکمۃ" میں ہے۔ کہیں فرقان سے جیسے آیت "اتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً" میں ہے۔ کہیں شرح صدر سے جیسے حدیث "فشرح اللہ صدری للذی شرح صدر عمر" میں ہے اور کہیں انبات سے جیسے حدیث "قبلت الماء وانبتت الکلاء" میں ہے۔ اور جامع عنوان کے ساتھ کہیں اجتہاد سے جیسے حدیث "المجتھد یخطی ویصیب" میں تعبیر کیا گیا ہے جس پر عام عرف شریعت میں یہی اجتہاد واستنباط کا عنوان غالب اور معروف ہوگیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اجتہاد ایک ملکہ اور فہم خاص کی ایک قوت اور علم کا ایک مخصوص وہبی درجہ ہے جس کی وساطت سے اس کے اہل نصوص کے دقیق اور خفی معانی اور احکام کے اسرار وعلل کو سمجھ کر ان پر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اور ان کے مقتضٰی پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

علم باطن ہی مورثِ طمانینت ہے

چنانچہ ظاہر ہے کہ علم کا یہ مرتبہ جس کا تعلق براہِ راست شرح صدر اور علم الٰہی سے ہے جس حد تک مورثِ طمانینت اور مسائل میں موجبِ اطمینان ہوسکتا ہے وہ اکتسابی درجہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جمع قرآن کے بارہ میں صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو مسلّمہ فقیہ ومجتہد ہیں استدلالی علم سے وہ طمانینت نہ ہوئی جو اس حالی علم سے میسّر آئی۔ زیدؓ بن ثابت کی روایت سے یہ دقیقہ کافی وضاحت کے ساتھ حل ہوتا ہے۔

عن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قال ارسل الی ابوبکر مقتل اھل الیمامۃ فاذا عمر جالس عندہ فقال ابوبکر ان عمر جاءنی فقال ان القتل قد استحر یوم القیامۃ بقرّاء القراٰن وانی اخشٰی ان یستحر القتل بالقرّاء فی کل المواطن فیذھب من القراٰن کثیر وانی ارٰی ان تامر بجمع القراٰن فقلت وکیف افعل مالم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عمر واللہ ھو خیر فلم یزل یراجعنی فی ذلک حتٰی شرح اللہ صدری للذی شرح لہ صدر عمر ورایت فی ذلک الذی رایٰ۔ (رواہ البخاری والترمذی)

"زیدؓ بن ثابت کی روایت ہے کہ زمانۂ جنگ یمامہ میں حضرت ابوبکرؓ نے میرے بلانے کے لئے آدمی بھیجا وہاں جاکر دیکھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے قصہ بیان فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے میرے پاس آکر یہ صلاح دی کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قرّاء قرآن کے کام آگئے۔ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح سب جگہ یہ لوگ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہوجائے گا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا امر فرمادیں۔ میں نے حضرت عمرؓ کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کس طرح کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا' واللہ یہ کام خیر محض ہے اور برابر اسی کو بار بار کہتے رہے حتیٰ کہ جس باب میں ان کو شرح صدر اور

اطمینان تھا مجھ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی بات مجھے محسوس ہوئی جو انہیں ہوئی تھی"۔

اس سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبرؓ کو اولاً جمع قرآن کی بدعت ہونے کا خیال تھا احادث ذم بدعت ان کے سامنے تھیں اس لئے انہیں جمع قرآن میں تردّد تھا۔ مگر جب استدلال سے گزر کر ان کے قلب میں باطنی علم منکشف ہوا کہ جمع قرآن کا یہ جزئیہ تحفظِ دین کے عام کلیہ کے ماتحت ہے اور ذمِ بدعت کے ماتحت نہیں آسکتا۔ تو شرح صدر کے ساتھ اس فعل کو کر گزرے اور آج تک دنیائے اسلام ان کے اس احسانِ عظیم سے مستفید ہو رہی ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ مجتہد کے لئے علم کا یہ خفی درجہ بعض اوقات جلی درجہ سے بھی زیادہ موجبِ طمانینت ہوتا ہے اور وہی اطمینانی کیفیات اس کے متبع افراد میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ وہ اس کا اتباع کریں۔

بہرحال اتنا واضح ہو گیا کہ امت کے لئے ایک درجہ علم خفی کا بھی پیغمبر نے وراثت میں چھوڑا ہے جو کلیات سے استخراج کے مسائل اور جزئیات سے استنباط دلائل کا ہے اور اس کے افراد مخصوص ہیں۔ نیز وہ ایسے مواقع کے لئے ہے کہ یا نص ہی موجود نہ ہو یا ہو مگر معانیٔ مختلفہ کو محتمل ہو یا متعینُ المحمل ہو۔ مگر یہ محمل دقیق اور غامض ہو یا محمل بھی واضح ہو مگر اس کی علتِ مستور ہو۔ جس کا انکشاف ہر فہم نہ کر سکتا ہو۔ تو ایسے مواقع میں بجز اجتہاد و استنباط کے چارۂ کار نہیں اور ضرورت تھی کہ امت کو اس فہم خاص کا رتبہ بھی عنایت ہو جو درحقیقت تشریع ہی کا ایک دقیق حصہ ہے اور جو علماء کے لئے **علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل** کے معزز اور بابرکت خطاب کے ماتحت ثابت کرتا ہے کہ علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کے سے کام کریں گے۔

اگر تبلیغ دین اور تربیتِ خلق کریں گے تو ایک عالم خطوں کو رنگ دے گا اور ہزاروں کو دائرہ اسلام میں داخل کردے گا ان میں دینی رنگ پیدا کردے گا۔ تعلیم مسائل پر آئیں گے تو انبیاء جو امورِ وحی سے کہتے تھے یہ بالہامِ الٰہی وحی سے استنباط کر کے کہیں گے یعنی احکامِ **تکلیفیہ** کی طرح احکامِ **وضعیہ** امت کے سامنے لا رکھیں گے اور یہ صورت بغیر اجتہاد و قیاس کے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے امت میں یہ علمِ غامض القاء کیا گیا اور قرنِ اوّل ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

صحابہؓ میں اہلِ اجتہاد

چنانچہ جب ان لوگوں کا اجتہاد سامنے آیا جو اس کے اہل تھے اور تشریع کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے تو حضورؐ نے بھی ان کے اجتہاد و استنباط کی تحسین فرمائی۔ چنانچہ نص سامنے نہ ہونے کی صورت میں عمومات اور کلیات سے استدلال کرتے ہوئے جو رائے پر عمل کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی اس کی مثال یہ ہے کہ:

> **عن طارقؓ ان رجلاً اجنب فلم یصل فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکر لہ ذلک فقال اصبت ــــ فاجنب اخر فتیمم وصلی فاتاہ فقال نحوما قال للآخر یعنی اصبت۔**

"حضرت طارقؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو نہانے کی حاجت ہو گئی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا اور اس قصہ کا ذکر

کیا۔ آپ نے فرمایا تونے ٹھیک کیا۔ پھر ایک دوسرے شخص کو اسی طرح نہانے کی حاجت ہوئی اس نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ پھر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کو بھی ویسی ہی بات فرمائی ___ جو ایک شخص سے فرما چکے تھے یعنی تونے بھی ٹھیک کیا"۔

اس حدیث سے اجتہاد و قیاس کا جواز صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر ان کو نص کی اطلاع ہوتی تو پھر بعد عمل کے سوال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے اپنے اپنے قیاس واجتہاد پر عمل کر کے حضور کو اطلاع دی اور آپ نے دونوں کی تصویب و تحسین فرمائی اور ظاہر ہے کہ شارع علیہ السلام کی تقریر یعنی کسی چیز کو سُن کر ردّ نہ فرمانا بلکہ صراحۃً اس کی تصویب فرمادینا اس کی مشروعیّت کی واضح دلیل ہے اس لئے نصِ صریح نہ ہونے کی صورت میں جوازِ اجتہاد و قیاس میں کوئی شبہ نہ رہا۔

اسی طرح بروایتِ ابوداؤد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوۂ ذات السّلاسل کے موقعہ پر سردیوں کی ایک رات میں جان کے خوف سے بحالتِ جنابت بجائے غسل کے تیمّم سے نماز پڑھا دی اور حضور کے استفسار پر عرض کیا کہ میں نے اللہ کے اس قول پر عمل کیا :

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔

"اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو"۔

حضور نے مسکرا کر سکوت اختیار فرمایا۔ جس سے واضح ہے کہ نص صریح نہ ہونے کی صورت میں رائے پر عمل کرنا عمومات و کلیات سے استدلال کرنا یعنی اجتہاد سے کام لینا خلاف حدیث نہیں ورنہ حضور نکیر فرماتے کہ تم لوگ دین میں رائے اور قیاس کو کیوں دخل دیتے ہو۔ یا نص تو موجود مگر محتمل الوجود ہو تو اجتہاد سے کسی ایک وجہ کا تعیّن کر کے اس پر عمل کرنا بھی خلاف نص یا خلافِ حدیث نہیں۔ چنانچہ حدیث ذیل اس پر شاہد ہے۔

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاحزاب لا یصلّین احد العصر الا فی بنی قریظۃ فادرک بعضھم العصر فی الطریق فقال بعضھم لا نصلّی حتی نأتیھا وقال بعضھم بل نصلّی لم یرد ذٰلک فذکر ذٰلک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یضعف واحدا۔

"ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر صحابہؓ سے فرمایا کہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچنے سے ادھر کوئی نہ پڑھے۔ بعض صحابہؓ کو راہ میں عصر کا وقت آگیا تو باہم رائے مختلف ہوئی۔ بعض نے تو کہا کہ ہم نماز نہیں پڑھیں گے یہاں تک کہ ہم بنی قریظہ پہنچ جائیں اور بعض نے کہا کہ ہم نماز پڑھیں گے حضور کے ارشاد کا مطلب تاخیرِ صلوٰۃ نہیں تھا بلکہ مقصود تاکید تھی کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرو، پھر یہ قصہ آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ نے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی"۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بعض نے اپنی قوّتِ اجتہادیہ سے قول رسول کی اصلی غرض کو سمجھ کر، جو کہ نص کی ایک محتمل وجہ تھی نماز پڑھ لی مگر آپ نے ان پر ملامت نہیں فرمائی کہ تم نے حدیث کے ظاہر الفاظ کے خلاف کیوں عمل کیا؟ یعنی ان کو عمل بالحدیث کا تارک قرار نہیں دیا یا نص صریح بھی موجود ہو اور اس کا محمل

بھی متعین ہو مگر مجتہد اس حکم کو کسی علت سے معلول سمجھ کر علتِ باطنیہ پر عمل کرے اور ظاہر نص کو ترک کردے تو یہ بھی خلافِ حدیث نہیں۔ چنانچہ حدیث انسؓ اس پر شاہد عدل ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ ان رجلا کان یتھم بام ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لعلیؓ اذھب فاضرب عنقہ فاتاہ فاذا ھو فی رکیّ یبرّد فقال اخرج فناولہ یدہ فاخرجہ فاذا ھو مجبوب لیس لہ ذکر فکف عنہ واخبر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فحسن فعلہ (زاد فی روایۃ) وقال یری الشاھد مالا یرے الغائب۔

"انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک لونڈی ام ولد سے مُتّہم تھا آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اس کی گردن ماردو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس آئے تو اس کو دیکھا کہ وہ ایک کنویں میں اُترا ہوا بدن ٹھنڈا کررہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا باہر نکل۔ اس نے اپنا ہاتھ دیدیا۔ آپؓ نے اس کو نکالا تو مقطوع الذّکر نظر پڑا۔ آپؓ اس کی سزا سے رُک گئے اور حضورؐ کو اس کی خبر دی۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کے اس فعل کو مستحسن فرمایا (اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے) کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پاس والا ایسی بات دیکھ سکتا ہے جو دُور والا نہیں دیکھ سکتا"۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اور صاف حکم موجود تھا مگر حضرت علیؓ نے اپنے ذوقِ اجتہاد سے اسے ایک علت سے معلول سمجھا اور جب علت کا وجود نہ پایا تو حکم سزا بھی جاری نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا یہ عمل ظاہر اطلاق حدیث کے خلاف تھا۔ اس سے واضح ہے کہ حدیث کی لم اور علت حکم سمجھ کر اس کے موافق عمل کرنا اور الفاظِ حدیث کے ظاہر کو ترک کردینا' خلاف حدیث نہیں بلکہ وہ عمل بالحدیث ہے مگر بطن حدیث پر ہے جو خود حدیث سے ثابت شدہ چیز ہے۔ اس کی نظیر یہ بھی ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو بشارت دی کہ جو بھی صدقِ دل سے کلمۂ طیبہ پڑھ لے گا وہ نارِ جہنم پر حرام ہوجائے گا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں لوگوں کو اس کی بشارتِ عام نہ دیدوں؟ فرمایا نہیں' لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل چھوڑ دیں گے)۔

اس ممانعتِ تبشیر میں کسی زمانہ کی قید نہ تھی مگر حضرت معاذؓ نے اپنے نورِ اجتہاد سے دوسرے دلائلِ کلیہ پر نظر کرکے اس ممانعت کو اس زمانہ کے ساتھ مقید سمجھا' جس میں اس پر بھروسہ کر بیٹھنے کا احتمال باقی رہے اور وفات کے وقت جب کہ وہ زمانہ ان کے زعم میں باقی نہیں رہا تھا اس بشارت کا اعلان عام کردیا۔

یا مثلاً (براویت مسلم) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے فرمایا کہ ایک لونڈی کو جس نے بدکاری کی تھی حضورؐ نے درے مارنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زچہ تھی۔ اس لئے درے نہ لگائے کہ کہیں مرنہ جائے۔ حضورؐ نے اس فعل کی تحسین فرمائی۔ اس سے واضح ہے کہ صحابہؓ نصوص کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کو مذموم نہ جانتے تھے ورنہ ظواہر احکام کو مقصود جان کر ان باطنی عِلل اور علومِ کلیہ سے بحث ہی نہ فرماتے۔ چہ جائیکہ ان بواطن پر عمل کرتے۔ یہ نظائر اس پر شاہد عدل ہیں کہ اگر مجتہد اپنی قوتِ اجتہادیہ سے کسی حدیث کے مدلولِ ظاہری کے خلاف یعنی اس بالاتر کوئی دقیق معنیٰ سمجھ جائے جس تک عوام علماء کی رسائی نہ ہو تو اس پر عمل جائز ہے۔

اُمّت میں اگر اجتہاد ضروری ہے تو تقلید بھی ضروری ہے

بہرحال جب یہ واضح ہوگیا کہ دین میں نص نہ ہونے یا متعیّنُ الوجہ نہ ہونے یا غیر معلول نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد و قیاس جائز ہے اور اس کے لئے افراد من اللہ منتخب اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہر ایک اس کا اہل نہیں اور وہ بتصدیقِ پیغمبر حجتِ شرعیّہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیر اہلِ اجتہاد یعنی غیر مجتہد کے لئے بجز اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت اور پیروی کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اِتباع کرے خود ان مخفی دلائل اور عِلل تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو دانایانِ اسرار و عِلل کے سامنے جھک جائے۔ کیونکہ مراتبِ علم کے دو ہی ہیں یا خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی دو مراتب بِلا کسی واسطہ کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ قیامت کے دن کُفّار اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل والوں کی سنی۔

وَقَالُوْا لَوْكُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَاكُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ۔

"اور کہیں گے کُفّار اے کاش ہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے"۔

بس یہی درجہ سمع و طاعت جو علم والے کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقّق کے سامنے ایک غیر محقّق عمل میں لاتا ہے۔ تقلید کہلاتا ہے جو فی نفسہٖ بھی اور بضرورتِ اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام اور غیر اہلانِ اجتہاد کے حق میں اب بھی اہلِ اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو اجتہاد کا حجتِ شرعیّہ ہونا لغو ہو جائے اور اس آیت کے کوئی معنیٰ ہی باقی نہ رہیں کہ :

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

"اگر تم لاعلم ہو تو علم والوں سے سوال کرو"۔

اور اس حدیث کا کوئی مِصداق ہی باقی نہ رہے کہ :

الم یکن شفاء العیّ السوال (رواہ ابوداؤد عن ابن عباسؓ)

"کیا عاجز کی شفاء سوال نہیں ہے؟"

پس اگر اجتہاد بنصِ حدیث شرعی چیز ہے اور غیر مجتہد بنصِ حدیث دنیا میں موجود ہیں کہ قرنِ اوّل تک میں موجود تھے۔ ادھر غیر مجتہد کا علاج و شفاء بنص حدیث سوال و تعمیل ہے تو غیر مجتہد کے لئے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارۂ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے تقلید کے بارہ میں حضورؐ کا ارشاد مستقلاً موجود ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من افتیٰ بغیر علم کان اثمہ علیٰ من افتاہ ۔ (الحدیث) (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص کو بے تحقیق کوئی فتویٰ دیدے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے کو ہوگا"۔

ظاہر ہے کہ اگر تقلید جائز نہ ہوتی اور کسی کے فتوی پر بدونِ معرفتِ دلیل کے عمل جائز نہ ہوتا جو حاصل تقلید کا ہے تو گنہگار ہونے میں مفتی ہی کی کیا تخصیص تھی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی

طرح سائل کو دلیل تحقیق نہ کرنے اور بلا تحقیق عمل کرنے کا گناہ ہوتا۔ پس جبکہ شارع علیہ السلام نے سائل کو باوجود تحقیق دلیل نہ کرنے کے عاصی نہیں ٹھہرادیا تو جوازِ تقلید بلاشبہ ثابت ہو گیا۔

صحابہؓ میں بھی تقلید رائج تھی

چنانچہ حضراتِ صحابہؓ میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد، مجتہد کے فتویٰ پر بلا تحقیقِ دلیل محض اس حسنِ ظن کی بنا پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے اور بلا دلیل فتویٰ نہیں دے رہا ہے۔

عن سالم سئل ابنؓ عمرؓ عن رجل یکون له الدین علی رجل الی اجل فیضع عنه صاحب الحق لیعجل الدین فکره ذلک ونهی عنه - (مؤطا امام مالکؒ)

"حضرت سالمؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابنؓ عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے شخص پر کچھ دَین معیادی واجب ہے اور صاحبِ حق اس میں سے کسی قدر اس شرط سے معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دَین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا"۔

چونکہ اس مسئلہ جزئیہ میں کوئی حدیثِ مرفوع صریح منقول نہیں۔ اس لئے یہ ابن عمرؓ کا قیاس ہے اور چونکہ سائل نے دلیل نہیں پوچھی اس لئے اس کا قبول کرنا تقلید ہے۔ نیز ابن عمرؓ کا دلیل بیان نہ کرنا خود تقلید کو جائز رکھنا ہے۔ اس لئے ابن عمرؓ کے فعل سے قیاس و تقلید دونوں کا جواز ثابت ہو گیا۔

اسی طرح بروایتِ مالکؒ حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دیدیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کردے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرما کر منع فرمادیا اور فرمادیا کہ باربرداری کا کرایہ کہاں گیا؟

چونکہ اس بارہ میں بھی کوئی صریح حدیث مرفوع مروی نہیں لہٰذا حضرت عمرؓ کا یہ جواب قیاس سے تھا اور چونکہ جواب کا ماخذ نہ آپؓ نے بیان فرمایا نہ سائل نے پوچھا بدونِ دریافتِ دلیل قبول کرلیا تو یہی تقلید تھی۔ پس جوازِ قیاس و تقلید حضرت عمرؓ کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اسی طرح بروایتِ مالکؒ ابو ایوب انصاریؓ حج کے لئے نکلے۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہو گئیں اور حج کا وقت نکل جانے پر پہنچے۔ حضرت عمرؓ سے سارا قصہ بیان کر کے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ افعالِ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسّر شدہ قربانی دیدو۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہؓ اجتہاد نہ کرسکتے تھے وہ مجتہدین صحابہؓ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے حضرت عمرؓ سے صرف حکم سُن لیا اور دلیل کی تحقیق نہیں کی جو تقلید کا حاصل ہے۔ یہ ہی صورت تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے جیسا کہ کتبِ احادیث سے مزاولت رکھنے والے جانتے ہیں۔

اس سے صاف واضح ہے کہ قرونِ خیر میں اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد و اشخاص الگ الگ تھے۔ یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کے لئے اجتہاد جائز نہیں تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس و ناکس کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہیں۔

اجتہاد و تقلید کی حدود

نیز اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ شریعت نے امّت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی جس سے واضح ہے کہ شریعت نہ تو اجتہادِ بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد اور یہی اس کی جامعیّت اور عدل واعتدال کا تقاضی بھی ہے ورنہ اجتہادِ بلا تقلید افراط تھا اور تقلید بلا اجتہاد تفریط تھی۔ عدل کا مقتضٰی یہی تھا کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حُدود میں۔ پھر ساتھ ہی اس اجتہاد و تقلید کا شریعت ایک نظم بھی چاہتی ہے کہ مقلّدین کی اکثریت مجتہدین کی مطیع رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام چونکہ کمالِ اعتدال اور جامعیّت کی شان رکھتی ہے اور اسی لئے یہ امت بھی اَعدلُ الاُمم اور جامع اقوام ہے۔ جس کا لقب ہی قرآنی زبان میں اُمّتِ وسط ہے۔ اس لئے منشاءِ شریعت یہ ہے کہ امّت میں ہر ایک کام جامعیّت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور یہ اجتماعیّت نظام لئے ہوئے ہو۔ خواہ وہ نظام سیاسی ہو۔ خواہ دینی اس انداز کا ہو کہ نہ اس میں تشتّت اور پراگندگی ہو جو بد نظمی ہے اور نہ جمود واستبداد ہو جو اجتماعیّت اور جمہوریت کے منافی ہے۔ اس لئے اس نے اُمّت کے سیاسی اور دینی دونوں نظامات میں یہی معتدل صورت قائم کی ہے۔ مثلاً امّت کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تاکہ قوم میں فوضویت اور لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندگی اور بد نظمی کی روح ہے۔ اس سے تو حکومت میں شخصیت قائم ہوئی۔

ادھر اس امارت کے لئے شوریٰ لازم قرار دیا تاکہ امیر میں استبداد بھی نہ پیدا ہو سکے اور قوم کے اجتماعی فکر کے قُویٰ معطّل اور بے کار نہ ہوں۔ اس صورت سے قوم میں جمہوریت باقی رہے۔ پس اسلامی امارت میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطّل اور بے کار بنادے اور عوام بھی اس پر حکومت کرنے لگیں۔

پس امیر کی شخصیت اور آمریّت سے تو قوم کی طوائفُ الملوکی اور پراگندگی دفع کی اور قوم کی شورائی تشکیل سے امیر کے استبداد کی روک تھام کردی۔ اس طرح شخصیت اور جمہوریت دونوں کو ایک معتدل درجہ کے ساتھ امّت کے سیاسی نظام میں شامل کردیا گیا۔ یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کرلئے گئے جو کمالِ اعتدال ہے۔ ٹھیک اسی طرح امّت کے دینی نظام میں شریعت نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام افکار کو اس درجہ آزاد چھوڑا کہ امّت کا ہر شخص مجتہد ہو اور کتاب وسنت میں ہر کس و ناکس کے آراء وقیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس امّت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس قُویٰ فکر واجتہاد سرے ہی سے معطّل ہوجائیں بلکہ ایک طرف تو جنسِ اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسبِ اقتضاء زمانہ آتی اور مختتم ہوتی رہیں گی تاکہ امّت کے قُویٰ فکر و تدبّر سُست نہ ہونے پائیں۔

اور ایک طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عامی اور ناواقف اپنی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے دین ہی کو آراء وقیاسات کا مجموعہ نہ بنادے اور اس طرح دین میں تشتّت وپراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں۔

پس امّت کے علمی تشتّت کو تقلیدی سمع وطاعت نے رفع کردیا اور تقلیدی جُمود کو شانِ اجتہاد و تحقیق سے دفع کیا۔ اس طرح اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے بچاکر امّت کو درمیان کے معتدل نقطہ پر قائم فرمادیا جس میں نافع پہلو سب قائم ہیں۔ چنانچہ امّت اگر مقلّد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اُسوۂ سلَف کی اس مقلّد بھی۔ غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شانِ تحقیق نمایاں ہے۔ اس لئے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس

سے جنسِ اجتہاد کی تردید ہی کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید ہی پر رد و انکار کوئی خوبی قرار دی جا سکتی ہے۔

اجتہاد کی ایک نوع ختم ہو چکی ہے اور اس کی واضح دلیل

باقی یہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اجتہاد کی وہ نوع جو استنباطِ عِلل اور اجتہاد فی الدین سے تعلق رکھتی ہے آج اس لئے نہیں پائی جاتی کہ اس کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ائمہ نے اسے اس حد تک مکمل کر دیا ہے کہ آئندہ اس سے نفع اٹھانے کی صورت تو باقی رہ جاتی ہے لیکن اس میں مزید تلاش و تحقیق کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی اصول ہے کہ جو مقصد دنیا میں مکمل ہو جاتا ہے اس کی متعلقہ قوت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ دین کی بنیادیں دو ہی ستونوں پر قائم تھیں۔ روایت اور درایت ___ روایت کا تعلق حافظہ سے ہے اور درایت کا تعلق فہم سے۔ اوئل اسلام میں جب کہ اسلام کا روایتی حصہ مکمل ہو رہا تھا' اللہ تعالیٰ نے محدثین کو جو مخصوص حافظہ عطاء فرمایا کہ آج اسے بجز کرامت اور خرقِ عادت کے کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا' ایک ایک محدث کو لاکھوں کی تعداد میں احادیث یاد ہوتی تھیں اور نہ صرف متونِ حدیث بلکہ مع اسانید و رجال اور نہ صرف رجال کے اسماء بلکہ ان کی سوانح اور صفات بھی اَزبر ہوتی تھیں جیسا کہ کتبِ طبقات سے واضح ہے۔ انہی سینوں سے وہ سفینے مدوّن ہوئے جو آج کتبِ حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

جب دین سینوں کے ذریعہ سے سفینوں میں منضبط ہو گیا اور محض حفظ پر مدار نہ رہا تو قوتِ حافظہ قدرتی عوامل کے ماتحت گھٹنی شروع ہوئی اور آج اس حد پر آ گئی کہ اگر ہم روزانہ کی معاشرتی زندگی میں نوٹ بک اور ڈائری جیبوں میں نہ رکھیں تو کاروبار صفر ہو جائے۔

پس جس حد تک اس محیر العقول قوتِ حافظہ کا کام پورا ہو گیا جو اس امت کو بطورِ اعجاز کے دی گئی تھی تو قوت کی وہ نوع بھی قدرتی طور پر ختم ہو گئی۔ گو جنسِ حافظہ آج بھی موجود ہے جس کی باقی ماندہ نوعیت مناسب وقت کام کر رہی ہے۔

دورِ روایت کے بعد اسی طرح جب کہ اسلام کا درایتی حصہ مکمل ہونا شروع ہوا اور روایات سے دین کو استنباط کر کے مبوّب اور مفصّل کرنے کی نوبت آئی تو حق تعالیٰ نے اس امت میں وہ اربابِ درایت و فقہ اور ائمۂ اجتہاد پیدا کئے کہ ان کے مصفّیٰ اذہان کا سرعتِ انتقال و نفوذ ان کے حیرتناک استنباطات اور ان کے فقہ نفس کے عجائبات بھی خرقِ عادت ہی کی صورت سے دنیا میں ظاہر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مسائل ہی مستنبط کئے بلکہ وجوہِ استنباط بھی علیٰ وجہِ البصیرۃ ظاہر کیں۔ کیفیتِ استنباط پر بھی روشنی ڈالی۔ پوری شریعت کی جزئیات کا ان کی کلیات سے ارتباط بھی معلوم کیا اور اس ربط کے واسطہ سے ہزاروں نئے مسائل کلیات سے اور ہزارہا عِلل کلیہ جزئیات سے استخراج کیں جس سے پوری شریعت شاخ در شاخ ہو کر ایک ہی شجرہ اور متصل واحد شئے دکھائی دینے لگی اور یہ سب کچھ اس شان سے ہوا کہ اربابِ فہم آج ان حضرات کی رسائی فہم پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے ان کا کوئی اکتسابی کارنامہ نہیں بلکہ محض وہبی عمل کہنے پر مجبور ہیں جس کے لئے خدا نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔

جب دین کا یہ فقہ اپنی مکمل صورت میں آ گیا۔ امہاتِ مسائل حقیقی تنقیح کے بعد باب وار مرتب ہو گئے اور ائمۂ فقہ کے سینوں سے نکل کر سفینوں میں مدوّن بھی ہو گئے تو ان ہی قدرتی عوامل کے ماتحت وہ خاص

قوتِ فہم بھی کم ہونی شروع ہوگئی کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور رفتہ رفتہ زمانہ آج اس درجہ پر پہنچ گیا کہ جدید استنباط تو بجائے خود ہے مستنبط شدہ مسائل کے خفی رشتہ کو جو متعلقہ کلیات سے قائم ہے بلکہ جزئیات و کلیات کے سلسلہ کے تسلسل اور صورت اِنسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا عامہ خلائق میں فہم باقی نہیں رہا ہے۔ اس لئے اجتہاد کی وہ نوع بھی باقی نہیں جس کا تعلق استخراج علل و استنباط مسائل سے تھا کہ یہ ضرورت زمانہ نے پوری کر کے ختم کر دی اور اس بناء پر وہ قوت بھی مضمحل ہوگئی۔

ختم شدہ اجتہاد کے استعمال کے نتائجِ بد

اس فقدانِ قوت کے بعد بھی اگر مدعیانِ زمانہ کو اجتہاد کی اس نوع میں آزادی مل جائے جس کے لئے لوگ تڑپتے ہیں تو قطع نظر استنباطِ مسائل کی ضرورت وعدم ضرورت کے فسادِ مذاق، غلبہ ہوا و ہوس اور جذبۂ خود مختاری کے ماتحت ہر ایک فاضل، ہر ایک گریجویٹ، ہر ایک وکیل، ہر ایک بیرسٹر، ہر ایک ایڈیٹر جو چند پیسوں میں لوگوں کا کچھ وقت خرید سکتا ہے بلکہ ہر ایک خواندہ ناخواندہ مجتہدِ عصر ہوگا اور اجتہادات کے ایسے ایسے انوکھے نمونے دنیا کے سامنے آئیں گے کہ اسلام کی اصلی شکل پہچاننی بھی مشکل ہو جائے گی۔

چنانچہ حسب مضمون "الاقتصاد" ایک شخص کہے گا کہ جس طرح سابق مجتہدین نے نصوص کو کسی علت سے معلول سمجھا اور بسا اوقات ظاہر نص کو چھوڑ کر باطنی علت پر عمل کیا اور کرایا، مجھے بھی اس کا حق ہے لہٰذا میرے نزدیک مثلاً وضو کا حکم معلل ہے جس کی علت یہ تھی کہ عرب کے اکثر لوگ اونٹ، بکریاں چراتے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر ان جانوروں کے بول و براز کی چھینٹوں سے آلودہ ہو جاتے تھے وہی ہاتھ منہ پر بھی لگ جاتا تھا اس لئے ان کو وضو کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے اعضاء وضو وہی رکھے گئے جن کی آلودگی عادتاً اکثر و بیشتر تھی۔ لیکن ہم ضروریات تمدن کے ماتحت روزانہ غسل کرتے ہیں، محفوظ مکانوں میں کرسی نشین رہتے ہیں اور وہ آلودگی کی علت ہم میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا وضو ہم پر واجب نہیں۔ ایک کہے گا کہ مثلاً نکاح میں شہود اور اعلانِ نکاح فی نفسہٖ ضروری نہیں بلکہ اس علت سے تھا کہ زوجین میں اختلاف و نزاع کے وقت تحقیقِ حال میں سہولت ہو۔

پس جہاں اس کا احتمال نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ آج کہا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی عِلل و اسرار دین کے ہوں گے اور ان ہی عِلل پر احکام مبنی ہوں گے تو ان مجتہدینِ عصر کی بدولت غریب اسلام کو تو منہ چھپانے کی بھی جگہ نہ ملے گی کیونکہ اس کا انجام احکام کی تحریف، اجماع کی مخالفت و تخریب، نصوص کی تبدیلی اور اصلی اسلام کا انہدام ہے۔ یہ آج کے اجتہادات کے عُریاں نمونے ہیں جنہیں ہر شخص ادنیٰ تأمل سے پہچان سکتا ہے اور بعض نمونے علمی رنگ کے ہوں گے جن کے اہمال کو خواص پہچان سکیں گے مگر اس قسم کے اجتہادی مفاسد پیش آنے کی وجہ وہی ہے کہ تکوینی طور پر وہ استخراجِ عِلل کی قوت تو بوجہِ انقضاء ضرورت کے ختم ہو چکی ہے اور یہ اس کے علم کہ کون حکم معلل ہے علت کے ساتھ اور کون تعبدی ہے جس قوت پر فہم پر مبنی تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس اِدعاء اور اوپر سے استعمال ایسے ہی نتائج پیدا کرے گا جو تمثیلاً عرض کئے گئے۔ ہاں اس خاص نوع کو چھوڑ کر جس نوع کے پردہ میں آج بھی جنس اجتہاد باقی ہے وہ عام تحقیق و تلاش کتاب و سنت میں تدبر، ان کے لطائف، دقائق کا استخراج، ہر زمانے کے تکوینی حوادث سے تشریعی مسائل کو تطبیق دے کر مناسب فتویٰ دینا۔ معاندین اسلام کے نئے نئے شکوک و شبہات کی تردیدات نصوص سے استنباط کرنا، اصول اسلام کے اثبات و تحقیق کے لئے کتاب و سنت سے

مؤیدات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ ہے۔ اجتہاد کی یہ نوع کل بھی تھی ور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی کہ قرآن کی شان لا تنقضی عجائبہ فرمائی گئی ہے جس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں۔

پس جس طرح کتُبِ روایت میں آج کسی جدید چھان بین اور رُواۃ پر نئی جرح اور تعدیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ حسبِ ضرورت صرف آئمۂ فن سے ان کی عرق ریزیوں کا ثمرہ پیش کر دینا کافی حجت ہے ورنہ تحصیلِ حاصل ہو گی۔ اس طرح کتبِ درایت میں بھی آج پھر سے اجتہاد کی ضرورت نہیں رہی جو کیا جا چکا ہے۔ بلکہ حسبِ ضرورت آئمۂ درایت سے ان کی کاوشوں کے ثمرات کا نقل کر دینا اور اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔ وہاں ہم روایت میں تقلیدِ ائمہ پر مجبور ہیں۔ یہاں درایت میں مجبور ہیں۔ گویا نہ نئی حدیث کی ضرورت ہے نہ نئے فقہ کی۔ محدّثین نے کوئی روایت نہیں چھوڑی جس کا صحت و سُقم کھول کر نہ رکھ دیا ہو۔ فقہاء نے کوئی درایتی احتمال اور بعید سے بعید صورت عمل ایسی باقی نہیں چھوڑی جس کو نکھار کر بدلائل سامنے نہ رکھ دیا ہو اور کسی جویائے عمل کے لئے تشنگی کی کوئی ادنیٰ صورت بھی باقی رہ گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نئے سے نئے مسائل پیش آئے اور آرہے ہیں مگر مفتیین کو فتاویٰ کے لئے اب تک کسی جدید فقہ مرتّب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اسی فقہ سے جو ایک لاء اور قانون کی صورت میں مدوّن ہے اور ان ہی اصول سے جس کے ماتحت یہ فقہی ترتیبات عمل میں آئیں زمانہ کی ساری ضروریات پوری ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں خواہ اس کے منصوص حصہ سے اور خواہ اس کے اجتہادی حصہ سے۔ یہ خود اس کی ایک مستقل دلیل ہے کہ اجتہادی دور اپنا کام پورا کر کے منقضی ہو چکا ہے جو لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اجتہاد فی الدّین کا دور ختم ہو چکا تو ہو جائے مگر اس کی تقلید کا دور کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ تقلید ہر اجتہاد کی دوامی رہے گی خواہ وہ موجود ہو یا منقضی شدہ کیونکہ تقلید عینِ اجتہاد میں نہیں کی جاتی بلکہ اس سے پیدا شدہ مسائل میں کی جاتی ہے اور وہ مسائل آج بھی موجود ہیں اور رہیں گے۔ اس لئے تقلید پر کوئی دور بھی اختتام و انقضاء کا نہیں آسکتا۔ خلاصہ یہ کہ جنسِ اجتہاد و تقلید میں سے کسی کو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی وقت بھی دنیا سے منقطع ہوئے ہیں اس لئے آج بھی وہ دونوں اپنی اسی نوعیت کے ساتھ جس کی تفصیل ابھی عرض کی گئی دنیا میں موجود ہیں کہ دین کی جامعیت تو ان دونوں کے وجود کو مقتضی ہے جبکہ یہ دونوں شرعی چیزیں ہیں اور دین کا اِکمال و اتمام ان دونوں کے درجۂ اعتدال کو مقتضی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ درمیانی نقطہ پر لا کر دونوں کو قائم رکھا جائے جس کی صورت ابھی عرض کی گئی۔

اختلافِ ائمہ باعثِ رحمت ہے

یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب اجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء بتفاوتِ افہام متعدد اور مختلف ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلہ میں آراء کئی ہو جائیں اور اجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں تو کیا اس اختلافِ رائے کا دروازہ کھلنا امت کی تفریق بلکہ تخریب اور تمذہب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورتِ اختلاف نہ فی نفسہٖ مضر ہے نہ دین کے لئے مضر ہے نہ امّت کے لئے مضر ہے۔ بلکہ علم، علماء اور پوری امت کے خواص و عوام کے لئے موجبِ ترقی اور باعثِ سود بہبود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم و تزاحم کے نہیں ہوتی بلکہ ترقی

نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے۔ اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزاحم آراء اور تصادمِ افکار کے نمایاں نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے۔

القلب میّت وحیاتہٗ بالعلم والعلم میّت وحیاتہٗ بالبحث والمناظرۃ۔

”دل آدمی کا مردہ ہے اس کی زندگی علم سے ہے اور علم انسان کا مردہ ہے اس کی زندگی بحث و مناظرہ سے ہے“۔

ظاہر ہے کہ بحث و مناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے۔ جس سے علم کے مختلف و مخفی گوشے کھل جاتے ہیں۔ تکوینِ الٰہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلہ میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تاکہ کفر باطل کے جتنے پہلوؤں سے اسلام سے ٹکرائے، اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہو جائیں اور انجامِ کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں۔ علم کے مقابلہ پر شبہات کا لشکر اسی لئے صف آراء کیا گیا کہ جہل اپنے جس جس حصہ سے علم سے ٹکراتا رہے علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دنیا کے سامنے ہوتے رہیں۔ پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکر دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔

شریعت نے مشورہ کا اصول اسی لئے رکھا کہ آرا کے تصادم سے مسئلہ کے موافق اور مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھنا کر منقح ہو جائے۔ غرض اگر اصول کے مقابلہ پر اضداد نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور قوی واشگاف ہو سکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضداد کی قلعی کھل سکتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے دین میں ایک حصہ محلِ فکر و بحث رکھ کر اجتہاد و تحقیق اور تزاحمِ آرا کے لئے چھوڑ دیا تاکہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی عِلل واسرار پر مشتمل ہے لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ کی حد تک کھلتا چلا جائے اور امّت کے مخصوص دماغوں کی جولانیاں اور قلوبِ صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیّت اور اسی کے ساتھ کتاب و سنت کی ہمہ گیری بھی کھل جائے۔ اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر مصفّٰی قلب و دماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار رہے۔ جس سے اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ اور وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کا پورا پورا ظہور ہو جائے۔ ہاں اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب و سنت کے بلیغ جُملات اور ذی وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعدِ عربیہ اور اصولِ لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقۃً پیدا ہوئے ہیں۔ وہ تمام محتملات بعض احتمالات میں نہ رہیں۔ بلکہ ہر ایک محتمل قابلِ عمل اور ایک مستقل اُسوہ بن جائے اور احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تاکہ کلامِ الٰہی اور کلامِ رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی امام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ امت کے زیرِ عمل آ جائے۔ پس آج اختلافِ آئمہؒ کی بدولت احادیث کا ہر ہر محتمل اجتہادی مسائل کی صورت میں امّت میں معمول ہے اور کلام پیغمبرؐ کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو ____ اسی لئے اس اختلاف کو رحمتِ واسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلام نبوّت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا والاعمال اَولٰی من الاھمال نیز امّت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ ہر مذاق کا امام اپنے مناسب مذاق علمی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے اس صورت میں اسلام ایک ایسے دریا کی مانند ہو گا جس کا ایک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدّد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو

کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے' مزہ بھی وہی ہے۔ البتہ سمت اور رُخ بدلا ہوا ہے یا ایک عظیم الشان درخت کے مشابہ ہوگا جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تاکہ جدھر سے بھی کوئی آئے پھل کھا سکے۔ یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگزیر طریقے پر ایک ہی سمتِ خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے ہر سمت سے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس کے سامان سے راحت اٹھا سکتے ہیں جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولتِ اختلاف آئمہ ہی کی بدولت امت کو حاصل ہو سکتی تھی اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلافِ آئمہ اصول کا نہیں بلکہ اتحاد اصول کے ساتھ سمتوں اور جہات وکیفیات کا اختلاف ہے تاکہ علم کی اس وسعت سے اسلام کہ ہمہ گیری اور امت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے۔ نیز ہر مذاق کے انسان کو الوانِ فہم کے مذاق کے مطابق مربّی اور سامان تربیت بھی میسّر آجائے۔

بس اس حکمتِ بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے آئمہ اجتہاد میں تعدّد بھی پیدا فرمادیا اور ان میں متعدّد حضرات کے مذاق اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا۔ اصولِ استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لِمّیات اور پھر ان لمّیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلاف ذوق سے پیدا ہوئے جو ائمہ کو قدرتِ الٰہی نے تکوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رونما ہوا کہ ان ائمہ کی مختلف شئون سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوّع شئونِ نبوۃ واشگاف ہوئیں۔ گویا وہ ساری شئون جو ایک ذاتِ بابرکات نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک امتی انفرادی طور تحمّل نہیں کر سکتا تھا۔ پوری امت کے راسخین فی العلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شان نبوّۃ نے ایک ایک مجتہد کے ذریعہ ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر امت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے، اور شئونِ نبوت کے یہ تمام الوان بحیثیت مجموعی ایک صد رنگ گلدستہ کی صورت سے دنیا میں ظاہر ہوئے۔ نظر بریں فقہاء امت کا یہ اختلاف امت کے حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علماً وعملاً مفید ثابت ہوا۔ فہیم شخصیات کے مکنون جو ہر کھلے۔ کتاب وسنت کی بلاغت وجامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا۔ امت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں۔ پیغمبر کے متنوّع علم کی شئون واضح ہو گئیں' غرض امت' پیغمبر' دین' مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروعی تنوّع بہر نہج مفید اور رحمت ثابت ہوا اسی لئے شریعت نے کھلے الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمتِ واسعہ کہا۔ ارشاد نبوی ؐ ہے'

اختلاف اصحابی رحمۃ واسعۃ۔

(رواہ البیہقی فی المدخل عن ابن عباس ورواہ الدارقطنی والدارمی وابن عساکر عن ابن عمر وصححہ الحاکم (قاسم العلوم مسئلۂ امامت)

"میرے صحابہؓ کا اختلاف بڑی رحمت ہے"۔

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ اس اجر وثواب کے مواعید دے کر امّت کو اس کی رغبت دلائی گئی۔ ارشادِ نبوی ؐ ہے :

عن عمرو بن العاص انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران واذا حکم ثم اجتھد ثم اخطا فلہ

اجر۔ (رواہ البخاری (الاقتصاد))

"عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی حکم کرنے والا حکم کرے اور اجتہاد میں مصیب ہو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر خطاء ہو جائے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے"۔

قرآن کریم نے بھی اپنے نظم میں اس اختلاف کی مشروعیت کی طرف اشارہ فرمایا گویا فروعی اختلافات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشادِ ربّانی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (القرآن الکریم)

"اور تم لوگ ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا واضح احکام پہنچ جانے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہو گی"۔

مِنْ بَعْدِ مَاجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم ہے جو دلائل کھل جانے کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول کا اختلاف ہو سکتا کیونکہ اصول خود فی نفسہ کھلے ہوئے اور واضح ہوتے ہیں اور یا ان فروع کا ہو سکتا ہے جن کے دلائل واضح ہو جائیں۔ پس اصولِ واضحہ اور فروعِ واضحۃ الدّلائل میں اختلاف آیت بالا سے مذموم اور ممنوع ثابت ہوا کہ وہ اختلاف محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہ ہوئے ہوں خواہ اس طرح کہ ان کے بارہ میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو یا نص ہے مگر ارادہ سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو جن میں وجہ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو۔ تو اس قسم کی فروعات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوحِ بیّنات سے پہلے پہلے کا ہو گا اس لئے مذموم بھی نہیں ہو سکتا یہی وہ اجتہادی اختلاف ہو گا جو اتحاد اصول کے ساتھ محض فروعاتی ہو گا اور مجبوری ہو گا جسے لسانِ نبوت پر رحمتِ واسعہ کہا گیا ہے اور جس کی خطاء پر اجر کا وعدہ دیا گیا ہے پس ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث کے تو منطوق اور قرآن کے مفہوم سے ثابت ہو گئی۔

مسائلِ فقہیہ کی تدوین مذموم نہیں ہو سکتی

بہرحال جبکہ اجتہاد مشروع بھی ہوا، اجتہادی اختلافات بھی شرعی اور مطلوب شرعی ٹھہرے تو ائمۂ اجتہاد کے ذریعہ ایسے اجتہادی اختلافات کا ظہور بھی نہ قابلِ ملامت ہو سکتا ہے نہ ایسے مسائل کی تدوین ہی قابلِ طعن ہو سکتی ہے۔ اگر کسی مجتہد کے تلامیذ اپنے عمل کے لئے اس کے اجتہادات کو ایک جگہ جمع کر لیں گویا بالفاظِ دیگر ان شرعیات کے مسائل کی تدوین کرنے لگیں تو آخر اس میں کونسی شرعی قباحت ہے؟ کہ اس پر انہیں قابلِ سرزنش شمار کیا جائے۔ بس ایسے ہی اجتہادی مسائل کے ایک جگہ جمع شدہ مجموعہ کا نام فقہ ہے جس کو کسی مجتہد کے متوسّلین نے باب وار اوراق میں ذخیرہ کر لیا ہو۔ پھر یہ نام بھی کوئی اختراعی نام نہیں بلکہ حدیثِ نبوی سے ثابت شدہ اور اللہ اور اس کے رسول کا تجویز فرمودہ نام ہے جیسا کہ حدیث ربّ حامل فقہ اور حدیث مثل من فقہ فی دین اللہ اور حدیث من یّرد اللہ بہ خیرا یفقّہہ فی الدین سے تفصیلی طور پر اس فقہ کی نوعیت عرض کی جا چکی ہے۔

مُتبعینِ فقہ کے لقب ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا ماخذ

ہاں پھر چونکہ یہ فقہ مجموعۂ سُنن تھا جس میں سُنن نبوی تو بطورِ ماخذ کے شامل تھیں اور سُننِ صحابہؓ بطور ماخذ کے جمع تھیں اس لئے اس میں سنیت کا بھی نور تھا اور جماعت صحابہؓ کا جماعتی نور بھی مجتمع تھا اس لئے عاملینِ فقہ نے اپنا نام اہل السنۃ والجماعۃ رکھ لیا تو کیا بُرا کیا بلکہ غور کرو تو یہ نام بھی حدیث ہی سے ماخوذ ہے عمروؓ بن عاص کی روایت میں ارشاد نبوی ہے:

> وان بنی اسرائیل تفرّقت علیٰ ثنتین وسبعین ملّۃ وتفترق امّتی علیٰ ثلث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا واحدۃ قالوا من ھی یا رسول اللہ؟ قال ما انا علیہ واصحابی۔ (رواہ الترمذی مشکوٰۃ باب الاعتصام)
>
> ''اور بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرق پر منقسم ہو جائے گی سب فرق ناری ہونگے بجز ایک کے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں اس پر چلنے والا ناجی ہے''۔

ظاہر ہے کہ اصحاب کے لفظ سے جو جمع لایا گیا ہے اس سے جماعت مفہوم ہو رہی ہے اور ما سے مراد طریقہ اور سنت ہے جو پیغمبر اور صحابہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس لئے فرقۂ ناجیہ کا ترجمہ ہوا ''سنتِ نبی وجماعتِ نبی'' ظاہر ہے کہ جب اہلِ فقہ کے فقہ میں یہی سنتِ نبی اور جماعتِ نبی جمع ہے اور انہوں نے اس لفظی اور معنوی مناسبت سے اپنا لقب اہل سنت والجماعت تجویز کر لیا تو اس میں کیا بُرائی ہے کہ یہ لقب ان کے حق میں مستوجبِ ملامت شمار کیا جائے بلکہ اس لقب کی ترکیب پر غور کیا جائے تو ایک اور شرعی حقیقت بھی اس لقب سے واشگاف ہوتی ہے جو دینی جماعت کے جسم کے لئے بمنزلہ روح کے ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت اور اہل الجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سُننِ نبوی کو محض الفاظِ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں جو حاملینِ حدیث ہیں جن کی زبانوں پر تو حدیث وقرآن کے الفاظ ہیں اور سینوں میں ان الفاظ کے مخفی حقائق ودقائق ہیں۔ گویا الفاظ کتاب وسنت کے ساتھ صحبت ومعیّت اساتذہ بھی ضروری ہے۔

اگر صحابہؓ نے حضورؐ کی زبان سے قرآن وحدیث سُنا اور ان کے حقائق کو حضورؐ کے سینہ مبارک سے لیا پھر تابعین نے صحابہؓ کی زبان سے تو قرآن وحدیث لیا اور ان کے قلوب سے اس کی صفائی واسرار کو حاصل کیا **بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ**

تو ہم بھی اس توارث کے ماتحت الفاظ کتاب وسنت تو کتُب سے لیتے ہیں اور ان کے حقائق ان روشن ضمیر اساتذہ کے قلوب سے جو خلفاً عن سلَف اس باطنی نور کو اخذ کرتے چلے آئے ہیں۔ پس اہل السنت والجماعت کے لفظ سے طریقہ اور مذہب بھی نکلتا ہے اور طریقہ کے ساتھ اہل طریق کی معیّت ملازمہ بھی مفہوم ہوتی ہے جو حقائق کے سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے دینی سلسلہ میں تعلیم وتربیت کے بھی دو اصول ذکر فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اور ایک استاذ۔ گویا کتاب کے ساتھ ایک عالم کتاب رسول' ضرور لازم رکھا ہے تاکہ وہ کتاب کے جلی وخفی حقائق سمجھائے بھی اور کر کے دکھلائے بھی۔ چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

"بلاشبہ ہم نے اپنے رسول بھیجے کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تاکہ لوگ عدل کے ساتھ ہوں"۔

اس لئے اہل السنت والجماعت کا عنوان ایسا جامع عنوان نکلا کہ اس میں دینی تربیت کے ان دونوں بنیادی اصول (کتاب اور شخصیت) کی طرف اشارہ ہو گیا جن سے ایک سچی جماعت یا صادق فرقہ کی تشکیل ہوتی ہے کہ اس کے لقب میں طریق اور اہلِ طریق دونوں پر روشنی پڑتی ہے ___

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اہل السنت والجماعت ہے وہ اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن بھی ہے کہ یہ کتاب کا مرتبہ ہے۔ اہلِ عترۃ بھی ہے کہ یہ شخصیت کا درجہ ہے لیکن ہر اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن کا اور اہلِ عترۃ کا اہلِ السنت والجماعت ہونا ضروری نہیں کہ ان القاب میں کسی میں فقط کتاب کی طرف اشارہ ہے اور کسی میں محض شخصیت کی طرف۔ پس حدیث میں جہاں بھی مسلمانوں کو اہل حدیث فرمایا گیا جیسے حدیث انسؓ سخاوی سے نقل کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمانوں کو "انتم اہل الحدیث" سے خطاب کیا گیا یا قیامت میں کیا جائے گا یا کسی حدیث میں مسلمانوں کو اہل قرآن کہا گیا ہے جیسے حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ میں ہے کہ :

انّ اللہ وتر یحب الوتر وتروا یا اھل القراٰن۔

(رواہ الترمذی والنسائی وابوداؤد، مشکوٰۃ باب الوتر)

"اللہ وتر ہے، وتر کو پسند کرتا ہے پس وتر پڑھو اے اہل قرآن"۔

یا کسی حدیث عترت کے اتباع کی دعوت دے کر گویا انہیں اہل عترت کہا گیا یہ سب اسماء جزوی اور نسبتی ہیں کہ یا مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا سنت نبوی کی طرف یا اصحاب و اہل بیت کی طرف ایک دم اشارہ بلکہ صراحۃً موجود ہے۔ اس حال میں کہ اہل حدیث ___ یا اہل قرآن کے القاب والی روایات میں اس لقب سے کسی اصطلاحی جماعت کی طرف اشارہ نہیں ورنہ چکڑالوی اہل قرآن اور شیعانِ اہل عترت کو اپنی حقانیت پر استدلال لے آنے کا کافی موقع مل جائے گا ___

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نسبت محض ہے جو ملابست کی وجہ سے فرمائی گئی ہے جیسے جنت میں مختلف دروازوں باب الصلوٰۃ، باب الجہاد، باب الرّیان وغیرہ سے داخل ہونے والوں کو محض ان اعمال یا ان دروازوں کی طرف منسوب ہو جانے کے سبب مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض کو اہل الصلوٰۃ کہا گیا، بعض کو اہل الصّیام کہا گیا اور بعض کو اہل الجہاد کہا گیا۔ یا بعض روایات میں انہیں اہل دین کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ ان القاب سے فرق اور مذہبی گروہ مراد نہیں ہیں بلکہ محض نسبتوں کا اظہار ہے جس سے مسلمانوں کی امتیازی شان اور تشریف مقصود ہے نہ کہ عقائد و مسائل کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرمانا۔ اسی طرح حدیث میں اہل الحدیث، اہل القرآن فرمانے سے اصطلاحی جماعتیں چکڑالوی یا امرتسری مراد نہیں بلکہ نسبتوں کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے بھی نسبت ہے۔ حدیث سے بھی ہے۔ صحابہؓ سے بھی ہے، صلوٰۃ سے بھی ہے صیام سے بھی ہے، جہاد سے بھی ہے، دین سے بھی ہے، کلمہ طیبہ سے بھی ہے۔ پس ایک مسلمان اہلحدیث بھی ہے، اہل قرآن بھی ہے، اہل عترت بھی ہے، اہل صلوٰۃ بھی ہے، اہل صیام بھی ہے۔ اہل جہاد بھی ہے، اہل دین بھی ہے، اہل علم بھی ہے اور اہلِ **لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ** بھی ہے۔ لیکن "**ما انا علیہ واصحابی**" کا جملہ جس سے اہل سنت والجماعت کا لقب **مستنبط** ہوتا ہے بولا ہی گیا ہے فرق کے تذکرہ کے سلسلہ میں اور اس لقب سے ایک ہی فرقہ کی تشخیص منظور ہے جو عند اللہ فرقۂ ناجیہ ہے۔ پس یہ لقب محض نسبت ہی نہیں بلکہ ایک جماعت کا شرعی سرنامہ اور عنوان ہے، اس لئے میرے خیال میں اہل سنت والجماعت نے اس لقب کو اپنے

لئے اختیار کر کے اپنے کمال تفقہ کا ثبوت دیا ہے کہ مسلک کا لقب بھی منصوص ہی انتخاب کیا یعنی اہل سنت والجماعت اور پھر لقب بھی وہ اختیار کیا جو لقب ہی کے طور پر حدیث میں مذکور ہوا ہے نہ کہ محض نسبت کے طور پر **فما احسن فقههم واحسن بدرايتهم** پس جس طرح حدیث کی اس نسبت ''اہل حدیث'' سے ''اہل قرآن'' کی نفی نہیں ہوتی اور اہل قرآن کے لفظ سے اہل حدیث کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل حدیث کے لفظ سے آخر اہل سنت والجماعت کے لقب کی یا ان کے مسلک فقہ کی یا اس کے لوازم اجتہاد و تقلید کی نفی کیسے ہو جائے گی اور حدیث کی یہ مراد ہی کب ہے کہ اہل حدیث یا اہل قرآن کے لقب کو بمقابلہ لقب اہل سنت والجماعت استعمال کیا جائے؟ نہیں بلکہ سوچا جائے کہ اگر فرقۂ ناجیہ کے لقب (اہل سنت والجماعت) سے نسبت محض اہل حدیث یا اہل قرآن کی نفی کی جاتی تو موقع بھی تھا لیکن نسبت محض کے عنوان سے ایک جماعتی لقب کے عنوان کی نفی کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہوسکتے جبکہ وہ منصوص بھی ہو۔ بہرحال اہل سنت والجماعت بحمد اللہ فرقۂ ناجیہ ہے۔ فرقۂ ضالّہ نہیں۔ اس کا لقب شرعی ہے بدعت نہیں۔ اس کے دستور العمل کا لقب (فقہ) منصوص ہے 'اختراعی نہیں۔ اس لئے اگر یہ شرعی جماعت اپنے شرعی مسلک کے مسائل بنام فقہ ایک جگہ مرتب اور جمع کر دے تو اس میں ملامت کی کیا بات ہے؟ چنانچہ آئمۂ مجتہدین کے تفقہات مرتب ہوئے اور اپنی اپنی جگہ کروڑوں مسلمانوں کے لئے دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور کبھی بھی امت نے ان کو ذریعہ مطاعن وملامت نہیں بنایا۔

بلکہ ہر طبقہ نے امت کی اس محنت کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے قرآنی معجزہ کی حجت سمجھا کہ اس کے ذریعے سے قرآن کے علوم سربستہ جو اس کے اعجاز کی روح اور وجوہ اعجاز کا اہم جزء تھے 'کھل گئے اور کتاب وسنت کے جوامع کلم کی اعجازی بلاغت وجامعیت نمایاں ہو گئی۔

تقلیدِ شخصی اختلافی مسائل میں ناگزیر ہے

بہرحال جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ اجتہاد مشروع 'اجتہادیات پر عمل مشروع 'ان کا مجموعی ذخیرہ فراہم کیا جانا شرعی چیز 'اس کا نام رکھنا شرعی بات اور ان سارے اجتہادیات میں غیر مجتہد کے لئے تقلید ناگزیر اور ساتھ ہی یہ کہ ہر اجتہادی مسئلہ میں دو آراء کا ہونا ممکن اور دائرہ شرع میں داخل بلکہ مستحسن اور مطلوب ہے۔ تو یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل میں پھر تقلیدِ شخصی بھی ناگزیر طریقہ پر ضروری ہو کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں دائر وسائر کبھی رہ ہی نہیں سکتا' نہ اعتقاداً نہ عملاً آخر ایک ساعات میں ناسخ ومنسوخ' راجح ومرجوح' اَولیٰ غیر اَولیٰ' حقیقت ومجاز' مشترک' مؤوّل' واجب اور مکروہ' فرض اور حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے سمجھ میں آسکتا ہے؟ چارو ناچار ایک ہی جانب کا اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غیر مجتہد کو اختلافیات میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنا پڑے گی۔ حتیٰ کہ اگر ایک مسئلہ میں ایک امام کی تقلید ہو اور دوسرے میں دوسرے کی تو میں کہوں گا کہ جس مسئلہ میں بھی کسی کی تقلید ہوئی ایک کی ہوئی اور وہی تقلید شخصی پھر باقی رہی۔ زیادہ سے زیادہ امام کئی ہو گئے۔ مگر ہر ہر مسئلہ میں امام ایک ہی رہا اور تقلید بھی واحد ہی کی رہی۔ یہ تو نہ ہوا کہ کسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعدّدہ ہو گئیں امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واقع ہوئی وہ رہی شخصی ہی۔ یا اگر ایک شخص ایک مسئلہ میں صبح کو ایک امام کا مقلّد ہے اور اسی مسئلہ میں شام کو دوسرے کا' جبکہ وہ دونوں مختلف الرّائے بھی ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اب بھی وہ تقلیدِ شخصی ہی رہی کیونکہ جس

صبح کو اس نے ایک امام کی تقلید کی تو اس صبح کو وہ یقیناً دوسرے امام کے نظریہ سے ہٹا ہوا اور اس کے عمل سے الگ تھلگ۔ شام کو جب اس نے دوسرا امام اختیار کیا' تو یقیناً صبح کا مذہب اور صبح کا امام بھی بدل دیا۔ اس لئے صبح کو تقلید شخصی ہی کی اور شام کو بھی تقلید شخصی ہی رہی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوئی عقلاً کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کونسی مذموم ہے اور کونسی مستحسن؟ مگر مختلف فیہ مسائل میں کوئی نوعیت ہی لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لئے اور تحقیق شخصی کے سوئی مجتہد کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ عقلاً آدمی بیک وقت **نقیضین** میں دائر و سائر کبھی نہیں رہ سکتا۔ نیز دین میں شرعاً تناقض غیر ممکن ہے۔

جو بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریہ سے علماً اس کی ایک جانب کو بڑھا ہے یا وہ مقلّد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب کو اختیار کر رہا ہے وہ ناگزیر ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے ورنہ وہ اور اس کا دین تناقض کا شکار ہو جائے گا۔ جو عقلاً و شرعاً محال ہے۔ جس کی دین میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ہاں اس کے نظائر ملیں گے کہ ایک جانب سے رجوع کر کے دوسری جانب اختیار کر لی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں پہلی جانب کو ترک کرنا پڑے گا۔ اور وہ تقلید شخصی یا تحقیق شخصی پھر آجائے گی۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک کے زیر عمل ہوتے ہوئے دوسری بھی معمول بن جائے۔

تقلیدِ شخصی کونسی مطلوب ہے اور وہ کیوں ضروری ہے؟

رہا یہ کہ ان ساری شخصی تقلیدات میں مطلوب کونسی تقلید ہے یا عقلاً اور نقلاً قابل قبول بلکہ قابل وقوع کونسی ہے؟ سو اس کے متعلق اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صرف ایک ہی صورت معقول ہو سکتی ہے کہ عمل کے دائرہ میں ایک ہی فقہ کے تمام مسائل پر عمل کیا جانا یا بالفاظ دیگر کل مسائل اجتہادیہ میں ایک ہی امام کی تقلید کیا جانا ضروری ہے کیونکہ علمی نظر میں یہ غیر ممکن ہے کہ اجتہادیات میں تقسیم کر کے بعض مسائل میں ایک امام کی اور بعض میں دوسرے کی تقلید کی جاسکے۔ بلکہ جس فقہ کو بھی اختیار کیا جائے گا اسے پورے ہی کو اختیار کرنا پڑے گا ورنہ وہی تناقض محال کسی نہ کسی جہت سے سر پر پڑ جائے گا۔ بعض مسائل میں جزئیات تناقض نمایاں ہوگا۔ بعض میں ان جزئیات کے مبادی اور تعلّقات کا تناقض رونما ہوگا اور بعض میں ان جزئیات کے کلیات اور اصول میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیونکہ

(۱) بعض مسائلِ اجتہادیہ تو وہ ہیں کہ خود ان ہی میں کھلا تناقض ہوتا ہے جسے ایک عامی سے عامی آدمی بھی پہچان سکتا ہے۔ مثلاً مسِ مراۃ (عورت کا چھودینا) کہ حنفیہ کے یہاں ناقض وضو نہیں اور شوافع کے یہاں ہے خارج من غیر السّبیلین شوافع کے یہاں ناقض وضو نہیں اور حنفیہ کے یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا ہوا تناقض ہے جو حکم کے لحاظ سے بھی ہے اور بناء حکم یعنی دلائل وغیرہ کے اعتبار سے بھی۔ پس ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ وہ ان مسائل کی ان دو متناقض جہات کو متناقض مانتے ہوئے بیک وقت نہ دونوں پر عمل کر سکتا ہے نہ دو اعمال کے درمیان دائر سائر رہ سکتا ہے کہ دین میں ایسے تناقض کی کوئی حجت اور کوئی نظیر ہی موجود نہیں اِلّا یہ کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے دو متناقض باتوں میں صراحۃً امّت کو خیار دیدیا گیا ہو۔ ایسی

صورت میں دو فقہیات یا دو فقہائیں دائر سائر رہنا کھلا تناقض قبول کر لینا ہے گویا دو متعارض چیزوں کو بیک وقت حق جان کر قابل عمل ماننا ہے جو عقلاً بھی باطل ہے اور شرعاً بھی محال ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عامی آدمی کھلے طور پر مسئلہ کی ایک ہی جانب اختیار کر کے ایک ہی امام کی تقلید پر مجبور ہوگا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ کی دو متخالف جانبین میں سے ایک وقت ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے وقت دوسری پر۔ یا ایک امام اور ایک فقہ کا پابند رہتے ہوئے اسی نوع کے کسی ایک آدھ مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے اور جبکہ اس مسئلہ کی وہ جانب ہی چھوڑ دی جائے گی جو اپنے امام کی اختیار کردہ تھی اور صرف وہی جانب لی جائے گی جو دوسرے امام کی مختار ہے تو اس میں وہ مذکورہ تناقض حکم بھی پیدا نہ ہوا اور ایک امام کی تقلید سے بھی آدمی باہر نہ ہوا کہ بہرحال اکثر وبیشتر بلکہ تقریباً کل ہی مسائل میں بجز اس ایک آدھ مسئلہ کے اپنے ہی امام کی تقلید موجود ہے تو ایسی معدودے چند جزئیات میں دوسرے امام کی تقلید کرنے میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک حنفی تمام مسائلِ فقہیہ میں حنفی رہتے ہوئے مفقود کے مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب پر عمل کرنے لگے اور حنفیہ کا مسلک اس بارے میں ترک کر دے تو اس میں وہ تناقض یا جمع بین الضدین کب لازم آیا جس سے بچنے کے لئے دو تقلیدیں غیر معقول سمجھی گئی تھیں لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو تناقض اب بھی موجود ہے اس خاص جزئیہ میں نہیں تو اس کے مبادی اور متعلقات میں موجود ہے وجہ یہ ہے کہ ہر ایک امام جب کسی مسئلہ میں کوئی اجتہادی رائے قائم کرتا ہے تو اس کے سامنے اس باب کے تمام مسائل کا ایک سلسلہ **مستحضر** ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذوق اور اصول سے ان تمام مسائل باب میں ایک خاص تناسب محسوس کرتے ہوئے اور اپنے ذوق اجتہاد سے اسی تناسب کو قائم رکھ کر اس باب کے تمام مسائل کی کڑیاں جوڑتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے امام کی ذوقی نظر میں بھی مذکورہ تناسب کا مذہبی رنگ قائم ہو بلکہ وہ تناسب وتوازن کا کوئی اور رنگ لئے ہوئے ہو جو اس رنگ سے بالکل جداگانہ ہو اس لئے اگر ایک امام کا مقلد ایسے کسی ایک مسئلہ میں بھی دوسرے امام کی تقلید کرے گا تو اس خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے ہمرنگ اور مبادی دوسرے مسائل میں تناقض رونما ہوگا اور اس نئے مقلد کے سراُن متعلقاتِ مسائل کی تقلید بھی لازم آجائے گی جن میں تقلید کا اس نے ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ مفقود کے مسئلہ میں یہی صورت ہے کہ مالکیہ کے یہاں چار سال میں تفریق اس پر دائر ہے کہ ان کے یہاں اکثر مدتِ حمل چار سال ہے اس لئے چار سال تک براءۃِ رحم کا انتظار کیا جاتا ہے۔ نیز چار سال کے بعد اِعسار بھی موجب تفریق ہو جاتا ہے لیکن فقہ حنفی میں اکثر مدتِ حمل دو سال سے زائد نہیں اور اِعسار موجب تفریق نہیں پس نفقہ کے اعتبار سے چار سال پر تفریق کا فتویٰ دیا جانا گویا مدتِ حمل بھی چار سال مان لینا اور اِعسار پر تفریق کا ترتّب کر لینا ہے حالانکہ یہ حنفی بحیثیت حنفی ہونے کے اکثر مدتِ حمل سال مانے ہوئے ہے۔ جس سے ابھی تک منکر نہیں اور اعسار کو موجبِ تفریق ہی نہیں کہتا۔

پس وہ مسئلہ مفقود کے معانی میں حنفی بھی ہے اور مالکی بھی ہے۔ دو سال کا بھی قائل ہے اور چار سال کا بھی، تفریق اعسار کا بھی قائل ہے اور عدم تفریق کا بھی قائل ہے اگر نفس مسئلہ مفقود کے فتویٰ میں وہ گرفتار تناقض نہ ہوا تو اس نے مبانی اور متعلقات میں ہو گیا جس کے رفع ہونے کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ہر مسئلہ میں حنفی رہے یا ہر مسئلہ میں مالکی بن جائے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ نہ ایک مسئلہ کی دو جانبین میں دائر رہے نہ ایک مسئلہ کے دو اجتہادی پہلوؤں

میں دو دو قتوں میں دائر رہا جائے بلکہ دو باب کے الگ الگ مسائل میں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو دو اماموں کی تقلید کی جائے مثلاً فروع صلوٰۃ میں ایک امام کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور فروع حج میں مثلاً دوسرے کے اجتہاد پر تو اس میں بظاہر تناقض کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور تقلید شخصی کی مصیبت سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں گو جزئیاتی تعارض نہیں مگر اصول یہ اور کلیاتی تعارض سے یہاں بھی مفر نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر امام کے اصول استنباط الگ الگ ہیں جو اس کے فطری مذاق اور افتادِ طبع سے سرزد ہوئے ہیں۔ اس لئے وہی رنگ اس کے پورے فقہ میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شرائع میں انبیاء کا رنگ سمایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شریعت جبکہ نبی کے دل و دماغ سے ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے تو نبی کا فطری رنگ شریعت میں جھلکنا ناگزیر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی شانِ جلالی تھی تو شریعت کے احکام میں بھی تشدد اور شدت غالب ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شانِ جمالی اور رافت و رحمت کی تھی تو ان کی شریعت میں بھی لین (نرمی) کا غلبہ ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ جامع شئون تھی جن کا غالب رنگ عدل واعتدال اور رحمت ویسر تھا تو شریعتِ محمدی کے ہر ہر مسئلہ میں یہ جامعیت اور مظاہرۂ عدل و رحمت بھی نمایاں ہے ___ غرض مذہب کے اصول و فروع میں صاحب مذہب کی فطری ذہنیت کا الگ رنگ اس لئے جھلکنا ضروری ہے کہ یہ تمام الہامی اصول و فروع اسی ذہنیت کے راستے سے گزر کر آتے ہیں۔ اس لئے باوجود دین انبیاء کے واحد ہونے کے ہر نبی کی شریعت کا ایک ممتاز رنگ ہے اور اس کے کمالات و کرامات کا ایک خاص لون ہے جو دوسروں میں نہیں ___ اور اس رنگ کے ماتحت اس کے تربیت یافتوں میں بھی وہی رنگ سرایت کرتا ہے جو مقتداء اعظم کا ہوتا ہے چنانچہ مختلف اُمم کی شئون اور آثار و خواص بالکل ممتاز اور باہم متخالف بھی ہیں اور اپنے اپنے نبی کی شئون کا مظہرِ اتم بھی ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے ایک دریا باوجود ایک ہونے کے جس جس خطۂ زمین سے گزرتا ہے اس کی خصوصیات اور وہاں کی ہواؤں کے مخصوص اثرات لیتا جاتا ہے اور اس کے سیراب ہونے والوں کے مزاج میں بھی وہی کیفیت سرایت کرتی ہے۔

پس شرائع تکلیفیہ کی طرح ہی شرائع وضعیہ (اجتہادی مسالک) بھی وجود متحد الاُصول ہونے کے جس امام کے دل و دماغ سے گزر کر باوجود کا جامہ پہنتی ہیں اس کا ذوقی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اور اسی کے ذوق سے نکلے ہوئے اصول استنباط سے مستنبط ہوتی ہیں ___ پس اس مجتہد کا پورا فقہ اور فقہ کے سارے ابواب اسی ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو انجام کاران عملی جزئیات کے واسطہ سے اس فقہ کے ہر متبع میں سرایت کرتا ہے۔ گویا اس فقہ کے تربیت یافتوں کی ذہنیت بھی اسی رنگ کی ہو جاتی ہے جو اصلی مربّی اور بانیٔ فقہ کی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مجتہد کے مزاج میں توسیع کا غلبہ ہے اور کسی کے مزاج میں احتیاط کا ___ کسی میں شدت ہے اور کسی میں لین ___ کسی میں جمعیت کا غلبہ ہے اور کسی میں جامعیت کا ___ کسی میں دیانات کا وفور ہے اور کسی میں اس کے ساتھ سیاست و نظم اور اجتماعیات کا بھی اعلیٰ شعور ہے ___ کسی میں ظاہریت کا غلبہ ہے ___ اور کسی میں باطنیت کا ___ کسی میں تاسی یا اُسوۃ السلف کا غلبہ ہے ___ اور کسی میں رجحانات کے تتبع واستقراء کا۔ ظاہر ہے کہ جہاں ظاہریت غالب ہوگی وہاں سب سے بڑا مرجح ظواہرِ روایت ہوں گے اور جہاں باطنیت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح بواطنِ روایت یعنی درایت ہوگی' جہاں تاسی کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح۔ تعاملِ سلف ہوگا اور جہاں شرعی جمہوریت کا غلبہ ہوگا وہاں سب سے بڑا مرجح سلف کی اکثریت ہوگی۔ بہرحال جس امام کی جو بھی ذہنی خصوصیات ہوں گی وہی اس کے اصول استنباط سے

چھنیں گی اور پھر وہی خصوصیات ان اصول کے ماتحت مستنبط شدہ جزئیات سے بھی مترشح ہوں گی اور ان ہی خصوصیات کا خاص رنگ بالآخر ان افراد کی تربیت کرے گا جو اس فقہ پر عامل ہوں گے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک فقہ کا مقلّد بظاہر تو جزئیات فقہ کی تقلید کرتا ہے لیکن بنظر حقیقت وہ ان اصول کی تقلید کرتا ہے جن سے وہ فقہ بنتا ہے اور اسے راہ عمل پر حقیقۃً وہ کلیات چلاتی ہیں جو ان جزئیات فقہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں۔

پس اگر دو فقہوں پر چلنے والا مثلاً ایسی جزئیات کا انتخاب کرے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نہ ہوں اور دونوں فقہوں کی تقلید ان غیر متعارض جزئیات میں شروع کردے تو گو وہ جزئیاتی تناقض میں گرفتار نہ ہو مگر در حقیقت اس کلیاتی تناقض کا شکار بنے گا جو ان جزئیات کی تشکیل کی ضامن ہیں اور ان میں رچی ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب وہ اصولاً متناقض اور ذوقاً متخالف ہیں تو اس مقلّد میں بھی یقیناً دو ذوقی رنگ اپنے تناقض سمیت بھرے جائیں گے۔ اندریں صورت ناگزیر ہے کہ باطنی طور پر اس کے روحانی مزاج میں فساد پیدا ہوا اور وہ متضاد اثرات کی کشاکش کا شکار ہو کر پراگندہ حال بن جائے اگر فی الحال تناقض مضر ہے اور وہ جزئیات کو ناقابل عمل بنا سکتا ہے تو وہی تناقض کلیات کو ناقابل نظر کیوں نہیں بنادے گا؟

اور جبکہ عمل نظر کے تابع ہے تو بالواسطہ اس کے عمل میں مفاسد پیدا ہوں گے جو بعد چندے ظاہر ہونے لگیں گے۔

ائمہؒ کے اختلافِ مذاق سے پیدا شدہ مختلف اصول

ائمہ کے اس اختلافِ مذاق کو امثلہ سے واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر غور کیجئے کہ مثلاً تعارضِ روایات کے وقت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق اور اس سے پیدا شدہ قوت سند ہے وہ روایات متعارضہ میں عموماً قوتِ سند کے معیار سے ترجیح دیتے ہیں۔ پس جس حدیث کی سند اصولِ روایت کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہوگی وہ اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دے کر دوسری ضعیف السند روایات کو جو اس کے خلاف ہیں یا ترک کردیں گے یا مرجوح قرار دیں گے یا اس کی کوئی توجیہ کریں گے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دارالہجرۃ کا ایسی صورت میں سب سے بڑا اصول تاسّی بأسوۃ السلف ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان دو متخالف روایات میں اہل مدینہ کا تعامل کس طرف ہے۔ یہ تعامل جس روایت کے ساتھ ہوگا وہ اختلافی مسائل میں اسی روایت کو اپنے مذہب کی اساس قرار دیں گے اور بقیہ روایات کو ترک کردیں گے ان کی کوئی توجیہ کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق اور اصولی معیار ایسے اختلافی مواقع پر رُجحانات سلف کا تتبع ہے کہ کثرت سے فتاویٰ صحابہؓ و تابعینؒ کس طرف ہیں۔ جدھر بھی یہ صورت ہوگی وہ اسی روایت کو مذہب کی اصل قرار دے کر بقیہ روایات کا اسی سے فیصلہ کردیتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذاق اور اس سے پیدا شدہ اصول ایک خاص جامعیّت کے ساتھ تطبیق و توفیق بین الرّوایات ہے۔ یعنی وہ ایک باب کی تمام متعارض روایات کو جو قابلِ احتجاج ہوں بیکدم سامنے لاکر ان کے مجموعہ سے شارع علیہ السلام کی غرض وغایت کا پتہ چلاتے ہیں اور نور اجتہاد سے یہ دیکھتے ہیں کہ آخر اس مسئلہ سے شارع کا منشاء کیا ہے۔ یہ منشاء جس روایت میں زیادہ واضح ہوتا ہے اسی کو مذہب کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ سنداً کچھ ضعیف ہی ہو اور بقیہ روایات کو اس طرح اس کلی غرض وغایت سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ وہ ساری روایات اپنے اپنے محل پر چسپاں نظر آنے لگتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ تمام روایات

میں مسئلہ ایک ہی ہے مگر کسی روایت میں اس کا حکم ہے کسی میں اس کی حکمت ہے اور کسی میں اس کی کیفیت ہے اور کسی میں اس کی کمیت ہے، کسی میں اس کی اصلیت ہے اور کلیت ہے اور کسی میں اس کے احوال و عوارض ہیں۔

غرض روایات کو غرض شارع کے سلسلہ سے ترتیب وار جوڑ کر انہیں جمع کر دینا امامؒ کا اصل اصول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلام پیغمبر کا ہر گوشہ تا بحدِ امکان زیرِ اعمال آجائے زیا اہمال نہ رہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے تفقہ کی چند امثلہ

مثلاً صومِ سفر کے سلسلہ میں مختلف احادیث وارد ہوئیں کسی حدیث سے نمایاں ہے کہ سفر میں صوم افضل ہے افطار سے۔ چنانچہ حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ جب انہوں نے حضورؐ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! سفر میں روزہ رکھنا گناہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ھی رخصۃ من اللہ عزوجل فمن اخذبھا فحسن ومن احب ان یصوم فلا جناح علیہ۔ (مشکوٰۃ)

"افطار کرنا اللہ کی طرف سے رخصت ہے جو اسے اختیار کرے گا تو یہ خوبی کی بات ہوگی اور جو روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں"۔

اس حدیث میں افطار کو رخصت فرما کر اس کو حسن فرمایا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ عزیمت روزہ ہی رکھنا ہے مگر جائز افطار بھی ہے۔ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ افطار افضل ہے صوم سے ___ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ کسی غزوہ میں بزمانہ رمضان ہم سب حضورؐ کے ساتھ تھے کہ حضورؐ نے ایک ہجوم دیکھا کہ ایک شخص پر سایہ کیا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ایک روزہ دار کی حالت گرمی سے بہت بگڑ رہی ہے۔ فرمایا:

لیس من البرّ الصّیام فی السّفر۔ (مشکوٰۃ کتاب الصوم)

"سفر میں روزہ رکھنا کوئی خوبی نہیں"۔

دوسری حدیث میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک سفر میں ہم حضورؐ کے ساتھ تھے۔ کچھ لوگ روزہ دار تھے، کچھ بے روزہ، منزل پر پہنچ کر روزہ دار تو بے دم ہو کر گر پڑے اور بے روزہ لوگوں نے کام کئے، خیمے گاڑے، جانوروں کو پانی پلایا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

ذھب المفطرون بالاجر۔ (مشکوٰۃ)

"بے روزہ لوگ اجر سمیٹ لے گئے"۔

اور بعض روایات میں صوم اور افطار میں تخییر معلوم ہوتی ہے کہ خواہ روزہ رکھ لو خواہ افطار کر لو، دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ ان ہی حمزہؓ ابن عمرو اسلمی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ:

ان شئت فصم وان شئت فافطر۔ (مشکوٰۃ)

"بحالت سفر جی چاہے روزہ رکھ لو جی چاہے افطار کر لو"۔

امام احمدؒ و اوزاعیؒ نے حدیث انسؓ کو اختیار کر کے کہا کہ سفر میں افطار افضل ہے تو انہوں نے افضل صوم اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض افضلیتِ صوم کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت اور تخییر کی نفی کر دی۔ بعض تخییر کے قائل ہوئے تو انہوں نے افضلیت افطار اور افضلیت صوم دونوں کی نفی کر دی اور

معیار انتخاب روایات ان حضرات کے یہاں وہی حدیث کی سندی قوت و ضعف یا تعامل کی مطابقت وغیرہ ہے۔ لیکن امام صاحبؒ نے اسی تطبیق و توفیق روایات کے ماتحت تینوں قسم کی روایات کو جمع فرما کر سب کو قابلِ عمل بنادیا اور کسی ایک جہت کی نفی نہیں کی۔ انہوں نے نورِ اجتہاد اور ذوقِ تشریع سے دیکھا کہ ان مختلف روایات سے شارع علیہ السلام کی غرض مختلف احوال میں مختلف احکام دینا ہے نہ کہ ایک حکم سے دوسرے کی نفی کرنی ہے۔ پس حدیثِ **تخییر** کو تو مساوات فی الجواز پر محمول فرمایا کہ اس سے شارع کی غرض صوم وافطار دونوں کو بلا کراہیت جائز بتلانا ہے کہ نفسِ جوازِ صوم و جوازِ افطار میں کوئی تفاوت نہیں اور افضلیت صوم کی روایت کو اصل پر محمول فرمایا کہ بالذات صوم ہی افضل ہے کیونکہ رمضان زمانہ ہی صوم کا ہے اس میں افطار کسی طرح بھی اصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اصلی فضیلت صوم ہی کو حاصل رہے گی جس کو اس روایت سے ظاہر فرمانا مقصود ہے اور افضلیت افطار کی روایت کو عوارض پر محمول فرمایا کہ جب حالت پریشان کن ہو جائے اور روزہ رکھنے میں تعب حدِ اعتدال سے گزرنے کا خطرہ ہو تو پھر عارضی فضیلت افطار ہی میں ہے۔ پس **تخییر** ہوئی جواز میں۔ افضلیت صوم ہوئی اصلیت صوم اور وقت میں اور افضلیتِ افطار ہوئی احوال صائم میں اور ظاہر ہے کہ جب مسافر پر یہی تین احوال آسکتے تھے تو شارع نے تینوں حالات کا حکم بیان فرمادیا پس ان تین حالات کی تفسیر نے ساری روایات کو ایک نقطہ پر جمع کر کے ان کے تعارض کو اٹھا دیا۔ **تخییر** بھی باقی رہی۔ افضلیت صوم بھی قائم رہی اور افضلیت افطار بھی ثابت رہی کسی ایک حکم سے دوسرے حکم کی نفی نہ ہوئی

پس امام صاحبؒ نے اس علم دقیق سے ساری احادیث کو جمع کر کے قابلِ عمل بنادیا نہ ان میں اور نہ کسی حدیث میں دوراز کار تاویل و توجیہ کی ضرورت پیش آئی۔ یا مثلاً شک کے بارہ میں تین قسم کی احادیث وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب شک ہو جائے کہ کتنی رکعات پڑھی ہیں تو نماز کا اعادہ کرنا چاہئے۔

اذا شک احدکم فلیستأنف

جب کسی کو نماز کی رکعات میں شک پڑ جائے تو نماز لوتائے"۔

دوسری یہ کہ بصورتِ شک نماز ہی میں تحرّی کرنی چاہئے یعنی اٹکل لگا کر غور کرنا چاہئے کہ کتنی رکعات ہوئیں۔ جدھر غلبۂ ظن ہو اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے۔

اذا شک احدکم فی صلوٰتہ فلیتحرّ الصواب فلیتم علیہ الحدیث

جب کسی کو تم میں سے نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے تو اٹکل لگانی چاہئے۔
اور اسی پر جو اٹکل میں غلبہ ظن سے دل میں آجائے) نماز پوری کرلینی چاہئے"۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب شک ہو جائے اور اٹکل سے غلبۂ ظن بھی کسی جانب سے حاصل نہ ہو کہ تین رکعت ہوئی ہیں یا چار تو جانبِ اقل کو اختیار کر کے اس پر نماز کی بناء کرو۔ تین اور چار میں اقل عدد تین کا ہونا بہر صورت یقینی ہوگا۔ اس لئے یقینی جہت لے لو۔ چنانچہ عطاء بن یسار کی حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے کہ:

اذا شک احدکم فی صلوٰتہ فلم یدرکم صلّی ثلثاً اواربعاً فلیطرح الشک ولیبن علی ما استیقن۔ (الحدیث مشکوٰۃ)

"جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعات کے بارہ میں شک پڑ جائے کہ تین رکعت پڑھی ہیں یا چار، تو شک کو چھوڑ کر جو جانب یقینی ہے (یعنی اقل) اسی پر بنا کرنی چاہئے"۔

ان تینوں احکام میں سے ایک ایک کو ایک ایک مجتہد نے اختیار کرلیا ہے بعض نے شک کی صورت میں

اعادۂ صلوٰۃ کا حکم اختیار کرلیا ہے تو انہیں قدرتی طور پر تحرّی (عمل بغلبۂ ظن) اور بناء علی الاقل کی نفی کردینی پڑی ہے۔ جمہور نے تحرّی اور غلبۂ ظن کا اعتبار کیا ہے تو انہیں استیناف اور بناء اقل کا حکم ترک کردینا پڑا ہے لیکن جب کہ یہ تینوں صُور ___ حدیث میں آچکی ہیں تو امام صاحبؒ نے اسی جمع بین الرّوایات کے اصول کے ماتحت تینوں احکام کو بیکدم اختیار کر کے تینوں قسم کی روایات کو جمع فرمادیا۔ اگر عمر میں پہلی بار شک پڑا تو اس کے لئے اعادۂ صلوٰۃ کا حکم ہے کیونکہ بار بار کے شک اور اعادہ سے جب شک کا وقوع عادۃً ضروری ہے نماز وبالِ جان ہوجائے گی جو تیسیرِ دین کے خلاف ہے اور حرج شرعاً مدفوع ہے اور اگر ایک سے زائد بار شک پڑنے لگے تو تحرّی کا حکم ہے کہ غلبۂ ظن پر عمل کیا جائے اور اگر غلبۂ ظن کسی جانب نہ ہو بلکہ دونوں جانبین میں شک مساوی رہے تو جانبِ اقل کو اختیار کیا جائے جو یقینی ہے۔ اس صورت میں اعادۂ صلوٰۃ۔ تحرّی اور بناء اقل تینوں حکم جمع ہوگئے اور روایات میں کسی کا رد اور کسی کا قبول لازم نہ آیا جس کی فقہی روح یہ ہے کہ شک ہوجانے پر اعادۂ صلوٰۃ، تحرّی، اختیار اقل درحقیقت حصول یقین اور دفع شک کے لئے ہیں اور ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی شک میں جو ایک مرض ناآشنا کی طرح نماز میں طاری ہوئی حصول یقین اعادۂ صلوٰۃ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے کہ پچھلی مشکوک نماز ترک کردی جائے۔ کیونکہ جس کے لئے شک کا مرض ہی نیا ہے وہ ابتداءً ہی اس کے علاج پر غور کرسکتا ہے۔ ہاں بار بار کے شک میں جبکہ عادۃً اس کی حقیقت کھل گئی اور وہ عادت بھی بن گئی۔ نماز میں رہتے ہوئے بھی اس کا علاج ممکن ہوگیا اور وہ تحرّی اور اٹکل سے غلبۂ ظن معلوم کرلینا ہے جدھر بھی غلبہ ہوگیا خواہ تین رکعت کی طرف یا چار کی طرف۔ پس امام صاحب کے طریق کے مطابق حدیث کے یہ تینوں احکام ایک دوسرے کی نفی اور تردید کے لئے نہیں رہتے بلکہ مختلف حالات کے مختلف احکام بن جاتے ہیں جن میں نہ تعارض ہے نہ تدافع اور تینوں احادیث اپنی اپنی جگہ چسپاں ہوکر قابل عمل ہوجاتی ہیں۔ غرض امام صاحبؒ کا ذوق اجتہادیات میں یہ ہے کہ تابحد امکان ہر حدیث زیرِ اعمال آئے۔ زیر اہمال نہ رہے۔ اس لئے وہ عامّۃً متعارض روایات میں سند کی قوت و ضعف کے معیار سے ترجیح و انتخاب کی صورت اختیار نہیں فرماتے کہ اس میں کسی نہ کسی جہت سے ترکِ حدیث یا ترکِ عمل بالحدیث لازم آجانا یقینی ہوجاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ترک ہو۔ جس کی صورت انہوں نے یہی اختیار فرمائی کہ ایک باب کی تمام احادیث سے وہ پہلے شارع کی غرض و غایت کا سُراغ لگاتے ہیں اور پھر اسی بنیادی غرض پر تمام احادیث کو دائر فرمادیتے ہیں۔ متعارض روایات میں امام صاحبؒ کی اس تطبیق اور جمع بین الرّوایات اور دوسرے حضرات ائمہ کی ترجیح و تعلیل روایات کی امثلہ بکثرت ہیں جن سے فقہ حنفی بھرا پڑا ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ دو مثالیں جو اس وقت سامنے آگئیں عرض کی گئیں۔

اس طولانی بحث سے غرض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصول اجتہاد ائمہ کے فطری مذاق کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں جامعیت ہے تو اصول بھی جامعیّت کے وضع ہوں گے۔ طبیعت میں ظاہریت ہے تو اصول میں بھی ظاہریت کا رنگ رہے گا اور طبیعت میں تاسّی بِالاُسوہ کا مذاق ہے تو اصول میں بھی وہی رنگ نمایاں ہوگا اور ان ہی اصول پر مجتہد کا پورا فقہ مرتّب ہوتا ہے۔ جس سے متبعینِ فقہ اور مقلّدین کی ذہنی اور عملی تربیت ہوتی ہے۔ پس اصول میں تخالف ہوگا تو مقلّد کی ذہنیت پر عملی جزئیات کا اثر بھی متضاد ہی پڑے گا۔ گو ابتداءً اسے کوئی جزئیاتی تخالف اور تضاد محسوس نہ ہو کیونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ مربوب میں سامان تربیت اثر انداز نہ ہو یا مثلاً متعارض روایات میں امام صاحب کا ایک خاص اصول یہ بھی ہے کہ وہ کسی باب کی ایسی حدیث کو جو کلیہ اور ضابطہ عامّہ کا رنگ لئے ہوئے ہو اصل قرار دے کر اس باب کے جزئی افعال کو جو نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں اور اس کلیہ کے خلاف پڑتے ہوں اس کلیہ کے تابع کرتے ہیں کلیہ کو افعالِ جزئیہ کے سبب توڑنا پسند نہیں کرتے کہ وہ معلوم السبب اور معلوم العلت ہے اور افعالِ جزئیہ واقعہ حال ہوتے ہیں جن میں کوئی عموم نہیں ہوتا کلیہ کو اصلیت پر باقی رکھ کر ان جزئی واقعات کی کوئی ایسی توجیہ فرمادیتے ہیں کہ وہ اس کلیہ کے مخالف نہ رہیں بخلاف دوسرے آئمہ کے کہ وہ ان جزئیات کی محض سندی قوت دیکھ کر ان سے کلیہ کی تخصیص کرنی شروع کردیتے ہیں۔ مثلاً آدابِ خلاء کے سلسلہ میں ابو ایوب انصاریؓ کی حدیث میں ایک کلیہ ارشاد فرمایا گیا:

اذا اتیتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولکن شرقوا اوغربوا۔

(بخاری و مسلم)

"جب تم استنجاء کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ رُخ ہو کر بیٹھو اور نہ قبلہ پشت ہو کر لیکن شرقاً غرباً بیٹھو (تاکہ قبلہ بغل میں رہے)"۔

یہ ایک حکم عام ہے جس میں استقبال واستدبار کو کسی مکان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا کیونکہ یہ حکم عظمت بیت اللہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے تاکہ افعالِ خسیسہ کے وقت قبلہ کا استقبال واستدبار نہ ہو کہ وہ صورت توہین بیت اللہ ہے اور تعظیم بیت اللہ فی نفسہ حسن اور ہر زمان ومکان میں مطلوب ہے۔ چنانچہ حکم کی یہ علت ایک دوسری حدیث میں صراحتاً مذکور بھی ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے:

اذا اتی احدکم البراز فلیکرم قبلة الله عز وجل فلا یستقبل القبلة۔ (

التعلیق الصبیح جلد اول صفحہ ۱۹)

"جب تم میں سے کوئی استنجاء کے لئے جائے تو چاہئے کہ قبلہ الٰہی کا اکرام کرے اس کا استقبال نہ کرے یعنی قبلہ رخ ہو کر نہ بیٹھے"۔

پس جبکہ اکرام بیت اللہ کی علت سے بحالتِ بول وبراز استقبال واستدبار قبلہ ممنوع تھا اور یہ علت فی نفسہٖ مطلوب ہونے کے سبب کسی قید سے مقید نہ تھی تو امام صاحبؒ نے مذہب کی اساس اس کلیہ کو قرار دے کر مطلقاً استقبال واستدبار کی حرمت کا فتویٰ دیدیا خواہ مکان ہو خواہ جنگل ہو بحالتِ قضاء حاجت استقبال قبلہ اور استدبار دونوں غیر جائز ہیں جس کے لئے اس حدیث کو بطور ایک کلی ضابطہ اور دستور العمل کے پیش فرمایا۔ مگر اس کلیہ کے خلاف حضور کے کچھ افعال ثابت ہوئے۔ چنانچہ حسب روایت بخاریؒ ومسلمؒ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حفصہؓ کے مکان کی چھت پر حضور کو قبلہ کی طرف پشت کئے ہوئے اور شام کی طرف رُخ کئے ہوئے پیشاب کرتے خود دیکھا۔ امام صاحب نے اپنے ذوق خاص سے جن کا ذہن کلی انضباط اور تعلیمات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔ اس جزئیہ سے متاثر ہوئے بغیر ضابطہ کلیہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور اس جزئی واقعہ کی ایسی توجیہات فرمادیں کہ وہ اس کلیہ کے خلاف نہ رہے کیونکہ کلیہ کا حکم جس علت پر دائر ہے یعنی تعظیم بیت اللہ وہ مکان اور صحراء ہر جگہ موجود ہے تو اس کو کسی ایسے جزئی واقعہ سے کیوں توڑا جائے جس کی نہ علت کا پتہ ہے نہ سبب کا۔ لیکن دوسرے آئمہؒ نے جن کا ذہن **تخصیصات** کی طرف زیادہ چلتا ہے اس کلیہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امام شافعیؒ نے اس کلیہ کا ہم پایہ جزئیات کو بناتے ہوئے یا اس جزئی واقعہ سے کلیہ سابقہ کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا کہ استقبال واستدبار مکان میں جائز اور اور صحرا میں غیر جائز۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ استدبار ہر جگہ جائز اور استقبال ہر جگہ غیر جائز۔

بہرحال یہ اختلاف اسی اصول استنباط کے اختلاف کے تابع ہے کہ اور حضرات نے صرف حکم حدیث پر

نظر فرمائی اور امام صاحب نے حکمت حدیث پر' اوروں نے ظہر حدیث لیا اور امام نے بطنِ حدیث کو آگے رکھا اور شارع علیہ السلام کا یہ منشاء پاکر کہ اصل مقصود حرمت بیت ہے اسے ہی بنیاد قرار دیدیا اب جو روایت اس کے خلاف آئی اس کی وجہ سے بنیاد کو منہدم نہیں ہونے دیا بلکہ اسے ہی بنیاد سے جوڑ دیا۔ پس ایک مقلد جو اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرے گا وہ درحقیقت ان اصول کی تقلید کرے گا جو ان مسائل میں سمائے ہوئے ہیں اور جبکہ ان میں تخالف ہے تو ان کی جزئیات میں بھی ہے یا مثلاً کہیں کہیں امام صاحب کسی ایک باب کے اصل موضوع کی روح پر مطلع ہوتے ہیں جو نصوص کتاب وسنت سے ان پر منکشف ہوتی ہے اور اس کو بنیاد قرار دے کر اس باب کی تمام روایات کے انتخاب کا معیار اسی روح کو قرار دیتے ہیں اور خلاف روایات کی ایسی توجیہہ فرمادیتے ہیں کہ اس روح پر کوئی اثر نہ پڑے لیکن دوسرے آئمہ مثلاً اس باب کی روح دوسری سمجھتے ہیں تو احکام میں اختلاف اس روح کے تفاوت سے پڑجاتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ کے بارے میں جب فعلی اور ترکی احادیث آتی ہیں تو امام صاحب اکثر و بیشتر ترکی احادیث کو اختیار کرتے ہیں اور فعلی احادیث کو ان کے تابع کرتے ہیں جیسے قرأۃ فاتحہ خلف الامام اور ترکِ قرآۃ فاتحہ کی روایات میں ترکِ قرأۃ کو' رفع یدین اور ترکِ رفع یدین میں ترک رفع کو' جہر آمین اور ترک جہر میں ترک جہر کو جہر بسم اللہ اور ترک جہر میں ترک جہر کو' نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لئے جمع بین الاشارۃ والتسبیح کی بجائے ترک جمع کو اختیار فرمایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام کے نزدیک نماز میں فعل پر ترک کو یا حرکت پر سکون کو ترجیح ہے۔ شاید اس بنا پر کہ امام کے نزدیک نماز کی بنا سکون پر ہے حرکت پر نہیں اور یہ لطیفہ امام پر آیات وروایات اور نماز کے انداز تشریع سے منکشف ہوا۔ مثلاً نماز کی اصلیت کے بارہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے :

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔

"نماز بھاری ہے مگر خشوع والوں پر"۔

اور خشوع کی حقیقت سکون ہے جو اولاً قلب میں آتا ہے اور پھر قالب پر' پھر اسی کے ساتھ امام نے نماز کی رفتار تشریع پر نظر فرمائی ہو کہ اس میں بھی حرکت سے سکون کی طرف آئے مثلاً پہلے نماز میں نقل وحرکت جائز تھی بعد میں نصِ حدیث سے منسوخ ہوئی اور سکون آگیا' پہلے سلام کلام جائز تھا بعد میں بنصِ حدیث اس سے روک کر سکوت کا حکم دیا گیا' پہلے اِلتفات (ادھر ادھر دیکھنا) جائز تھا بعد میں منسوخ ہو کر اس بارہ میں سکوت پیدا کردیا گیا' اولاً نشہ کی حرکات کے ساتھ نمازیں جائز تھیں بعد میں انہیں منسوخ کر کے نماز میں سکون پیدا کردیا گیا۔

بہرحال رفتار تشریع حرکت سے سکون کی طرف آنا تھا تو امام کے اس قلب صافی نے جو ایک اساسی رنگ تشریع سے مُنصبغ اور افتادِ شریعت کا محرمِ راز تھا یہ اخذ کیا کہ نماز میں اصل چیز سکون ہے۔ لہٰذا جتنا سکون ترقی کرتا جائے گا نماز کی حقیقت سے انتفاع زیادہ ہوتا جائے گا۔ شارع کی اس غرض کو پیش نظر رکھ کر امام کے نزدیک جب امام کے فعلی اور ترکی اُمور میں اختلاف وتزاحم واقع ہوا تو انہوں نے اسی رفتار اور لونِ اجتہاد کے ماتحت جانب سکون کو ترجیح دی اور تمام وہ روایت اختیار کرلیں جو اس رنگ پر مشتمل تھیں کہ ان کے نزدیک یہی روایات غرض شارع سے زیادہ اوفق تھیں۔ خواہ سنداً وہ کسی درجہ کی ہوں' مگر قابل احتجاج ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فعلی اور ترکی روایات میں سے عموماً فعلی روایات کو ترجیح دی ہے۔ قرأۃ فاتحہ کو اختیار کیا' رفع یدین کو ترجیح دی' جہر آمین کو منتخب فرمایا' جہر بسم اللہ کو اولیٰ کہا وغیرہ وغیرہ جس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ نے نماز کی ہیئت کذائی پر غور کر کے اسے فعل سمجھا ہے اور جب وہ از قسم فعل ہے تو اس میں افعال جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کا حسن بڑھتا جائے گا۔

حج میں اس کے برعکس قصہ ہے۔ امام صاحبؒ نے دیکھا کہ حج کی عبادت ہی حرکت ہے گھر سے نکلنا، بیت اللہ کے گرد گھومنا، صفا مروہ میں دوڑنا، عرفات کا سفر اختیار کرنا، منیٰ میں رمی جمار کرنا وغیرہ۔ غرض پوری عبادت ایک مستقل سفر اور متعدد انواع حرکات کا مجموعہ ہے۔ پس جتنے بھی افعال اور حرکات زائد ہوں گے، حج میں حسن پیدا ہوگا۔ اس لئے اس عبادت میں ان روایات کو ترجیح دی ہے جو کسی حرکت اور فعل پر مشتمل ہیں بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ کے انہوں نے حج میں اس کے برعکس جانب سکون اور تقلیل حرکت کی جہت کو اختیار فرمایا ہے۔ شاید اس لئے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک حج مظاہرۂ محبت ہے اور محبت کا ثمر ربودگی اور ترک ہے۔ ترکِ وطن، ترکِ لباس، ترکِ زینت، ترکِ خوشبو، ترکِ راحت، ترکِ لذّت وغیرہ اس لئے اس عبادت میں جتنے تروک بڑھتے جائیں گے اس کی حقیقت تام ہوتی جائے گی۔ مثلاً قارن کے حق میں امام صاحب کے یہاں دو طواف اور سعی ہے اور شوافع کے یہاں ایک طواف اور سعی ہے۔ وہ تکثیر فعل کی طرف گئے اور یہ تقلیل فعل کی طرف۔ اس قسم کی صدہا امثلہ کتبِ فقہ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بہر حال حجت احوال یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی غائر نظر ہمیشہ اصول اور تہہ کی طرف دوڑتی ہے اور وہ ہر مسئلہ کی لِم اور اس کی اندرونی بنیاد تک پہنچ کر غرض شارع کا پتہ چلاتے ہیں۔ اسی باطنی غرض اور حکمت کے معیار سے روایات کے احکام کے درجات قائم کرتے ہیں اور ان میں تطبیق وتوفیق دیتے چلے جاتے ہیں اسی لئے ان کے فقہ میں کلیات، تعمیمات اور ہمہ گیری بہت زیادہ ہے۔ دوسرے حضرات حکم دیکھتے ہیں اور اسی کو اصل قرار دے کر روایات پر نظر کرتے ہیں تو احکام میں تعداد اور تکثیر تو زیادہ ہوتی ہے مگر انضباط تسلسل اور ترتیب اس طرح کی نہیں آتی کہ ہر ہر جزئیہ کسی نہ کسی اصل اصل سے جُڑا ہوا نظر آئے اور ہر ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے مربوط دکھائی دے۔

ظاہر ہے کہ تسلسل اور ترتیب میں انضباط ہوتا ہے اور دوسری صورت میں تکثیرِ احکام، اسی لئے فقہ حنفی میں ترتیب وتسلسل اور جامعیت واجتماعیت کا رنگ غالب ہے اور دوسرے فقہیات میں تکثیر احکام اور تکثیرِ جزئیات کا رنگ غالب ہے اور کلیاتی دائرہ محدود ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ مخصوص رنگ کے اصول اپنے اپنے فقہ کے تمام ابواب اور ساری ہی اجتہادی فروع میں رچے ہوئے ہوں گے گویا ایک فقہ کے سارے مسائل کی تشکیل یہ ایک ہی رنگ کے اصول کریں گے تو اس پورے فقہ کا ایک مزاج قائم ہو جائے گا جو اپنے امام کے ذہنی مزاج کے مطابق ہوگا۔ پھر وہی ذہنی مزاج ان کا بھی بنے گا۔ جو اس فقہ کی تقلید کریں گے۔ کیونکہ مربوب کی ذہنیت مربی ہی کی ذہنیت سے بنتی ہے۔ اس صورت میں دو فقہوں کی جزئیات خواہ کتنی ہی غیر متبائن ہوں اور بظاہر سطح تناقض سے کتنی ہی بعید ہوں، مگر یہ ذوقی الوان اور اصول استنباط کا تناقض ان میں رچ کر انہیں اصولی طور پر متضاد بنادے گا اور یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تقلید حقیقۃً جزئیات کے پردہ میں ان اصول کی ہوتی ہے جو ان جزئیات کو پردۂ ظہور پر لاتے ہیں اور وہ متعارض ہیں تو وہی تضاد پھر باقی رہا۔ جزئیاتی نہ سہی کلیاتی سہی اور جبکہ یہ اصول وکلیات ہی اصل میں محل تقلید ہیں تو خاص کی نظر میں یہ تضاد اس سے اشد ہوگا جو جزئیاتی تھا کہ جزئیات تقلید کے بارہ میں اصل ہی نہ تھیں۔ یہ اصول ہی اصل تھے اور اصل کا فساد فرع کے فساد سے عقلاً وشرعاً مہلک تر ہوتا ہے۔

پس ایسے اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے دو فقہین کا بیک دم تقلید کیا جانا بالفاظ دیگر ایک فقہ کی تربیت

کے ہوتے ہوئے دوسرے فقہ کی تربیت کا رنگ اس پر چڑھایا جانا علاوہ تربیت کی دو عملی اور تضاد حالی کے ہر مربی امام کی تربیت کو ناقص اور نکما بنالینا ہے۔

مثلاً اگر امام ابو حنیفہؒ ان ہی اصول استخراج پر نماز کے ذریعہ سکون اور حج کے ذریعہ حرکت کا ذوق حامل فقہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں اور شافعی اس کے برعکس اور اس ہرجائی مقلد نے نماز حنفی اصول پر پڑھ کر حج شوافع کے طریق پر کرلیا تو ذوق حرکت اسے کسی طرف سے بھی نہ مل سکے گا۔ کیونکہ اس کی نماز تو ساکن ہی رہی حنفی اصول پر اور حج ساکن رہا شافعی اصول پر حالانکہ جو امام اپنے ذوق اجتہاد سے اس میں نماز کا سکون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اسی ذوق سے اس میں حج کی حرکت بھی رائج کرنا چاہتا تھا کہ اس مجموعہ ہی سے اس کے نزدیک مقلد کی ذہنیت میں صحیح توازن پیدا ہو سکتا تھا اور اسی میں اس کی روحانی فلاح تھی لیکن جبکہ اس مقلد نے آدھی تربیت ایک سے کرائی اور آدھی ایک سے اور وہ بھی دونوں جانبین کے سکون عبادت ہی کی جہت لے لی تو اوّل تو کسی امام کے رنگ پر بھی اس کی تربیت مکمل نہ ہوئی اور جتنی ناقص بھی ہوئی وہ بھی دو رخی مقام کی صرف ایک ہی جانب پر مشتمل رہی گویا یہ مقلد ناقص بھی رہا اور ایک جہت سمجھنے سے بھی خالی رہا اور اوپر سے کلیاتی تضاد حال کا شکار بھی ہو گیا۔ جو اس کے فساد مزاج کا پورا پورا سامان ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض 'یونانی طبیب کا علاج کراتے ہوئے بعض ڈاکٹری ادویہ بھی استعمال کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ادویہ میں کوئی تعارض نہیں لیکن ادویہ کے مخفی سلسلہ میں جس کو روش علاج اور طریق تدبیر کہنا چاہئے۔ اصولی تعارض ضرور موجود ہے جو مریض کے مزاج کو فاسد کردینے کے لئے کافی ہے کیونکہ ڈاکٹر اپنے اصول اور روش علاج کے ماتحت مثلاً مریض کو ____ دودھ کی تاکید کرے گا اور طبیب اپنی روش فن کے لحاظ سے اس سے روکے گا' ڈاکٹر مثلاً پھلوں کا استعمال ضروری قرار دے گا اور طبیب اس سے مانع آئے گا۔ ڈاکٹر ایک غذا تجویز کرے گا۔ طبیب اس کے خلاف دوسری۔ غرض ایک جزوی دوا کے استعمال میں تو بظاہر کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا تھا مگر یہ دوا جس مجموعی روش اور جن ڈاکٹری اصول کے نیچے آئی ہوئی ہے وہ یقیناً اس روش و اصول کے معارض ہیں جو طب یونانی کی ادویہ کی پشت پر ہیں اس ایک جزوی دوا کے راستہ سے یہ اصولی تعارض مریض پر متضاد آثار ڈالے گا اور مریض اس حالت میں زیادہ دن اپنی خیر نہیں منا سکے گا مگر اس مخفی مضرت کو عوام نہیں صرف اطباء ہی پہچان سکتے ہیں جن کے قول پر اعتماد کرنے کے سوائے مضرت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

عدم تقلید یا نقیضین میں دائر سائر رہنے کے چند واضح مفاسد

ساتھ ہی اس پر غور کیجئے کہ اس ہرجائی پن اور نقیضین میں دائر رہنے کی عادت کا طبعی اثر ایک دوسری نوعیت مفاسد کی یہ ہوگی یہ شخص کئی کئی آئمہ اور مفتیین کی طرف رجوع کرتے رہنے کی حالت میں اپنے نفس کے لئے سہولیات تلاش کرنے کا عادی ہو جائے کہ جدھر سہولت دیکھی اُدھر ہی سے فتویٰ لے لیا اور ادھر کا مقلد بن گیا۔ اس صورت میں گویا یہ تقلید غیر معین غلبہ ہوا دھوس کے ماتحت اس کی مطلب برآری کا ایک آلہ اور حیلہ ہوگی وہ ان کئی آئمہ کے پردہ میں درحقیقت مقلد اپنے نفس کا ہو گا۔ جس کے سامنے طاعت حق نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اپنی راحت و سہولت و نفسانی شہوت ہوگی مثلاً ایک شخص نے وضو کیا اور پھر خون نکلوایا جس امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وضو ٹوٹ گیا تو اس نے کہا کہ میں امام شافعیؒ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کے بعد عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا جس سے امام شافعیؒ کو نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے تو اس نے کہا کہ میں امام ابو حنیفہؒ کا فتویٰ لیتا ہوں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور بلا تجدید وضو نماز پڑھ لی چونکہ اس

شخص کا وضو بالاجماع ٹوٹ چکا ہے گو سبب مختلف ہوئے اس لئے اس کی نماز سب کے نزدیک باطل ہوئی مگر یہ اپنے نزدیک پھر بھی اپنے کو متوضّی اور مصلّی سمجھ رہا ہے۔ جس سے علاوہ فرق اجماع کے مفسدہ کے اس شخص کی ساری تحقیق اور تقلید کا حاصل حظِّ نفس اور مطلب بر آری کے سوا کچھ نہ نکلا گویا اس کا دین اس کے ہوا کے تابع ہو گیا نہ کہ ہواء نفس دین کے تابع ہوئی حالانکہ صریح ارشاد نبویؐ ہے :

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤمن احدکم حتٰی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ

"عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے"۔

پھر فروع میں اس قسم کی آزادی کا خوگر ہو جانے سے اصول میں ایسی آزادی کا آجانا غیر مستبعد نہیں رہتا بلکہ عادۃً ایسا ہو رہا ہے حالانکہ بنصِ حدیث شبہات میں پڑنے والا بالآخر حرام میں پڑ کر رہتا ہے۔

بہرحال ایسا مقلد عام جو بلا تعیین مختلف ائمہ کی تقلید کا خوگر ہے وہ یقیناً نقیضین میں دائر سائر رہے گا خواہ وہ تناقض جزئیاتی ہو یا کلیاتی۔ ساتھ ہی ان متخالف اجتہادات کے آثار سے اس کا روحانی مزاج بھی فاسد ہوئے بغیر نہ رہے گا یا ہواء نفس اس کے دین پر غالب آجائے گی یا وہ رضاء حق کا طالب نہ رہے گا یا اجماع امّت کا ربقہ گلے سے نکال پھینکے گا اور نتیجۃً فروعات کی آزادی اصول تک پہنچ جائے گی اور اصول کو بھی حظِ نفس اور مطلب بر آری ہی کا ذریعہ بنا کر بالآخر سرے سے دین کو کھو بیٹھے گا یہی وجہ ہے کہ روحانی تربیت اور نفسانی معالجہ کے سلسلے میں جس کے اطباء انبیاء علیہم السلام ہیں ایک نبی کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے دوسری شریعت اور نبی کو حق جاننے کے باوجود اس پر عمل کرنے کی خاص طور سے ممانعت فرمائی گئی ہے ادب تو اتنا کہ ایک نبی اور اس کی شریعت کے انکار پر پورا دین حبط لیکن احتیاط اس پر یہ کہ اس سچے نبی کے ایک جزئیہ پر بھی بلا اجازت نبی زمان عمل غیر جائز اور ممنوع جس کا راز یہی ہے کہ ہر شریعت کی تربیت کا رنگ جدا جدا ہے۔ نفس میں ان کے متضاد آثار پیوست ہونے سے اس نفس کی ہلاکت ہے نہ کہ تقویت' چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضورؐ کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہود کی بعض باتیں ہمیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں اگر اجازت ہو تو لکھ لیا کریں؟ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا :

اَمُتَھَوِّکُوْنَ انتم کما تھوکت الیھود والنصارٰی لقد جئتکم بھا بیضاء نقیۃً ولو کان موسٰی حیاً ما وسعہ الا اتباعی۔

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"کیا تم اپنے احکام دین کے بارہ میں ابھی تک حیرت میں پڑے ہوئے ہو کہ دوسروں کی باتیں لکھنا چاہتے ہو؟ بلاشک میں تمہارے پاس ایک صاف اور روشن شریعت لے کر آیا ہوں۔ اگر موسیٰ بھی آج زندہ ہوتے تو انہیں میرے اتباع کے سوا چارۂ کار نہ تھا تو پھر تمہیں انکا اور ان کی شریعت کا اتباع کب جائز ہے؟"۔

اس اصول پر مربیان باطن' حضرات صوفیا کرام قدس اللہ اسرارھم نے اپنے طریق تربیت کی بنیاد بھی توحید مطلب پر رکھی جس کا حاصل یہی ہے کہ ایک شیخ سے وابستہ ہو کر دوسرے کی طرف عملی رجوع کرنا باعث تباہی نفس ہے۔ ادب و تعظیم بلا استثناء سب کا ضروری ہے لیکن اِتّباع صرف ایک کا کہ ہر مربّی باطن کا

رنگ ذات ہی الگ ہے۔ اس سے پیدا شدہ اصولی تربیت کا رنگ بھی جدا جدا ہے اور اسی رنگ کے مطابق پروردوں کے نفوس پر احوال وکیفیات بھی اسی رنگ کے طاری ہونے ضروری ہیں۔ پس اگر توحید مطلب باقی نہ رہے بلکہ طالب وسالک اپنے تلون کے تحت مختلف مشائخ میں دائر سائر پھرتا رہے تو اس میں یکسوئی' ایک رنگی اور دل جمعی کی دولت کبھی پیدا نہیں ہوسکتی جو تمام کمالات باطن کی اساس ہے اور اس لئے اسے تمام عمر کبھی بشاشت و تمکین میسّر نہیں آسکتی جس کے لئے ساری ریاضات کی جاتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ طریقِ نبوت ہو یا طریق ولایت دونوں میں توحید مطلب کے بغیر تربیت کا کام نہیں چل سکتا۔ پھر اسی طریق کی روشنی میں اطباء جسمانی کو بھی توحید مطلب بنام توحید مطب اختیار کرنی پڑی کہ اس کے بغیر مریض کی صحت ہی متوقع نہیں ہوسکتی ــــ

پس جو انتظام انبیاء علیہم السلام نے اپنی شان تربیت کو مؤثر بنانے کے لئے کیا۔ اولیاء نے اپنی شان معالجہ کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔ اطباّء نے اپنے طریق علاج کو نتیجہ خیز کرنے کے لئے کیا جس کا نام توحید مطلب یا توحید مطب ہے وہی انتظام بعینہٖ فقہاء ملّت نے اپنی شرعی راہنمائی اور دینی تربیت کو پر اثر اور مثمر بنانے کے لئے فرمایا اور اپنی فقہی توحید مطلب کا نام تقلید شخصی یا تقلید معین رکھ کر یہ شرعی مطب کھول دیا تاکہ ایک ہی فقہ کو اپنا دستور زندگی ٹھیرا کر اور کئی کئی فقہیات اور فقہاء کے مخالف آثار تربیت کا شکار نہ بن کر اپنے دین کو یکسوئی اور طمانینت سے عمل پیرا رہے کہ اس کے بغیر تشویش وپراگندگی اور مذکورہ مفاسد کے بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہیں یہی وجہ ہے کہ قرونِ خیر گزر جانے کے بعد دانایانِ امّت نے نظم ملّت قائم رکھنے اور اسے تشتت وپراگندگی سے بچانے کے لئے اجتہاد و تقلید کا یہ ایک خاص نظام قائم کیا کہ نہ امّت کو اجتہاد میں آزاد چھوڑا کہ ہر شخص مجتہد بن کر کتاب وسنت کو اپنے آراء وقیاسات کا کھلونا بنالے اور نہ تقلید میں آزاد چھوڑا کہ جس کی چاہے اور جتنوں کی چاہے تقلیدات میں چکر کھا کر اپنے نفوس کو تباہ کرلے بلکہ اجتہاد کا دائرہ بھی محدود رکھا جیسا کہ وہ تکوینا بھی محدود تھا اور تقلید کا دائرہ بھی تنگ کیا جیسا کہ وہ عقلاً تنگ ہی تھا کہ غیر معین نہ ہو اور معین ہو کر بھی ایسے فرد کی ہو جو علم وعمل' ورع وتقوی' شعور تشریع' علم لدنی' ادراک خواص واحکام' انکشاف اسرار وعلل وجدان ظواہر وبواطن' احساس وجزئیات وکلیات' شریعت میں یگانہ ہو' حاذق ہو اور اوپر سے اس کی یہ علمی وعملی قوت اسباب سے بالاتر ہو کر ایک موہبت الٰہی ہو جس کے ماتحت وہ اس آیت کا سچا مصداق ہو کہ :

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ۔

"اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے امر کی ہدایت کرتے ہیں جبکہ انہوں نے صبر اختیار کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے رہے"۔

یہاں صبر کے لفظ سے قوّتِ عملیہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام طاعات کا مبداء صبر ہے۔ یعنی وہ صبر علی الطّاعات ــــ اور صبر بین الشّہوات میں راسخ القدم ہو جو مطلق عمل سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو حدیث جبریلؑ میں احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ ادھر ایقان سے قوّتِ علمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ علوم کی اساس یقین صادق ہی ہے۔ یعنی وہ پوری شریعت اور اس کے جزوی اور کلی مقاصد کے بارہ میں کمال یقین کے ساتھ درجہ معرفت پر آیا ہوا ہو جو ایمان سے آگے کا مرتبہ ہے جس کو قرآن نے اطمینان سے تعبیر کیا ہے۔

سلَف میں تقلیدِ معیّن عام تھی

چنانچہ سلَف سے لے کر خلَف تک اخلاقی مسائل میں ایسے ہی جامع افراد کی تقلید معیّن بطورِ دستور العمل کے شائع ذائع رہی اور قرن صحابہؓ ہی سے اس کا وجود شروع ہو گیا تھا مثلاً حدیث حذیفہؓ میں جس کو ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے:

انی لا ادری ماقدر بقائی فیکم فاقتدوا باللذین من بعدی واشار الی ابی بکرؓ وعمرؓ۔

"مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگوں میں کب تک زندہ رہوں گا؟ سو تم لوگ ان دونوں کا اقتدا کیا کرنا اور اشارہ سے ابوبکرؓ و عمرؓ کو بتلایا"۔

ظاہر ہے کہ مِنۡ بَعۡدِیۡ سے ان دونوں حضرات کی حالت خلافت مراد ہے کیونکہ بلا خلافت تو ہر دو حضرات حضورؐ کے سامنے بھی موجود تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلیفہ ہونے کی حالت میں ان کا اتباع کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ خلیفہ ایک ہی ہوں گے نہ کہ دونوں اکٹھے ____

اس لئے حاصل یہ ہوا کہ صدّیق اکبرؓ کی خلافت میں ان کا اور خلافت فاروقی میں ان کا اتباع کرنا۔ پس حضورؐ نے ایک زمانہ خاص تک ایک معیّن شخص کے اتباع کا دین میں حکم فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ ان سے دلیل بھی ہر مسئلہ کی تحقیق کیا کرنا اور نہ یہ عادۃ مستمرہ تھی۔ یہی تقلیدِ شخصی ہے کہ عملی مسئلہ پیش آنے پر کسی ایک عالم سے رجوع کر کے اس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے لیکن دلائل کے پوچھنے کا کوئی التزام نہ تھا چنانچہ لوگوں کے سوال کرنے پر ان کے جو فتاویٰ روایات میں مذکور ہیں ان میں نہ دلیل کا سوال ہے نہ دلیل کا اظہار۔ یہی تقلیدِ شخصی تھی کہ ایک پورا ملک جمع ہو گیا اور بلا استفسار دلیل کے اس کے فتاویٰ پر عمل کرنے لگا۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہی مسئلہ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا تو انہوں نے ابو موسیٰؓ کے خلاف بتایا۔ جب ابو موسیٰ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ جب تک یہ حبر تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ مت پوچھا کرو۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو تمام مسائل میں ایک طرف لگا دینا اور لوگوں کا اس پر عمل درآمد کرنا جس میں مطالبہ دلیل کا کوئی سوال نہیں۔ پس یہی تقلید شخصی ہے۔

اہل مدینہ عموماً حضرت زید بن ثابتؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ عکرمہؓ کی روایت بخاری میں ہے کہ لوگوں نے ابنؓ عباسؓ سے کہا کہ ہم زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کے امام و مفتی حضرت زید بن ثابت تھے اور لوگ ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرتے تھے خواہ وہ نص سے حکم دیں یا عدم نص کی صورت میں قیاس سے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا قرآن کے **سبعۃ احرف** کو حرف واحد پر **مقتصر** فرما دینا اور تمام محروسہ ہائے اسلامی میں صحابہؓ و تابعینؒ کا اسی کو عملاً قبول کر لینا اتباع و تقلیدِ معیّن نہیں تھا اور کیا تھا؟ ____ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح حکم حدیث تو موجود نہ تھا۔ ایک علت پر جس کو حضرت ذی النورین کے تفقہ نے ادراک کیا یہ حکم دائر تھا جبکہ ان کے نزدیک اس علت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ حکم **سبعۃ احرف** بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کی روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس قیاسی حکم کو سب نے قبول کر لیا اور کسی نے بھی مطالبہ دلیل نہ کیا۔ اسی طرح اور قیاسی احکام میں بھی قرن صحابہؓ میں تقلید شخصی کی گئی ہے جیسا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کا واقعہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے غلہ اس شرط پر قرض دینے

کو ناپسند کیا کہ وہ دوسرے شہر میں ادا کیا جائے اور فرمایا کہ کرایہ باربرداری آخر ادا کرنے والا کس سے لے گا؟ اس فتویٰ پر لوگوں نے عمل کیا۔ اور یہ قیاس سے فتویٰ دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بارہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔

پس تقلید بھی ہوئی اور ہوئی قیاسی حکم میں۔

بہرحال تقلید شخصی کا عمل قرنِ سلف میں رائج تھا آج چونکہ اس کے بغیر لوگ طرح طرح کے علمی و عملی مفاسد کا شکار ہیں جن کی تشریح ابھی عرض کی گئی کہ اجتہاد کی آزادی سے فتنہ شبہات پھیلتا ہے اور تقلید کی آزادی سے فتنہ شہوات بڑھتا ہے۔ اس لئے قدرۃً اس میں وجوب کی شان پیدا ہو گئی کہ وہ واجب کا مقدمہ بن گئی اور اس کے بغیر اتباع ہواء سے محفوظ رہنا عادۃً محال ہو گیا۔ اس لئے تقلید شخصی بھی ضروری اور واجب ہو گئی ہے۔ مگر واجب بالغیر۔ قرونِ اولیٰ میں یہ غیر یعنی فتنہ شبہات و شہوات شائع نہ تھا۔ اس لئے یہ تقلید معیّن جواز کے درجہ میں تھی۔ آج شائع ہے اس لئے وجوب کے درجہ میں ہے۔

الحاصل مطلق تقلید اور تقلیدِ معیّن کتاب و سنت کی روشنی میں ایک ثابت شدہ اور معمول بہ مسئلہ واضح ہوئی۔ مطلق تقلید تو بنص قرآنی:

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"علم والوں سے سوال کرو اگر تم علم نہیں رکھتے"۔

اور تقلید معیّن بوجہ مفاسدِ مذکورہ اصول کتاب و سنت، احادیث باب، تعامل سلف، اجماع امت اور نبض شناسانِ امتِ مرحومہ کے تجربات وغیرہ سے واجب ثابت ہوئی اور غیر مجتہد کے حق میں ضروری نکلی۔ مگر صرف مسائلِ اختلافیہ میں کہ انہی مسائل میں **نقیضین** کا اجتماع یا **نقیضین** میں دائر سائر رہنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی تھی جو دین کے نقطۂ نظر سے محال ہے کہ دین میں تناقض محال ہے۔

اسی لئے عامۂ تمام اکابر امت اور ہر قرن کے علماء فحول جو اجتہادی شان تک رکھتے تھے تقلید معیّن کے دائرہ سے باہر نہیں ہوئے۔ بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکثر و بیشتر اربابِ سُنن و جوامع مقلد ہی ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے عام محققین اور خصوصاً ولی اللّٰہی خاندان اور سلسلہ کے تمام وہ اکابر جن کی تحقیقات اور لطائف و معارف آئمۂ اجتہاد کا دور یاد دلاتی ہیں۔ خود اپنے لئے اور اپنے حلقۂ اثر کے لئے تقلیدِ معیّن ہی ضروری سمجھتے رہے اور کبھی اس کے حلقہ سے باہر نہیں ہوئے۔

دین کے بارہ میں یہی وہ اُسوہ ہے جو بطور توارُثِ علماء دیوبند تک پہنچا اور اسی راہ پُرامن پر دارالعلوم دیوبند نے راہ روی اختیار کی۔ حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ بانی و سرپرست اوّل دارالعلوم، حضرت مولانا محمد رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ صدر مدرس اوّل و سرپرست ثالث دارالعلوم، حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ صدر مدرس ثانی و سرپرست رابع دارالعلوم، حضرت حکیم الاُمت علامہ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سرپرست خامس دارالعلوم، حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ صدر رابع دارالعلوم وغیرہ وغیرہ جن کی تقاریر اور تحریرات دریائے اجتہاد کی نہریں معلوم ہوتی ہیں بایں تحقیق نظر و فکر تقلید معیّن کے دائرہ سے نہ کبھی خود باہر ہوئے نہ اپنے حلقہ ہائے اثر کو باہر ہونے دیا۔ پھر ان حضرات کے ہزارہا تلامذہ اور شاگردانِ رشید۔ پھر دارالعلوم کے ہزارہا فروعی مدارس جو ہند و بیرونِ ہند میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے محقق علماء اور ان کے حلقہ ہائے اثر اسی پرانے مسلک پر جمے رہے اور لوگوں کو جماتے رہے۔

بالخصوص حضرت بانیٔ دار العلوم (قاسم العلوم والخیرات) نے اپنے مخصوص رنگ سے امام ابو حنیفہؒ کی تقلید بھی کی اور ساتھ ہی محققانہ انداز سے تمام فقہ اور کلام کا اصولی فلسفہ بھی اسی انداز سے کھول کر دکھلایا کہ تقلید ایک مستقل تحقیق نظر آنے لگی اور جس کی بدولت دار العلوم کے یہ ہزارہا فضلاء اور شاگرد ان شاگرد بھی رہے اور محقق فی التقلید بھی ہوئے۔ اسی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان حضرات نے اسی مسئلہ تقلید کے ذریعے سے لوگوں کے دین کی حفاظت کی۔ ورنہ ایک طرف سے ملک کا جاہل طبقہ جس کی ملک میں اکثریت تھی فکر وخیال پر اس درجہ قیود و بند عائد کر چکا تھا کہ اپنی آبائی رسوم کو اسلام اور رانہی کی کورانہ تقلید کو پیروی اسلام سمجھ کر ہر کس و ناکس کی تقلید میں گرفتار تھا جس سے ان میں طرح طرح کی بدعات و محدثات رچ گئی تھیں۔

اور دوسری طرف سن ۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم اور اس سے پیدا شدہ آزاد خیال کے سبب فکر وخیال کی وہ آزادی پھیل چکی تھی کہ ہر شخص مجتہدِ مطلق ہونے کا مدعی اور اسے اپنا جائز حق سمجھ رہا تھا۔ جزئی عقول دماغوں پر اس درجہ مسلّط ہو چکی تھیں کہ مذہبی نقل و روایت کے ردو قبول کا معیار ہی یہ عقول رہ گئی تھیں۔ غرض ایک طبقہ تقلید جامد کا شکار تھا اور ایک طبقہ اجتہاد مطلق کے خیال میں غرق تھا۔ ایک نے طبقہ تقلید بلکہ رابقہ تقلید ہی کو گلے سے اتار پھینکا تھا۔

ایک نے تقلیدی افراط میں گرفتار ہو کر ہر ہر صاحب سجادۂ و دلق بلکہ ہر ہر مدعی کی تقلیدِ مطلق کرنے کا نام دین رکھ چھوڑا تھا۔ پس جامد مقلد یا بہت سوں کے سامنے جھکنے والے بہت سوں کے افعال کی اقتدا کرتے کرتے بدعات و محدثات کا شکار ہوئے اور فتنہ شہوات میں جا گرے اور آزاد خیال کسی کے ایک بھی سامنے نہ جھکنے کی خو پیدا کر کے اپنی عقل کے بندے بن گئے تھے۔ جو ان کی عقل میں آیا مان گئے جو نہ آیا انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ لوگ فتنہ شبہات میں جا پھنسے تھے۔

اگر یہی لیل و نہار رہتے تو ہندوستان کی پوری دنیا شبہات و شہوات میں پھنس کر کلیۃً اپنا دین کھو چکی ہوتی۔ خدا رحمتیں نازل کرے ان سلاطینِ امت اور مجدّدینِ دین پر کہ انہوں نے اجتہاد و تقلید کا وہی معتدل اور درمیانی نکتہ پکڑ کر جو حقیقۃً کتاب و سنت کی روح تھا اس امت کو سنبھالا اور ہند اور بیرون ہند میں حنفیت اور حنفیت کی جڑیں مضبوط کر دیں۔ دائرہ تقلیدِ معیّن کو بھی نہ چھوڑا اور شانِ تحقیق کو بھی ہاتھ سے نہ دیا اور پھر ایک طرف کتاب و سنت کے علم وسیع کا روشن مینارہ دلیل راہ بنایا اور دوسری طرف ریاضت و مجاہدات کر کے معرفتِ نفس اور معرفتِ ربّ کی منازل طے کیں جس سے ان کا علم منقول سے معقول بنا اور پھر معقول سے محسوس ہو کر مشاہدہ میں آ گیا یعنی جو علم اوپر والوں سے سنا تھا پہلے اسے استدلال سے سمجھا اور پھر اس کے استعمال سے اسے اپنا حال بنا لیا جس سے پوری شریعت اپنے ظہر و بطن کے ساتھ ان پر منکشف بھی ہوئی اور ان کا حال ہو کر ان کی طبیعت بھی بن گئی۔

لیکن غور کیجئے کہ اس انکشافِ تام اور ان کمالاتِ ظاہر و باطن کے ہوتے ہوئے بھی جبکہ ان جیسے مانے ہوئے محققین اور عارفین نے بھی تقلید کا دامن دینی تحفظ کی خاطر کبھی نہ چھوڑا تو ایک ایسے دور میں جبکہ ہم لوگوں کا علم تو مضمحل ہو کر رسمی سا رہ گیا ہے اور اسلام کمزور ہو کر اسمی سا ہو گیا ہے۔ تقویٰ و طہارت اور عمل کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ فہم عالی گویا کہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ کام کا وجود نہیں ہے اور دعاوی بے شمار ہیں۔ حیرت ہے کہ آج کے بہت سے بزرگوار اس سیدھے سادے محافظ دین طریق عمل یعنی تقلید معیّن سے جو سلف کے وقت سے اسی تحفظِ دین کی خاطر معمول بہ ہے کس سہولت سے روگردانی فرما رہے ہیں؟

مناسب تو یہ تھا کہ خود بھی اس طریق عمل کو اختیار فرماتے کہ اس میں کوئی برائی نہ تھی لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم اس راہ کے اختیار کرنے والوں پر ملامت نہ فرماتے کہ اختیار کرنے والوں نے بہرحال کسی بدعت یا شرعی مذموم کو اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ایک حجت کے ساتھ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اپنے دین کی حفاظت کر سکیں جیسا کہ سلف نے بھی اور بعد میں پوری امت نے بھی امن اسی میں دیکھا تھا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس مسلک اور اس کے سالکین کو ہر طعن کا مخاطب بنایا گیا اور کسی قسم کے حملوں سے احتراز بھی نہیں کیا گیا۔

کہیں کہا گیا کہ مقلد جھگڑالو ہوتے ہیں اور لڑتے ہیں، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین نے غیر مسلک والوں پر تعدیات کیں جس کے لئے تاریخی شواہد لائے جاتے ہیں تاکہ منافرت کا تخم کافی مضبوطی کے ساتھ دلوں میں جم جائے اور برگ لے آئے، کہیں کہا جاتا ہے کہ مقلدین یا احناف نے حکومت کے زور سے اپنے مسلک کو پھیلایا ہے گویا فقہ حنفی یا دوسرے فقہیات عیاذاً باللہ خرافات کا مجموعہ تھے جن میں نہ کوئی معقولیت تھی نہ کشش۔ اس لئے جبری اشاعتوں کی بدولت زور زبردستی سے دنیا میں پھیلائے گئے؟

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات ہیں جو مذاہبِ اربعہ اور ان کے ماننے والوں کی نسبت شائع کئے جاتے ہیں۔ مجھے ان خیالات کا اس تحریر میں جواب دینا نہیں ہے کیونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس تحریر کا موضوع کوئی ردّ وقدح یا مناظرہ نہیں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس قسم کے خیالات وافکار کم سے کم محقق علماء اور مربیانِ امّت کے شایانِ شان نہیں۔ اگر کسی فرد یا جماعت میں شخصی یا جماعتی کمزوریاں ہوں تو اس میں مسلک یا مذہب کا کیا دخل ہے کہ وہ اس کی طرف منسوب کر دی جائیں؟ اگر آج مسلمان اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں سر پھٹول روا رکھتے ہیں تو اس میں اسلام کا کیا دخل ہے اور کس طرح جائز ہوگا کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کو اسلام کا ثمرہ کہا جائے؟

بہرحال مقلد یا غیر مقلد کسی وقت بھی باہم غیر مناسب انداز سے باہم آویزش کرنے لگیں تو اس میں تقلید اور عدم تقلید کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ یہ محض ان کے جذبات ہیں جو اپنے ہی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کا نہ کسی شرعی مسئلہ سے تعلق ہے اور نہ کسی شرعی مسلک سے، اجتہاد و تقلید جیسے شرعی مسائل اپنی جگہ ہیں اور یہ کمزوریاں اپنی جگہ، ان کمزوریوں پر اعتراض اپنی جگہ کتنا ہی صحیح ہو مگر ان شرعی مسائل یا ان کے ماننے والوں پر کسی حالت میں بھی وارد نہیں ہو سکتا۔

بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ پر ہر وقت حاصل ہے لیکن اسی حد تک کہ مبتلی متنبّہ ہو جائے نہ اس حد تک کہ یہ امر بالمعروف ہی ایک مستقل نزاع بن کر محاذ قائم کر دے اور باہمی منافرات کی تخم ریزی اور آبیاری کرنے لگے۔

اس لئے میری درمندانہ گزارش ہے کہ مسائل کو مسائل کے درجہ میں رکھ کر تمام حضرات خواہ وہ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں یا ترکِ تقلید سے تعلق رکھتے ہوں۔ نفسِ دین کے تحفظ میں اجتماعی جدوجہد صرف کرنے کی فکر فرمائیں اور فروعی مسائل کے اختلافات میں جو آج سے مختلف فیہ نہیں صحابہؓ ہی کے وقت سے مختلف فیہ چلے آ رہے ہیں۔ ایک اختلافی جہت کے ماننے والوں کی طرف سے یہ حجت کافی خیال فرمالیں کہ فلاں طبقہ، فلاں فقیہ کے فتاویٰ پر عمل کر رہا ہے۔ مخترع اور مبتدع نہیں ہے۔ یہ حجت ہر زمانہ میں ایسے مسائل میں قاطع سمجھی گئی ہے نہ کوہ مورثِ نزاع۔ اس لئے خدارا آج بھی اس حجت کو قاطع نزاع ہی بنائیے نہ کہ موجبِ نزاع۔ ضرورت ہے کہ سب حضرات باہمی اشتراکِ عمل سے پوری قوم کی تعمیر کی فکر فرمائیں اور یہ سب مل کر

ایسے لائحہ عمل پر غور کریں جو مسلمانوں کو ایک سطح پر لا سکے اور معاندین اسلام کی مخفی ریشہ دوانیوں کا کسی حد تک سدِّباب کر سکے۔

حضرات! اپنے باہمی اتحاد میں کم سے کم حضرات صحابہؓ کے اس اُسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنالینا چاہئے کہ قرآن کریم کی بعض شاذ آیات جن کو صحابہؓ کے اجماع نے قرآن کریم کا جزو تسلیم نہیں کیا۔ بعض حضرات صحابہؓ کے پاس موجود تھیں جو انہیں خلاف اجماع قرآن کا جزو جانتے تھے لیکن کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ارباب اجماع نے مخالفین کے اجماع کے خلاف یا مخالفین اجماع نے ارباب اجماع کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔

پس حضرات مقلدین جبکہ ترک تقلید کو خلاف اجماع سمجھتے ہیں تو وہ تارکین تقلید کے بارہ میں ان حضرات صحابہؓ کا اُسوۂ اختیار فرمائیں۔ جنہوں نے اپنے اجماع کے باوجود مخالفین اجماع کے خلاف نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کسی جنگ کا آغاز کیا۔ بلکہ تفہیم کا حق ادا کر دینے کے بعد ان کی تحقیق پر انہیں معذور سمجھ کر ہمیشہ چھوڑے رکھا۔

ادھر حضرات منکرین تقلید اگر تقلید کو باوجود اجماع امت کے قابلِ قبول نہیں سمجھتے تو وہ ان حضرات صحابہؓ کا راستہ اختیار فرمائیں جنہوں نے شاذ آیات کے بارہ میں اپنی تحقیق نہیں چھوڑی تو اجماع کنندوں کے مقابلہ میں بھی نہیں آئے اور انہیں ان کے عمل کے لئے آزاد چھوڑا۔ تقلید کے فریقین بلکہ تمام فرقِ اسلامیہ جب تک حضرات صحابہؓ کی اس پر حوصلہ رواداری کا اسوہ اختیار نہیں فرمائیں گے۔ امت کے اجتماعی مسائل کا حل کبھی نہیں ہو سکتا۔

آج امتِ مسلمہ کو تعلیم عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ جہالت کے جراثیم نے اس کے قومی جسم کو مثل ایک بے جان لاشہ کے کر دیا ہے۔ اسی طرح آج تبلیغ عام کی شدید ترین ضرورت ہے کہ مسائل سے عدم واقفیت نے انہیں اندھیرے میں ڈال رکھا ہے۔ اسی طرح امت کو اصلاح اخلاق کی قوی ترین ضرورت ہے کہ بداخلاقیاں ناسُور ہو کر اس قوم کو لگ گئی ہیں۔

اسی طرح صفائی معاملات کی آج حد درجہ ضرورت ہے کہ بدمعاملگی نے قوم کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی ہے۔

اسی طرح سیاسی حقوق کے تحفظ کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس کے فُقدان نے قوم کی شوکت وقوت کو قطعاً زائل کر دیا ہے۔

لیکن یہ سارے اجتماعی معاملات آپ حضرات جب ہی پایہ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جبکہ ان فروعی اختلافات کو نزاعات نہ بنائیں اور رواۃ کے بادیانت اختلافات کو اس کی حدود میں قائم رکھ کر اسلام کی سرحدوں کو محفوظ کرنے کی فکر کریں اور امت کی اس اجتماعی ساکھ کو پھر از سرنو قائم کرنے کی کوشش کریں جو بہت حد تک پامال ہو چکی ہے اور ان نزاعات کے ذریعہ ہی روبزوال ہو رہی ہے۔ میں اس کی امید رکھوں گا کہ ''آل انڈیا احناف کانفرنس'' ان عمومی اور اجتماعی مہمات کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے دائرہ عمل میں لے لے گی۔

مجھے آل انڈیا احناف کانفرنس کے دعوتی پوسٹر کو دیکھ کر جس میں غیر مسلک کے علماء کو بفراخ دلی وفراخ حوصلگی دعوت دی گئی ہے۔ یقین کامل ہے کہ اس کانفرنس کے مخلصانہ جذبات عمل انفرادیت سے بالاتر اجتماعی روح اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اس کے مخلص کارکن اتحاد بین المسلمین کے زیادہ سے زیادہ خواہش مند

ہیں۔ اس لئے اس کانفرنس سے یہ توقّع بے جا نہیں ہے کہ عرض کردہ مقاصد اس کے اساسی مقاصد قرار پاسکیں گے اور اس کے ہاتھوں پھلیں پھولیں گے۔

آخر میں تمام ذمّہ داران کانفرنس کا مکرّر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی فراخ دلی سے مجھ ناچیز کو اپنے کج مج خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمایا اور میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود مجھے قبول فرما کر میری انتہائی عزت افزائی فرمائی ___ حق تعالیٰ شانہٗ ذمّہ دارانِ کانفرنس، کارکنانِ جلسہ اور تمام حاضرین اجلاس کی ان مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق دے اور ہم سب کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پسِ منظر

خُطبۂ صدارت

اجلاسِ جمعیت العلماءِ صوبۂ بمبئی

منعقدہ ۴، ۵، ۶، ۷ صفرالمظفر ۱۳۶۴ ہجری

از فخرالاماثل حضرت الحاج مولانا قاری حافظ محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

جمعیت العلماء صوبہ بمبئی نے گزشتہ سال ۴۴ء میں اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا تھا۔ ممدوح نے اس اجلاس میں ارتجالاً زبانی جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس نے اہلِ بمبئی کے مذہبی اور سیاسی احساس وشعور کو بیدار کرنے میں حیرت انگیز کام کیا۔ قبول و تأثر کی ایک رو تھی جو چالیس پچاس ہزار سامعین کے قلوب میں گھر کرتی چلی گئی تھی۔

مشرقی ومغربی تعلیم ونظریات دونوں کے حامل ودلدادہ اس خطبہ سے یکساں متأثر تھے۔ سیاسی وغیر سیاسی۔ سرکاری وغیر سرکاری، مذہبی اور غیر مذہبی، مسلم اور غیر مسلم کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس پر حقائق ومعارف کے اس آبِ حیات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا ہو اور وہ خواب گراں سے ہوشیار نہ ہو گیا ہو۔ بمبئی کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسا سیاسی پروگرام سُنا جو قرآن وسنت اور صرف قرآن وسنت سے مرتب کیا گیا تھا اور جس میں انسان کے لئے دنیا کے موجودہ حالات میں فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی حاصل کرنے کے سہل الحصول اور یقینی طریقے بھی موجود تھے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی۔

بمبئی ___ ! جہاں کے باحوصلہ اور نیک دل مسلمانوں کو ایک خود غرض جماعت نے اپنی نفس پرستی اور جلبِ منفعت کے لئے مبتلائے فریب کر رکھا تھا اور مخلصانہ مذہبی جذبات کو غلط راستوں پر ڈال کر سچا دین پیش کرنے والوں اور کلمۂ حق کہنے والوں سے اس درجہ متنفر اور متوحش کردیا تھا کہ وہ ان کے قریب جانے یا ان کی کوئی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ انہوں نے جب جمعیت علماء کے پلیٹ فارم سے اس بیدار کن صدائے حق کو سُنا تو وہ چونک اُٹھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اربابِ غرض نے سالہا سال سے ان کے مذہبی جذبات کو جن راہوں پر ڈال کر علماء دیوبند کے خلاف جو اشتعال اور نفرت پیدا کردی ہے وہ سراسر باطل ہے۔

حق یہی ہے کہ دین و دنیا کی خیر و فلاح اور تعلیمات نبویؐ کا صحیح اُسوہ اگر کسی کے پاس ہے تو وہ انہی علماء حق کے پاس ہے۔

اس احساس کا پیدا ہونا تھا کہ بمبئی جیسے عظیم الشّان شہر کے گوشہ گوشہ سے طالبانِ حق گروہ در گروہ حضرت ممدوح کی خدمت میں یہ اِلتجا لے کر حاضر ہونے لگے کہ ہمارے علاقے کے مسلمانوں کے کان بھی اس صدائے حق سے آشنا کئے جائیں جس سے وہ اب تک مختلف حیلوں گمراہ کن تدبیروں سے محروم رکھے گئے ہیں۔ اہلِ بمبئی کی اس طلب صادق اور اِلتجائے شدید نے حضرت مہتمم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پروگرام میں مخلصین و طالبین بمبئی کے لئے جتنا وقت نکال سکیں نکالیں۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے جتنا ممکن ہو سکا بمبئی میں قیام فرمایا اور وہاں کے تقریباً ہر حصہ کے تشنگانِ حقیقت و معرفت کو اپنے ارشاداتِ عالیہ اور مواعظِ حسنہ کے شیریں اور صاف و شفاف آبِ رواں سے سیراب کرنے کی کوشش کی۔ پیاسوں کی پیاس کا یہ عالم تھا کہ جام پر جام پیتے جاتے تھے اور هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ پکار رہے تھے۔ چونکہ مولانائے ممدوح کی ذات گرامی دار العلوم دیوبند جیسے عظیم الشّان مرکزی ادارہ کی اہم ذمّہ داریوں کا بار گراں بھی ہے اس لئے تقریباً تین ہفتہ سے زیادہ بمبئی میں قیام نہ فرما سکے اور بمشکل دیوبند واپس تشریف لائے۔

اس سال جمعیّت کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ذمّہ دارانِ جمعیّت نے پھر حضرت ممدوح سے صدارت اجلاس قبول کرنے کی باصرار درخواست کی اور اہلِ بمبئی کے والہانہ شوق کا شدّ و مدّ کے ساتھ اظہار کیا۔ چنانچہ مخلصینِ بمبئی کی دعوت کو قبول کرنا پڑا اور ممدوح نے بمبئی تشریف لے جا کر فرائض صدارت انجام دیئے۔ اس سال مسلمانانِ بمبئی کا ذوق و شوق المضاعف تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حاضرین جلسہ کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہوتی تھی۔ اجلاسِ جمعیّت کے ختم ہونے پر اہلِ شہر کی جانب سے علاقہ وار جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان میں حضرت ممدوح نے انسان کی نجات اور اس کی زندگی کے مختلف گوشوں میں فلاح و خیر کا وہ پروگرام پیش فرمایا جو قرآن و سنت کا مرتّب کردہ ہے۔ ان خطبات و مواعظ نے مسلمانان بمبئی کے ایمانوں میں جلا پیدا کر دی۔ اربابِ باطل نے تدلیس و تلبیس اور افتراء و بہتان پر جماعت دیوبند کے خلاف سالہا سال میں عناد و عداوت کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی اور بمبئی کے سنجیدہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دیوبند کی محبت و عقیدت کا گہرا نقش قائم ہو گیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

۵ صفر ۶۴ھ کو جمعیت العلماء صوبۂ بمبئی کے سالانہ اجلاس میں حضرت ممدوح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا دیوبند سے بمبئی تشریف لے جاتے ہوئے راستہ میں قلم برداشتہ تحریر فرما لیا تھا۔ اتنا بھی موقعہ نہ مل سکا کہ مسوّدہ پر نظرِ ثانی کی جا سکتی۔ دراصل یہ خطبۂ صدارت کے مضامین کا ایک اجمالی خاکہ تھا جو رواروی میں بطورِ یادداشت مرتّب کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ سامعین کو طبعًا تحریر کے سننے میں اُلجھن اور ضیق ہوتی ہے۔ نیز تحریر کے ذریعہ مسائل کی تفہیم میں مختلف الخیال اور تفاوت الخیال حاضرین کی کماحقہٗ رعایت نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے ممدوح نے اس مرتّب کردہ تحریری خاکہ پر زبانی خطبہ ارشاد فرمانا زیادہ مناسب خیال فرمایا۔ اس زبانی خطبہ میں بہت سے مضامین تحریر کردہ خطبہ سے زائد بیان ہوئے اور مجمع پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ممدوح کا خیال تھا کہ خطبہ پر نظرِ ثانی کے وقت تقریر کے زائد نکات و مضامین کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ لیکن حضرت ممدوح نے جیسے ہی تقریر ختم فرمائی۔ مُدیرانِ جرائد نے اصرار کیا کہ مسوّدہ جس حالت میں بھی ہے انہیں دے دیا جائے کہ انہوں نے تقریر کے جو نوٹ لئے ہیں۔ یہ مسوّدہ یقیناً ان سے زیادہ مفصل ہوگا اس لئے مسوّدہ دے دیا گیا اور اسے بمبئی کے اردو، انگریزی، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ اخبارات نے نمایاں طور پر اور

بعض نے پورا اور بعض نے اس کے خاص خاص حصے شائع کئے بلکہ بعض اخبارات نے پبلک کے شدید مطالبہ کی بنا پر اس مکمل مسوّدہ کو ایک سے زائد مرتبہ شائع کیا۔

بمبئی سے واپسی پر اثناءِ سفر میں ممدوح نے اس مسوّدہ پر نظرِ ثانی کر کے اس میں ان مضامین کا اضافہ بھی فرمادیا جو تقریر میں خاص طور پر آ گئے تھے۔ اب حذف واِزدیاد اور ترمیم و تنسیخ کے بعد یہ مسوّدہ اپنی مکمل صورت میں مرتب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس خطبہ کی حیثیت عام رسمی خطبات صدارت سے مختلف ہے اور اس میں زمانۂ حال کی ضروریات میں مسلمانوں کی بہترین مذہبی وسیاسی راہنمائی کی گئی ہے۔ اس لئے مدیرِ رسالہ دارالعلوم کی درخواست پر حضرت ممدوح نے ترمیم شدہ مسوّدہ دفتر رسالہ کو مرحمت فرمادیا جس کو بالاقساط رسالہ میں شائع کیا گیا۔

دارالعلوم کے جن نمبروں میں یہ خطبۂ صدارت شائع کیا گیا اور اطراف واکنافِ ہند سے ان کی فرمائشیں اس کثرت سے آئیں کہ وہ نمبر بہت جلد ختم ہو گئے اور فرمائشات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس لئے شائقین کے اصرار پر منظوری حضرت مہتمم صاحبؒ مدّ ظلّہٗ العالی یہ خطبۂ صدارت کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

ناظم کتب خانہ قاسم العلوم دیوبند

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمدؒ قاسم نانوتویؒ

آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ :
میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دُنیا و عقبیٰ دونوں کے اِنکشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔
(از حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ)

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحین امّت کے تعارف کے لئے ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی تقریر جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے متعلق براڈ کاسٹ ہوئی' نذرِ قارئین ہے۔

موضوعِ تقریر

میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیّت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند ہے۔
حضرت ممدوحؒ کی ولادت سن ۱۲۴۸ھ ' بمطابق سن ۱۸۳۲ء میں اور وفات سن ۱۲۹۷ھ ' بمطابق سن ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدّت میں آپؒ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلے میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے' جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انگریزی اِقتدار کا تسلّط اور مسلمانوں کی شکست

سن ۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے پیرو مُرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر مُلکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی لیکن جنگ میں شکست ہوگئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصُوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساسِ کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنریوں نے عیسائی اقتدار کے زیرِ سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کردیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح " کا عطیہ اور امانت ہے۔ اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصبُ العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اِتہامات کی بوچھاڑ بھی شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مُبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمانِ اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم سے اِلحاد و دہریّت

کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل ونہار رہے تو وہ دن دُور نہیں کہ آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں خود اپنے اخلاقی نظام اور تہذیب و کلچر سے بیگانہ محض ہو کر رہ جائیں گی۔

مذہبی انقلاب کی ضرورت

حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنے نورِ معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشاراتِ غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں اُلجھنے کے ایک عالمی نقطۂ نظر پر ڈال دینے اور قوم میں ایک مذہبی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تاکہ یہ احساسِ کمتری دُور ہو۔ اس کے لئے آپ نے تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دُور تھا۔

چنانچہ سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ نے اپنی ایمانی فراست سے چھینے ہوئے اقتدار کا نعم البدل تعلیمی راہ سے حریتِ فکر کے بقاء وارتقاء کو قرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد سن ۱۲۸۳ ہجری بمطابق سن ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر با آسانی حاصل کرلیا۔ اس الہامی نقطۂ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریتِ فکر اور استقلالِ وطن کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتبِ فکر اور عظیم تحریک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسمؒ نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانے پر مدارس قائم فرمانا شروع کئے اور بنفسِ نفیس خود جا کر مراد آباد، گلاوٹھی، امروہہ، مظفر نگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جابجا اپنے متوسلین کو زبانی اور خطوط کے ذریعے قیامِ مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرتؒ کی زندگی ہی میں قائم ہو گئے۔

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی

اور پھر حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے حریتِ فکر کے امین فضلاء نے پورے ملک میں حتیٰ کہ انہی فضلاء نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرزِ فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے۔ عالمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ جس کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو صاحبِ دل علماء اور صداقت شعار رفقاء کار حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ یہ ہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتبِ فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت و عظمت کی حامل ہے۔

مدارسِ عربیہ کی معنوی بُنیاد

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روزِ اوّل سے یہ درسگاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی۔ حضرتؒ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اُصول اپنے دستِ مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دَور میں بانیٔ دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری پوری حفاظت و رعایت کی جاتی رہی ہے۔ یہ

اصول درحقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیادیں ہیں۔ جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

اور نہ صرف دارالعلوم ہی بلکہ ان تمام مدارسِ عربیہ کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور ان کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چنانچہ ان اُصولِ ہشگانہ پر حضرت اقدس نے سُرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ :

”وہ اصول جن پر مدارسِ چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں“

یہی ہمہ گیر اصولِ قیامِ مدارس کی اس اجتماعی تحریک کی بنیاد بنے جس سے سن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشاۃِ ثانیہ ملی۔ ان اصول کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندہ پر قائم فرمایا تاکہ اس میں ابتداہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو۔ ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ، تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے پر امداد غیبی منقطع ہوجائے گی۔ رجوع الی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑجائے گی۔ جس کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے اپنی طویل نظم کے بعض اشعار میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا کہ : ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لئے
کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہوجائے گا

پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یوں سمجھ لینا کہ بے نُور وضیاء ہوجائے گا

ان اصولوں میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد رہے جو کہ اجتماعیت کی روح ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اصولاً معاملاتِ دارالعلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرماکر اس کو عہد استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنادیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقررہ اہلِ شوریٰ کے ایسے واردین، صادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہ اور ان سے دلچسپی رکھتے ہوں۔

یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی فکر کے ناقابلِ انکار شواہد ہیں اور انہی سے دارالعلوم دیوبند کی نوعیت، اہمیت بھی واشگاف ہوجاتی ہے۔

خلافتِ ترکی کی تائید

انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رُخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی ہمہ گیری سیاسی راہنمائی سے اس دَور کی خلافتِ اسلامیہ یعنی خلافت ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا۔ سلطان ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کو ان کی طرف مائل کرتے رہے اور اس دور میں جنگ روم وروس ہوئی تو خود بہ نفسِ نفیس دورے کرکے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر کا تقریباً بڑا سامان بطورِ چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرمایا تاکہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بند رہے۔

اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ جب مسلمانانِ ہند نے احیاءِ خلافت کی تحریک شروع کی بلا تفریق مذہب وملّت وملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق ومتحد ہو کر اس میں برابر کی شریک رہیں۔ اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذاتِ خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تاکہ مشرق ومغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اور ان کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو اور ساتھ ہی ترکی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔

فکرِ قاسمیؒ کے تین بُنیادی عناصر

یہ تفصیل فکرِ قاسمیؒ کے ان تین بنیادی عناصر کو واشگاف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملّت کا بقاء وارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری، ذوق اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔

آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ اس قاسمی فکر کے امین بنے اور ان کے بعد حضرتؒ کے خلف الرّشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ اس کے علمی امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے ریشمی خط کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید وبند کی صُعوبتیں جھیلیں۔ ان کے بعد ان کے ہزار ہا شاگردوں میں بھی یہی رنگ جو ہر نفس ہوتا رہا۔

جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت علّامہ سیّد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری وغیرہم تھے (رحمہم اللہ اجمعین) جنھوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا اور انجام کار ان بزرگوں کا وہ وحدتِ عالمِ اسلام کا خواب اب تعبیر کے قریب ہوتا جارہا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی دورۂ یورپ کی تمنّا

آخر عمر میں آپ نے بطورِ خاص اس تمنّا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یورپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو۔ بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا وعقبیٰ دونوں کے اِنکشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔

مباحثہ شاہجہاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرتؒ نے ہندو، مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دَور کے ہندو زعماء نے یہ کہہ کر کیا کہ :

"یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی ہے"۔

یہ روشن حقائق اس عظیم حقیقت کو طشت ازبام کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اور ان کے شیخ ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ کا یہ قول کہ :

"کئی صدیوں کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے"۔

ان کی عظمت واہمیت کے باب میں بلا خوف تردید حرفِ آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

آئینہ خدمت جمعیت علماءہند

پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشاکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے' جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حَکَم کے ہو جو سب کے قضیئے چکا سکے ___ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرۃً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے۔ جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے ___ مذہب اور بالخصوص "دین فطرت" (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

خطبۂ صدارت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

شکریۂ اکابر

بزرگان ملت و اعیان امت!

اس مقدس جلسہ کی صدارت کا یقیناً میں اہل نہ تھا۔ پھر بزرگان اور اکابر شیوخ کی موجودگی نے تو میری ذات ہی کو درجۂ صفر میں پہنچا دیا ہے' اس صورت میں کسی نام نہاد اہلیت کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جرات نہیں ہوتی کہ اس مقام پر کھڑا ہوں چہ جائیکہ کچھ عرض و معروض کروں۔ ساتھ ہی اس مقام کی ذمہ داریاں اور وہ بھی بحالات موجودہ جن وسیع معلومات اور جس ہمہ گیر فکر و تجربہ کی متقاضی ہیں وہ اپنے اندر مفقود ہیں اس لئے رہی سہی ہمت بھی جواب دے دیتی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ جن بزرگوں نے بنام صدارت یہ عزت افزائی فرمائی ہے وہی اس کی سرپرستی بھی فرمارہے ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہونے کی جرأت

---

[1] ۔ خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء صوبہ متحدہ منعقدہ مراد آباد ۱۹ مارچ سنہ ۱۹

کی اور اکابر و اعیان کے شکریہ کے بعد ذیل کی چند معروضات پیش کرنے کے ہمت ہوئی۔

نظریاتی فتن کا دور

حضرات محترم!

آج کے حالات جن سے ہم گذر رہے ہیں نہایت پیچیدہ اور نازک ہیں' سطح پر سکون ہے مگر سطح کے نیچے آب زیر کا مضمون ہے' اوپر سے سبزہ زار ہے مگر اندر خارزار' اگر کوئی **مخملین** سبزہ زار میں گھس جاتا ہے تو نیچے کے چبھتے ہوئے خار اسے زخمی کئے بغیر نہیں چھوڑتے' خصوصیت سے **مسلمانوں** کا معاشرہ چند در چند فتن میں گھر ہوا ہے **شریعت** نے دین کے بارہ میں خبر دی تھی کہ دور فتن میں دین کا سنبھالنا ہاتھ میں چنگاری سنبھالنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن آج دنیا کا تھامنا دین تھامنے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے' **کشمکشوں** اور مصادمتوں کا دور دورہ ہے۔ قوم میں باہم جماعتی کش مکش علیحدہ ہے قومی رجحانات اور ہیں اور سرکاری کچھ اور' کچھ ان دونوں لائنوں سے الگ ہو کر دونوں کے مدمقابل ہیں افراد و جماعات ہی میں کش مکش نہیں بلکہ نظریات بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ ان **کشمکشوں** میں **مسلمان**

"دوگونہ رنج وعذاب است جان مجنون را"

کا مصداق ہے اور اس کی ہدف ہونے کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ : ؎

ہر بلائے کز آسماں آید
بر زمین نارسیدہ می پرسد
خانۂ انوری کجا باشد؟

یعنی مسلم آزاری اغیار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر مسلم آزاروں کی فہرست تیار کی جانے لگے تو اغیار کے ساتھ مسلمان بھی اس میں نظر آئیں گے۔

متضاد عناصر کی ہمہ گیر راہنمائی

ظاہر ہے کہ پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی رہنمائی تو بجائے خود ہے لب کشائی بھی آسان کام نہیں' البتہ اس تضاد اور کش مکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو' اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو جو سب کے قضیے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے' جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے' مذہب اور بالخصوص "دین فطرت" (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

اس ہندوستان کی سرزمین میں اگر حضرت سلطان الہند خواجہ اجمیری' نور ہند خواجہ کلیری' قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ہر قرن کے علمائے ربانی و مشائخ حقانی قدس اللہ اسرارہم نے ہر پارٹی ہر فرقہ اور ہر فریق کو آخر اپنی وسعتوں میں گم کر کے رکھ دیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سسٹم کا ثمرہ نہ تھا بلکہ پارٹی فیلنگ سے

بالاتری کا کرشمہ تھا۔ آج بھی اگر مسلم اقوام کی صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے تو خواہ وہ کسی لائن پر ہو انہیں اعیان امت کے اس ہمہ گیر رنگ اور انہی کے سچے جانشینوں کے اسوہ پر کار آمد اور موثر ہو سکتی ہے۔

جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت

جمعیت علماء اپنی اصل فطرت سے ایک خالص مذہبی جماعت ہے۔ گواس نے ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا۔ قربانیوں کا لگاتار سلسلہ صفحۂ تاریخ پر ثبت کیا اور آزادی کے میدان جنگ میں نہ صرف یہی کہ کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سب سے آگے ہو کر کام کیا۔ لیکن پھر بھی اس کی بنیاد مذہب تھی اور مذہب ہی کے معیار سے اس نے یہ کچھ کیا۔ وقتی ضرورت ختم ہو جانے پر بالآخر اس نے پھر اسی اصل کی طرف رجوع کیا جو اس کی اصل سرشت تھی یعنی مذہب اور مذہبی رجحانات۔

جمعیت علماء نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے علیحدگی کا جو نظریہ قائم کیا وہ یقیناً قومی تعمیر کے لحاظ سے موزوں ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ نہ اس لئے کہ سیاست کوئی شجر ممنوعہ تھی یا وہ اس کے حق میں عدم جواز کے تحت میں آگئی تھی بلکہ عام سیاسی مصالح کے علاوہ اس لئے کہ انقلاب کے بعد کسی قوم کو بنانے والے طبقہ کے لئے سیاسی الجھنوں سے یکسو ہونا ہی طبعًا ضروری ہوتا ہے اور وہ سیاسی اتار چڑھاؤ میں گھر کر تعمیری کاموں کے لئے وقت نہیں دے سکتا۔

قومی تعمیر کی دفعات

قومی تعمیر کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام کو جو اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سمیٹ کر ذیل کے عنوانات کے تحت میں لاسکتے ہیں :

نظام تعلیم، نظام تبلیغ، اصلاح معاشرہ اور مذہبی و تمدنی حقوق کا سیاسی تحفظ ___ قومی تعمیر کی ان دفعات میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے جس سے کسی قوم کا دل و دماغ بنایا جاتا ہے۔ تمام کامیابیاں اور ہر نوع کی عزت و سربلندی کا ابتدائی زینہ علم ہے، حق تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کا سلسلہ اسی علم کی نشرواشاعت کے لئے قائم فرمایا۔ اسلام میں سب سے پہلی آیت ہی اقرأ نازل ہوئی جس کا حاصل پڑھنے پر ابھارتا ہے۔ اسلام سے قبل کا قریبی دور گو ساری ہی بشری خرابیوں پر مشتمل تھا، مگر اسے "دور جاہلیت" کا نام دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ ہمہ نوع شرور و آفات کا سرچشمہ جہل اور ہمہ نوع کمال و خوبی کا سرمنشا علم ہے، اس لئے دینی تقاضوں کے اعتبار سے سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔

سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ

وقت کے لحاظ سے بھی یہ مسئلہ مسلمانوں بلکہ ہر مذہبی فرقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ توجہ طلب ہے کیوں کہ جبری تعلیم کے قوانین کے تحت جو نصاب حکومت نے تیار کیا ہے اس سے سیکولرازم کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا عام رخ بلکہ اس کے بہت سے اجزاء اسلام کے عقائد و اعمال پر براہ راست ایک مستقل زد ہیں، جس سے ایک مسلمان بچہ کا عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مسلمان باقی رہنا دشوار ہے، اس لئے بتقاضائے وقت بھی اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی کفالت قومی طور پر کی جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی اکابر امت اور نبض شناسان قوم کی یہی اعلیٰ ترین سیاست تھی کہ وہ جابجا دینی مدارس قائم کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے سنبھال لیا۔ یہ مدارس آج بھی بحمد اللہ کامیابی کے ساتھ جاری اور اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان میں سے کتنے ہی مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے دارالعلوم دیوبند' مظاہر علوم سہارنپور' مدرسہ شاہی مراد آباد وغیرہ' ان مدارس کا مقصد جامع علماء تیار کرنا ہے جو قوم کی ہدایت و راہنمائی کے فرائض انجام دیں ___ لیکن موجودہ دور اور اس کے حالات کے لحاظ سے ان مدارس کے علاوہ ایسے مکاتب کی بھی اشد ضرورت پیش آگئی ہے جو مختلف پراگندہ بلکہ گندہ لٹریچروں کے زہریلے اثرات سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ اگر مدارس دینیہ علماء تیار کریں تو یہ مکاتیب دینیہ پڑھے لکھے دیندار تیار کر سکیں جو گو عالم نہ ہوں مگر دین کی سمجھ رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم اور ذریعۂ تعلیم

جمعیت نے ان ہی مقاصد کی روشنی میں کافی عرق ریزی سے ایک جامع نصاب تیار کرلیا ہے جو بتدریج ملک میں اپنی جگہ کرتا جارہا ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبے جمعیت کے ساتھ اس بارے میں تعاون کریں اور اس کے پروگرام کے مطابق یہ نصاب رائج کرنے پر تل جائیں تو بہت حد تک اس زہر کو نکالا جاسکتا ہے۔ جو ان غیر معتدل نصابوں یا مروجہ بلیک تعلیم کے ذریعہ دل و دماغ میں پیوست کیا جارہا ہے۔

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو کے سوا دوسرا نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ اس کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اردو ایک ہلکی اور شیریں زبان ہونے کے علاوہ یہاں کی مادری زبان بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سے علوم وفنون کی خزینہ دار بھی بن چکی ہے' اس کا تحفظ علوم وفنون کا تحفظ ہے جو بہرحال مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی کی رکھی اور تفہیم اردو کی' اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی بلکہ دنیائے اسلام کے ہزارہا افراد ان مدارس کی بدولت اردوداں ہو گئے اور آج افغانستان' ایران چینی ترکستان' روسی ترکستان' حجاز' افریقہ' عراق' جاوا' سماٹرا وغیرہ دور دراز ممالک بھی اردو زبان سے بیگانے اور بے تعلق نہیں اور اس لئے جتنے ادارے آج اردو کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں ہمیں ان سب کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو نے تحفظ اردو کے سلسلے میں جو کامیاب مہم شروع کی جمعیت علماء اور مدارس دینیہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور تابحد مقدور اس میں تعاون سے کام لیا جس کے اچھے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

ذوق عربیت کی اہمیت

مجھے اس سلسلہ میں ادھر بھی توجہ دلانا ہے کہ جیسے اردو ہماری وطنی اور علمی زبان ہونے کی حیثیت سے اس ملک میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عربی زبان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے جو ہمارے دین ومذہب کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس حد تک مذہب میں فنائیت کا مقام رکھتے ہیں اسی حد تک وہ اس مذہبی زبان سے نابلد اور بے پرواہ بھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن اور اس کے محاورات سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی جو بہت حد تک ان کے دینی ذوق کے لئے حجاب اور کتاب وسنت سے بے تعلقی کا ذریعہ بن جاتی ہے اگر اقوام وملل اور دنیا کے ممالک میں ربط باہمی

کا ذریعہ زبان کے سوا دوسرا نہیں تو کتاب وسنت سے لگاؤ اور ربط پیدا کرنے کا ذریعہ بھی عربی زبان کے سوائے دوسرا نہیں۔

ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمان بچوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بیگانہ نہ رکھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس ضرورت کو مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سیکرٹری نے پورا کردیا ان کے عربی نصاب کا پانچ کتب پر مشتمل سیٹ عربی کی ایک قابل قدر پنج گنج ہے۔ جس سے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ قلیل مدت میں قرآنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھی اس اردو نصاب کے ساتھ جو جمعیت علماء نے مرتب کیا ہے مکاتب کا جزو بنادیا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو یہ اہم ضرورت پوری ہو سکتی ہے جو کتاب وسنت ہی کی حد تک نافع ثابت نہیں ہوگی دنیائے اسلام کے باہمی رابطہ کے لئے بھی مؤثر اور کارآمد ثابت ہوگی۔

تربیت عوام

لیکن تعلیم پھر بھی تربیت خواص کا ذریعہ ہے اس سے تذکیر عوام کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس کا ذریعہ تبلیغ ہے بشرطیکہ وہ جماعتی خصوصیات کی نہ ہو کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور مسائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خالص اسلامی مسائل کی نشر واشاعت اور الاہم فالاہم کے قاعدے سے جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں انہی کے مناسب حال شریعت کے مسائل سے دماغوں کو روشنی بخشی جائے۔

جمعیت علماء اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی' اس کی رپورٹوں میں تبلیغی خدمات کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے۔ فی الحال ایسی مبلغ تیار کئے جانے کی ضرورت ہے جو جھگڑالو نہ ہوں' ضدی نہ ہوں' سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ مسائل کو سلجھا کر دماغوں میں سلجھاؤ پیدا کردیں۔ آج جبکہ پرچار اور تبلیغ کے نام پر بہت سے پراگندہ خیالات اور غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں اشد ضرورت ہے کہ صحیح مسائل کو پیش کرکے دلوں کو تشتت وپراگندگی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

اصلاح معاشرت

آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عامۃً مسلمانوں کی معاشرت غیر اسلامی ہوتی جارہی ہے ان کا رہن سہن چال چلن رفتار گفتار وغیرہ غیر اقوام کے نمونہ کا ہوتا جارہا ہے۔ روحانی آداب کے بجائے جذبات نفسانی دل و دماغ پر چھاتے جارہے ہیں۔ شادی غمی کے اجتماعات اور خانگی زندگی میں غیر اسلامی رسوم اور منکرات بطور جزء زندگی کے داخل ہوگئے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلم قوم کا صحیح کیریکٹر اور مقام متعین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

اور وہ محض وعظ وپند یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہر ہر مقام پر برادریوں میں سے بااثر لوگوں کو چن کر ان کی عملی کمیٹیاں بنائی جائیں' برادری کے بڑوں کی اصلاح پر زور صرف کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ اس اثر کو پھیلایا جائے جس میں عملی مشقت اور جدوجہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جمعیت علماء قیام مکاتب اور تبلیغی نظام کے سلسلہ میں یہ خدمت باحسن اسلوب انجام دے سکتی ہے۔ پس قیام مکاتب اور تنظیمی مساعی کے وقت اس اصلاحی تنظیم کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہ سہولت کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ اصلاحی کام خود اتنا وسیع اور اہم ہے کہ جو طبقہ بھی اس کام میں ہمہ تن لگ جائے گا' اسے دوسرے میدانوں

میں کودنے کا وقت نہیں مل سکتا۔

بنابریں ان امور کے لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔ قومی کاموں کے سینکڑوں شعبے ہیں اگر کارکنوں کا ایک ہی طبقہ سارے کاموں کو سنبھالنے کی فکر میں لگ جائے تو کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تقسیم عمل کے اصول پر کارکنوں کی جماعت کو بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔

جمعیت علماء ان تعمیری خدمات میں لگ کر یقیناً سیاسی میدانوں میں پہلے کی طرح نہیں اتر سکتی لیکن اس کے معنی کلی یکسوئی کے بھی نہیں' اگر جمعیت علماء مسلمانوں کی مذہبی' معاشرتی اور عام اجتماعی خدمات کے لئے کمربستہ ہوگی لامحالہ مثبت پہلو کے ساتھ اسے منفی پہلو بھی سامنے رکھنے ہوں گے اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی' معاشرتی اور تمدنی حقوق پر کس راستہ سے زد پڑ رہی ہے؟ اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ اگر قانون ان حقوق پر اثر انداز ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا اور اسے اپنی پوری آئینی جدوجہد سے بدلنے کی سعی کرنا بھی اسی کا کام ہوگا' ظاہر ہے کہ اس منفی پہلو کی روک تھام کے لئے اسے سیاست اور سیاسی رفتار سے کلی علیحدگی کئے بغیر اس پر گہری اور تنقیدی نظر بھی رکھنی پڑے گی اور ساتھ ہی سیاسی حلقوں سے کچھ نہ کچھ قریب بھی رہنا ہوگا۔ اس لئے جمعیت علماء کے سیاست سے کلی علیحدگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاسی میدان سے اس حد تک تعلق اس کے ۱۹۴۷ء کے اعلان علیحدگیٔ سیاست کے مخالف نہیں کیونکہ سیاست سے اس کا اتنا تعلق کسی عام عملی جدوجہد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹری سیاست کا تعلق ہے جس سے جماعتی علیحدگی کا اعلان ۴۷ء میں کیا گیا ہے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے لیکن اس سلسلہ میں گزارش کئے بغیر نہ رہوں گا کہ خاص افراد کو چھوڑ کر کم از کم جمعیت کے عام عہدیداران اور اس نظریہ میں عملی ہم آہنگی قائم رہنی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صورت حال غلط اور صحیح ہر قسم کے الزامات کا منشاء بنتی رہے گی۔

جو جماعتیں خالص سیاسی یا دفاعی لائنوں پر کام کرنا چاہتی ہیں ہمارے لئے ان سے الجھنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ تعمیری کام کتنے بھی ضروری ہوں دفاعی ضرورتوں سے خالی نہیں رہ سکتے۔ بالخصوص جبکہ دور ہی کشاکشی' اور کش مکش کا ہو۔ تقسیم عمل کے اصول پر اگر کوئی جماعت اپنے اندرونی دواعی اور سچے ارادوں سے ایسی کوئی لائن اختیار کرتی ہے تو اس کے مسائل پر ہمیں جانچ اور تنقید کا حق حاصل ہونا چاہئے لیکن خود اس کمیونٹی یا جماعت کو رد کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ اگر وہ آئین کے دائرہ میں اپنے کام کے لئے کوئی وجہ جواز رکھتی ہو تو کلمہ خیر کہہ دینے کا بھی مضائقہ نہیں۔

جمعیت کا منتہائے نظر

جمعیت علماء اپنے اسم و رسم کے اعتبار سے اہل علم کی جماعت ہے جس کا منتہائے نظر مذہب اور دین ہے۔ اس لئے وہ صرف اپنے ہی حلقہ کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام کارکن جماعتوں کے لئے ایک مفتی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کا اخلاقی ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی آئینی ربط بھی ملک کے ذی رائے طبقہ اور مسلمانوں کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے قائم رہنا مناسب ہوگا تاکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی مذہبی ضروریات اور ان کی مواقع و مشکلات خود ان ہی حلقوں کی زبانی براہ راست جمعیت علماء کے سامنے آتی رہیں اور ادھر جماعتی مسائل میں جمعیت کو بھی ہر طبقے سے فکری مدد ملتی رہے۔ اس سلسلہ میں اگر جمعیت کے انتخابات کی صورتیں امکانی حد تک رسمیات سے آزاد ہو کر سادہ اور بے تکلف رہیں تو ان میں ہمہ گیری بھی

بڑھ جائے گی۔ خود عوام کی کشش میں بھی اضافہ ہوگا اور کسی طبقہ کو بھی عقیدت سے اس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار

۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء کے ذمہ دار کارکنوں نے مسلمانوں کے پرسنل اور مخصوص معاملات کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں نہ وہ نظرانداز کی جاسکتی ہیں اور نہ ہی صفحہ عالم سے مٹ سکتی ہیں۔ ایسے معاملات کا سلسلہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک برابر قائم رہے گا جب تک کہ حالات کلیۃً سازگار نہ ہو جائیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی حجاج اور زائرین حرم کے پاسپورٹ کے ساتھ انکم ٹیکس کے فارم کی خانہ پری کی قید بھی ہے جو اس سال سے لگائی جارہی ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے حجاج کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوگی اور اس کا اثر زائرین کی تعداد اور حج کے ابھرتے ہوئے ذوق و شوق پر بھی پڑ سکتا ہے۔

امید ہے کہ جمعیت علماء اس بارے میں پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے حج کے پاسپورٹ سے اس قید کو اٹھادیئے جانے کی پوری پوری جدوجہد کرے گی۔

بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ مسلمانوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ہے۔ جو ان کے لئے باعث تشویش و پریشانی بنا ہوا ہے۔ اس میں الجھ کر کبھی ان میں ترک وطن کے وساوس ابھرنے لگتے ہیں، کبھی آئندہ نسلوں کے بارے میں پریشان کن خیالات انہیں ستاتے ہیں اور یوں بھی بیکاری بہت سے فتنوں کی آبیاری کی جڑ ہوتی ہے۔ برسر کار اور باروزگار ہو جانے سے خود ہی بہت سے مفاسد کا سد باب ہو جاتا ہے۔ جمعیت علماء اس کی کوئی ذمہ داری تو نہیں لے سکتی۔ لیکن اگر زیر غور مسائل میں یہ مسئلہ بھی سامنے رکھ لیا جائے تو قوم کے اغنیاء یا حکومت کے ذریعہ غرباء کی بیکاری کا مسئلہ حل کرنے کی کیا کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس مسئلہ میں مسلمانوں کو تسلی دلائی جاسکے اور ان کے لئے اطمینان خاطر کا کم از کم استدلالی سامان ہی فراہم کیا جاسکے۔

قیام مکاتب اور اصلاح معاشرت کی مساعی کے سلسلہ میں اگر یہ مسئلہ سامنے رہے تو ہر جگہ کے اغنیاء اور غرباء کے ارتباط سے اس شکل کے آسان ہونے کی صورتیں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوں گی۔

جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت

بہر حال جمعیت علماء کی سابقہ بیش قیمت خدمات کے ساتھ آج بھی اگر اس کے تعمیری پروگرام اور کام کو سامنے لایا جائے تو اس کی وسعتیں سابق سے کم نہیں ہوئیں۔ یہ کہنا کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا کہ اگر جمعیت علماء نے سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کردیا ہے تو اب اس کے کشکول میں کچھ باقی نہ رہا اور اس کی کائنات ختم ہوگئی؟ اگر اس کی سیاسیات حقیقۃً مذہب کے ماتحت اور بلاشبہ تھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی وہ مذہب ہی کا کام کررہی تھی اور آج بھی مذہب ہی کے سامنے ہے۔ ضرورت ختم ہو جانے یا بدل جانے پر کام کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے۔ اصل موضوع و مقصد میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ اور اس لئے آج بھی اس کے نصب العین کا دامن پہلے ہی کی طرح بھرپور ہے اور اس لئے جس طرح ۴۷ء سے پہلے اس کے نظام میں شامل ہونے کی ضرورت تھی اسی طرح آج بھی ہے۔

بالخصوص اس کے تعلیمی پروگرام کو عملاً جاری کرنے اور پھیلانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان جمعیت علماء کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور پوری امنگ اور حوصلہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔

۷۴۷ء کے بعد جمعیت علماء ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم پر مسلمان اپنے تمام دینی' معاشرتی' تمدنی اور دوسرے تمام جماعتی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک شاندار تاریخ ہے جو سب کے سامنے ہے' کل کی طرح آج بھی اس سے بے اعتماد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے نئی نئی جماعتیں بنانے کی بجائے یہی زیادہ بہتر ہے کہ اس بنی ہوئی جماعت سے کام لیا جائے۔ اس کے نظام کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نظام سے وابستہ ہو کر اسے کامیاب بنایا جائے۔

رایوں کے تفاوت اور اختلاف خیال سے نہ کوئی ادارہ خالی رہ سکتا ہے نہ کوئی جماعت لیکن یہ کسی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مخل نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کا عزم ہو اور نیت صادق ہو' بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جمعیت علماء کے مقاصد مسلمانوں کی کسی خاص جماعت یا خاص پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتے' اس لئے تمام مسلمان اس ادارہ کو بلا تفریق خیال و مشرب اپنا سکتے ہیں۔

سرمایۂ جمعیت

جمعیت علماء اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتی ہے۔ اس کے نظریات ہندوستان کے ان چیدہ علماء کے ذہنوں کا سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کامیاب خدمت اور تربیت کی ہے' اس لئے اس کے نظریات کی حد تک بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کسی بھی نظریہ کو مان کر مسلمانوں کو پچھتانا نہیں پڑا ہے' کوئی وجہ نہیں کہ اس کے نظریات اور ہمارے اعتماد و تعاون میں کوئی خلیج حائل ہو یا ہم اس کی تنظیم میں شامل ہونے سے کوئی جھجک محسوس کریں اگر رکاوٹ کی کوئی وجہ بھی سامنے ہو تو اس کے دفعیہ کا طریق بھی اعتراض یا دور بیٹھ کر کچھ کہنے سننے کی بجائے یہی زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ یگانگت کے ساتھ قریب ہو کر اس کی اصلاح کی جائے۔

جو چیزیں اس وقت عرض کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں' پہلے بھی بارہا کہی جا چکی ہیں اور ان کا بہت سا حصہ خود جمعیت علماء کے پروگرام میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ مقصد صرف تذکیر و تجدید اور آپ سے طلب عمل ہے' کسی آئین و اصول کی خوبی کھلنے کا راستہ صرف عمل ہے' اگر عمل نہ ہو تو قرآنی اور قطعی اصول بھی اپنی جگہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں نافع ثابت نہیں ہو سکتے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ جزوی آراء و قیاسات کے اختلافات کو یک قلم ترک کر کے راہ عمل پر قدم بڑھائے جائیں' بلکہ اب اس کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جمعیت علماء لوگوں کو بلانے اور کام میں لگنے کی بار بار اپیل کرے بلکہ لوگ از خود اپنی خدمات پیش کر کے اس کا ہاتھ بٹائیں' اگر بالفرض کارکنان جمعیت کے عمل میں کوتاہی اور فروگذاشت بھی ہے۔ جس سے کوئی فرد اور کوئی جماعت بری نہیں تو وہ بھی آپ حضرات کے مستعد ہو جانے اور عمل کا مطالبہ کرنے پر رفع ہو جائے گی جس سے اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

بزرگان جمعیت علماء کی یہ صدارت بخشی اپنے ایک کمربستہ خادم کی محض حوصلہ افزائی ہے' ورنہ اس مجمع اکابر و اعیان کے سامنے ایک ناکارہ و نااہل کا کرسیٔ صدارت ہی نہیں بلکہ اس صف کی کسی کرسی پر آبیٹھنا جرأت و بے ادبی ہے۔ میں بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ان سطور کو ختم کرتا ہوں اور "جمعیت علماء زندہ باد" کہتا ہوں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تیونس و مراکش کی جدوجہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین۔ قوموں کا فرد' خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو' یا اندھیری رات کا فرزند' جس طرح ایک انگریز' ایک فرانسیسی' ایک امریکن' ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے' اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔
از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ـــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــ

احوال واقعی

بزرگان محترم!

ہم یہاں انسانی تاریخ کے ایک اہم مرحلے پر ایک بڑے مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں' میں خداوند برتر وتوانا کا اور اس کے بعد آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقعہ پر صدارت کی عزت سے سرفراز فرمایا اور یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے دو قوموں کی آزادی کے معاملہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔

حق خود ارادیت

زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہمارے میدان' ہمارے کھلیان' ہمارے گاؤں کے چوپال اور بڑے بڑے شہروں کے ہال اس نعرہ سے گونج رہے تھے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج جبکہ ہمارا ملک آزاد ہے اور اس کی آزادی کے ۶ سال گذر چکے ہیں تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگیں قوموں کا فرد' خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو یا اندھیری رات کا فرزند' جس طرح ایک انگریز' ایک فرانسیسی' ایک امریکن' ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔

ـــــــــــــــ

ؔ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۳ء یوم احتجاج کے موقع پر بمبئی میں خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔

آزادی کی حمایت

حضرات! ہم یہاں ملک کی مشہور اور مؤقر جماعت جمعیت علماء ہند کی ہدایت پر تیونس اور مراکش کی آزادی کی حمایت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملک کے قومی اور مذہبی رہنماؤں نے ہندوستان چھوڑو کا نعرہ لگایا تھا۔ آخر کار غلامی کی فوجوں نے ہندوستان چھوڑ دیا اور انگریزوں کی ہندوستان سے بوریا بستر باندھنا پڑا۔ آج ہم اس شہر میں فرانس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تیونس اور الجزائر کو چھوڑ دے اور یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ کامیاب ہوا۔

تیونس کی صورت حال

محترم حضرات!

مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیونس اور مراکش کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کردوں' تیونس ۴۸ ہزار مربع میل کا اسلامی علاقہ ہے جو شمالی افریقہ میں بحرروم کے کنارے اٹلی اور فرانس کے سواحل کے سامنے واقع ہے۔

یہاں آخری مردم شماری کے مطابق ۲۶ لاکھ انسان آباد ہیں۔ اب یہ آبادی اندازاً ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں ایک لاکھ آٹھ ہزار فرانسیسی موجود ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں۔ یہاں برائے نام ایک سلطان موجود رہتے ہیں مگر اصل راج فرانسیسی شہنشاہیت کا ہے۔ پچاس سال کا عرصہ ہوگیا کہ غیر ملکی طاقتیں تیونس کے معاملہ میں بے جا اور ظالمانہ طور پر دست اندازی کررہی ہیں۔ تیونس کی جنگ آزادی نئی دستور پارٹی کی رہنمائی میں جاری ہے مجھے اس تحریک کے اسیر رہنما جناب حبیب بورقیبہ سے گذشتہ سال اسی شہر بمبئی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا جب کہ انہوں نے خلافت ہاؤس کے ایک نمائندہ اجتماع میں اپنے مطالبات آزادی کی شرح فرمائی اور مجھے ان کی تائید میں تقریر کرنے کا موقعہ دیا گیا' اس مختصر مختصر تقریر میں انہیں یقین دلایا گیا کہ ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اور بالخصوص مذہبی حلقہ آپ کے مطالبات کی تائید میں ہے۔ آج ایک سال کے بعد وعدے کے دہرانے کا پھر موقع مل رہا ہے' آپ کے شہر میں تیونس امدادی کمیٹی موجود ہے۔ جس کا اعلان آپ تین چار روز پہلے اخباروں میں دیکھ چکے ہیں جو ان نعروں اور وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔

مراکش کا مسئلہ

تیونس سے زیادہ مراکش کا مسئلہ بین الاقوامی ہنگامۂ آزادی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراکش شمالی افریقہ میں مغرب اقصیٰ کا ملک ہے۔ یہ ملک عرض البلد شمالی کے (۲۸) اور (۳۶) درجے کے درمیان اور طول البلد غربی کے (۳) اور (۱۴) درجے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحرروم اور آبنائے جبل الطارق' مغرب میں اٹلانٹک سمندر' جنوب میں صحرائے اعظم اور شمال مشرق میں کوہستان واقع ہے' اس کا رقبہ ۵ لاکھ ۸۱ ہزار کلومیٹر مربع میل ہے۔

مراکش کو فرنگی اقوام نے جو بد قسمتی سے اس وقت جمہوریت کے نام پر دنیا کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہیں۔ تین

حصوں میں تقسیم کرکے اس کی سالمیت، طاقت اور صلاحیت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے ایک حصہ فرانسیسی مراکش ہے جو فرانس کی غلامی میں ہے۔ اس حصہ کا دارالسلطنت فیض ہے اور اس کی آبادی ۸۴ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔

دوسرا حصہ اسپینی مراکش ہے جو اسپین کی غلامی میں ہے جس کا پایۂ حکومت رباط ہے اور اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔

تیسرا حصہ سفید فام بین الاقوامی غلامی کے ماتحت ہے جس پر انگریز، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، امریکی، ڈچ اور بیلجیم شہنشاہیت پسند طاقتیں حکومت کرتی ہیں اس کا دارالخلافہ طنجہ ہے اور اس کی آبادی دس ہزار ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق مراکش کی آزادی کا مسئلہ کم یا زیادہ ایک کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔

دو نئی سلطنتیں

پس آج شمالی افریقہ کے نقشہ پر اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر دو نئی سلطنتیں ابھر رہی ہیں، ہمارے عقیدے کے مطابق اب دونوں قوموں کی آزادی ایشیائی طاقت میں ایک نیا اضافہ کرے گی اور ان دونوں ملکوں کی آزادی سے دنیا کے امن کو ایک نئی ضمانت مل سکے گی۔

اس نقشے کے پیش نظر ہم آج یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آزادی کا وہ نعرہ جو ساری دنیا میں گونج رہا ہے تیونس اور مراکش کو اس سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔

ہم دنیا کی رائے عامہ کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فرانسیسی شہنشاہیت کو تیونس، الجزائر اور مراکش سے دستبردار ہونا چاہیے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برطانیہ ہندوستان اور پاکستان سے، امریکہ فلپائن سے، اٹلی طرابلس اور حبش سے اور ہالینڈ انڈونیشیا سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

مطالبات اور تائید

ہمارا یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ:

(۱) تیونس کی نئی دستوری پارٹی اور مراکش کی استقلال پارٹی دونوں ملکوں کے عوام کی طرف سے آزادی کا مطالبہ کرچکی ہیں اور یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

(۲) اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت تیونس اور مراکش کی آزادی، آزاد دنیا کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے اور اقوام متحدہ کی اسمبلی میں دو نئے ملکوں کے داخلہ سے خود اقوام متحدہ کی ساکھ بڑھے گی اور شکوک و شبہات کم ہو جائیں گے، جن سے دنیا کے امن کو خطرہ درپیش ہے۔

(۳) عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتیں تیونس اور مراکش کی آزادی کے لئے اقوام متحدہ کی راجدھانی میں سرگرم کار ہیں اور ان طاقتوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو سلامتی کونسل میں دونوں ملکوں کی آزادی کا مقدمہ پیش کردیا ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ آزاد ہندوستان بھی شامل ہے۔ نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہے۔ اس لئے یہ ہماری قومی پالیسی کا بھی تقاضا ہے کہ ہم ان دونوں ملکوں کے جہاد آزادی میں پوری پوری حمایت کریں۔

(۴) ۶ ستمبر کے اجلاس میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اقوام متحدہ میں عرب ملکوں کے نمائندوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اقوام متحدہ ___ کی جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں تیونس اور مراکش کا مسئلہ پرزور طریقہ پر پیش کریں اور اپنے دوست ممالک سے اس مسئلہ میں کمک حاصل

کریں۔

فرانس کا دیوالیہ پن

سیاسی واقعات کے اس صاف و صریح نقشے کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک تجویز کی صورت میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں جبکہ ابھی ماضی میں پچاس کروڑ انسان (جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں) اپنی آزادی کے مالک بن چکے ہیں۔ فرانس کا ایک کروڑ انسانوں کو غلام بنائے جانے پر اصرار کرنا اس کے سیاسی دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے جسے آج کل کے دور میں آزاد قوموں کی منظوری نہیں ہوسکتی ـــــ اندریں حالات ہندوستانی عوام اور ان کی حکومت جنہوں نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اور آج مصر اور فلسطین کی آزادی کی حمایت میں ہمنوائی کا فرض انجام دے رہے ہیں، تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی تائید و حمایت سے بھی کسی طرح چشم پوشی اور سکوت نہیں کرسکتے۔

آج دنیا میں امن، انصاف، حق خود ارادیت، مساوات اور انسانیت کے الفاظ سب سے زیادہ یورپ کی آبادیوں کے زبان زد ہیں۔ اگر ان کے یہاں ان الفاظ کے کچھ معنی ہیں اور حقیقۃً یہ الفاظ مہمل اور بے معنی بناکر استعمال نہیں کئے جارہے ہیں تو فرانس، اٹلی، بلجیم، اسپین، انگلستان، امریکہ اور تمام ان یورپین طاقتوں سے جو تیونس اور مراکش پر اپنا پنجۂ استبداد جمائے ہوئے مطمئن بیٹھے ہیں، ہم یہ اپیل کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انسانیت پروری کے دعویدارو! اے امن وانصاف کے ٹھیکیدارو! اور اے خود ارادیت اور انسانی حقوق کے علمبردارو! تمہیں تیونس اور مراکش کی آبادیوں کو غلام بنائے رکھنے پر آخر کیوں اصرار ہے؟

اگر تمہیں حقیقی امن وانصاف اور انسانیت کی لاج نہیں تو کم ازکم اپنے ان لفظی دعوؤں ہی کی پاسداری کرو اور ایک کروڑ انسانوں کے ایک ایسے جائز مطالبہ کی راہ میں حائل نہ ہوں جس کی کمک پر پوری جمہوریت پسند دنیا کھڑی ہوئی ہے۔

مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن

حضرات! مجھے چونکہ ہندوستان میں ایشیا کے سب سے بڑی مذہبی اور علمی مرکز دار العلوم دیوبند سے ذمہ دارانہ تعلق ہے اور اسی کے ایک ذمہ دار اور خادم کی حیثیت سے میں نے اسلامی اخوت کا حوالہ دیکر تیونسی لیڈر جناب حبیب بورقیبہ کو یقین دلایا تھا کہ اس مطالبہ میں ہندوستان کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بے موقعہ ہوگا اگر میں اس اہم ترین مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن واضح کئے بغیر اس افتتاحیہ کو ختم کردوں۔ جبکہ کسی بھی ایسے اجتماعی یا سیاسی مسئلہ میں جس میں مسلمان بالاستقلال یا دوسری اقوام کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں، اسلام نے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ صاف واضح اور روشن ہدایات دی ہیں، جہاں تک کسی قوم کی آزادی اور ظالم قوموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس کا سب سے بڑا حامی ہے، فرعون سے بنی اسرائیل کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ آزادی اس بارے میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔ اسرائیلیوں کو مصر کی فرعونی حکومت نے غلام بنا رکھا تھا، انہیں حقوق شہریت سے محروم کردیا تھا، ذلیل سے ذلیل خدمات ان سے متعلق کی جاتی تھیں، انہیں اچھوت بنادیا گیا تھا، اقتصادی حالت ان کی زبوں تھی۔ اوپر سے انہیں پارٹیوں میں منقسم کردیا گیا تھا تاکہ ان کی سالمیت اور اجتماعی صلاحیت ختم ہوجائے، اس کا نرینہ

اولادوں پر کنٹرول تھا اور پیدا ہوتے ہی تہ تیغ کردیا جاتا تھا تاکہ آئندہ بھی ان میں کوئی اولوالعزم سپوت پروان نہ چڑھنے پائے جو اپنی قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر ابھر جائے اور غلام قوم میں کوئی صحیح لیڈر شپ قائم نہ ہو جائے۔ جو ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے' لیکن غاصب قوم کی اپنی سفاکیوں اور چالاکیوں کی اندھیروں میں بالآخر موسیٰ علیہ السلام کی مقدس ہستی اسرائیلیوں میں پیدا ہوئی اور ابھری جسے فرعون جیسے قاتل اسرائیل کے دربار میں شاہانہ طریق پر بلوایا گیا ___ اور آخرانہوں نے قوم کی اس بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر فرعونی دربار میں اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ پیش کردیا۔ فرعون نے اپنے کچھ سابقہ احسانات پرورش جتا کر اور نعمتوں کے تذکرہ سے مطالبۂ آزادی کو ٹلانا اور رلانا چاہا۔ جس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ :

"ہاں میری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے شاید یہی ہوگی کہ تو نے میری قوم کے لاکھوں افراد کو غلام بنا رکھا ہے"۔

پھر اس نے دھمکیوں سے مطالبہ آزادی کو دبانا چاہا جو ظالم قوموں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے اور کہا :

"اے موسیٰ! میں تجھے جیل بھیج دوں گا"۔

اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ :

"اگر چہ میں روشن دلیلیں بھی اپنے مطالبات کے جواب میں پیش کردوں یعنی جیل اور قید وبند کی دھمکیوں سے ایک مدلل دعویٰ کا جواب تھوڑا ہی ہو سکتا ہے؟"

ان غلط حیلہ جوئیوں سے کوئی اثر نہ لیتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرعون کے سامنے یہ مطالبۂ آزادی رکھ دیا کہ میں بحکم خداوندی کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ کردے اور ان کو غلامی کا عذاب دینے سے دست کش ہو جا۔ درصورت خلاف ورزی فرمایا کہ ورنہ پھر اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی اور حق وصداقت کے مطالبات جھٹلانے کا وبال جھٹلانے والے ہی کو بھگتنا ہوگا۔

اس واقعہ میں خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو مطالبۂ آزادی دے کر بھیجنے سے واضح ہے کہ مظلوم قوموں کا مطالبۂ آزادی ___ ایک مذہبی حق ہے۔ جس کو خدا کی طرف سے تائید ہی حاصل نہیں بلکہ اس کا حکم اور امر شامل ہے جو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ ایسے مطالبات کو لے کر اٹھنے والا درحقیقت ایک مذہبی تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر جہاں تک کسی دبے ہوئے وطن اور سرزمین کو ظالموں کے ناجائز قبضہ سے نکالنے اور حق دار کو قبضہ دلانے کا تعلق ہے۔ اسی واقعہ میں اس کی بھی صاف وصریح ہدایت ملتی ہے۔

استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار پر عتاب الٰہی

سرزمین فلسطین پر عمالقہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور بنی اسرائیل کو جن کی وہ سرزمین تھی اس سے محروم کردیا تھا حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسرائیلیوں کو حکم بھیجا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارا حق ہے' اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرو اور عمالقہ کی غاصب اور جابر قوم کا قبضہ وہاں سے اٹھا دو۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ کے تن وتوش اور ظاہری قوت سے مرعوب ہو کر تعمیل حکم میں پس وپیش کیا اور غاصب قوم کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر اپنے وطن میں داخل ہونے سے انکار کردیا کہ جب تک یہ جابر قوم ہمارے وطن کو خود نہ چھوڑ دے گی ہم اس میں داخل نہ ہوں گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا۔

قوم کو سمجھایا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس پر بھروسہ کرو، وعدہ ہے کہ جب تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہی کو دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی بنی اسرائیل جی چرا گئے اور استخلاص وطن کے لئے جدوجہد کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر انہیں خدا کی طرف سے سزا دی گئی۔ ایک تو یہ غلبہ وقبضہ چالیس برس مؤخر ہو گیا۔

اور دوسرے ۴۰ سال کی اس لمبی مدت میں بنی اسرائیل وادی تیہ میں بھٹکتے پھرے گویا سزا کے طور پر گھر سے بے گھر بھی رہے اور معتوب الٰہی بھی ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ظالم قوموں سے اپنی سرزمین کا چھڑانا ایک ایسا مذہبی فریضہ ہے کہ اس میں پس وپیش یا انکار کرنے سے اقوام معتوب خداوندی ٹھہر جاتی ہیں اور انہیں مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس مقصد کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔

آزادی، مذہبی اور انسانی حق

پس! آج تیونس اور مراکش کے باشندے اگر فرانس سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے ان سے اپنی سرزمین چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے ملک پر خود اپنا قبضہ چاہتے ہیں تو یہ ان کا شرعی اور مذہبی حق ہے جس کو انہیں بہر صورت حاصل ہی کرنا چاہیے۔ اور اگر ہم یا دنیائے اسلام کے تمام باشندے خواہ وہ عرب لیگ کے ممبر ہوں یا عرب ممالک کے سرکاری نمائندے اس مطالبۂ آزادی کی حمایت میں فرنچ حکومت اور یورپین اقوام کے غاصبانہ اقتدار کے مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ان کا یہ فعل نہ صرف بین الاقوامی قانون، آزادی ممالک اور جمہوریت پسند اقوام کی متفقہ خواہشات کے مطابق ہے بلکہ مذہبی اصول اور اسلامی قانون کے منشاء کے بھی عین مطابق بلکہ اس کے امر وحکم کے تحت ایک شرعی فریضہ ہے۔

بہر حال تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی یہ حمایت خود ان ملکوں کی ذمہ دار عوامی جماعتوں، اقوام متحدہ کے چارٹر عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتوں، عرب لیگ کمیٹی کی تجویز، ہندوستان کی جمہوریت پسند پالیسی اور بالآخر مذہب کی صاف وصریح ہدایت کے تحت نہ صرف واجبی بلکہ واجب اور انسانیت کے حقوق کی صحیح حفاظت ہے۔

جہاد آزادی میں شرکت

ہم جمعیت علماء ہند کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے عین وقت پر اس ملک کے لوگوں کو، مساوات کا شور برپا کرنے والوں کو کہا، اگر تم واقعی ان الفاظ سے دنیا کو دھوکا نہیں دے رہے ہو ان کا قومی اور مذہبی فریضہ یاد دلایا۔ ہم ان تمام جماعتوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس عظیم مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور آئندہ کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں اس کام کو قانونی پوزیشن کی حد تک اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی اور اپنی قومی پالیسی کی رہنمائی میں جاری رکھنا چاہئے اور بمبئی کے اس نمائندہ اجلاس میں ایک مکمل اور جامع تجویز سلامتی کونسل میں بھیج کر شمالی افریقہ کے اس جہاد آزادی میں اپنی شرکت کا واضح یقین دلا دینا چاہئے نیز مجھے امید ہے کہ ذمہ داران اجلاس اس موقع پر اپنی سیاسی اور مذہبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بارہ میں ہندی عوام کے نقطۂ نظر سے تیونس اور مراکش کے تمام باشندوں کو بھی باخبر کر دینے کا خوشگوار فریضہ ادا کریں گے۔

وباللّٰہ التوفیق

اظہار تشکر

دورۂ افریقہ سے واپسی پر الوداعی خطاب

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

امابعد

محبت وشکر گذاری کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا

بزرگان محترم، صاحب حق صدر باوقار، اراکین جمعیت علماء، اور ذمہ داران قوم!

اس پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں متعدد جلسے، مجلسیں ہوتی رہیں اور میں اس میں حاضر رہا۔ آج بھی ایک بڑا اجتماع سامنے ہے ___ لیکن اور جلسوں کی نسبت اس جلسے کی نوعیت کچھ جداگانہ ہے۔

اس سے پہلے جو جلسے ہوتے تھے وہ درحقیقت سننے کے لئے تھے اور آج کا جلسہ کچھ کہنے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے آپ حضرات سنتے تھے اور بولنے والا ایک ہی ہوتا تھا۔ لیکن آج میں سننے والا ہوں۔ سب حضرات بولنے والے ہیں۔ جس کی ترجمانی وہ حضرات فرمارہے تھے، جنہوں نے ابھی کلام کیا۔ ہمارے مولانا عمردین صاحب، ہمارے محترم احمد اللہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب۔ یہ حضرات کچھ کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا اور اس کو یوں کہنا چاہئے کہ اس ناچیز خادم کے پچیس روزہ قیام کے سلسلے میں جو کچھ آپ کا تاثر ہوا، اسے قدردانی کے ساتھ اور شکریہ کے الفاظ کے ساتھ آپ نے ظاہر فرمایا۔

ان الفاظ سے اور پچیس روزہ محبت کے طرز عمل سے، خود میرے اندر بھی محبت وشکر گذاری کے جذبات پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ میں انہیں الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتا۔ وہ قلب کی کیفیات ہیں اور کیفیات الفاظ میں نہیں آسکتیں، کتنے بھی بڑے سے بڑے الفاظ میں کیفیات کی تصویر کھینچی جائے، محبت کو ظاہر کیا جائے۔ لیکن وہ ظاہر ہو ہی نہیں سکتی۔ الفاظ کا دامن تنگ ہے اور جذبات محبت کا میدان بے حد وسیع ہے۔ تو الفاظ کی قبا کا لباس ان پر چست ہو ہی نہیں سکتا۔ کتنا ہی آدمی کھل کر بیان کرے، حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

پرسید یکے کہ عاشقی چیست؟

کسی عاشق سے کسی نے پوچھا کہ بھائی عاشقی اور محبت کیا چیز ہے، اسے کچھ الفاظ میں بیان کرو ۔

پُرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ تو چوں ماشوی بدانی

یعنی میں محبت کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ قلبی کیفیات اتنی لطیف اور باریک ہوتی ہیں کہ الفاظ میں نہ سما سکتی ہیں نہ الفاظ ان کو ادا کرسکتے ہیں۔ خواہ وہ نفسانی کیفیات ہوں یا روحانی‘ الفاظ سے بالاتر ہیں۔

اگر کوئی بچہ آپ سے سوال کرے کہ جوانی کی کیا کیفیت ہیں؟ ذرا مجھے بتلادیجئے۔ آپ کیا بتلائیں گے۔ یوں کہیں گے کہ بیٹا! ایک دس برس کا انتظار کرو۔ جوان ہوجاؤ گے۔ خود بخود پتہ چل جائے گا۔ جوانی کیا چیز ہے۔ اس کی کیا کیفیات ہیں۔ ایک نوجوان آدمی بوڑھے سے سوال کرے کہ بڑے میاں! مجھے بڑھاپے کی کیفیات بتلادو؟ بوڑھا یہی کہے گا کہ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ بڑھاپے تک پہنچ جاؤ۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔ بڑھاپا کیا ہے۔ میں لفظوں میں کیسے ادا کروں؟

اسی طرح جب ایک بوڑھا آدمی اس کیفیت کو جو کسی محتضر کی جان پر گزر رہی ہو۔ کسی پر نزع کی کیفیت ہو‘ جان کنی ہو، اس کو شریعت اسلام میں محتضر کہتے ہیں کہ موت اس کے پاس آگئی ہو۔ اب ایک بوڑھا اس محتضر سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ الفاظ میں مجھے بتلادو۔ وہ کہے گا کہ اس کیفیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ چند دنوں میں تمہارے اوپر بھی آنے والی ہے۔ اس وقت سمجھ میں آجائے گی۔

___ یا ایک محتضر کسی میت سے پوچھے کہ قبر میں تم پر کیا کیفیات گزریں۔ وہ بھی کہے گا بھئی! قبر میں آجانا۔ آنا تو ہے ہی۔ وہاں سمجھ میں آجائے گی۔ میں کیا بیان کروں؟ تو کیفیات کو نہ الفاظ ادا کرسکتے ہیں نہ وہ الفاظ میں سما سکتی ہیں ___ اگر مجھ سے کوئی پوچھنے لگے کہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟ میں کیا بیان کروں؟ کتنا ہی بیان کروں‘ حق ادا نہیں ہوگا۔ سوائے اس کے کیہ کہوں چار پیسے خرچ کرو‘ سیب خریدو‘ کاٹ کے کھاؤ‘ پتہ چل جائے گا کہ سیب کی کیا کیفیات ہیں؟ مزے کو الفاظ میں میں کیسے ادا کروں؟ تو سیب کا مزہ ایک حسی اور مادی چیز ہے‘ وہ الفاظ میں ادا نہیں ہوسکتا‘ عاشقی اور محبت الفاظ میں کیسے سما سکتی ہے؟ کیسے ترجمانی ہوسکتی ہے؟

آپ حضرات کے محبت کے عمل سے جو شکر گزاری اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ الفاظ نہیں ہیں کہ انہیں ادا کیا جائے۔

آپ کی محبت کے جذبات دل کا جوہر بن گئے ہیں جو آخرت تک ساتھ جائیں گے

پھر ایک طرف تو پچیس دن کا عمل ہے اور ایک طرف قول ہی قول ہے۔ کوئی عمل مجھ سے بن ہی نہیں پڑا۔ آپ حضرات کی طرف سے عمل کا ظہور ہوا۔ محبت کا عمل‘ مدارات کا عمل‘ اکرام ضیف کا عمل۔ آپ نے یہ عمل کرکے دکھلایا۔ ایک دن کی مہمانی ہو‘ دو دن کی ہو؟ یہ پچیس دن کی مہمانی؟ ___ شرعی طور پر آدمی تین دن مہمان ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر مستحب ہے۔ گو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تین دن کی مہمانی واجب تھی۔ اور حدیث میں فرمایا گیا، اس زمانے کے لوگوں کو خطاب تھا کہ اگر کوئی تین دن مہمانی نہ کرے‘ ایک ہی دن میں جواب دے دے‘ تو مہمان کو حق ہوتا تھا کہ میزبان کے گھر سے اتنی قیمت کی روٹیاں اٹھاکے لے جائے جس میں تین دن کی مہمانی ہوسکتی ہے۔ مگر یہ ابتدائی حکم منسوخ کردیا گیا۔ ایک وقتی طور پر یہ حکم تھا‘ کیونکہ غربت کا دور تھا۔ اسلام لانے کے لئے لوگ آتے تھے‘ ان کی مدارات اور مہمانی نہ کی جاتی‘ وہ دین کی دولت سے محروم ہوجاتے۔ اس لئے تین دن کی مہمانی واجب قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ یہ مستحب اور اعلیٰ و اولیٰ کا درجہ ہوگیا۔

البتہ اس سے کم جتنے دن یا جتنی دیر ٹھہرے‘ اس کا اکرام واجب قرار دیا گیا‘ بلکہ اس کو ایمان کا جز بتلایا گیا اور فرمایا گیا‘

من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ۔

جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مہمان کی مدارات کرے۔

مہمان کی مدارات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے روزانہ مرغ ہی کھلایا جائے یا بریانی کھلائی جائے‘ یہ معنی نہیں۔ بلکہ یہ کہ جو کچھ بھی کھلایا جائے‘ محبت سے کھلایا جائے‘ چاہے چٹنی روٹی ہو اور اگر گوشت بریانی ہو اور ساتھ محبت ومدارات بھی ہو تو یہ نور علیٰ نور ہے ___ غرض پچیس دن تک اسی طرح کی مہمانی کیا جانا‘ یہ مستحب ہونے کے درجات سے بالاتر ہے۔ واجبات میں نہیں تھی۔ محض محبت اور مخلصانہ جذبات تھے۔ تو پچیس دن کے عمل سے جو جذبات وتاثرات محبت اور شکر گزاری کے پیدا ہوئے وہ دس پندرہ منٹ میں الفاظ میں کیسے ادا ہو سکتے ہیں۔ وہ جذبات تو ساتھ جائیں گے‘ وہ دل کا جوہر بن گئے۔

اور یہی محبت کے جذبات ان شاء اللہ آخرت تک بھی جائیں گے‘ دنیا تک محدود نہیں ہیں ___ اس لئے کہ آپ حضرات نے جو مدارات ومحبت فرمائی‘ وہ دنیا کی خاطر نہیں فرمائی‘ وہ آخرت کی خاطر فرمائی۔ کسی دنیوی رشتے سے نہیں کی کہ میرے سے آپ کی کوئی غرض متعلق تھی یا کوئی دنیا کا مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ محض اپنے دین کی محبت میں اس شبہ کی بنا پر کہ یہ شخص ہمیں کچھ نیک ہدایت کردے گا۔ تو یہ آخرت کے جذبات تھے۔ اس لئے اس کے تاثرات بھی یہیں تک نہیں ہیں‘ آخرت تک جائیں گے۔ جو چیز دنیا سے آخرت تک جانے والی ہو‘ اس کو الفاظ میں کس طرح سمایا جاسکے اور کون سا ایسا لفظ ہے کہ اس میں دنیا و آخرت دونوں سمٹ کر آجائیں۔ اس لئے یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں ان جذبات تشکر کو یا اپنے ان تاثرات کو جو آپ حضرات کی محبت سے پیدا ہوئے‘ الفاظ میں ادا کرسکوں۔ بجز اس کے کہ دعا کی ہے اور یہ وعدہ ہے کہ آئندہ بھی دعا کروں گا۔ نیز دعا کے سوا اور کسی چیز کی ہم میں استطاعت بھی نہیں ہے۔

اور یہ اس لئے بھی کہ دعا کے لئے اہلیت شرط نہیں ہے۔ نااہل بھی دعا مانگتا ہے‘ اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ گنہگار بھی دعا مانگتا ہے۔ اللہ اس کی بھی سن لیتا ہے۔ اس لئے دعا مانگنے کے لئے اہل ہونا ضروری نہیں۔ اسی دعا کی آپ سے بھی استدعا ہے۔ بجز دعا کے میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے کہ میں پیش کرسکوں۔

مولانا عمر دین صاحب نے یہ فرمایا کہ وہ خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات سے تقریر کررہے ہیں ___ خوشی اس کی ظاہر ہے کہ ان کے خیال کے مطابق پچیس روزہ قیام میں کچھ کام بنا۔ رنج اس کا ظاہر کررہے ہیں کہ آج جدائی کا دن ہے لیکن میرے اندر اس وقت سوائے رنج کے کوئی خوشی کا نشان نہیں ہے۔

اس لئے جدائی کا غم الگ ہے اور کام نہ بننے کا غم الگ ہے اس لئے کہ کوئی خدمت نہیں بن پڑی۔ یہ تو آپ کی قدردانی اور محبت کی بات ہے جو کہ آپ نے فرمایا کہ اپنا سب وقت لگادیا ___ کچھ بھی وقت نہیں لگایا۔ محض چند ساعتیں ایسی گزری ہیں جس میں کچھ عرض کرسکا۔ جو مجھے کرنا چاہئے تھا‘ نہیں کرسکا۔ اس لئے میرے واسطے تو غم ہی غم کا موقع ہے۔ جدائی کا غم بھی ہے اور کچھ نہ کرسکنے کا غم بھی ہے۔ اب سوائے اس کے میں شکریہ کی بجائے آپ حضرات سے معافی چاہوں اور کیا کرسکتا ہوں۔ جو تقصیرات ہوئی ہیں‘ ان سے آپ درگزر فرمائیں اور جو خدمت میں قصور ہوا ہے‘ اس کو نظر انداز فرمائیں۔ کریموں کی کریم النفسی یہی ہوتی

ہے کہ قصور و تقصیر پر درگزر اور معافی کا برتاؤ کیا جائے۔

اصل شکریہ عملی زندگی میں انقلاب ہے

بہرحال ان دنوں میں جو بھی آپ نے خلوص اور محبت کا برتاؤ فرمایا' اس کے اثرات دل کے اندر موجود ہیں ___ لیکن میں سمجھتا ہوں ان کا حقیقی شکریہ یہ ہے کہ جو گذارشات پیش کی گئی ہیں' ان پر عملی زندگی میں کوئی چیز سامنے آئے۔ عمل میں انقلاب پیدا ہو۔ یہ اصل شکریہ ہے۔ شرعاً بھی شکریہ اسی کو کہتے ہیں۔ کہ اگر قول کی بات بتائی گئی ہو' تو وہ قول کیا جائے' یہ شکریہ ہے اور اگر عمل کی بات بتائی گئی ہو' عمل کیا جائے' یہ شکریہ ہے اس لئے میں تو آپ کے شکریہ کا متمنی ہوں۔

یہ بھی ایک بے جا جرأت اور جسارت ہے کہ میں آپ سے یوں کہوں کہ میرا شکریہ ادا کیجئے۔ مگر ہاں میں یہ جرأت کرتا ہوں۔ آپ شکریہ ادا کریں۔ مگر عملی شکریہ ادا کریں۔ اگر ان پچیس دنوں میں کوئی کام کی بات آپ کے کانوں میں پڑ گئی ہے۔ تو اس پر عمل کر کے دکھلائیں۔

اور حقیقت میں یہ میرا شکریہ نہیں ہو گا۔ یہ حق تعالیٰ شانہ کی اور دین اسلام کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکر گزاری ہو گی کہ جنکی جوتیوں کے صدقے میں ہم کچھ کہہ سکے اور آپ کچھ سن سکے ___ تو اصل شکریہ جس کی مجھے خود طلب اور تمنا ہے وہ یہ ہے کہ عملی طور پر ہماری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ آپ حضرات تقریباً سوا اسی سال سے یہاں ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد یہاں آئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی آپ کو آج دولت یا عیش میسر ہے۔ یہ ان آباؤ اجداد کا طفیل ہے۔ یہ ان کی دعاؤں کی اور خلوص کی برکت ہے۔ وہ آئے اور اپنا دین ساتھ لے کر آئے۔ دنیا بھی کمائی اور انہوں نے دین بھی کمایا اور دین کو مضبوطی سے پکڑا۔ ان کے دین کے آثار موجود ہیں۔ یہ جو آج اس ماحول میں آپ کے اندر دینی جذبات موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کا طفیل ہے۔ یہ ان کے اثرات ہیں جو آبائی طور پر آپ کے اندر منتقل ہیں۔ اسی سے آپ اندازہ کریں کہ اگر آپ ان تاثرات کو باقی رکھیں گے۔ آپ کی اولاد میں بھی وہ تاثرات منتقل ہوں گے۔ جیسے ان آباؤ اجداد سے آپ نے کچھ پایا' آپ کی اولاد بھی کچھ پائے گی اور اگر خدانخواستہ آپ نے ان اثرات کو چھوڑ دیا تو اولاد سے بھی کوئی توقع نہ رکھی جائے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آنے والے اپنے دین میں بھی مضبوط تھے' دنیا میں بھی۔ ان کے معاملات میں کھرا پن اور خالص دینی رنگ تھا اور ڈھیلا پن نہیں تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا ہے جب کوئی قوم میری اطاعت کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میں اس پر رحمت کرتا ہوں اور رحمت کا اثر اس کی سات پشت تک جاتا ہے اور جب کوئی قوم میری نافرمانی کرتی ہے، میں بھی اس پر لعنت کرتا ہوں اور میری لعنت کا اثر بھی سات پشت تک جاتا ہے۔ یہ جو آپ کی پشتوں میں دین اور جذبات دین کا اثر ہے۔ یہ ان بزرگوں کے اثرات ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کا طفیل ہے' جنھوں نے اپنے قلوب کو دین سے بھر رکھا تھا۔ یہی عبرت کا مقام ہے۔ ہم بھی اگر اسی طرح سے ان کے دین کے جذبات سے بھرپور ہیں۔ تو ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ اس دین کا اثر ہماری اولادوں میں بھی قائم رہے گا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی شکریہ یہ ہے کہ دین کی باتوں کو عملی طور پر دنیا کے سامنے ظاہر کیا جائے۔

اسلام درحقیقت نام ہی عمل کا ہے۔ اسلام قول یا خیال کا نام نہیں ہے۔ حدیث میں ہے الایمان بِضعٌ

والاسلام علانیۃ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جو قلب میں رہتی ہے' وہ عقائد کا مجموعہ ہے۔ اسلام کھلی ہوئی چیز ہے جو عمل کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ تو نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' سچ بولنا اور حسن معاشرۃ وغیرہ یہ اسلام ہے اور اللہ کو ایک جاننا' رسول کو برحق ماننا' قیامت کو برحق ماننا' یہ ایمان ہے۔ ایمان مثل جڑ کے ہے جو دلوں میں مخفی رہتا ہے اور اسلام مثل شاخوں اور پھل پھول کے ہے جو اوپر نظر آتا ہے۔ اس لئے اسلام عمل ہی کو کہتے ہیں۔ کسی تخیل کا نام اسلام نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی چیز عمل سے ظاہر ہوگی' قول سے نہیں ہوگی اور جو چیزیں پیش کی گئی ہیں' وہ اسلام کی چیزیں پیش کی گئی ہیں۔

اس لئے کہ ایمان تو بحمد اللہ ہر ایک کے دل میں موجود ہے۔ ہم جتنے بھی ہیں' آخرت کے' اللہ کی وحدانیت' رسول کی رسالت کے بھی قائل ہیں اور سب چیزوں کو حق مانتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو موجود ہی ہے۔ کسر اور کوتاہی جو ہم میں ہے وہ عمل میں ہے عقائد میں نہیں ہے۔ اس واسطے عمل ہی کی چیزیں زیادہ بیان کی گئیں۔ اس لئے اس چیز کی تمنا اور توقع بھی ہے کہ وہی چیزیں آگے ظاہر بھی ہوں۔ تو اصل شکریہ وہی ہوگا۔

اس لئے قول کا شکریہ بلاشبہ ایک قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے کہ شکر جس طرح زبان اور قلب پر آتا ہے' اسی طرح عمل پر بھی آتا ہے۔ قلب کے شکر کے معنی اعتراف کے ہیں۔ زبانی شکر کے معنی بولنے کے ہیں۔ عملی شکر کے معنی عمل کرنے کے ہیں۔ تو قلب میں اور زبان پر بھی بحمد اللہ شکر گزاری کے جذبات اور اقوال موجود ہیں۔ اب آگے انتظار ہے تو عملی زندگی کا ہے۔ عملی چیزیں سامنے آئیں' جن کے اوپر چلا جائے۔ پھر شکریئے کی تکمیل ہو جائے گی۔

دنیوی مشکلات کے حل کے لئے دینی و روحانی تدبیر

جو حالات آج کل پوری دنیا میں اور یہاں (افریقہ میں) بھی پیش آ رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر دین ہی کے اعتبار سے فی الحقیقت پریشان کن ہیں۔ دنیوی اعتبار سے مشکلات ہیں مگر دنیا کی مشکلات زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتیں' کیونکہ عارضی ہوتی ہیں۔ ہوتی بھی ہیں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ اگر دینی تکلیف پیش آئے' وہ زیادہ سوہان روح ہوتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے مصیبت کا تذکرہ کیا۔ تو کیسا اچھا حل دل کو ہلکا کرنے کے لئے بتلایا۔

فرمایا جب کوئی مصیبت آئے۔ پہلے یہ سوچ کہ وہ تمہارے دین پر آئی ہے یا دنیا پر آئی ہے۔ اگر دنیا پر آئی ہے تو وہ شکر گزاری کا موقع ہے کہ الحمد للہ دین محفوظ ہے' جو کچھ گزر رہی ہے دنیا پر گزر رہی ہے اور دنیا کی مصیبت چند دن کی ہوتی ہے۔ مگر دین کی مصیبت پائیدار ہوتی ہے' وہ لمبی چلتی ہے' اس کے آثار زیادہ ہوتے ہیں۔ اس واسطے اگر دین آفتوں سے محفوظ ہے' تو ہمارے لئے شکر کا موقع ہے۔

دنیا کی آفات بلاشبہ تکلیف دہ ہیں۔ لیکن ان کے حل بھی ہیں دنیوی اعتبار سے بھی' شرعی اعتبار سے بھی' وہ مصیبتیں ختم بھی ہو سکتی ہیں۔ خود دنیا ہی ختم ہونے والی ہے۔ تو اس کی مصیبتیں بھی عارضی ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے' وہ اپنی ایک عمر لے کر آتی ہے۔ اس میں اجمالی درجہ میں اس کا کچھ دفعیہ اور تدبیر کرو۔ مگر زیادہ اللہ کو سونپ دو۔ جب اس کی عمر پوری ہوگی' وہ اپنے وقت پر خود ختم ہو جائے گی اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارے تو بعض دفعہ الٹ پڑ جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص بیمار ہو' تو

ڈاکٹر یا طبیب کو بلائے اور اپنا معمولی علاج شروع کر دے' بیماری اپنے وقت پر گزر جائے گی لیکن اگر اتنا اہتمام کیا کہ ایک ڈاکٹر صبح کو اور ایک شام کو اور دوپہر کو ایک۔ علاج کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ وہ علاج معالجہ ہی خود مرض بنا جاتا ہے۔ مرض کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

اگر کوئی چڑیا کسی جال میں پھنس جائے' تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ آہستہ بیٹھی غور کرتی رہے کہ کونسا سوراخ ہے جس سے میں جال سے نکل کر بچوں اور اگر زیادہ ہاتھ پیر مارنے شروع کئے تو جال اتنا پھنس جائے گا کہ پھر نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ تو مصیبت جب آتی ہے تو زیادہ ہاتھ پیر مارنے سے آتی ہے۔ صبر و تحمل اور تدبیر کہ کس راستے سے اس مصیبت سے نکلیں' اس کی تدبیر کیا ہوسکتی ہے۔ سکون و صبر کے ساتھ وہ کی جائے۔ کچھ مصیبت کو گوارا کر لیا جائے' کچھ تدبیر کی جائے اگر آدمی یوں چاہے کہ مصیبت آنے نہ پائے اور بالکل ختم ہو جائے۔ یہ ناممکن ہوا کرتا ہے۔ یہ دنیا کی فطرت کے خلاف ہے۔ تو کچھ تھوڑی سی وہ گوارہ کی جائے' تھوڑی سی تدبیر کی جائے۔ بیچ کا راستہ نکل آتا ہے۔ مصیبت کو ہاتھ پیر مار کر بالکل دفع کرے تو آدمی پھنس جائے گا اور بالکل چپ بیٹھا رہے تب بھی دوامی طور پر پھنسا رہے گا۔ بیچ ہی کی چال کار آمد ہوتی ہے۔ بہرحال دنیوی مصائب آتی بھی ہیں' جاتی بھی ہیں۔ زیادہ خیال کرنے کی چیز یہ ہے کہ دینی مشکل نہ ہو جو ہمارے دین پر کچھ بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے جتنا بھی عرض کیا وہ دینی امور کے بارے میں عرض کیا' دنیوی' سیاسی یا انتظامی معاملات۔ ظاہر ہے کہ میں ایک غیر ملکی آدمی کہہ ہی کیا سکتا ہوں اور کہنے کی ضرورت جب ہو' جب ملک کے اندر بافکر اور باتدبیر لوگ موجود نہ ہوں۔ وہ خود ہی متفکر ہیں اور تدبیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنا کام تو یہ ہے کہ دعا کی جائے۔ ہم دعا کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ ہر مشکل سے آپ حضرات کو بچائے اور امید ہے کہ مشکلات رفع ہوں گی۔ حسن نیت اور تدبر کے ساتھ چلا جائے اور اللہ سے معاملہ صحیح کر لیا جائے' مشکلات رفع ہو جائیں گی اور مشکلات تو انسان پر آتی ہیں۔ اس لئے کہ دنیا نام ہی مشکلات کا ہے۔ اگر مشکلات نہ ہوں پھر اس کو جنت کیوں نہ کہا جائے؟ اور جنت کی پھر طلب کیوں ہو؟ طلب اسی لئے ہے کہ دنیا مشکلات کا نام ہے۔

بہرحال اس کی دعا ہے اور انشاء اللہ رہے گی کہ حق تعالیٰ آپ حضرات کی ہر قسم کی دینی اور دنیوی مشکلات حل فرماوے۔ (آمین) مصائب سے بری و بالا کر دے اور طمانینت و سکون کی زندگی دین و دنیا دونوں کے لحاظ سے نصیب فرماوے۔ (آمین)

اس لئے میں جو کچھ بھی عرض کر رہا ہوں' وہ در حقیقت اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار ہے کہ خود میں کتنا متاثر ہوا۔ آپ تو اپنے دینی جذبات کی وجہ سے کچھ کلام سن کے متاثر ہوئے ہوں گے۔ لیکن میں عمل کو دیکھ کے متاثر ہوں کہ پچیس دن میں ہر قسم کی محبت و مدارات اور قدردانی سامنے آئی۔ ابتدا میں آتے ہوئے مجھے تشویش تھی کہ معلوم نہیں کیسا ماحول ہو گا۔ لوگ کچھ بات بھی سن سکیں گے یا نہیں؟ کس قسم کے جذبات ہوں گے ___ جب دور بیٹھے ہوئے اجنبیت ہوتی ہے' تو آدمی کو **تخیلات** پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے کہ میرے عزیز نے بیان کیا۔ آنے کے بعد پہلے ہی دن معلوم ہوا کہ اپنے عزیزوں میں آ گئے۔ کوئی اجنبیت اور بُعد محسوس نہیں ہوا۔ بالکل جیسے ہم گھر والے ہوتے ہیں اور پچیس دن کے بعد تو آدمی ویسے ہی گھر والا ہو جاتا ہے۔ مگر ہم تو پہلے ہی دن گھر والے ہو گئے۔

اس پر میں جتنا بھی شکر گزار اور اپنے جذبات اور قلب کی تاثرات کو ظاہر کروں' وہ کم ہی کم ہوں گے' سوائے اس کے میں دعا کروں اور دعا کا وعدہ کروں اور آپ حضرات کے سامنے کیا پیش کر سکتا ہوں۔

البتہ اتنی بات آپ حضرات سے عرض کرنی ہے کہ یہ مشکلات کا زمانہ ہے۔ جس طرح اور تدابیر کی جاتی ہیں اور اہل الرائے جو تدابیر بتلاتے ہیں۔ اس پر چلا جائے۔ وہ تدبیریں اپنی جگہ ہیں ___ لیکن روحانی طور پر بعض ادعیہ اور چیزیں ایسی ہیں' وہ بھی مشکلات کے حل کے اندر معین ہیں اور ایک مسلم کے لئے ان سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اللہ کے بتلائے ہوئے راستہ پر آدمی چل پڑے اور اس سے قطع نظر کرے کہ کیا ہوگا؟ بس وہ حل ہو جائے گی۔ مگر ہم ایسے ماحول میں ہیں، اس درجے کا تو ہمارا ایمان نہیں ہے کہ بالکل ہر چیز سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو روحانی سلسلے میں ڈالدیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ دنیوی و معاشرتی تدابیر ضرور ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ دینی تدابیر سے بھی غافل نہ رہا جائے۔

صحابہؓ پر مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض غزوات اور جنگوں میں جب غیر مسلموں سے مقابلہ پڑا ہے تو حق تعالیٰ نے اس وقت آیت اتاری۔ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اور اس کا ثمرہ بھی بتلایا کہ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ___ اور جوں ہی صحابہؓ نے اس کا ورد شروع کیا تو اللہ کی خبر ہے کہ انقلاب پیدا ہو گیا اور مصیبت سے نعمت آگئی۔ اور اللہ کے فضل سے برائیاں دور ہو گئیں۔

اس لئے اگر کوئی شخص کم سے کم روزانہ صبح کی نماز کے وقت سو مرتبہ ورد کر لیا کرے۔ اور یہ نیت کر لیا کرے کہ میری بھی مشکل حل ہو اور میرے بھائیوں کی بھی۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے۔ جس کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے۔ ہر ایک وعدہ ٹل سکتا ہے اللہ کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ یہ تو لکھی پڑھی بات ہے ___ اس سے مشکلات حل ہوں گی۔ اس لئے ایک تو یہ اور ایک یہ آیت کریمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ___ یہ حضرت یونس علیہ السلام کو تدبیر بتلائی گئی تھی جب کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوئے' اور مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو یہ دعا تلقین فرمائی۔

اس کا اثر یہ نکلا کہ مصیبت ختم ہوئی اور ایسی بہترین فضا سامنے آئی کہ یونس علیہ السلام کے سامنے کامیابیاں ہی کامیابیاں تھیں۔ کوئی ناکامی باقی نہیں رہی۔ یہ ہمارے اعتقادات میں کچھ ضعف اور سستی ہے' جس کی وجہ سے ہم پورا دھیان نہ دے سکے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تجربہ تو کر کے دیکھئے' ان شاء اللہ حالات بدلیں گے' یہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے۔ کسی اور کا بتلایا ہوا نسخہ نہیں ہے' جس کے علم میں کوئی کوتاہی ہو تو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا صبح کو سو مرتبہ ورد کر لیا جائے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ سوتے وقت اس کا ورد کر لیا۔ تو صبح کی دعاء تو مصیبت سے نعمت کا انقلاب پیدا کرے گی اور شام کی یہ دعا غم سے مسرت اور ناکامی سے کامیابی کا انقلاب پیدا کرے گی ___ انہی دو چیزوں کی ضرورت ہے کہ زندگی کامیاب ہو ___ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تدبیر بھی کرو۔ مگر ظاہر بات ہے کہ محض تدبیر تو کارگر نہیں ہوتی اور اس پر اثرات پیدا کرنے والے تو اللہ ہی ہیں۔ اس لئے کہ تدبیر تو بندے کا ایک فعل ہے' لیکن بندہ فاعل تو نہیں ہے' فاعل مختار تو اللہ ہے' اس میں اثر ڈالنے والا تو وہ ہے۔ چھری کے اندر کاٹنے کا اثر ہے۔ لیکن اگر اللہ اثر چھین لے تو چھری کام نہیں کر سکتی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھی گئی تھی' چھری کی دھار بھی تھی' گلہ بھی نازک تھا۔ چاہئے تھا کہ کاٹتی اور اپنا اثر دکھاتی۔ مگر تاثیر نکال دی گئی تھی۔ کوئی اثر نہ دکھا سکی۔ گویا چھری میں اثر دینا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ آگ کی تاثیر جلانا ہے۔ لیکن حقیقت میں اللہ کی قدرت اور مشیت جلاتی ہے آگ نہیں جلاتی۔ اس میں سے جلانے کی تاثیر نکال لی گئی۔ وہی آگ باغ و بہار بن گئی۔ اللہ رب العزت جو فاعل حقیقی ہیں۔ ان سے

معاملہ صحیح ہونا چاہئے۔ آگ کو پانی ٹھنڈا کرنے والا نہیں ہے' مشیت ٹھنڈا کرتی ہے۔ اگر پانی کو آگ بنادیں تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اسی طرح چھری نہیں کاٹتی مشیت حق کاٹتی ہے۔

اس واسطے مشکلات کے رفع کرنے کی جہاں اور تدابیر کی جائیں۔ وہاں بڑی تدبیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے نسخوں کو استعمال کیا جائے اور اس کا ورد کیا جائے۔ امید ہے کہ چند دن کے بعد ہر شخص محسوس کرے گا کہ کچھ انقلاب ہوا ہے۔ کچھ خیر کی طرف بات آرہی ہے۔ اس واسطے ادھر توجہ فرمائی جائے۔

شریعت کا ہر حکم دینی و دنیوی فوائد پر مشتمل ہے

اس کے علاوہ جو جو چیزیں وقتاً فوقتاً عرض کی گئیں۔ وہ حقیقت میں دینی اعتبار سے بھی نافع تھیں' دنیوی اعتبار سے بھی۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں آخرت کے ساتھ دنیا کا مفاد شامل نہ ہو۔ گو میں نے اس کی پوری تشریح نہیں کی کہ دنیوی فوائد کیا کیا ہیں۔ زیادہ دینی فوائد بتلائے گئے ہیں۔ لیکن جب آپ کرو گے' دنیوی فائدہ بھی آخرت کے ساتھ اس پر مرتب ہو گا۔

مسواک کے بارے میں علماء لکھتے ہیں اور احادیث میں ہے کہ مادی فائدہ تو یہ ہے کہ منہ میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے امراض رفع ہو جاتے ہیں ___ آخرت کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی کو مرتے وقت کلمہ نصیب ہو تا ہے یہ گویا مسواک کی تاثیر بتلائی گئی۔

یہ اثر کیوں ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ اس کی تشریح اس وقت مقصود نہیں ہے کہ مسواک کرنے سے مرتے وقت کلمہ کس طرح منہ سے نکلے گا؟ یہ لمبا مضمون ہے۔ مگر بتلانا یہ ہے کہ اس میں دونوں فائدے ہیں۔ منہ کی خوشبو' یہ مادی فائدہ اور کلمہ نصیب ہو جانا یہ روحانی فائدہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شہادت کی حالت میں تھے' تو آپؓ مرض میں مبتلا تھے' زخم گہرا تھا' وفات قریب تھی۔ ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ جب وہ واپس چلا گیا۔ فرمایا اس نوجوان کو بلاؤ۔ اس کی لنگی پیروں سے اتنی نیچے پڑی ہوئی تھی کہ زمین کے اوپر گھسٹتی ہوئی آرہی ہے۔ فرمایا'

> **یافتیٰ! ارفع ازارک فانہ انقی لثوبک واتقیٰ لربک**
>
> "اے عزیز! اس لنگی کو زمین پر گھسٹنے کی بجائے اوپر ٹخنوں تک اٹھا۔ یہ کپڑے کے لئے پاکی کا ذریعہ بنے گا اور تیرے پروردگار کے لئے رضامندی کا ذریعہ بنے گا۔ مادی فائدہ بھی بتلایا' آخرت کا فائدہ بھی بتلایا"۔

اسی طرح حدیث میں ہے : **صوموا تصحوا** روزہ رکھو' صحت حاصل کرو۔ تو روزہ کا دنیوی فائدہ صحت ہے اور اخروی فائدہ رضاء خداوندی ہے ___ اس لئے میں نے عرض کیا جہاں مادی تدابیر اختیار کی جائیں۔ وہاں روحانی تدابیر سے غفلت نہ کی جائے۔ اس پر ان شاء اللہ دنیوی فوائد بھی مرتب ہوں گے۔

نیز دنیوی اور دینی تدبیر میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح ہے' وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ اس لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ صبح کے وقت بیٹھ کر دس پندرہ منٹ **حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ** کا ورد کرلے اور رات کو سوتے وقت پانچ منٹ صرف کرکے آیت کریمہ کا ورد کرلے۔ پھر ان شاء اللہ اس کے اثرات نمایاں ہوں گے۔

میں نے ان چند کلمات سے اس وقت اپنے جذبات تشکر کا بھی اظہار کرنا ہے' اپنی محبت کا اظہار کرنا ہے اور دعا کے لئے دعویٰ تو نہیں کرتا۔ مگر بہرحال یہ ظاہر کرنا ہے کہ دعا کے سوا اور میں کسی کام کا ہوں بھی

نہیں۔ اس سے انشاء اللہ غفلت نہیں ہوگی۔ دعائیں برابر کرتا رہوں گا اور وہاں کے بزرگوں کو بھی توجہ دلاؤں گا کہ وہ بھی آپ سب حضرات کے لئے دعائیں کریں؟ ادھر دعا ہو' ادھر مادی تدبیر اور روحانی تدبیر ہو۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مشکلات کا حل نہ نکلے۔ دنیوی و دینی دونوں مشکلات ان شاء اللہ ختم ہوں گی۔

باردگر شکریہ

ان چند الفاظ کے ساتھ میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ حضرات سے بھی دعاؤں کا خواہشمند ہوں۔ آپ دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں۔ مادی چیزیں منقطع ہو جاتی ہیں۔ لیکن دعا منقطع نہیں ہوتی۔ اگر انسان آخرت میں بھی چلا جائے' جب بھی دعا وہاں پہنچتی ہے۔ اس لئے اس سے آپ بھی فراموش نہ فرماویں۔

رہا یہ کہ یہاں دوبارہ آنا ___ تو میں کہتا ہوں کہ مولانا عمر دین صاحب کم ہمتی کیوں فرماویں کہ میں جوہانسبرگ سے یہاں آؤں۔ یہ ہمت فرمائیں کہ میں ہندوستان سے لوٹ کر پھر یہاں آجاؤں۔ اس چیز کی کیا ضرورت ہے کہ میں تھوڑی دور جا کے پھر واپس آؤں۔

آپ کی محبت کی تو بے شک یہی بات ہے کہ تھوڑی دور سے واپس آؤں۔ مگر اصول یہ ہے کہ ڈاکٹر بھی موجود ہیں۔ وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ بھوک چھوڑ کے کھانا چاہئے۔ زیادہ پیٹ بھر کے آدمی کھالے گا تو کھانے کی طرف توجہ باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کچھ بھوک چھوڑی رکھنی چاہئے تاکہ بھوک باقی رہے اور دوبارہ خواہش ہو کہ پھر کھانا آئے اور جلدی جلدی کھانے میں معدہ خراب ہوتا ہے۔ بیچ میں کچھ فاصلہ ہونا چاہئے۔ اس واسطے آپ ہمت سے یوں کہیں کہ ہم وہاں سے بلوائیں گے۔ جوہانسبرگ سے بلوانا کوئی زیادہ ہمت کی بات نہیں ہے اور میں انشاء اللہ حاضری کے لئے تیار رہوں گا۔ نکما تو رہوں گا جیسے اب نکما ہوں' پھر رہوں گا۔ مگر آنے کے لئے بہرحال تیار رہوں گا۔ حق تعالیٰ حاضری بھی نافع فرمادے اور جو کچھ آپ حضرات کے لئے کہا جائے' وہ بھی۔

ان چند جملوں کے ساتھ میں اپنے بھائیوں کا' بہنوں کا اور اس ملک کے تمام مسلم باشندوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں' جنہوں نے اپنی محبت اور مدارات سے ہمارے قلوب کو موہ لیا ہے اور اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ حق تعالیٰ اس محبت کو باقی رکھے اور اس کو دارین میں ثمرات صالحہ کا ذریعہ بنائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

****